حق گوئی

ایوب بیگ مرزا

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 3-35869501
maktaba@tanzeem.org

نام کتاب ——— حق گوئی

تالیف ——— ایوب بیگ مرزا

طبع اوّل (دسمبر 2016ء) ——— 1100

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 35869501-3

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 300 روپے

ISBN: 978 - 969 - 606 - 043 - 7

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

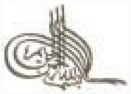
فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ نمبر
1۔	بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر	08
2۔	جہالت جدیدہ بمقابلہ جہالت قدیمہ	12
3۔	فریضہ نہی عن المنکر	16
4۔	نوجوانانِ پاکستان سے اپیل!	19
5۔	ابلیسی کردار	22
6۔	نسخۂ کیمیا	24
7۔	تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!	27
8۔	تا نہ وبالا نہ گردد ایں نظام	31
9۔	سبق پھر پڑھ امانت کا، عدالت کا، شجاعت کا	35
10۔	امن چاہتے ہو تو جنگ کے لیے تیار رہو!	38
11۔	اے مسلمانانِ پاکستان! مطالبات تسلیم کرلو	41
12۔	مجھے میرے دانشوروں سے بچاؤ!	45
13۔	اس آگ کو گل وگلزار میں بدل دو	48
14۔	ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد	50
15۔	اگر یہ صبح بھی صبح بے نور ثابت ہوئی تو.....؟	53
16۔	صور میں ماری جانے والی دوسری پھونک	56
17۔	ہے کوئی.....	59
18۔	عید آزاداں شکوہِ ملک ودیں عید محکوماں، ہجومِ مومنین	62
19۔	ہر چہ دانا کند.....	65
20۔	حضور ﷺ کا جو غدار ہے، موت کا حقدار ہے!	68
21۔	ہم سب زرداری ہیں؟	71
22۔	نفرت کیوں؟	74

23۔	N.D.W یا N.R.O	77
24۔	اسلام اور امن	80
25۔	.....انجامِ گلستاں کیا ہوگا!	83
26۔	آخر کب تک؟	85
27۔	تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ	88
28۔	اِک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا	92
29۔	''ریاست ہوگی ماں کے جیسی''	97
30۔	رمضان، قرآن، مسلمان اور پاکستان	100
31۔	طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں	104
32۔	عافیہ، انسانیت اور عافیت	107
33۔	اے ٹیپو سلطان کے بیٹو.....	111
34۔	''ایں جا بیا!''	113
35۔	ہم شرمندہ نہیں!	117
36۔	''کراچی'' جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب	121
37۔	شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات!	125
38۔	ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!	129
39۔	پس چہ باید کرد؟	133
40	افواجِ پاکستان کے نام!	137
41	سیکولر لابی کا سفید جھوٹ	141
42	عُرْوَۃُ الْوُثْقٰی	145
43	16 دسمبر 1971ء سے 16 دسمبر 2011ء تک کا سفر	149
44	کہاں ہیں وہ لوگ؟	153
45	خدارا سوچیے تو سہی!	157
46	سرمائے اور محنت میں توازن کی ضرورت	161
47	کرپشن کے سمندر میں شہزادوں کی کشتی رانی	165
48	خس کم جہاں پاک	168
49	دینی جماعتوں کے لیے لمحۂ فکریہ!	171
50	عیدِ آزاداں یا عیدِ محکوماں	175

51	عید کبھی رمضان سے پہلے نہیں آتی!	179
52	شام جل رہا ہے لیکن.....	183
53	ہم مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں!	187
54	ہندو صحافی سرمیلا بوس کے انکشافات	191
55	اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں.....	195
56	دھرتی ماں؟	198
57	عاقلاں را اشارہ کافی است!	202
58	پاکستان: اسلامی فلاحی ریاست یا مسلمانوں کا ملک؟	206
59	فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے	210
60	کیا پاکستان کا آئین اسلامی ہے؟	214
61	عُروۃُ الوثقیٰ	218
62	ایں ہمہ آوردۂ تست	223
63	کارلوٹا گال کی رہائی	228
64	نسخۂ کیمیا (قرآن سے رہنمائی)	233
65	ہم سب گلوبٹ ہیں؟	238
66	میاں صاحب! ابھی وقت ہے	241
67	حلوائی کی دکان پر.....	245
68	قصۂ آدم و ابلیس	249
69	گو نظام گو!	253
70	محرم الحرام میں دو عظیم شہادتیں	258
71	تعلیمی نصاب میں Pluralism کا پیوند	262
72	ظلم اسلام کی ضد ہے	266
73	تقدیر کا فیصلہ	271
74	بڑے اجتماعات: ہدف یا حصولِ ہدف کا ذریعہ؟	275
75	فوج: بائنڈنگ فورس؟	279
76	کیوں قتل کرتے ہو بچوں کو!	283
77	فوجی عدالتیں آخر کیوں؟	287
78	ناک کٹی جمہوریت سیکولرازم کی راہ پر گامزن	290

79	تہذیبوں کا تصادم	294
80	امریکا بھارت گٹھ جوڑ نیا نہیں، پرانا ہے!	298
81	.....ہاں باقی وہ رہ جائے گا	303
82	ہوسِ زر	308
83	کراچی، کرچی کرچی کیوں؟	313
84	ہوئے تم دوست جس کے.....	318
85	پاکستان: بھارت کے خفیہ ہتھیار ''را'' کی زد میں	322
86	ایم کیو ایم پر بی بی سی کے سنگین الزامات	326
87	عید کبھی روزوں سے پہلے نہیں آسکتی	330
88	ملا عمرؒ کی رحلت اور کالم نگار کا المیہ	334
89	﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾	338
90	1965ء کی جنگ: ایک پہلو یہ بھی ہے	342
91	اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے	346
92	زلزلہ سے بڑا عذاب	350
93	نوشتۂ دیوار	354
94	بند گلی سے نکلتا کشادہ راستہ	358
95	اے اللہ! ہمیں برکت دے ہمارے شام میں!	362
96	سب سے پہلے پاکستان	367
97	وزیراعظم پاکستان کا جنرل اسمبلی میں خطاب	371
98	ہماری قربانیاں	375
99	غلامی کی زنجیر توڑ ڈالیں	379
100	زمینی حقائق	385
101	مودی کو جواب دیں، وگرنہ.....	389
102	اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر!	393
103	خدا خیر کرے.....ایک سیاسی میچ کا احوال	397



تقدیم

از: حافظ عاطف وحید

حدیث صحیح میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ، وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ، وَسَيَكُوْنُ بَعْدِيْ خُلَفَاءُ فَيَكْثُرُوْنَ (الی آخر الحدیث۔ متفق علیہ)

حدیث مبارکہ کی شرح میں علامہ شامیؒ نے لفظ ''تسوس'' کی وضاحت میں لکھا ہے:

''هی استصلاح الخلق بارشادهم اِلَی الطَّريق المنجی فی الدنيا والآخره'' یعنی ''تسوس'' (اس کا مصدر ہے ''سیاسة'') کا مطلب ہے لوگوں کی اصلاح وفلاح کی غرض سے اُن راستوں کی طرف رہنمائی جو دنیا اور آخرت میں نجات کے ضامن ہیں۔ گویا بنی اسرائیل کے انبیاء کی سیاست لوگوں کی دنیوی واُخروی حیات کی فلاح واصلاح تھی۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کے بعد اب یہ کام انبیاء کے جانشین سرانجام دیں گے' نہ کہ کوئی اور نیا نبی آکر یہ کام کرے گا۔

ہمارے محاورے میں بعض شرعی اصطلاحات کا کچھ اپنا ہی معنی ہے۔ لفظ سیاست بھی انہی میں سے ہے۔ سیاست کا مطلب ہمارے ہاں عموماً یہ لیا جاتا ہے کہ کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے (یا نئی پارٹی بنا کر) ملکی الیکشن میں حصہ لیا جائے اور اقتدار کی دوڑ میں شریک ہوا جائے —— تاکہ اقتدار میں آکر بہت سی مزعومہ اصلاحات کا کم سے کم وعدوں کی حد تک بیڑا اُٹھایا جائے۔ اور اگر فی الواقع اقتدار میں حصہ رسدی مل گیا تو گویا ''ثواب دارین'' نصیب ہوگیا —— ورنہ ''حزبِ اختلاف'' کی برکات تو ہیں ہی' انہی پر قناعت کی جائے!

سیاسی کشاکش میں جہاں سیکولر و نیم سیکولر جماعتیں برسرپیکار ہیں وہیں بعض مذہبی جماعتیں

بھی سیاست کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے سیاسی کردار کے لیے ''کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ'' ہی سے دلیل پکڑتی ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ جب انبیائے بنی اسرائیل ہمارے محاورے کے مطابق 'سیاسی' قرار پاتے ہیں تو بس یہی ایک نکتہ کافی ہے ہماری سیاسی اداؤں کی صداقت کی دلیل کے طور پر۔ باقی ''استصلاح الخلق بارشادھم الی الطریق المنجی فی الدنیا و الآخرہ'' نہ بھی ہو پائے 'سیاست تو ہے نا!

ایک معتدل اور حقیقت سے قریب تر تعبیر اس حدیث مبارکہ کی یہ ہے کہ ہماری متداول سیاست کے دو پہلو ہیں۔ ایک عملی سیاست اور دوسرا نظری سیاست! عملی سیاست میں حصولِ اقتدار کی جدوجہد کا پہلو غالب ہے اور نظری' فکری اور علمی پہلو مغلوب ہے۔ جبکہ نظری سیاست میں اس کے برعکس فکری' نظری اور علمی پہلو غالب ہے جبکہ حصولِ اقتدار کی کشاکش کالمعدوم ہے۔ گویا انبیائے بنی اسرائیل ''اصلاح المعاش والمعاد'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے دنیوی اور اُخروی فلاح و کامیابی کے راستے بتاتے تھے' اپنے قول سے بھی اور عمل سے ان راستوں کی حقانیت کی شہادت بھی دیتے تھے' اور یوں لوگوں کی فکری و نظری اور علمی و عملی اصلاح کی عظیم خدمت سرانجام دیتے تھے۔ اس تعبیر اصطلاح کے مطابق وہ لوگ جو اس قسم کی نظری سیاست کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں وہ ہیں حقیقتاً انبیاء کے وارثین ہیں نہ کہ وہ جو اقتدار کی کشمکش میں ایسے گم ہو جائیں کہ ''پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی'' کا مصداقِ کامل بن جائیں۔

زیرِ نظر کتاب بعنوان ''حق گوئی'' ایک ایسی ہی نظری سیاست کا حاصل مطالعہ ہے جو ہمارے محترم مرزا ایوب بیگ صاحب کی تحریروں سے ماخوذ ہے۔ بیگ صاحب ایک بزنس مین بھی ہیں اور کہنہ مشق سیاسی تجزیہ نگار بھی۔ ان کے تجزیے اُن اعلیٰ دینی تصورات سے متاثر و مملوء ہیں جن کا غلغلہ نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ''تحریک رجوع الی القرآن'' کے عنوان سے برصغیر پاک و ہند میں بلند ہوتا رہا ہے۔

اس تحریک کے بانی و مؤسس اور محترم بیگ صاحب کے مرشد و مربی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ پاکستان میں اُس نظری سیاست کے موجد ہیں جو انبیائے بنی اسرائیل کا خاصہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ کے ساتھ اُس حدیث مبارکہ کو بھی اس نظری سیاست کا جزو لاینفک قرار دیا جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ' اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ' اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ)) قَالُوْا : لِمَنْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟

قَالَ: ((لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ)) (ترجمہ: ''دین تو نام ہی وفاداری و خیر خواہی کا ہے۔ پوچھا گیا کس کے ساتھ وفاداری اور کس کے ساتھ خیر خواہی؟ فرمایا: اللہ کے ساتھ' اس کی کتاب کے ساتھ' اس کے رسول کے ساتھ' مسلمانوں کے اماموں کے ساتھ اور ان کے عوام کے ساتھ'')۔ ان دو احادیث کے انضمام و اتصال سے نبوی سیاست کی بہتر تعبیر و تشریح ہوتی ہے۔ اس منصوص سیاست کا اول و آخر نصح و خیر خواہی ہے —— دینی اعتبار سے بھی اور دنیوی اعتبار سے بھی۔

مرزا ایوب بیگ صاحب لگ بھگ دو دہائیوں سے اس نظری سیاست میں دینی و ملی اہداف کو پیش نظر رکھتے ہوئے جہاد بالقلم کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کے تجزیے اور شذرات ندائے خلافت' میثاق کی زینت بھی ہیں اور بعض ملکی اخبارات و رسائل کی بھی۔ ہماری نظر میں اس کتاب کا ایک ایک عنوان اہم ہے اور یہ مسلمانانِ پاکستان پر ان دو دہائیوں میں گزرے سرد و گرم حالات کا بے لاگ جائزہ اور غیر جانبدار منظر نامہ ہے۔ قاری اگر معلوم کرنا چاہے کہ اس پر آشوب دَور کی فتنہ سامانیوں کے بالخصوص پاکستان کے سماجی' معاشی اور سیاسی حالات پر اثرات کیا کیا مترتب ہوئے اور اُن سے کیسے عہدہ برآ ہوا جائے —— بایں صورت کہ اقوامِ عالم میں پاکستان کا وقار بھی قائم رہے اور قدم قدم پر اللہ کی مدد کا آسرا بھی ٹوٹنے نہ پائے —— تو اس کے لیے اِس کتاب سے بہتر شے کوئی نہیں۔

مرزا ایوب بیگ صاحب کا زورِ قلم عوام و خواص کو یکساں مخاطب بناتا ہے۔ ایشوز چاہے ملکی و علاقائی ہوں یا بین الاقوامی' ہر سطح پر خیر خواہانہ نصیحت کا فریضہ سرانجام دیا —— اور بغیر کسی 'خدمتانے' کے —— اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ کی شان اور اُمید کے ساتھ۔ ایسے کاٹ دار قلم کی تو دنیا میں بہت 'قدر' ہوتی ہے۔ بعض لکھاریوں کی قدر لفافوں میں سما جاتی ہے اور بعض کی بریف کیسوں میں۔ لیکن یہاں معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ بقول شاعر ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی!

اور

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف!

ان مضامین کی افادیت کے عمومی پہلوؤں کے پیش نظر مکتبہ خدام القرآن کے ذمہ داران نے انہیں یکجا کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ محترم مرزا ایوب بیگ صاحب کی تائید وتصویب سے مضامین کا انتخاب عمل میں آیا اور یوں ایک مفید مطلب نسخہ کتاب وجود میں آ گیا۔ شعبہ مطبوعات کے شیخ رحیم الدین صاحب نے مشفقانہ دباؤ ڈال کر اس ناچیز سے پیش لفظ کی یہ چند سطریں تحریر کروائیں۔ بلاشبہ اس کا اگر کوئی کریڈٹ ہے تو وہ شیخ صاحب ہی کو جاتا ہے۔ راقم اللہ تعالیٰ کے حضور دست بہ دعا ہے کہ وہ اس کارِ خیر کے جملہ اسباب وظاہری مسبّبین کو اپنی خصوصی رحمت سے اَجرِ عظیم عطا فرمائے اور اس کاوش کو قبولیتِ عامہ نصیب فرمائے۔ آمین!

آخر میں اس نظری سیاست کے خال خال پائے جانے والے کواکب کی نذر ہیں' فیض احمد فیض کے مندرجہ ذیل اشعار:

اِدھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم وہمت کے مدعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں صدقِ ایماں کی
آزمودہ پرانی تلوار مڑ گئی ہے
جو کج کلہ صاحب حشم تھے
جو اہل دستار محترم تھے
ہوس کے پر پیچ راستوں میں
کلہ کسی نے گرو رکھ دی
کسی نے دستار بیچ دی ہے

اُدھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لٹا کر
نظر سے اوجھل ہوئے
اور اپنی لحد میں اِس وقت تک غنی ہیں'
اُدھر بھی دیکھو
جو حرفِ حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے رخصت ہوئے
اور اہل جہاں میں
اِس وقت تک نبی ہیں
(نبی لفظی معنی میں۔ اصطلاحاً نہیں!)

❁❁❁


بسم الله الرحمن الرحيم

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!

اللہ ربّ العزت کی صفتِ خلاقی کا اعلیٰ ترین شاہکار کون ہے؟ حسنِ خلق کی انتہا کون ہے؟ بندگی کی معراج پر کون ہے؟ کائنات میں بے مثل کون ہے؟ حکمت اور دانائی کے بلند ترین مقام پر کون فائز تھا؟ کس کی رسائی وہاں تک ہوئی جہاں پہ فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں؟ آدم وحوا کی اولاد میں سے وہ واحد ہستی کون سی ہے جس کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' کھانا پینا' سونا جاگنا' دیکھنا سننا' رہنا سہنا اور پہننا اتارنا تاریخ نے مقدس امانت کے طور پر محفوظ کر لیا؟ وہ کون ہے جس کی تجارت دیانت کی علامت تھی؟ وہ کون سی ہستی تھی جس کی امانت داری کی قسم اُس کی جان کے دشمن بھی کھاتے تھے؟ غریب کی پشت پناہی' یتیم کی سرپرستی' بچوں سے شفقت' بڑوں کی عزت واحترام' بیمار کی تیمارداری میں کون انسانوں میں سرفہرست ہے؟ عورتوں کے حقوق اور غلاموں سے اچھے سلوک کا دنیا میں مبلغ اعظم کون ہے؟ عہد نبھانا' وعدہ وفا کرنا دنیا کو کس نے سکھایا؟ وہ کون سی ہستی ہے جس کی زبان پر صرف حق جاری ہوتا اور جس سے صرف عدل کا صدور ہوتا؟ کیے جدید دور کے محققین نے تاریخ کا دھارا موڑ دینے والوں میں سے سرفہرست قرار دیا' یعنی عظیم ترین انقلابی تسلیم کیا؟ ایک مسلمان کے لیے اِس پرچۂ سوالات کا جواب دینا آسان ترین کام ہے' جس کے لیے ایک لمحہ بھی سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔ یقیناً یہ وہی ہستی ہے جس پر کائنات کے خالق ومالک نے خود درود وسلام بھیجا!—— لیکن مقامِ افسوس ہے کہ محبت کے تقریری اور تحریری دعووں کے باوجود اِس مقدس ترین ہستی کے فرمودات پر عمل اور اُس کی سنت کی پیروی آج مسلمان کے لیے مشکل ترین کام بن گیا ہے۔ کمالِ مہربانی سے

ماہ ربیع الاوّل حضور ﷺ کو الاٹ کر دیا گیا ہے، جب نعت بھی ہو گی، آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کا چرچا بھی ہو گا، لیکن فرد اور معاشرہ کی سطح پر کوئی عملی تبدیلی رونما نہیں ہو گی۔

12 ربیع الاوّل پہلے بارہ وفات کہلاتی تھی، پھر عید میلاد النبیؐ بن گئی۔ لیکن ہم اِس بحث میں نہیں الجھتے کہ آپ ﷺ کی حقیقی تاریخ پیدائش یہی ہے یا نہیں! مؤرخین کی اکثریت ربیع الاوّل کی مختلف تاریخیں بتاتی ہے۔ بعض محققین ربیع الاوّل کے علاوہ دوسرے مہینوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ روزِ قیامت کسی مسلمان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ بتاؤ ہم نے کس ماہ اور کس دن اپنے محبوب کو دنیا میں بھیجا تھا اور تم نے اُس روز جشن منایا تھا یا نہیں؟ آپ کی ولادت کا جشن منانے والوں کی خدمتِ عالیہ میں عرض ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کے نوجوانوں کو یہ بھی بتائیں کہ یومِ طائف آپؐ پر کیا گزری تھی؟ حرم شریف میں حالتِ سجدہ میں آپ کے سر مبارک پر اونٹ کی اوجڑی رکھ دی گئی تھی۔ آپؐ اپنے قبیلہ سمیت شعبِ ابی طالب میں تین سال قید رہے اور معاشی بائیکاٹ کا سامنا کیا، جس کے دوران آپؐ اور اہلِ قبیلہ درختوں کے پتے چباتے اور سوکھے ہوئے چمڑے اُبال کر اُس کا پانی پیتے رہے تاکہ جان و جسم کا رشتہ برقرار رکھا جا سکے۔ غزوۂ اُحد میں دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔ لیکن اِس سب کچھ کے باوجود آپؐ اپنے مقدس مشن سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہ ہوئے۔ اِسی طرح لالچ اور ترغیب کے تمام ہتھکنڈوں کے جواب میں فرمایا کہ اگر تم میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سورج بھی رکھ دو تب بھی احکاماتِ خداوندی سے سرِ مو انحراف نہیں کروں گا۔ آپ ﷺ پر درود بھیجنا کہ یہ سنت اللہ ہے اور آپؐ کے اوصاف اور محاسن کا ذکر کرنا یقیناً عبادت ہے، لیکن اس کے باوجود آپؐ کے احکامات پر عمل پیرا ہونے سے گریز کرنا اور سنتِ نبویؐ کو اپنانے سے راہِ فرار اختیار کرنا کھلی منافقت ہے اور اللہ ربّ العزت کو منافقت سے شدید نفرت ہے۔ اسی لیے اُس نے جہنم کی بدترین وادی کو منافقوں کا ٹھکانا بنایا ہے۔

خطبہ حجۃ الوداع کا غور سے مطالعہ کریں۔ حضور ﷺ نے جہاں اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کا گواہ مسلمانوں کے انبوہِ کثیر کو بنایا وہاں امت کو یہ ذمہ داری بھی سونپی کہ وہ اِس دعوت کو دنیا بھر میں پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے۔ ہم غور کرنے کی تکلیف گوارا کریں تو بڑی آسانی سے اِس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اُمتِ مسلمہ آج ذلت و رسوائی سے کیوں دوچار ہے، دشمن کا خوف ہمارے اذہان و قلوب پر کیوں مسلط ہے اور شکست اور

ہزیمت ہمارا مقدر کیوں ٹھہر گیا ہے؟ اس لیے کہ محسن انسانیت ﷺ سے ہماری زبانی محبت' اطاعت کی آمیزش نہیں رکھتی۔ نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت اللہ کی کبریائی کو دنیا میں کارفرما کرنا اور اُس نظامِ عدل وقسط کو قائم کرنا تھا جس کے بنیادی اصول وقواعد اللہ ربّ العزت نے اپنی آخری کتاب میں نازل کر دیے تھے۔ پھر یہ کہ اُمتِ مسلمہ کو اُمت وسط قرار دیا تھا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اِس کا بنیادی فریضہ بتایا گیا تھا۔ لیکن یہ قوم دوسروں کو معروف کا حکم کیا دیتی اور منکر کے راستے کا پتھر کیا بنتی' وہ خود مصنوعی روشنیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔

حیرت اس بات پر ہے اور سوال یہ ہے کہ جس اُمت کے قائد نے اپنے پیروکاروں کو نجی اور اجتماعی زندگی کے یہ تمام اَسرار ورموز سکھا' سمجھا اور پڑھا دیے ہوں اُس نبی ﷺ کے اُمتی یعنی مسلمان آج ذلت ونکبت سے لبریز زندگی گزارنے پر کیوں مجبور ہیں؟ ہم ذلیل وخوار کیوں ہیں؟ ہماری دعائیں کیوں نہیں قبول ہوتیں؟ دشمن کے دلوں سے ہماری ہیبت کیوں جاتی رہی ہے؟ دشمنانِ اسلام ہم پر حاوی کیوں ہیں؟ ہم پر خوف اور بھوک کا عذاب کیوں مسلط ہے؟ ہم اگر آپ ﷺ کی تعلیمات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اِس ذلت ورسوائی کی صرف اور صرف وجہ یہ ہے کہ ہم محسن انسانیت ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کو ترک کر چکے ہیں۔ ہم یا تو سیکولرازم کی راہ اختیار کر کے دین سے لاتعلق ہو گئے یا مذہب کی ایسی جزئیات میں اُلجھ کر رہ گئے جن کا انسان کی دنیا وآخرت کی فلاح وکامرانی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہم نعت گوئی پر سر بہت دھنتے ہیں' لیکن حضور ﷺ کی دیانت' امانت اور راست گوئی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ ہم حضور ﷺ کی غریب پروری پر بہت تقریریں کرتے ہیں' لیکن ہمارا معاشرہ ظلم وستم کے حوالے سے بے مثل ہے۔ راہِ حق پر چلتے ہوئے جو مصائب حضور ﷺ نے جھیلے اُن کا ہم ذکر بھی کم کرتے ہیں۔

ہم اگر نبی آخرالزماں ﷺ کی مبارک زندگی پر انتہائی سنجیدگی سے غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ آپؐ صرف آخری نبی اور رسول ہی نہ تھے' بلکہ اللہ ربّ العزت نے آپؐ پر اپنے پسندیدہ دین اسلام کی تکمیل بھی کر دی' لہٰذا اب دین کا کسی نہ کسی خطۂ زمین پر نافذ اور قائم ہونا اس کا منطقی تقاضا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء ورُسل علیہم السلام اسی دین کے تکمیلی مراحل کو کسی نہ کسی انداز میں آگے بڑھاتے رہے۔ اگرچہ انہیں شریعت یا لائحہ عمل مختلف دیے گئے لیکن دین سب کا ایک تھا' مشن سب کا ایک تھا' یعنی انسانوں پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر اللہ کے اُس دین کو بالفعل نافذ کیا جائے۔ حضور ﷺ سے پہلے یہ کام بہت سی

وجوہات کی بنا پر انجام تک پہنچایا نہ جا سکا' حالانکہ مختلف قوموں کو انبیاء و رُسل نے لاجواب کر دینے والے معجزے دکھائے جبکہ آپ ﷺ کا کمال یہ تھا اور یہ کمال لاجواب اور بے مثل تھا کہ آپؐ کے پاس نہ عصائے موسیٰؑ تھا کہ کسی دریا کے سینے کو چیر دیتے' یا وہ اژدھا بن کر وقت کے ساحروں کو نگل لیتا' نہ آپ ﷺ پر اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر آسمان سے خوان اُترا' نہ آپؐ نے قریش کو قائل کرنے کے لیے مردے زندہ کر کے دکھائے' نہ آپؐ کے لیے آگ کو گلستان میں تبدیل کیا گیا' بلکہ جب آپؐ پر سنگ باری ہوئی تو جسم اطہر لہولہان ہوا' جنگ میں دندانِ مبارک شہید ہوئے' یہاں تک کہ جادو کا اثر بھی ہوا۔ لیکن آپ ﷺ نے اللہ کے دین کی دعوت کا کام دن رات جاری رکھا اور خالصتاً انسانی سطح پر کوشش اور جدوجہد سے دین حق کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب اور نافذ کرنے کا محیر العقول کارنامہ سرانجام دیا۔ یعنی جس دین کی دعوت دی' جس کی تبلیغ کی اُسے ایک حقیقت کا روپ دے کر دنیا کو دکھا بھی دیا۔

آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے اور دنیا میں عزت و وقار کا مقام حاصل کرنے کے لیے ہمیں سیرتِ نبوی سے روشنی حاصل کرنی ہو گی اور صحابہؓ کے کردار کا جائزہ لینا ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے یوم پیدائش پر جشن تو نہیں مناتے تھے' لیکن جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرتا تھا وہاں صحابہؓ کا خون گرتا تھا۔ آپؐ کے اشارۂ ابرو پر جان کی بازی لگانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مکہ کی بے آب و گیاہ زمین کے یہ مکین قیصر و کسریٰ پر حاوی ہو گئے۔ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار پکڑ کر وہ بحر و بر کو روندتے چلے گئے۔ صحرا' جنگل اور پہاڑ کوئی ان کے راستے میں حائل نہ ہو سکا' حالانکہ ہماری طرح اُن کے بھی دو ہاتھ دو پاؤں تھے' لیکن اُن کے قلوب قرآن کی دولت سے مزین تھے' اُن کے سامنے نبی مکرم ﷺ کی سیرت تھی اور سنتِ رسولؐ اُن کا ہتھیار تھا۔ آج بھی ہمارے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہم اپنے قول و فعل کا تضاد دور کریں۔ ہماری زبانیں اگر حضور ﷺ کی نعت گوئی سے تر ہوں تو ہمارے افعال ارشادِ نبویؐ کے مطابق ہوں۔ ہم سنتِ رسولؐ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں اور صرف ماہ ربیع الاوّل ہی نہیں ہر دن ہر شب کی نسبت حضور ﷺ سے جوڑ دیں۔ کسی صورت اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور کبھی سنتِ رسولؐ کا دامن ہمارے ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ ہماری زندگیاں اس بات کی گواہ ہوں کہ ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر!!



جہالتِ جدیدہ بمقابلہ جہالتِ قدیمہ

جہالت قدیم ہو یا جدید انسانی معاشرے کے لیے ہمیشہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ جہالتِ قدیمہ کیا تھی؟ غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں اور انسان کی خرید و فروخت سرِ عام اور سرِ بازار ہوتی تھی۔ ہوا کی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ حاکمِ وقت جس کی زبان قانون کا درجہ رکھتی تھی وہ اپنے کسی ناپسندیدہ شخص کو سزا دینے کا یہ طریقہ بھی اختیار کر لیتا تھا کہ اجتماع عام میں اُسے بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جب شیر بنی آدم کی چیڑ پھاڑ کرتا تو یہ مجمع قہقہے اور ٹھٹھے لگاتا۔ لیکن تب دنیا بہت بڑی تھی۔ پہیہ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ مواصلاتی نظام انتہائی سست رو تھا۔ میڈیا نامی کوئی شے نہ تھی۔ بات سینہ بہ سینہ آگے پہنچتی لہٰذا اچھائیوں اور برائیوں کے اثرات محدود رہتے تھے۔ ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ تک پہنچ بھی جاتے تب بھی علاقائی حدود نہ پھلانگ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض برائیاں افراد اور نجی سطح پر ہونے کے باوجود اُسی معاشرے میں پوری طرح نفوذ نہ کر سکیں۔ مثلاً معاشی سطح پر سود تھا لیکن جب دو افراد قرض کا لین دین سود کی بنیاد پر کرتے تو وہی دو افراد یا زیادہ سے زیادہ وہی دو گھرانے متاثر ہوتے تھے۔ معاشرے اور سوسائٹی پر بحیثیت مجموعی اُس کے اثرات بہت کم اور جزوی پڑتے تھے۔ ظلم تھا، کفر تھا، شرک تھا، کذب بیانی تھی، لڑائی جھگڑے تھے، لیکن جو کچھ تھا ظاہر و باہر تھا منافقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن آج کا دور جسے جدید دور کہا جاتا ہے، اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کو یہ کرّہ ارض کم پڑ رہا ہے اور وہ انسان کے لیے چاند اور مریخ میں جگہ تلاش کر رہی ہے۔ اور اپنے معاشرہ کو بزبانِ خود مہذب معاشرہ کہا جاتا ہے۔ بڑے پُرزور اور پُرجوش انداز میں یہ الفاظ ادا کیے جاتے ہیں Our Civilized Society سیاسی اور عمرانی سطح پر جمہوریت کو اور جمہوری طرزِ حکومت کو ترقی کے زینہ کا آخری

Step قرار دیا جاتا ہے۔ گویا انسانی اجتماعیت نے اِس شعبہ میں چوٹی سر کر لی ہے اور منزل پالی ہے۔ لہٰذا فرمودہ مغرب یہ ہے کہ سیاسی اور عمرانی سطح پر یہ End of the history ہے۔ آیئے، ہم بھی اِس جدید دور پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے اِس حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جو اُمتِ مسلمہ کو مخاطب کرتے ہوئے دیا گیا ہے اور جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ کسی فرد یا قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کی راہ سے نہ ہٹا دے اِس حکم کو ایک اصول تصور کرتے ہوئے ہم جدید دور کا جائزہ لیتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ کوئی معاشرہ دورِ قدیم کا ہو یا جدید کا کلیتاً اچھائی اور خیر سے محروم نہیں ہوسکتا، اِس لیے کہ اچھائی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اِسے مسخ کیا جاسکتا ہے، کچلا جاسکتا ہے، ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہر معاشرے میں کسی نہ کسی درجے میں، کسی نہ کسی انداز میں موجود رہے گی، ناپید نہیں ہوگی۔ لہٰذا ہم نے نہ ہی دورِ قدیمہ کی اچھائیوں کا ذکر کیا ہے نہ ہی دورِ جدیدہ کی اچھائیوں کا ذکر کریں گے، یہ جتنی ہیں کم ہیں۔ اچھا معاشرہ وہ ہے جس میں اچھائی غالب ہو اور برا معاشرہ وہ ہے، جس میں برائی غالب ہو۔ لہٰذا قدیم اور جدید معاشرے کا ذکر اور تقابل برائیوں کی نسبت و تناسب سے ہوگا۔ جدید دور میں انسان کھلی منڈی میں خریدا اور بیچا نہیں جاتا۔ مالیاتی اداروں کے چمکتے دمکتے دفاتر میں انسانی گروہ، جماعتیں اور اقوام بک جاتی ہیں اور خرید لی جاتی ہیں۔ یعنی فرد براہِ راست خریدا نہیں جاتا، گروہوں، جماعتوں اور اقوام کے واسطے سے فروخت ہوتا ہے۔ پھر جماعتوں اور قوموں کے سربراہ اُسے re-sale کرتے ہیں۔ منافع دو جگہ تقسیم ہونے کی وجہ سے دورِ جدید کے انسان کو دورِ قدیم کے انسان کی نسبت اپنی قیمت کم وصول ہو رہی ہے۔ کیونکہ انسانوں کے لاٹ فروخت ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُس کی مارکیٹ ویلیو کم ہوگئی ہے اور وہ پہلے کی نسبت سستے داموں فروخت ہونے پر مجبور ہے۔ سود آج کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جاہلیت جدیدہ میں سود (معاذ اللہ) ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بلا سود معیشت کا تصور بھی احمقانہ ہے (نقل کفر کفر نباشد) نظروں سے اوجھل ہی سہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ پرانے زمانے کا سود جو انفرادی طور پر لیا جاتا تھا ایک فرد یا ایک گھرانے کو تباہ و برباد کرتا تھا، آج قرض صنعتکار، سرمایہ دار اور حکومتیں لیتی ہیں۔ سود در سود قوم کے ہر فرد کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ بنک میں سٹاک رہن سرمایہ دار رکھتا ہے۔ نتیجہ میں پیدا ہونے والی مہنگائی غریب کی گردن پر لاد دی جاتی ہے۔

سماجی سطح پر جائزہ لے لیں۔ پہلے عورتیں کنیزیں بنالی جاتی تھیں۔ اندرونِ خانہ عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی تھی۔ آج آزادیِ نسواں کے نام پر اُنہیں بے لباس اور برہنہ کر کے شمع محفل بنا دیا گیا ہے۔ اُس کی عریاں تصاویر چوکوں میں آویزاں کی جاتی ہیں۔ قانونی اجازت کے ساتھ اُن کی البم ہوٹلوں کو فراہم کی جاتی ہے۔ مرد کے مساوی مقام اور شانہ بشانہ کام کرنے کا دلفریب جھانسہ دے کر اُسے معاشی حیوان بھی بنا دیا گیا ہے۔ فحاشی، بے حیائی اور عریانی کو یوں گھر گھر میں داخل کر دیا گیا ہے کہ غضِ بصر انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ بدترین استحصال اور ظلم آج کے دور میں سیاسی سطح پر ہو رہا ہے۔ جرمنی کے ہٹلر کو بدترین گالیوں سے نوازا گیا اُسے اور نازیوں کو نفرت کا سمبل تو بنا دیا گیا لیکن ہٹلر ہی کے نازی وزیر خارجہ گوئبلز کی سیاست کو آئیڈیل بنا لیا گیا ہے۔ گوئبلز کا ایمان اور عقیدہ تھا کہ جھوٹ اتنا زیادہ بولو، تسلسل سے اور زوردار انداز میں بولو کہ سچ اُس کے سامنے دب جائے۔ یقین کیجئے کہ جدید ترقی یافتہ نام نہاد مہذب مغربی معاشرہ نے اِس فیلڈ میں بعض معاملات میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے گوئبلز کو بھی مات دے دی ہے۔ گوئبلز اکیلا تھا یا شاید اُس کے چند ساتھی ہوں، لیکن آج پورا مغربی میڈیا اپنی حکومتوں کے اشارے پر یہ فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ اِس حوالہ سے ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ نائن الیون کے بعد صرف دہشت گردی کا معاملہ لے لیں، یہودیوں اور عیسائیوں نے مسلمان حکمرانوں کی مدد سے کس طرح سیاہ نہیں گہرے سیاہ کو سفید ثابت کیا اور کیسے صاف اور اُجلے دامنوں کو کیمرہ ٹرک (Trick) سے دنیا کو داغدار اور گندہ دکھایا۔ دہشت گرد اور انتہا پسند کے الفاظ کا اتنا شور و غوغا کیا گیا کہ کانوں کے پردے جواب دے گئے۔

ہم چاہتے ہیں کہ جہالت قدیمہ اور جدیدہ کے عنوان کے تحت مغرب کی ان دو اصطلاحات سے بھی دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ انتہا پسند (یعنی مغرب کا Extremist) ہمارا اپنا بیورو کریٹ اور ضرورت سے زیادہ پڑھا لکھا طبقہ یہ لفظ ناک اوپر کو چڑھا کر اور ہونٹ ٹیڑھے کر کے نفرت انگیز لہجے میں بولتا ہے، ہم اِس بارے میں اپنی مختصر سی رائے دیتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات نبی آخر الزماں ﷺ کی مبارک سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے افعال ہمارے لیے حجت کا درجہ رکھتے ہیں، جو اعتدال اور توازن کی معراج ہیں۔ اِس سے کم، اِس سے زیادہ اِس کے علاوہ سب انتہا پسندی ہے۔ اگر اللہ کے احکامات کی پابندی اور سنت رسول ﷺ کی پیروی (جس میں مختلف شکلوں میں جہاد بھی شامل ہے) انتہا پسندی ہے تو ہم دل کی گہرائیوں سے دعا

لرتے ہیں کہ اے اللہ ہر مسلمان کو انتہا پسند بنا۔ اے اللہ انتہا پسندی ہمارا مقدر بنا دے۔ رہ گئی بات دہشت گردی کی تو پہلے دہشت گرد کی تعریف تو متعین کر لیں۔ دہشت گرد کون ہوتا ہے؟ کسے کس عمل کے بعد دہشت گرد قرار دیا جائے گا۔ عملی طور پر امریکہ اور مغرب کا رویہ تو یہ ہے کہ وہ خود بمباری کرے توپوں کے گولے برسا کر ہنسی بستی انسانی آبادیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ ڈیزی کٹر بموں سے انسانی جسموں کے پرزے اُڑا دے۔ انسانوں کو پنجروں میں بند کر کے اُن سے درندوں والا سلوک کرے۔ دوسری قوموں اور ملکوں پر بلا جواز اور ناجائز غاصبانہ قبضہ کرے۔ یہ سب کچھ امن کی خاطر ہے بلکہ یہی امن ہے اور اگر متاثرہ قوم یا افراد ردِعمل میں ہتھیار اُٹھائیں، ظلم کے خلاف ڈٹ جائیں اور جوابی حملے کریں اور اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کریں تو یہ دہشت گردی ہے اور ایسا کرنے والے دہشت گرد ہیں۔ ہم کسی قیمت پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہماری رائے میں یہ ریاستی دہشت گردی ہے اور انتہائی قابل نفرت اور قابل مذمت ہے۔ سیدھی سی بات ہے، بلاتفریق مذہب و نسل ہر انسان کی جان محترم ہے اور کسی کا بلاوجہ بلا جواز اور بلا مقصد خون نہیں بہایا جا سکتا۔ کوئی فرد، کوئی ادارہ یا کوئی حکومت محض ملک گیری کی ہوس میں کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کے بغیر جنگ و جدل کا بازار گرم کرتی ہے تو یہ دہشت گردی ہے۔ جس قوم اور ملک پر یہ دہشت گردی مسلط کی جائے گی تو اُس کے صاحبِ اقتدار اور مقتدر لوگوں کا قومی اور دینی فریضہ ہے کہ وہ جوابی کارروائی کریں اور وہ حکومت یہ فیصلہ کرنے کا حق بھی رکھتی ہے کہ وہ اپنی مدد کے لیے کہاں سے اور کن افراد سے مدد حاصل کرتی ہے۔ اور اگر اُس ملک کی حکومت اپنا یہ فریضہ ادا نہیں کرتی اور دشمن کے ایجنٹ کا رول ادا کرتی ہے تو پھر عوام کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اپنے اِن دونوں دشمنوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے جہاد کس انداز سے کرے۔

بہرحال ہمارا اصل موضوع جہالتِ قدیمہ اور جہالتِ جدیدہ تھی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جہالت ہر دور اور ہر طرح کی قابل مذمت اور قابل نفرت ہے، لیکن جہالت جدیدہ انسان پر ظلم و ستم ڈھانے اور اُسے انفرادی اور اجتماعی طور پر تباہ و برباد کرنے میں جہالت قدیمہ سے بازی لے گئی ہے اور اِس کا انجام کسی خطے کی نہیں عالمی سطح پر تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اپنے اور اپنے بندوں کے دشمنوں کو ہدایت دے اور اگر ہدایت اُن کی قسمت میں نہیں تو اِس سے پہلے کہ وہ عالمی سطح پر تباہی پھیلائیں وہ خود تباہ و برباد ہو جائیں۔ ✿✿✿

فریضہ نہی عن المنکر

پاکستان کے خالص مذہبی حلقوں میں جمہوریت کو کبھی بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ لیکن اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جمہوری نظام کا ملوکیت اور فوجی آمریت سے اصل فرق اظہار رائے کی آزادی کا ہوتا ہے۔ جمہوریت میں گھٹن نہیں ہوتی اور ماحول میں جس کی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اِس نظام میں دانشوروں اور سیاست دانوں کو تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ جمہوری ملک میں اگر کوئی اختلافی مسئلہ زیادہ شدت اختیار کر جائے تو لوگ اپنے جذبات کے اظہار کے لیے سڑکوں پر نکل آتے ہیں۔ جمہوریت کی زبان میں اِسے عوامی مظاہرہ کہا جاتا ہے۔ اصولی طور پر تو مظاہرہ کسی بھی شعبہ زندگی میں اختیار کی گئی کج روی اور غلط کاری کے خلاف ہونا چاہیے لیکن پاکستان میں مظاہرہ صرف سیاسیاست سے منسلک ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی مظاہرین خصوصاً مظاہرے کے منتظمین سیاسی عزائم رکھتے ہیں اور اُن کا ہدف بلاواسطہ یا بالواسطہ اپنے سیاسی حریف ہوتے ہیں۔ اِس کا اہتمام اکثر و بیشتر اپوزیشن جماعتیں کرتی ہیں، تاکہ عوامی سطح پر وقت کے حکمرانوں کے خلاف جذبات بھڑکائے جائیں اور کرسی کی جنگ میں پانسہ پلٹا جا سکے۔ ایسے مظاہروں میں کسی ایسی برائی کے خلاف آواز اٹھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جس سے اُن کا اپنا ووٹ بنک متاثر ہونے کا معمولی سا امکان بھی ہو۔

تنظیم اسلامی کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کی سیاست اور فرقہ واریت سے بلند ہو کر معاشی اور معاشرتی برائیوں کے خلاف مظاہرے کرتی رہتی ہے اور عوام کو اِن برائیوں کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتی ہے۔ گزشتہ ہفتے تنظیم اسلامی نے عریانی اور فحاشی کے خلاف ملک

گیر مظاہرہ کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کر کے حاصل کیا گیا تھا' وہاں لوگوں کا اسلام سے تعلق محض رسمی اور رواجی سا ہو گیا ہے۔ سیکولر اور آزاد خیال لوگوں کا تو ذکر ہی کیا' نماز روزہ کے پابند مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ معاشرتی اور سماجی سطح پر اللہ اور رسول ﷺ کے فرامودات کو پسِ پشت ڈالے ہوئے ہیں۔ بقول علامہ اقبال

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

اللہ رب العزت نے اپنی آخری کتاب قرآن حکیم میں اسلام کا معاشرتی نظام بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور معاشرتی برائیوں کی وجہ سے سابقہ امتوں کے عبرتناک انجام سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ اللہ فرماتا ہے "بے حیائی کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ ظاہر ہو یا چھپی ہو" اور مزید ہم پر واضح کر دیا کہ "شیطان تمہیں بُرے کاموں اور فحش باتوں کا حکم دیتا ہے"۔ ہمارا دین عورت کو پردے کا اہتمام کرنے اور گھر میں ٹکے رہنے اور مرد و زن کو نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ عریانی اور فحاشی کا آغاز بے پردگی سے ہوتا ہے لیکن مغرب کی تقلید میں ہمارے معاشرے میں بے پردگی کو فیشن سمجھا جاتا ہے' اور یہ سٹیٹس سمبل بن چکا ہے۔ حالانکہ مغرب میں عریانی اور فحاشی کے تباہ کن نتائج ظاہر ہو رہے ہیں۔ خاندانی نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ اگر ہم مغربی معاشرہ کی تقلید کرتے رہے تو یہ تباہی و بربادی ہمارے گھروں کا رخ بھی لازماً کرے گی۔ لہٰذا ہماری سیاسی خصوصاً مذہبی سیاسی جماعتوں کو حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اقتدار کے حوالے سے میوزیکل چیئر کے کھیل میں مصروف رہتی ہیں اور کرسی کی جنگ میں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں اپنی توانائیاں صرف کرتی ہیں تو یہ نظریاتی ملک کسی خوفناک حادثہ سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ہماری رائے میں کوئی جماعت سیاسی ہو یا مذہبی قوم کا درد رکھنے یا وطن سے محبت کرنے کی دعویدار ہے تو اُس کا ٹیسٹ یہ ہے کہ وہ فریضہ نہی عن المنکر ادا کرتی ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک ووٹ بنک کے متاثر ہونے کے خدشہ سے کسی برائی سے صرف نظر کرنا قومی جرم ہے۔

قیادت کا رویہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے موقف کا تعین کرے بلکہ قیادت کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ راہِ راست کی طرف عوام کی رہنمائی کرے اور عوام کی تعلیم و تربیت پر وقت اور وسائل صرف کرنے میں بخیلی سے کام نہ لے۔ ایک اچھی قیادت کا حقیقی وصف یہ ہے کہ وہ کسی

سیاسی نقصان کو خاطر میں نہ لائے اور پوری استقامت کے ساتھ صراطِ مستقیم اور شاہراہ حق پر گامزن رہے، عوام کو دلیل سے قائل کرے لیکن صرف گفتار کی غازی نہ بنے بلکہ اُس کا کردار بھی بے داغ ہو۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کو خاص طور پر اِس طرف توجہ دینی چاہیے۔ آخروی فلاح کے حصول کی جدوجہد میں اگر انتخابات میں ہار ہو جائے تو ایسی ہار پر جیت کو سو بار قربان کیا جا سکتا ہے۔ عوام کو برائی سے آگاہ کرنا ہی نہیں روکنا بھی ہمارا فرض ہے، وگرنہ کون نہیں جانتا کہ امام غلطی کرے اور اصلاح قبول نہ کرے تو مقتدیوں کا گناہ بھی اُس کے سر آتا ہے۔



نوجوانانِ پاکستان سے اپیل!

کیا کبھی آپ نے دیکھا کہ کسی گھر میں جواں سال مریض جان کنی کی حالت میں پڑا ہو، اُس کی نبض ڈوب رہی ہو۔ ڈاکٹر کے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی ہو۔ وہ بار بار نفی میں سر ہلا رہا ہو۔ کبھی ایک نسخہ تجویز کر رہا ہو اور کبھی دوسرا، اور گھر والوں سے دعا کے لئے کہہ رہا ہو۔ لیکن اُس گھر کے مکین دوا اور علاج کے لئے دوڑ دھوپ کرنے کی بجائے اور اللہ سے مریض کی شفا اور صحت یابی کے لئے گڑگڑا کر دعائیں کرنے کی بجائے، راگ رنگ میں مصروف ہوں یا ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے تالیاں پیٹ رہے ہوں یا گھر میں رنگا رنگ تقریبات منعقد کر رہے ہوں یا سیر و تفریح اور پکنک منانے کا پروگرام بنا رہے ہوں۔ اگر اہلِ خانہ کی ذہنی حالت درست ہے تو ایسا ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ کوئی قوم 60 سال کی عمر کو پہنچے تو وہ اُس کی بھرپور جوانی بلکہ نوجوانی کی عمر ہے۔ جیسے چین اور بھارت اِس عمر کو پہنچے ہیں تو اُن کی توانائی عالمی سطح پر محسوس کی جا رہی ہے، جبکہ جوان سال پاکستان انتہائی لاغر اور کمزور حالت میں بستر پر پڑا ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کا خون نچوڑا جا چکا ہے۔ اُس کی ہڈیوں کا گودا نکالا جا چکا ہے یا اِس کو کوئی ایسا موذی مرض لاحق ہو گیا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں۔ دنیا جہاں اور خود پاکستان کے اندر سے یہ آوازیں اُٹھ رہی ہیں کہ اب بچنا نظر نہیں آتا۔ عالمی سطح پر ایک انتہائی طاقتور اتحاد اپنے دانت تیز کر رہا ہے۔ سفید سامراج پاکستان کے اندر کارروائی کرنے کی باتیں سرکاری سطح پر کر رہا ہے لیکن گردن گھما کر دیکھیں، کوئی اضطراب، بے چینی، بے قراری، کوئی تشویش یا کم از کم پریشانی ہی آپ کو محسوس ہوتی ہے؟ شادیوں کا موسم ہے، شادیانے بج رہے ہیں۔ واپڈا کی پھیلائی ہوئی تاریکی کو جنریٹروں کی گڑگڑاہٹ سے روشنی میں بدلا جا رہا ہے۔ دھن کمانے اور اندھا دھند کمانے کا موسم تو

60 سال سے یکساں ہے، اُس کے بدلنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ حرام حلال پرانے زمانے کی کہانیاں ہیں۔ بے حیائی اور بدکرداری کو روشن خیالی کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ جشن آزادی پر صدرِ محترم بھی ناچتے ہیں۔

یہ اُس پاکستان کی کہانی ہے جسے دشمن نے 1971ء میں وار کر کے دولخت کر دیا تھا۔ اب وہی دشمن عالمی اتحاد کی صورت اختیار کر کے بدترین وار کرنے کی تیاریوں کو آخری شکل دے رہا ہے۔ لیکن ہم باہم دست و گریبان ہیں۔ ہم دولت کی دیوی کے پجاری بن چکے ہیں۔ اسی کے آگے سربسجود ہیں۔ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے، ہمیں کچھ غرض نہیں۔ ہاں کچھ دانشور ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر کسی قدر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن متوقع تباہی و بربادی سے محض اظہارِ تشویش سے بچا نہیں جا سکتا، اِس کے لئے قوم کے ہر فرد خصوصاً نوجوانانِ پاکستان کو اُٹھ کھڑا ہونا ہوگا۔ ابھی مہلت ہے، ابھی مریض کے رکتے ہوئے سانس کو بحال کیا جا سکتا ہے۔ جوش اور ہوش دونوں کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مل بیٹھ کر کوئی لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ ماضی پر نگاہ ڈالنی ہوگی۔ کہاں سے ڈی ٹریک ہوئے۔ کیوں کج راہ ہوئے۔ مرض کی درست تشخیص ہو پھر علاج کے لئے نسخہ تجویز ہو۔

ہماری رائے میں استحکامِ پاکستان کے لئے تحریکِ پاکستان جیسا عزم لیکن انداز مختلف اپنانا ہوگا۔ قیام پاکستان کے لئے مسلمان ووٹ کی ضرورت تھی۔ متقی پرہیزگار اور فاسق و فاجر مسلمان کا ووٹ ایک جیسا تھا۔ لہٰذا زبان کی نوک پر آئے ہوئے اِس نعرہ سے کام چل گیا: ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ''۔ دفاعِ پاکستان اور استحکامِ پاکستان کے لئے لا الٰہ الا اللہ میں ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ بھی کرنا ہوگا۔ اِسے ذہنی اور قلبی طور پر تسلیم کرنا ہوگا اور اِسے عملی شکل بھی دینا ہوگی، جیسے کوئی انسان مسلمان تو صرف کلمہ طیبہ پڑھنے سے ہو جاتا ہے لیکن اچھا مسلمان اللہ اور رسول کے احکامات کی پابندی کے بغیر نہیں بن سکتا۔ ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ مملکت خداداد پاکستان کو بچانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ کی جائے۔ ہر پاکستانی مسلمان اپنی ذات پر بھی اسلام نافذ کرے اور جس مقصد کے لئے پاکستان بنایا گیا تھا یعنی ایک اسلامی فلاحی جمہوری ریاست قائم کی جائے گی اُس مقصد کے لئے تن من دھن لگا دے۔ اگر ہم نفاذِ اسلام میں کامیاب ہو جائیں اور دنیا کو اسلامی ریاست کا ایک نمونہ دکھا دیں تو پاکستان نہ صرف جانبر ہو جائے گا بلکہ ایک قوت بن کر ابھرے گا، ان شاء اللہ۔ ہم ایک بار پھر نوجوانانِ

پاکستان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ قیام پاکستان کے بعد سے ہماری قیادت سے نفاذ اسلام کے حوالے سے جو مجرمانہ کوتاہی ہوئی اُس کا ازالہ کریں۔ ملک کی بقاوسلامتی کے لئے سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کی جدوجہد میں شامل ہو جائیں۔ وہ سوچیں اور غور کریں کہ پاکستان کا مستقبل ہی اُن کا مستقبل ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ پاکستان کا مستقبل تاریک ہو اور اُن کا مستقبل روشن ہو جائے۔ جس کسی کو ارضِ پاکستان سے محبت ہے وہ جان لے کہ پاکستان جسم ہے اور اسلام اِس کی روح ہے۔ روح اِس قفس سے پرواز کر گئی تو اِس لاشے کو نوچنے کے لئے چیل اور گِدھ تیار بیٹھے ہیں۔



ابلیسی کردار

''جامعہ حفصہ آپریشن کرنے والوں کو میں سیلوٹ کرتا ہوں اور قوم کو بھی چاہیے کہ اُنھیں سلام کرے۔'' یہ الفاظ صدر بش یا ٹونی بلیر کے نہیں ہیں بلکہ مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر پرویز مشرف کے ہیں۔ اِس بدقسمت شخص کی یہ ہرزہ سرائی ہم نے اس کے منہ سے نہیں سنی بلکہ اخبار میں پڑھی اور خلق خدا کو اِس کا ذکر کرتے سنا۔ ہمارے پاس اِس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی اِس کی کوئی وجہ تسمیہ بیان کر سکتے ہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں ہمارا ذہن یہ جملہ پڑھ اور سن کر قصۂ آدم و ابلیس کی طرف منتقل ہو گیا۔ یہ قصہ قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ شیطان کی دلیل یہ تھی کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور آدم مٹی سے، اور آگ مٹی سے برتر ہے۔ اللہ نے اس پر لعنت بھیجی اور وہ راندۂ درگاہ ہوا۔ وہ عزازیل سے ابلیس ہو گیا یعنی انتہائی ناامید۔ اُسے سزا جرم کے فوراً بعد نہیں بلکہ اپنے جرم پر مُصر رہنے پر سنائی گئی۔

صدر مشرف گزشتہ دنوں سینئر صحافیوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ اِس گفتگو میں اُنہوں نے جھوٹ کے انبار لگا دیئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ اُنھوں نے ججوں کو برطرف نہیں کیا بلکہ ججوں نے خود ہی P.C.O کی تحت حلف نہ لیا، اس لیے وہ فارغ ہو گئے۔ صدر مشرف اپنے نو سالہ اقتدار کے دوران جن جرائم کے مرتکب ہوئے، اُن کی فہرست بہت طویل ہے۔ اُنھوں نے 12 اکتوبر 1999ء کو اسمبلی میں دو تہائی اکثریت کے حامل عوامی وزیراعظم کو گن پوائنٹ پر گھر بھیج دیا اور اپنے فوجی حلف کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے ملک کے چیف ایگزیکٹو بن بیٹھے۔ پھر جعلی ریفرنڈم کے ذریعے صدر بن کر قوم پر مسلط ہو گئے۔ اگرچہ یہ بھی سنگین جرائم ہیں اور پاکستان کے آئین کی شق 6 کے مطابق باغیانہ فعل ہے اور مجرم کو سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ لیکن عوام اِس

کے باوجود فوجی حکمرانوں کو اِس لیے قبول کر لیتے ہیں کہ سیاست دان بھی اُن سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ تاہم عوام کے نزدیک نائن الیون کے بعد صدر مشرف نے جو رول اختیار کیا اور نام نہاد دہشت گردی کی جنگ کو جس طرح اپنے اقتدار کی طوالت کے لیے استعمال کیا، اُسے محض غیر قانونی اور غیر اخلاقی کہہ دینا درست نہیں ہے، یہ ملک وقوم کے ساتھ غداری کی گئی تھی۔ پھر جامعہ حفصہ میں جو کچھ ہوا اگر کسی انڈسٹریل ادارے یا جلسے جلوس میں ہوا ہوتا، تب بھی اسے ظلم اور درندگی کہا جاتا، لیکن قرآن پڑھتی جوان بچیوں کو فاسفورس بموں سے جلا کر بھسم کر دینا، اُن کی جلی ہوئی ہڈیوں کو نالے میں پھینک دینا، اِس قبیح فعل کی مذمت کے لیے دنیا کی کوئی زبان الفاظ فراہم نہیں کر سکتی۔ یہ مسلمانوں کے لیے ہی نہیں انسانیت کے لیے باعث شرم ہے۔ کسی نے درست کہا ہے کہ انسان جب ظلم وستم پر اترتا ہے تو درندوں کو مات کر جاتا ہے۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ جس اقتدار کو بچانے اور امریکی سہارا حاصل کرنے کے لیے اِس بد بخت شخص نے یہ ظلم کمایا تھا، وہی اقتدار اِس کی گردن میں رسہ بن کر پڑے گا (ان شاء اللہ)۔

ارادہ تو یہ تھا کہ صدر مشرف نے اپنی گفتگو میں دروغ گوئی کے جو نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں، اُن سب کا پوسٹ مارٹم کیا جائے لیکن سچی بات یہ ہے کہ جامعہ حفصہ میں ہونے والے ظلم اور درندگی کی مذمت سے ابھی دل بھرا نہیں۔ بہر حال اپنی کم علمی اور کم مائیگی کی وجہ سے اِس مذمت کو ادھورا چھوڑتے ہوئے ہم قوم سے ایک سوال کرتے ہیں کہ کیا ایک ایسا شخص جو بات بات پر جھوٹ بولے یعنی ثابت شدہ کاذب ہو، وہ مسلمانوں کا حکمران بن سکتا ہے۔ ایک حدیث شریف کی ترجمانی یوں کی جا سکتی ہے کہ مسلمان میں بہت سے عیوب ہو سکتے ہیں لیکن وہ جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اِس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانانِ پاکستان پر فرض ہے کہ وہ ایسے دروغ گو اور کاذب انسان کو مسند اقتدار سے اُتار کر کٹہرے میں کھڑا کریں اور اُس سے اُس کے ظلم وستم کا حساب لیا جائے اور سچ یہ ہے کہ دنیا اور اِس کے قوانین ایسے ظالم انسان کو بھرپور سزا دینے سے قاصر ہیں۔ کیا ایک مرتبہ دی گئی پھانسی جامعہ حفصہ اور قبائلی علاقوں میں بہائے گئے خون کا بدلہ ہو سکتی ہے۔ یقیناً نہیں۔ اِس کا حساب اور اس کی پوری سزا تو صرف روز قیامت ممکن ہوگی۔



نسخہ کیمیا

کالم نویسی اور اداراتی تحریریں یہ کام دنیا میں سب سے زیادہ آسان پاکستان میں ہے، اِس لیے کہ جس طرح یہ کوئی خبر نہیں کہ کتے نے انسان کو کاٹ لیا بلکہ خبر یہ ہے کہ انسان نے کتے کو کاٹ لیا، اِسی طرح جن ممالک میں لائف روٹین کے مطابق چلتی رہتی ہے، کوئی سیاسی ہنگامے نہیں ہوتے، آئین بنتا اور ٹوٹتا نہیں رہتا، لانگ مارچ اور ٹرین مارچ نہیں ہوتے، دھرنے نہیں دیئے جاتے، گو صدر گو یا گو وزیراعظم گو نہیں ہوتا، حکومتیں سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس پر حملے نہیں کراتیں، ججوں کو قید بامشقت نان فنکشنل نہیں کیا جاتا، جن ممالک میں این آر او (NRO) یعنی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا لائسنس نہیں ملتا اور جہاں اپنے شہریوں کو سپر پاور کے حوالے کر کے دام کھرے نہیں کیے جاتے، جہاں لاپتہ افراد (Missing Persons) کی اصطلاح سے کوئی آشنائی نہیں، جہاں نہ کبھی 9 مارچ آتا ہے اور نہ کبھی 12 مئی آتا ہے اور اہم ترین بات یہ کہ جہاں سربراہ حکومت یا سربراہ ریاست کے باوردی ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اِن ممالک کے لکھاری کتنی مشکل میں ہوتے ہوں گے۔ اِن بیچاروں کے پاس لکھنے کو مواد کہاں سے آتا ہوگا۔ پاکستان اِس حوالہ سے نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ اپنی اچھل کود ایکسپورٹ بھی کرتا رہتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالقدیر ایران، لیبیا اور شمالی کوریا کی گلیوں میں ایٹم بم لے لو، بڑا ستا لے لو کی صدائیں لگاتا رہا ہے۔ یہ کسی نے اُس پر الزام نہیں لگایا، بلکہ خود بنفس نفیس اُس نے الیکٹرانک میڈیا پر اس جرمِ عظیم کا بقائمی ہوش وحواش اعتراف کیا ہے اور یہ پردہ سکرین پر صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دلی آمادگی اور انشراح صدر کے ساتھ کیا ہے؟

پیارے وطن میں تو روزنامے میں اداریہ لکھنا کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہفت روزہ یا ماہنامہ

میں تو اداریہ نویس کو یہ مسئلہ پیش آ جاتا ہے کہ کون سے مسئلہ پر قلم اُٹھایا جائے اور کس سے صرفِ نظر کیا جائے۔ اِسی ہفتہ کو لے لیں، بہت سے موضوعات ہیں۔ مثلاً لانگ مارچ ہے جس کی دھوم نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں مچی ہوئی تھی۔ غریب نواز بجٹ تھا۔ پھر یہ کہ آصف زرداری کا ہر بیان اگرچہ اعلیٰ درجہ کے پولیٹکل انٹلکچولز کو تو مخمصے میں ڈال دیتا ہے، ہمہ شمہ اداریہ نویس کو تو اُن کا ہر جملہ ایک اداریے کا مواد مہیا کر دیتا ہے۔ پھر اپنے الطاف بھائی ہیں۔ ہر ایشو پر اُن کے فدائی ''جو قائد کا غدار ہے، موت کا حقدار ہے'' کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں۔ ہم جیسے بدذوق اُس پر بھی قلم اُٹھا لیتے ہیں۔ کبھی کبھار یورپ والے جوابی مروت کا اظہار کرتے ہوئے عالمی خواتین دن، مزدوروں کا عالمی دن، مدر ڈے، فادر ڈے اور ویلنٹائن ڈے جیسے خوبصورت آئیڈیاز دیتے ہیں تو قلکاروں کو قرطاس سیاہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آج ہم نے اِن موضوعات کے مجمع پر خودکش حملہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی ہر موضوع پر دو دو جملے لکھ کر صحافت کا لانگ مارچ کریں گے۔

سچ یہ ہے کہ وکلاء کا لانگ مارچ حاضری کے اعتبار سے انتہائی کامیاب تھا۔ پُرامن اور عدم تشدد کے حوالہ سے یہ ایک معجزہ تھا جو رونما ہوا۔ ججوں کی بحالی اور مشرف کی بدحالی کے حوالہ سے بھی اِس لانگ مارچ سے منزل قریب آئی ہے، البتہ اِس کا اختتام بڑے بھونڈے انداز سے کیا گیا۔ جن وجوہات کی بنا پر دھرنا نہیں دیا جا سکتا تھا وہ وکلاء قیادت کے سامنے پہلے بھی تھیں، پھر کنفیوژن کیوں پیدا کیا گیا۔ آغاز میں یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ہمارے اِس لانگ مارچ کا اختتام ایک بڑے جلسہ پر ہوگا، دھرنا دینے کے لیے ہمارے وسائل نہیں ہیں۔ ہم لانگ مارچ کے بعد منزل کے حصول کے لیے اگلا لائحہ عمل دیں گے۔ بجٹ کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ہمیں بہت ڈر محسوس ہوتا ہے، کل کلاں کوئی کہہ دے گا، یہ وطن آپ کا بھی ہے آپ ہی اِس کا بجٹ بنا دیں اور ہم انتہائی مشکل میں پھنس جائیں گے اِس لیے کہ اِس حال میں کہ اِس اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں، بجٹ سازی کے لیے معاشی یا اقتصادی ماہر کی نہیں شعبدہ باز کی ضرورت ہے اور اس کام کے لیے موجودہ شعبدہ بازوں سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟ یہ بجٹ زراعت دوست بجٹ کہلوانے کا حق رکھتا ہے اگر وہ سب کچھ کیا جائے جو کہا گیا ہے۔ آصف زرداری کے بیانات کے حوالہ سے جاوید ہاشمی نے کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے کہ اِن کے بیانات کو سمجھنے کے لیے خصوصی سیاسیات میں پی ایچ ڈی کرنا پڑے گی۔ اپنی سیاست کا بنیادی اصول آصف زرداری نے یہ بتایا

ہے کہ پارلیمنٹ بالادست ادارہ ہوگی لیکن خود اپنے لیے پارلیمنٹ سے دور رہ کر بادشاہ گری کا رول پسند کیا ہے۔ قائد ایوان اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ ججوں کی بحالی کا اُنہوں نے عزم کیا ہوا ہے۔ آصف زرداری پُر مغز سیاست دان ہیں۔ اُنہوں نے اس عزم کو عمل میں بدلنے کا کبھی وعدہ نہیں کیا، لہٰذا وہ اپنے عزم کو سنبھالے رکھیں گے اور کوئی اُنھیں وعدہ شکن نہیں کہہ سکے گا۔ الطاف بھائی کے مقرر کردہ کراچی کے میئر اب براہِ راست امریکہ مدعو ہوتے ہیں اور وہاں ہوم ڈیپارٹمنٹ سے مذاکرات کرتے ہیں جہاں پاکستان کے کسی مرکزی وزیر کی پہنچ بھی نہیں ہے۔ ہم اُن پر تبصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔ اِس ہفتہ میں پاکستان سمیت دنیا بھر میں فادرز ڈے منایا گیا یعنی یورپ نے ہمیں پڑھایا ہے کہ کرسمس کے علاوہ بھی ایک دن اولڈ ہاؤس میں اپنے باپوں کی خبر لے لیا کرو۔ آج جبکہ لمحے لمحے کی قیمت ہے باپ کو ایک سال میں ایک چھوڑ دو بار ملاقات کا موقع فراہم کر دینا یقیناً اہل یورپ کی طرف سے فراخ دلی کا اظہار ہے۔ ہم مسلمانانِ پاکستان کس قدر سمجھدار ہیں۔ اِس کام میں بھی دنیا کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں، شاید بھول جاتے ہیں کہ ہماری بغل میں کتابِ زندہ ہے جو ہر پہلو سے ایک بے مثل شاہکار ہے، جس میں والدین کے حقوق کا اعتراف اور اُن کا زندگی بھر احترام فرض کیا گیا ہے۔ یہی ہماری پستی، ورزوال کا اصل سبب ہے کہ ہم اِس کتابِ زندہ سے منہ موڑ کر امریکہ اور یورپ سے گندم کے ساتھ ساتھ فلاحی تعلیمات بھی وصول کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی لانگ مارچ اُس وقت تک کُلی خیر کی حیثیت سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی، کوئی بجٹ عوامی بجٹ نہیں بن سکتا اور ہم اپنی قیادت کے شعبدہ بازی سے ڈھلوان سے لڑھکتے رہیں گے اور عالمی میدان میں فٹ بال بنے رہیں گے جب تک اِس کتاب زندہ کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رہنما نہیں بنائیں گے۔ قرآن کو رہنما بنالو، دنیا تمہیں اپنا رہنما بنالے گی۔ یہی قوت، ترقی اور عزت واحترام حاصل کرنے کا نسخہ کیمیا ہے۔



تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب!

مسلمانانِ ہند کا روزِ اوّل سے مذہب سے جذباتی لگاؤ رہا ہے۔ دنیا کے کسی بھی حصہ میں مسلمانوں پر افتاد پڑے یا کسی مقدس ہستی کی شان میں گستاخی کی جائے، اِس کے خلاف بھرپور اور زوردار آواز برصغیر پاک و ہند سے ہی اٹھے گی۔ ''ترک نادان'' نے خلافت کی قبا چاک کی تو ہندوستان میں تحریک خلافت اِس زور سے برپا ہوئی کہ گاندھی جیسے مسلم دشمن کو بھی اِس کے حق میں آواز اٹھانا پڑی۔ فلسطینیوں کی جس جوش و جذبہ سے حمایت اِس خطہ سے کی گئی، اُن کی ایسی اخلاقی اور سفارتی تائید تو اہل عرب بھی نہ کر سکے۔ اسی مذہبی جذبہ نے جنون کی صورت اختیار کی اور مسلمانانِ ہند کو ''پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ'' بتایا گیا، تو ہندوؤں کی منظم اکثریت اور ہٹلر کی قوت کو پاش پاش کر دینے والی انگریزی فوج ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعرہ کے سامنے سیلاب میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ افسوس یہ جذبہ

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

کے مصداق مسلمانانِ ہند کی عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ کر سکا۔ اکثریت کبھی پابندِ شریعت نظر نہ آئی۔ روزمرہ زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اللہ اور رسول ﷺ کو حَکم نہ بنایا گیا (اِلا ماشاء اللہ)، قرآن کو چوما چاٹا گیا۔ اُس کے تقدس پر جانیں نچھاور کی گئیں لیکن اُسے امام نہ بنایا گیا۔ بہرحال یہ جذبہ انتہائی قیمتی اور قابلِ قدر تھا۔ اگر اِسے دیانتداری اور خلوص سے مثبت رخ دینے کی سعی کی جاتی تو اِس خطے کے مسلمانوں کی تقدیر بدل جاتی، ہندوستان کی تاریخ بدل جاتی۔ لیکن بیوپاری قلم کاروں نے، دورِ کعت کے اماموں نے اور مذہب کا کھیل کھیلنے والے کھلاڑیوں نے اِس

جذبے کو ہمیشہ منفی انداز میں استعمال کیا، مذہبی منافرت پھیلانے اور مسلمان کو مسلمان کا دشمن بنانے کے لئے استعمال کیا۔ اِس گروہ کی تازہ ترین واردات یہ ہے کہ اُنہوں نے ARy پر ڈاکٹر اسرار احمد کے ایک نشری پروگرام کو عذر بنا کر ٹیلی فون پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں، غلیظ گالیاں نکالیں۔ قرآن کے اِس خادم کے خلاف بازاروں میں بینر لگائے، جلوس نکالے، جلسے کیے، جن میں انتہائی اشتعال انگیز اور مغلظ زبان استعمال کی۔ ڈاکٹر صاحب تو بہر حال ایک عام مسلمان ہیں۔ اُنہوں نے سب کچھ صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ اِس پر اللہ رب العزت کے ہاں اُن کا اجر محفوظ ہے۔ اِس معاملہ میں ہمارے لیے نا قابل برداشت بات یہ ہے کہ فتنہ سازوں نے اِس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرامؓ پر تبرّے بھیجے اور انتہائی غلیظ زبان استعمال کی، جسے یہاں نقل کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔

ہم اپنے قارئین کا یہ حق سمجھتے ہیں کہ اُنہیں اصل واقعہ سے آگاہ کیا جائے۔ یہ گیارہ سال پہلے 1997 کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنا سلسلہ وار درسِ قرآن دے رہے تھے۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر 43 کا شانِ نزول بیان کرتے ہوئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک حدیث کا حوالہ دیا۔ یہ سنن ابو داؤد اور جامع ترمذیؒ کی روایت ہے۔ اہل سنت کے اکثر مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اِس کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی نے خوب چھان پھٹک کر اِس حدیث کو صحیح قرار دیا۔ جبکہ مجموعہ ہائے تفاسیر میں دیگر کے علاوہ تفسیر طبری، قرطبی، ابن کثیر، زاد المسیر، الدر المنثور، روح المعانی، تفسیر خازن، الوسیط وغیرہ میں یہ حدیث مذکور ہے۔ عصرِ حاضر کی معروف تفاسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیان القرآن، مفتی محمد شفیعؒ کی معارف القرآن اور مولانا عبدالرحمٰن کیلانی کی تیسیر القرآن میں بھی یہ حدیث مذکور ہے۔ ہم یہ چند حوالے اِس لیے پیش کر رہے ہیں، تاکہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ یہ حدیث محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی طبع زاد نہیں کہ اُنہیں اِس پر مطعون کیا جائے، خدا جانے یہ انتشار پسند مسلمان یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اِس الزام تراشی کی زد ڈاکٹر اسرار احمد پر نہیں پڑتی بلکہ اہل سنت کے علماء اور مفسرین پر پڑتی ہے، زمانی لحاظ سے اُن کا تعلق چاہے سلف سے ہو یا خلف سے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات پر کیچڑ اچھالنے والے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب شیعہ سنی مفاہمت کے علمبردار رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کمسن افراد میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے، جو خلیفہ راشد تھے، جن کا شمار

عشرہ مبشرہ میں تھا، وہ نہ صرف بدری صحابی تھے بلکہ کفار کے خلاف ہر محاذ پر صفِ اوّل میں نظر آتے تھے۔ میدان جنگ میں اپنوں سے ہی نہیں، دشمن سے بھی دادِ شجاعت حاصل کرتے تھے۔ علم وفلسفہ کے میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نظر نہیں آتے۔ اُن کے اقوالِ زرّیں آج بھی مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ ایسے جلیل القدر صحابی کی شان میں کون مسلمان ہوگا جو گستاخی کی جرأت کرے گا اور لطف کی بات یہ ہے کہ مذکورہ حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذاتِ اقدس پر قطعی طور کوئی حرف نہیں آتا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے دل ودماغ پر حضرت علیؓ کی عظمت ورفعت کس قدر چھائی ہوئی ہے، اِس کا اندازہ اُن کی ایک تقریر سے آسانی سے کیا جاسکتا ہے جسے بعدازاں کتابی شکل دی گئی، اِس کا عنوان ہے: مثیلِ عیسیٰؑ، علیؓ مرتضیٰ۔ اِس کتاب کے صفحہ نمبر 43 پر محترم ڈاکٹر صاحب نے حضرت علیؓ کے حوالے سے اِن خیالات کا اظہار کیا ہے کہ ان کی رائے میں ''شاہکارِ رسالت'' کی اصطلاح اگر کسی صحابی پر راست آتی ہے تو وہ حضرت علیؓ ہیں۔ اس لیے کہ بالکل ابتدائی عمر سے ہی آپؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں پرورش پانے کا موقع ملا۔ پھر ایمان لانے کے بعد سے ہجرت تک اور ہجرت کے بعد حضرت فاطمہؓ سے نکاح تک آپؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں ان کے ساتھ رہے۔ اِسی طرح صفحہ 46 پر حضرت علیؓ کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصی نسبت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''سیرت کا ایک اہم واقعہ ذہن میں تازہ کرلیا جائے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو اپنے نائب کی حیثیت سے مدینہ میں رہنے کا حکم دیا، مگر یہ بات حضرت علیؓ کے مزاج سے بعید تھی کہ وہ شرکتِ جہاد سے محرومی کو گوارا کرلیں۔ پھر کچھ منافقین نے طعنہ زنی بھی کی۔ چنانچہ آپؓ نے رنجیدہ ہوکر شکوہ کے انداز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلیں، دادِ شجاعت دیں اور میں عورتوں، بوڑھوں اور مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے مدینہ میں رہ جاؤں! حضرت سعدؓ بن ابی وقاص روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی اس شکوہ آمیز التجا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اے علی! میرے ساتھ تمہارا وہی مقام، مرتبہ اور تعلق ہے جو ہارون علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھا، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''۔ (بخاری ومسلم) یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ کی عدم موجودگی میں ان کی نیابت حضرت ہارونؑ کرتے تھے، اسی طرح میرے نائب کی حیثیت سے تم مدینہ میں رہو۔ البتہ چونکہ ہارونؑ نبی بھی تھے، لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرمادی کہ نبوت کا دروازہ تو اب ہمیشہ کے لیے

بند ہو چکا ہے۔"

جن قلوب میں رتی بھر ایمان ہے وہ سوچیں کیا اِن خیالات کی حامل شخصیت حضرت علیؓ کی شان میں گستاخی کا تصور بھی ذہن میں لا سکتی ہے۔ ہمیں افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بعض پست ذہنیت کے حامل نام نہاد لیڈر اپنا قد بڑھانے اور اپنی لیڈری چمکانے کے لیے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں، وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے اپنی دیہاڑیاں کھری کرتے ہیں۔

ہم یہاں یہ وضاحت کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم جہاں حضرت علیؓ اور اہلِ بیت کے خادم کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، وہاں دیگر تمام صحابہ رضی اللہ عنہم خصوصاً خلفائے ثلاثہ کی جوتیوں کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا اپنے لیے اعزاز سمجھتے ہیں۔ ہم امہات المومنینؓ میں سے ہر ایک کو اپنی حقیقی ماں سے کہیں زیادہ قابل عزت و احترام سمجھتے ہیں، خصوصاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کی پاک دامنی کی گواہی اللہ رب العزت قرآن پاک میں دیتا ہے۔ وہ اہل ایمان کی محسنہ ہیں۔ بعض صغار صحابہؓ اور تابعین اُن سے دینی معاملات میں رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ اِن مقدس ہستیوں پر تبرّا بازی کرنے والے بھی ہمارے نزدیک بدعقیدہ اور گمراہ لوگ ہیں۔ مسلمان ملک کی مسلمان حکومت کو اِن تبرّا بازوں کا سختی سے نوٹس لینا چاہیے۔ ہمارے نزدیک تمام صحابہؓ عدول ہیں۔ اُن سے اجتہادی خطا تو ہو سکتی ہے، اِس لیے کہ معصومیت نبوت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ حضرت علیؓ تو عظیم المرتبت صحابہ میں سے ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ صحابی بھی قابلِ احترام ہے جسے ایمان کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک جھلک دیکھنی نصیب ہوئی۔ ہمارے نزدیک کسی صحابی کی توہین بالواسطہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے۔ لہٰذا ایمان کی سلامتی اس میں ہے کہ بلا امتیاز تمام صحابہؓ کی دل و جان سے عزت کی جائے۔

آخر میں ہم ڈاکٹر صاحب سے بھی گزارش کرتے ہیں کہ وہ احتیاط کا دامن مضبوطی سے تھامے، اللہ سے حق گوئی کی توفیق طلب کرتے ہوئے کتاب اللہ کی خدمت جاری رکھیں۔ موت کا ایک دن معین ہے۔ گزشتہ صدی میں علامہ نے شاید آپ ہی جیسے لوگوں کے لیے یہ شعر کہا تھا

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

❁❁❁

تا تہہ و بالا نہ گردد ایں نظام

کُل دنیا اِس وقت مالیاتی بحران سے گزر رہی ہے۔ یہ بحران اگر چہ اچانک نمودار ہوا ہے لیکن اِسی کی وجوہات فوری طور پر پیدا نہیں ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کیپٹلزم ہے کیا؟ اس نظام کی بنیادیں معاشی کم اور سیاسی و عسکری زیادہ ہیں۔ کیپٹلزم کی مثال گلے بان اور گلے کی طرح ہے۔ بڑے سرمایہ دار گلے بان کی حیثیت سے دنیا کو بھیڑوں کا گلا بنائے ہوئے ہیں۔ چین اِس نظام کا جزوی طور پر حصہ دار بنا، اِس لیے مکمل طور پر اِس جال میں نہ پھنسا۔ کیپٹلزم میں سود کو جڑ اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کی معیشت میں سود کو مرکزی حیثیت یہود کی کوششوں اور چالاکیوں سے حاصل ہوئی۔ دنیا میں اِس وقت یہودیوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ سے کم ہے یعنی وہ دنیا کی کل آبادی کا 1/400 بھی نہیں ہیں۔ اتنی قلیل تعداد سے دنیا پر سیاسی اور عسکری غلبہ حاصل کر لینا ممکن نہ تھا۔ Give the devil his due کے مصداق یہودیوں کی ذہانت اور چالاکی کی داد دینا ہوگی کہ انہوں نے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں یہ بھانپ لیا تھا کہ سائنسی ترقی سے دنیا کے سکڑنے کی وجہ سے عالمی سطح پر تجارت ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جائے گی، لہٰذا عالمی سطح پر اثر و رسوخ اور غلبہ کے لئے اب مضبوط معیشت عسکری قوت سے بھی زیادہ اہم رول ادا کرے گی۔ ہم (یعنی یہودی) چھوٹی قوم ہوتے ہوئے معاشی طور پر انتہائی مضبوط ہوں گے تو سکڑی ہوئی اِس دنیا کی بڑی اقوام چاہے وہ سیاسی اور عسکری لحاظ سے کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں، ہمارے سامنے جھکنے پر مجبور ہوں گی۔ اگر چہ وقت کی سپر قوت کو اپنے زیر اثر رکھنے کی پالیسی وہ صدیوں پہلے ترتیب دے چکے تھے اور اس پر عمل پیرا بھی تھے لیکن دنیا کے چھوٹے ہونے اور باہمی تجارت بڑھنے سے

مال وزر کی بنیاد پر دنیا کو کنٹرول کرنا آسان ہو گیا اور یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ یہودی مال اکٹھا کرنے اور اسے سنبھالنے کے زبردست ماہر ہیں۔ کاغذ کی کرنسی کا چلن بھی اُسی دور میں ہوا جس نے عیار یہودی کا کام بہت آسان کر دیا گیا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا تھا

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود
نورِ حق از سینہ آدم ربود
تا تہہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق ہے یہ چونکہ باطل کا کھڑا کیا گیا ایک غیر فطری استحصالی نظام ہے جس کی بنیاد سود، ناجائز منافع خوری اور مادر پدر آزاد مارکیٹ پر ہے لہٰذا اس کی ناکامی اور تباہی تو یقیناً اِس کا مقدر ہے۔ ہمارے لیے اصل سوال یہ ہے کہ پاکستان کہاں کھڑا ہے۔ ''حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں'' کے مصداق کس کس بات کا ماتم کیا جائے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اب ہمارے پاس رونے دھونے اور بین کرنے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا، ہم نے اِس خباثت بھرے نظام کو اپنایا اور اِس کی خباثت میں اپنی طرف سے مزید اضافہ کیا۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پر کفایت کریں گے۔ اِس نظام میں بنک تاجروں اور صنعتکاروں کو قرضے دیتے ہیں جو مع سود بروقت بینکوں کو واپس کئے جاتے ہیں۔ شاذ کے درجے میں ڈیفالٹ کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے جسے قانون کے بمطابق ڈیل کر لیا جاتا ہے۔ دوسرے ممالک میں اِس معاملے میں چھوٹے یا بڑے سیاسی یا غیر سیاسی اور فوجی و غیر فوجی کا قطعی طور پر لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ لیکن ہمارا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ پاکستان میں اپنی پارٹی کی حکومت آ جائے تو قرضے بنک سے لیے ہی اِس لیے جاتے ہیں کہ انہیں ہضم کرنا ہے۔ حکومت بدلنے پر اگر آپ بھی وفاداری بدل لیں تو کوئی آپ کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایوبی مارشل لاء سے قرضوں کا نشہ لگایا گیا اور ہم دلدل میں پھنستے چلے گئے ہماری حماقت و جہالت کی انتہا یہ ہے کہ ہم اِس دلدل سے نکلنے کا طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ نشہ آور دوا میں اور اضافہ کر دیا جائے ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف نے جب ہمیں نیم مردہ کر دیا تو اب اِس کو لاش سمجھ کر فرینڈز آف پاکستان کنشوریم کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ طوطی کی نقار خانے میں کون سنے گا بہرحال ہم اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے اِس

بیماری کا واحد اور فوری علاج یہ ہے کہ قرضوں کی معیشت پر لعنت بھیجی جائے اگر ہم ایٹم بم بنانے کے لئے گھاس کھانے کو تیار تھے تو اپنی آزادی، خودمختاری اور سلامتی کی حفاظت کے لئے کیوں قربانی نہیں دیں گے۔ پاکستان کے پاس اِس وقت نو ارب ڈالر کے قریب زرمبادلہ کے ذخائر ہیں جبکہ بیرونی قرضے کی ادائیگی چوالیس (44) ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ انتہائی مصدقہ اطلاع کے مطابق پاکستانیوں کے دنیا بھر میں ایک (125) ایک سو پچیس ارب ڈالر کے قریب مختلف بینکوں میں پڑے ہیں۔ اگر ہم اِس ملک کی سلامتی اور آزادی کے بارے میں مخلص ہیں تو پاکستان کے اِس خون کو واپس پاکستان کے جسد میں داخل کریں یقیناً یہ مردہ زندہ ہو جائے گا اور طے کریں کہ کسی صورت میں بھی قرضے کی لعنت خود پر مسلط نہیں ہونے دیں گے اِس نیک کام کا آغاز حکمرانوں کو کرنا چاہیے ہمیں یقین ہے عوام اُن کی پیروی کریں گے پھر سیاسی اور عسکری سطح پر بھی ہمیں کوئی Do more کہنے کی جرأت نہیں کر سکے گا اور ہم آزاد خارجہ پالیسی ترتیب دے سکیں گے وگرنہ معاشی غلامی نے آج ہمیں اگر اِس سطح پر پہنچایا ہے کہ آصف زرداری یہ کہنے اور ماننے پر مجبور ہیں کہ امریکہ ہماری سرزمین پر ہماری مرضی سے حملے کر رہا ہے تو کل کلاں قرض خواہ کے مطالبے پر ہمیں اپنے ایٹمی اثاثہ جات سپر پاورز کو پلیٹ میں رکھ کر پیش کرنے پڑیں گے۔ وگرنہ سلامتی کونسل سے اپنی مرضی کی قرارداد منظور کروا کر ہمیں پتھر کے دور میں دھکیلنے کی دھمکی دوبارہ دی جا سکتی ہے۔

ہم نے آغاز میں تحریر کیا تھا کہ ساری دنیا کا مالیاتی نظام بحرانی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ حقیقت میں اصل معاملہ امریکہ کا ہے سٹینڈرڈ آف لائف کی بے جا ترقی نے پیداواری اخراجات میں زبردست اضافہ کر دیا ہے۔ امریکہ کے پاس اب اسلحہ کے سوا دنیا کو اور کچھ دینے کے لیے نہیں۔ چین کے سستے مال نے امریکہ کی برآمدات کا خاتمہ ہی نہیں کیا بلکہ امریکہ کے اندر چینی مالِ تجارت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں لہٰذا اُسے تجارتی خسارے کا سامنا ہے امریکہ اِس وقت دنیا کا سب سے زیادہ مقروض ملک ہے ہر امریکی بچہ 64000 ڈالر کا قرض سر لے کر پیدا ہوتا ہے۔ عراق اور افغانستان نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔ امریکی معیشت زوال پذیر ہے لیکن بینک ڈوبنے اور دیوالیہ کا شور قبل از وقت ہے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کی تیل سے مالا مال ریاستوں کا خزانہ امریکہ میں جمع ہے۔ چین نے برآمدگی بڑھانے کے

جنون میں کثیر رقم امریکی بینکوں میں جمع کرائی ہوئی ہے۔ امریکہ کی للچائی ہوئی نظریں اب امریکہ میں جمع شدہ رقوم پر ہیں۔ اگر امریکہ نے کوئی مجرمانہ حرکت کی تو جہاں دوسرے ممالک کو مالی نقصان ہوگا مغرب کا اصل نقصان یہ ہوگا کہ اعتماد ختم ہو جائے گا اور یہ عدم اعتماد سرمایہ دارانہ نظام پر ایسی کاری ضرب لگائے گا کہ اِس نظام کا بچ نکلنا تقریباً ناممکن ہوگا ہم تو خود اِس نظام کی بربادی کے خواہش مند ہیں لیکن اگر اِس کے ملبہ کی چند اینٹیں بھی ہم پر گر گئیں تو ہم بلڈوز ہو جائیں گے لہٰذا فوری اور ہنگامی طور پر یہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کہ ہم پاکستانی اپنا سرمایہ بیرون ملک سے اپنے ملک منتقل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔ اور پھر پرائے نظاموں پر دو حرف بھیج کر اپنی معیشت کو خالصتاً اسلامی نظام کے عین مطابق استعوار کریں۔ لیکن یہ پہلے نظام کو ختم کیے بغیر ممکن نہیں۔



سبق پھر پڑھ امانت کا، عدالت کا، شجاعت کا

''کتوں اور کالوں کا داخلہ ممنوع ہے'' جس ملک میں جگہ جگہ کلبوں اور ریستورانوں پر یہ کتبے آویزاں تھے اور بعض جگہوں پر ابھی تک آویزاں ہیں، اِس ملک کا سربراہ ایک کالا بن گیا ہے اور ایسا نہیں کہ یہ اقتدار کسی جنگ کے نتیجہ میں یا چور دروازے سے داخل ہو کر حاصل کیا گیا بلکہ عوامی عدالت میں پیش ہو کر بذریعہ ووٹ مینڈیٹ حاصل کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی کا ابھی پہلا عشرہ چل رہا ہے، لہٰذا یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صدی کی اہم ترین خبر ہوگی، لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ صدی کی اہم ترین خبروں میں سے ایک خبر ہوگی۔ اکیسویں صدی کا آغاز امریکہ نے مسلمان دنیا کو اپنا ہدف بنا کر کیا تھا اور آٹھ سال میں مختلف کارروائیوں سے امتِ مسلمہ کے بچے بچے کو باور کروا دیا کہ امریکہ ہمارا بدترین دشمن ہے۔ فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلیوں کی وحشیانہ بربریت ہو یا کشمیریوں کا ہندو قابض افواج کے ہاتھوں ہلاک ہونا ہو، اِس درندگی میں امریکی پشت پناہی کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ عراق اور افغانستان میں خود امریکی فوج مسلمان کے خون سے ہاتھ رنگ رہی ہے۔ لہٰذا اِس حقیقت کا اعتراف کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے والے شخص کے دل میں جس تناسب سے ایمان ہے، اُسی قدر اُس کے دل میں امریکہ مخالف جذبات ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اِن جذبات کے اظہار کے طریقے مختلف ہیں۔ ندائے خلافت کا ہر قاری بخوبی جانتا ہے کہ ہم اپنے امریکہ مخالف جذبات کا اظہار کس شدت سے کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن ہمارے آقا اور اللہ کے حبیب حضور اکرم ﷺ کا حکم ہے کہ بات حق کی کرو چاہے تمہارے بہترین دوست کے خلاف جائے یا تمہارے بدترین دشمن کے حق میں ہو۔ اِس حکم کو بجالاتے ہوئے اور give the devil his due کے اصول کے تحت ہم علی

الاعلان کہیں گے کہ امریکیوں نے ثابت کیا ہے کہ وہ اُس نسلی امتیاز کو دفن کر چکے ہیں اور انہوں نے نسلی امتیاز کا دھبہ اپنے دامن سے دھو دیا ہے۔ اس سے وہ امریکہ جو معاشی سے زیادہ اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار تھا، اُس کے اخلاقی زوال میں ٹھہراؤ پیدا ہوگا، دنیا میں اُس کا امیج بہتر ہوگا۔

اب آیئے، اُس بحث کی طرف کہ باراک حسین اوباما امتِ مسلمہ خصوصاً پاکستان کے لئے اچھا صدر ثابت ہوگا یا بُرا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا کے ہر ملک میں خارجہ امور پر اسٹیبلشمنٹ حاوی ہوتی ہے، البتہ ہر ملک کی اسٹیبلشمنٹ کے اجزاء مختلف ہوتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں یہ صرف سول اور فوجی بیوروکریسی پر مشتمل ہوتی ہے جو سیاست دانوں کے وزن کو حالات کے مطابق قبول یا رد کرتی رہتی ہے۔ اس اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کے بغیر پاکستان میں خارجہ امور کے حوالہ سے سٹیرنگ موڑا نہیں جا سکتا۔ امریکہ کی اسٹیبلشمنٹ کے اجزاء میں اہم ترین حیثیت تھنک ٹینکس کی ہے۔ خود کانگرس اور سینٹ کے اراکین کو مضبوط پوزیشن حاصل ہے اور پینٹاگون کے جرنیل بھی اِس اسٹیبلشمنٹ کے اہم جز ہیں۔ پھر وائٹ ہاؤس کا سینئر سٹاف جو صدر امریکہ کے حقیقی ذاتی مشیر کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ بھی اسٹیبلشمنٹ کا ایک اہم جز ہے۔ اِن اجزاء کو مجتمع کر کے امریکہ کی اسٹیبلشمنٹ وجود میں آتی ہے۔ اور خارجہ امور کے سٹیرنگ پر اِس کی مضبوط گرپ ہوتی ہے۔ ہماری رائے میں اِس اسٹیبلشمنٹ کے تمام اجزاء یہودیوں کے زیر اثر ہیں۔ یہ اجزاء اسٹیبلشمنٹ کے جال کی لڑیوں کے مانند ہیں۔ صدر امریکہ خود بھی اِس جال کی ایک لڑی ہے۔ مضبوط صدر یعنی بھرپور سیاسی بیک گراؤنڈ رکھنے والا، دولت کے حوالہ سے باوسائل، سینٹ اور کانگرس کے ارکان سے ذاتی تعلقات رکھنے والا صدر اپنا رول زوردار انداز میں ادا کر سکتا ہے لیکن اِس جال کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتا۔ بہترین مثال رچرڈ نکسن کی ہے۔ اُسے امریکی one of the best presidents of U.S.A کہتے تھے اور کہتے ہیں، لیکن جب اُس نے اس جال کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ روتا ہوا ذلیل و خوار ہو کر وائٹ ہاؤس سے باہر نکلا بلکہ اُسے وائٹ ہاؤس سے اٹھا کر باہر پھینک دیا گیا۔ اِس ترازو میں اوباما کو تول لیں، وہ کالا ہے۔ چاہے کم تعداد میں سہی لیکن بہت سے گوروں کی نفرت کا اب بھی مرکز ہوگا۔ اس کا سیاسی بیک گراؤنڈ سرے سے موجود ہی نہیں۔ وہ ایک امیر آدمی بھی نہیں ہے۔ امریکہ کو اِس وقت معاشی بحران کا سامنا ہے اور معاش کی کنجی یہودیوں کے مکمل طور پر قبضہ میں ہے۔ امریکہ کو معاشی بحران سے نکالنے کے لئے اُسے یہودیوں کی مدد اور تعاون کی ضرورت ہوگی، لہٰذا یہودیوں کے ہاتھوں استعمال ہونا اُس

کی مجبوری ہوگی۔ یہودی اُمت مسلمہ سے خصوصاً ایٹمی پاکستان سے جو سلوک روا رکھنا چاہتے ہیں، اوباما کو یہودیوں کی دی گئی لائن کو فالو کرنا پڑے گا۔ کٹر اسرائیلی نژاد یہودی راہم عماتو ائیل کو وائٹ ہاؤس کا چیف آف سٹاف مقرر کر کے اوباما نے اپنے سفر کا رخ ظاہر کر دیا ہے۔ اگر چہ یہ بات بھی اہم ہے کہ اوباما غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے اور غیر معمولی صلاحیتیں اپنا اظہار چاہتی ہیں۔ پھر یہ کہ اوباما کے نعرے change, we need نے زبردست عوامی حمایت حاصل کی ہے۔ لہٰذا اوباما کی غیر معمولی صلاحیتیں اور تبدیلی کی عوامی خواہش سے کوئی معجزہ رونما ہو سکتا ہے۔ البتہ ہمیں ایسے معجزے کی قطعی طور پر توقع نہیں بلکہ عین ممکن ہے کسی ایسی کوشش سے اوباما کسی حادثے سے دوچار ہو جائیں اور یہ حادثہ ایک بار پھر امریکہ میں کالے اور گورے کی جنگ کا باعث بنے۔ واللہ اعلم۔

پاکستانیوں کو یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ جو اپنا دوست نہیں اُس کا کوئی دوست نہیں۔ اوباما نے پاکستان کے بارے میں انتخابی مہم کے دوران جو بیان دیئے ہیں، اُن میں بہت تضاد ہے۔ وہ پاکستان پر براہ راست حملہ کی بات بھی کرتا ہے۔ پاکستان کی معاشی امداد بڑھانے کی حمایت بھی کرتا ہے۔ وہ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے خاتمے کے لئے تنازعہ کشمیر کا فیصلہ بھی ناگزیر سمجھتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ آج دنیا میں انصاف میرٹ پر ممکن نہیں رہا، فریقین کو تولا جاتا ہے کہ اس کا وزن بھاری ہے۔ کمزور کا ساتھ دینے کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ اگر اوباما کشمیر کے بارے میں ایسا موقف اختیار کرتا ہے جو بھارت کے مفادات کے خلاف ہو مثلاً کشمیر کی مکمل آزادی، تو یہ ہمارے لیے بھی ایک بڑا خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک آزاد کشمیر کی صورت میں امریکہ وہاں خود کود سکتا ہے، لہٰذا بات پھر لوٹ کر یہاں آئے گی کہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ہمیں خود کو مضبوط کرنا ہے۔ مگر افسوس ہم نے نظریۂ پاکستان کو خیر باد کہہ کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔ ہم جوں جوں اِس نظریہ کی عملی تنفیذ سے دور ہوتے جائیں گے، ذلت، نکبت اور خواری کی لپیٹ میں زیادہ سے زیادہ آتے جائیں گے۔ خدارا اِس پر نگاہ نہ رکھیں کہ امریکہ میں کون آتا ہے، کون جاتا ہے۔ امت مسلمہ کے کسی دوست کے آنے کی قطعی طور پر کوئی توقع نہیں۔ بھلائی اور ترقی کی طرف ہمیں خود راستہ بنانا پڑے گا اور یہ وہی راستہ ہے جو صحیفۂ آسمانی قرآن پاک نے اور ناطق قرآن رحمت للعالمین نے ہمیں دکھایا ہے۔ اسی پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنے اندر وہ جذبہ پیدا کر سکیں گے جس کی وجہ سے ہمارے اسلاف نے اسلام کو سپر قوت بنایا اور دنیا میں عزت و احترام کا مقام پیدا کیا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا ✿✿

امن چاہتے ہو تو جنگ کے لیے تیار رہو!

زمینی حقائق ظاہر کر رہے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ نہیں ہوگی، لیکن یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ ایٹمی قوت کے حامل ملک، پاکستان کی حکومت کیوں حواس باختہ ہوگئی ہے۔ اوّل روز سے اُس کا رویہ اور طرزِ عمل پراسرار ہے۔ وزیراعظم ٹیلی فون پر ہی ڈی جی آئی ایس آئی کو بھارت روانہ کر رہے تھے۔ شیری رحمان پاکستان کی وزیر اطلاعات ہیں لیکن انہوں نے بھارتی ترجمان کا رول اپنالیا ہے۔ وہ وضاحتیں پیش کر رہی ہیں کہ بھارتی فضائیہ کے طیارے غلطی سے پاکستان کی فضائی حدود میں داخل ہوگئے تھے۔ اُن سے کوئی پوچھے کہ غلطی ایک ہی دن میں لاہور سیکٹر اور کشمیر سیکٹر میں کیوں لگی۔ کیا یہ بھی اتفاق ہے کہ اِن ہی دو سیکٹروں میں بھارتی طیاروں کو غلطی لگی جن میں بھارتی دعویٰ کے مطابق لشکر طیبہ کا مرکز ہے (یعنی مرید کے) اور آزاد کشمیر جہاں تربیتی کیمپ بتائے جاتے ہیں۔ پاک فضائیہ کے ترجمان کے مطابق بھارتی طیارے میزائلوں سے لیس تھے۔ آدھی رات کو بھارتی طیارے ہماری سرحدوں کے پاس مسلح ہوکر آوارہ گردی میں کیوں مشغول تھے؟ صدر محترم بھی پیچھے نہیں رہے، فرماتے ہیں بھارتی فضائیہ کو ٹیکنیکل غلطی لگی، یعنی اُنہوں نے اس غلطی میں ٹیکنیکل کا اضافہ کیا ہے۔ وزیراعظم صاحب فرماتے ہیں کہ بھارتی طیارے مڑتے مڑتے پاکستان کی فضائی حدود میں مجبوراً داخل ہوئے۔ جبکہ 1987ء میں بھارت اور پاکستان کے درمیان میں طے ہوا تھا کہ دونوں ممالک کے جنگی جہاز فضا میں اپنی سرحدوں کے پندرہ میل اندر رہیں گے۔ یعنی بقول ہماری حکومت کے بھارتی طیاروں نے 15+4=19 کلومیٹر لمبی انگڑائی لی۔ بہرحال اتنی وضاحتوں کے بعد بھارت کو کسی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ پاک فضائیہ کے ترجمان نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ بھارتی طیارے ہماری سرحدوں میں 4 کلومیٹر

تک گھس آئے تھے، ہمارے جہاز فوری طور پر اُڑے، اُنہوں نے بھارتی جہازوں کا تعاقب کیا تو وہ فوری طور پر واپس بھارت چلے گئے۔ پاکستان کی فوجی قیادت بار بار اعلان کر رہی ہے کہ ہم دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ثمر مبارک مند ہر روز کسی نہ کسی چینل پر آ کر قوم کو بتا رہے ہیں کہ بھارت کا کوئی کونہ ہمارے میزائلوں کی رینج سے باہر نہیں۔ حکومت کے تمام دوستوں اور دشمنوں نے حکومت کو یقین دہانی کرائی ہے کہ اگر بھارت نے جنگ مسلط کی تو ہم حکومت کی پشت پر ہوں گے۔ بھارتی میڈیا کی بیہودہ گفتگو نے پاکستانی عوام میں اشتعال پیدا کر دیا ہے۔ وہ اپنے تمام مسائل بھلا کر بھارتی جارحیت کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بننے کی حکومت کو یقین دہانی کرا رہے ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہر سطح پر جو اتحاد پاکستان میں نظر آتا ہے، وہ بھارت میں بھی نہیں ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ اِس سب کچھ کے باوجود حکومت کی سراسیمگی کی کیا وجہ ہے، وہ پیران کیوں چھوڑ رہی ہے۔ معذرت خواہانہ رویہ بلکہ منت سماجت اور اوٹ پٹانگ بیانات، جیسے کوئی ہوش کھو گیا ہو۔ ایک طرف کہا جا رہا ہے کہ حکومت بھارت نے ہمیں کوئی ثبوت فراہم نہیں کیے تو پھر یہ پابندیاں اور گرفتاریاں کیسی؟ کیا دشمن ان باتوں سے خوش ہو جائے گا؟ کوئی ہے جو ان نام نہاد لیڈروں کو سمجھائے کہ جنگیں کبھی پاؤں پڑنے اور منتیں کرنے سے نہیں روکی جا سکتیں۔ شکاری کبھی شکار پر رحم نہیں کھاتا۔ فرد ہو یا ریاست اگر خود پر خوف طاری کر لیں گے اور پسپائی کو پالیسی بنا لیں گے تو ایک وقت آئے گا کہ دماغ ماؤف ہو جائے گا اور پشت دیوار سے لگ جائے گی، پھر دشمن کے لیے تر نوالہ بن جائیں گے۔ کوئی انسان بقائمی ہوش و حواس جنگ کا خواہشمند نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے کہ اگر دو ایٹمی ممالک کے درمیان جنگ ہو گئی تو دونوں طرف کوئی رونے دھونے کے لیے بھی نہیں بچے گا اور برصغیر پاک و ہند ایک بڑے قبرستان میں تبدیل ہو جائے گا۔ جنگ کمزوری سے نہیں قوت کے اظہار سے رُکتی ہے۔ 2002ء میں بھی بھارت جنگی جنوں میں مبتلا ہوا تھا لیکن 10 ماہ میں 36 ارب روپے خرچ کر کے ہندو بنیا واپسی پر مجبور ہوا۔ تب بھی کسی منت سماجت سے نہیں، ایٹمی میزائلوں کے خوف سے واپسی ہوئی تھی۔ ذرا سوچیے، اگر جاپان کے پاس ایٹمی قوت ہوتی اور وہ کسی ایک امریکی شہر کو بھی نیست و نابود کرنے کی طاقت رکھتا تو کیا امریکہ جاپان پر ایٹم بم گراتا؟ اللہ رب العزت بھی ہمیں اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم اسی لیے دیتا ہے کہ ہم دشمن کے لیے نرم چارہ نہ بن جائیں، لیکن اور یہ بہت بڑا لیکن ہے کہ محض عسکری

قوت بڑھانے سے قومیں محفوظ نہیں ہوتیں، معاشی اور اخلاقی قوت بھی کسی سلطنت کے لیے ستون کا درجہ رکھتی ہے۔ پھر یہ کہ جو قوم اپنے بنیادی نظریہ کو ترک کر دے تو گویا اُس نے اپنی جڑ اور بنیاد پر تیشہ چلایا۔ ماضی قریب میں سوویت یونین کی مثال ہمارے سامنے رہنی چاہیے، ایٹمی قوت ہونے کے حوالہ سے وہ پاکستان سے بہت آگے تھی، لیکن یوں چکنا چور ہوئی جیسے کانچ کا گلاس زمین پر گر جانے سے ہوتا ہے۔ اِس لیے کہ معاشی حالت دگرگوں ہو گئی تھی اور ریاست اپنے نظریہ اشتراکیت سے عملاً ہٹ چکی تھی۔ ہم نے بھی اگر نظریۂ پاکستان سے انحراف جاری رکھا تو اللہ نہ کرے ہمارا انجام بھی ویسا ہی ہو۔ نظریۂ پاکستان کو ترک کرنے سے پاکستانی قوم وجود میں نہ آ سکی بلکہ ہم کئی قومیتوں میں بٹ گئے جن میں ہر دن گئے کشیدگی اور نفرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمارے چاروں صوبوں کے عوام تہذیبی، لسانی اور معاشرتی سطح پر بہت مختلف ہیں۔ بود و باش بالکل مختلف ہے۔ انہیں ایک کرنے والی شے صرف اور صرف اسلام ہے۔ آپ اسلام کو ترک کریں گے تو وحدت کا پارہ پارہ ہونا ایک فطری اور منطقی نتیجہ ہوگا۔ ہم پر کسی بیرونی حملہ کی ضرورت نہیں رہے گی لہٰذا بیرونی حملہ سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈر و اس اللہ رب العزت سے کہ جب وہ کسی امر کا ارادہ کر لیتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ اُسی کا دامن تھام کر ہماری کشتی بھنور سے نکل کر ساحل پا سکتی ہے۔ ہمیں مضبوط اور مستحکم پاکستان کے لیے نظریۂ پاکستان کو عملی تعبیر دینی ہوگی اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو اِس میں کیا فرق ہے کہ تباہی و بربادی دشمن کے میزائلوں سے برپا ہوتی ہے یا آپس میں دست و گریبان ہونے سے، لہٰذا رجوع یعنی رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے، اس سے پہلے کہ مہلت ختم ہو جائے۔ آخر میں ہم حکومت کی خدمت میں ایک دانا کا قول پیش کرتے ہیں۔

''امن چاہتے ہو تو جنگ کے لیے تیار رہو۔''



اے مسلمانانِ پاکستان! مطالبات تسلیم کرلو

بھارت میں وار روم میں میٹنگز ہو رہی ہیں جن میں فوجی سربراہوں کے ساتھ وزیر اعظم، صدر اور وزیر خارجہ بھی شرکت کر رہے ہیں۔ سفارتی سطح پر شب و روز محنت ہو رہی ہے۔ دنیا بھر سے ایک سو بیس ممالک سے اپنے سفیروں کو ملک میں واپس بلا کر ان سے مشاورت ہو رہی ہے۔ سلامتی کونسل سے مسلسل رابطہ ہے۔ انٹرنیشنل کورٹ میں کیس درج کروا دیا گیا ہے اور انٹرپول کے ذریعے مولانا مسعود اظہر کی گرفتاری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، جس پر تبصرہ نگار کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کے لیے انٹرپول کو انکار کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ان ساری کاوشوں میں امریکہ بڑھ چڑھ کر اور جائز ناجائز ہر طریقے سے بھارت کا مددگار و معاون بنا ہوا ہے، بلکہ اُسے پاکستان کو دباؤ میں لانے کے نت نئے مشورے دے رہا ہے۔ اور برطانیہ امریکہ کے چیلے چانٹے کی حیثیت سے مدعی بھارت سے بھی دو ہاتھ آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ بقیہ یورپ بھی ممبئی سانحہ کو بھارت کے ساتھ بہت بڑا ظلم قرار دے رہا ہے۔

ایسے نازک موقع پر جب دنیا ایک متحدہ محاذ بنا کر پاکستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہی ہے اور پاکستان کا ازلی دشمن بھارت اس محاذ کا ہراول دستہ بن کر پاکستان پر دانت تیز کر رہا ہے، پاکستان کی حکومت اور فوج میں ہم آہنگی نظر نہیں آ رہی، اور بھارت مسلسل اس کوشش میں ہے کہ اس خلیج کو مزید بڑھایا جائے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ صدر زرداری کو فون پر دھمکیاں ایک جعلی کال کے ذریعے دی گئی تھیں۔ پھر بھارتی طیاروں کی خلاف ورزی کو سیاسی حکومت ٹیکنیکل غلطی اور فضائیہ بھارتی جارحیت قرار دیتی ہے۔ یہ خبریں انتہائی حیران کن اور تشویش ناک ہیں کہ سلامتی کونسل نے جماعۃ الدعوۃ پر جو پابندی لگائی ہے اس میں خود پاکستانی حکومت کی رضامندی شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ

چین نے بھی قرارداد کو ویٹو نہیں کیا۔ پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان پیپلز پارٹی کا اتحاد تو کب کا پارہ پارہ ہو چکا ہے' خود پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر مار دھاڑ شروع ہو چکی ہے۔ وزیر اعظم پر زبردست دباؤ ہے کہ وہ استعفا دے دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً صدر اور وزیر اعظم کے درمیان جنگ شروع ہو چکی ہے اور جو عناصر وزیر اعظم سے استعفا کا مطالبہ کر رہے ہیں' انہیں صدر کی آشیر باد حاصل ہے۔ اپوزیشن لیڈر چودھری نثار نے پارلیمنٹ کے باہر میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے حکومت پر الزامات کی بوچھاڑ کی ہے۔ وکلاء نے اپنی تحریک کے اگلے مراحل کا اعلان کیا ہے' جن میں لانگ مارچ اور دھرنا بھی شامل ہے۔

کیا اس صورت حال میں پاکستان اس بھارت سے جنگ کر سکتا ہے جو اس سے حجم میں دس گنا بڑا ہے' جس کی عسکری قوت پاکستان سے کئی گنا زیادہ ہے' جس کی پشت پر سفارتی سطح پر پوری دنیا ہے' امریکہ جس کا سٹریٹجک پارٹنر ہے۔ اس نازک موقع پر جب ملک کی سلامتی شدید خطرے میں ہے' ہم ملک کے تمام باسیوں خصوصاً مقتدر حلقوں سے دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ للہ اپنے اختلافات' اپنے جھگڑے بعد کے کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیں۔ اس وقت قومی اتحاد اور یک جہتی کی شدید ضرورت ہے۔ قومی اتحاد ایٹم بم سے بڑی قوت ہے۔ صرف قومی سلامتی کے اجلاس میں تمام سیاسی جماعتوں کا متحد ہو کر یک زبان سے حکومت کو حمایت کی یقین دہانی سے بھارت کو دھچکا لگا تھا' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اختلافات بدتر انداز میں آشکار ہو رہے ہیں۔

بھارتی حکومت خصوصاً وزیر خارجہ پرناب مکھر جی کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے کہہ رہا ہو ہمارے مطالبات تسلیم کرتے ہو یا نکالیں تمہارا بھرکس۔ صورت حال کے اتنے خطرناک ہو جانے کے باوجود ہماری رائے میں جنگ کے امکانات زیادہ نہیں ہیں' اگرچہ مائیک مولن کا فوری طور پر خطے کا دورہ معنی خیز ہے۔ شنید یہ ہے کہ وہ پاکستانی افواج کو اس بات پر راضی کرنے کے لیے آیا تھا کہ بھارتی فضائیہ کو مرید کے اور کشمیر کے علاقے میں چند حملے کر لینے دیئے جائیں اور پاکستان جوابی کارروائی نہ کرے' تاکہ کانگریس حکومت بھارت میں اپنی پوزیشن کو بہتر بنا سکے اور اپنے عوام کو مطمئن کر لے کہ ہم نے ممبئی حملوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری فوجی قیادت کسی صورت میں یہ قبول نہیں کرے گی۔ بھارت بار بار کہہ رہا ہے کہ اس کے پاس بہت سے آپشنز ہیں۔ ہماری رائے میں بھارت دوسرا آپشن اختیار کرے گا' وہ یہ کہ ہماری اقتصادیات کو تباہ کر کے

ہمیں کسی آنے والے وقت میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرے گا۔ یہ پروسیجر طویل ہے اور بھارتی حکومت اور عوام کے لیے تکلیف دہ ہوگا' لیکن ہماری رائے میں یہ ہے وہ میدانِ جنگ جس میں ہماری شکست بڑی واضح نظر آ رہی ہے' اور جس میں جواب دینے کی ہم نے قطعی طور پر کوئی تیاری نہیں کر رکھی۔ ہمارے پاس برآمد کے لیے صرف کپاس اور چاول کی دو فصلیں ہوتی ہیں۔ الحمدللہ' دونوں اس مرتبہ بہت اچھی ہیں۔ بھارت کوشش کرے گا کہ ان دونوں کا عالمی ریٹ اس قدر گرا دے کہ پاکستان یا تو برآمد کر ہی نہ سکے اور اگر کرے بھی تو اس کے ہاتھ کچھ نہ لگے' پھر وہ باہمی تجارت بھی فوری طور پر بند کر دے۔ ان دونوں اقدامات سے بھارت کا معاشی نقصان پاکستان سے کہیں بڑا ہوگا' لیکن بھارت کی معاشی حالت اس پوزیشن میں ہے کہ یہ بڑا نقصان برداشت کر جائے۔ اس کے نتیجہ میں جو نقصان پاکستان کو ہوگا وہ اگرچہ حجم کے حوالہ سے چھوٹا ہوگا لیکن پاکستان کی خستہ حال اکانومی اسے بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔ افغانستان کے راستے جعلی کرنسی بھی پاکستان میں داخل کی جا سکتی ہے جو مارکیٹ میں افراطِ زر کا طوفان کھڑا کر دے گی۔ امریکہ قرضہ جات کا شیڈول ٹائٹ کر دے گا۔ چند روز پہلے آئی ایم ایف نے اگلی قسط کے لیے نئی شرط عائد کر دی ہے کہ پاکستان 100 ارب روپے ترقیاتی بجٹ سے کم کرے۔ یوں پاکستان کو ڈیفالٹ کر کے کسی جنگی کارروائی سے پہلے ہی اپنا ایٹمی ڈیٹرنٹ رول بیک کرنے کو کہا جائے گا۔ اس وقت ہم دیوار سے لگ چکے ہوں گے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ایک لحاظ سے یہ معاشی دہشت گردی ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ چاہے گھاس کھانی پڑے (اور یہ گھاس خواص بھی کھائیں) اپنے پاؤں چادر کے اندر کرنے ہوں گے۔ اگر ہم یہ معاشی حملہ درویشانہ انداز میں سہہ گئے اور مالی مدد کے لیے کسی کے پاؤں نہ پڑے تو ہماری حالت میں انقلابی تبدیلی آ سکتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا بگاڑ جس قدر زیادہ ہو چکا ہے، قومی سطح پر ہمیں ایک جھٹکے کی ضرورت ہے۔ بغیر کسی جھٹکے یعنی کڑی آزمائش سے گزرے ہم نہیں سنوریں گے۔ اگر موجودہ صورت حال سے بھی ہم بغیر کسی قربانی کے گزر گئے تو اگلا حادثہ جانکاہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دنیا ہمارا گھیراؤ کر چکی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم تن تنہا اس دنیا کو صرف اس لیے شکست دینے میں کامیاب ہو جائیں کہ ہمارے پاس ایٹم بم ہے۔ (اگر ہم دنیا کے مطالبات کے آگے نہیں جھکتے تو یہ بھی دنیا کی شکست ہو گی) عالم کفر متحد ہو چکا ہے۔ اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے' تن تنہا اس کو شکست دی جا سکتی ہے لیکن

اس کے لیے اللہ کی مدد درکار ہوگی۔ اللہ کی مدد کی کچھ شرائط ہیں' اللہ کے کچھ مطالبات ہیں۔ اے کاش! ہم طے کرلیں کہ ہم مطالبات تسلیم کریں گے لیکن بندوں کے نہیں' طاقتور قوتوں کے نہیں بلکہ ان سب کے خالق اور مالک کے جس کی قوت کے سامنے کسی قوت کی کوئی حیثیت نہیں۔ پھر یہ کہ اس کے مطالبات تسلیم کرنے میں کوئی شرمندگی کوئی پچھتاوا نہیں۔ اے مسلمانانِ پاکستان! اس نکتہ کو سمجھ لو' اسے تسلیم کرلو' اس پر عمل کر گزرو' ورنہ مٹ جاؤ گے ماضی کی ان بستیوں کی طرح جو نافرمانی پر ہلاک کردی گئیں اور سامانِ عبرت بنادی گئیں۔

اے مسلمانانِ پاکستان! عافیت اسی میں ہے کہ مطالبات تسلیم کرلو لیکن صرف اس ذاتِ کبریا کے جو عطا کرنا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور اگر وہ روک دے تو کوئی دے نہیں سکتا اور کسی بڑے کی بڑائی اُسے نفع نہیں پہنچاتی۔

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ تم کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے



مجھے میرے دانشوروں سے بچاؤ!

سجاد حیدر یلدرم اگر آج حیات ہوتے تو ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' کے عنوان کی بجائے ''مجھے میرے دانشوروں سے بچاؤ'' کے عنوان سے معرکۃ الآراء مضمون لکھتے۔ ہم نے شہرۂ آفاق کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کیا کہ آج کے آفاق میں شہرہ اسی شے کو نصیب ہوتا ہے جس پر امریکی یا کم از کم یورپی مہر تصدیق ثبت ہو۔ جس طرح کسی زمانے میں خبر وہ ہوتی تھی جو پائنیئر میں شائع ہوتی تھی، اسی طرح آج حقیقت وہ ہوتی ہے جو گوروں کی طرف سے منکشف ہو۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ برصغیر میں ہندو کی غلامی مسلمان کی غلامی سے بہت پرانی اور دیرینہ ہے جبکہ آزادی دونوں کو ایک ہی وقت میں یعنی 1947ء کو نصیب ہوئی۔ پھر مسلمانانِ پاکستان خصوصاً اُن کی ایلیٹ کلاس اور دانشور طبقہ ذہنی غلامی سے آزاد کیوں نہ ہوسکا؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم 1947ء سے پہلے عسکری اور سیاسی لحاظ سے غلام ہونے کے باوجود آج کی نسبت غلامانہ ذہنیت کے بہت کم شکار تھے۔ ہماری غلامانہ ذہنیت کا پہلا مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب 1949ء میں قومی اسمبلی میں قراردادِ مقاصد منظور کی گئی تو کچھ اس طرح کے تبصرے سننے میں آئے کہ آج کے جدید جمہوری دور میں یہ اعلان کرنا کہ اللہ حقیقی مقتدرِ اعلیٰ ہے، (Sovereignty belongs to Allah) اس سے ہمارے سر دنیا کے سامنے شرم سے جھک گئے ہیں۔ نائن الیون تک یعنی پچاس سال مرعوبیت، احساسِ کمتری، ڈر، خوف ہماری رگوں میں بڑی آہستگی سے سرایت کرتا رہا، لیکن نائن الیون کے بعد تو ہم جست لگا کر آگے بڑھے اور امریکی غلامی کا پٹہ چوم کر اپنے گلے میں ڈال لیا اور ہم غلام محض بن کر رہ گئے۔ نو سال میں Do more کی گردان سے ہماری جبیں کو زمین سے لگا دیا گیا۔ جہاں تک حکومتوں کا تعلق ہے وہ مشرف کی آمریت ہو یا زرداری مارکہ

جمہوریت، اُن کی مجبوری ہے۔ اقتدار کی چاٹ میں وہ ملکی مفادات کی لوٹ سیل لگا دیتے ہیں۔ اُن کی غلامی قابل فہم ہے، ہم اِس وقت ذکر کریں گے اپنے ان ہم وطن دانشوروں کا جنہوں نے نائن الیون کے بعد امریکہ کے تمام دعوؤں اور الزامات کو حق اور سچ جانا۔ امریکہ نے اپنی فرمانبرداری اور اطاعت تک معاملہ محدود نہ رکھا بلکہ حکومت پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ بھارت کو بھی اپنا بڑا تسلیم کرے۔ حکمرانوں کی اطاعت کیشی قابل فہم ہے۔ ممبئی سانحہ میں حکومت پاکستان کا معذرت خواہانہ رویہ بھی اسی وجہ سے تھا۔ انتہائی قابل افسوس طرز عمل ہمارے دانشوروں کا ہے جن میں سے اکثر جب کالم لکھتے ہیں یا ٹی وی ٹاک شوز میں آتے ہیں تو بات کا آغاز یوں کرتے ہیں جیسے یہ بات تو طے شدہ ہے کہ ممبئی حادثے میں پاکستان کے ریاستی نہ سہی غیر ریاستی عناصر تو اس دہشت گردی میں لازماً ملوث ہیں۔ یہ بھی من وعن تسلیم کرتے ہیں کہ فاٹا اور شمالی وجنوبی وزیرستان میں ملکی اور غیر ملکی دہشت گردوں کے ٹولے عالمی امن کے لیے بہت بڑا خطرہ ہیں۔ علاوہ ازیں امریکہ اور یورپ جو الزامات ہم پر لگاتے ہیں وہ بغیر کسی تحقیق اور چھان پھٹک کے اس کی باقاعدہ تشہیر کرتے ہیں اور اُسے آگے بڑھاتے ہیں۔ چند روز پہلے ایک محترم اور محترمہ ٹی وی کے ایک پروگرام میں بتا رہے تھے کہ اُنہوں نے حال ہی میں بھارت کا دورہ کیا ہے، وہاں لوگوں کا بڑا غصہ ہے، اور اگر اس طرح کا کوئی اور حادثہ رونما ہو گیا تو پھر ہم پر قیامت ڈھا دی جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ بھارتی عوام کا غصہ بالکل درست ہے لیکن اس کا پاکستان سے کیا تعلق؟ بھارتی عوام کو اپنی حکومت پر غصہ اور برہمی کا اظہار اس لئے کرنا چاہئے کہ ممبئی کا جو ڈرامہ رچایا گیا ہے اس کا سکرپٹ اتنا کمزور کیوں تھا؟ بھارتی فوج 10 دہشت گردوں سے تین دن کیوں لڑتی رہی؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے دانشوروں کا اصل فرض تو یہ تھا کہ اس ڈرامے کا پوسٹ مارٹم کرتے۔ بھارت نے جتنے بے ہنگم اور مضحکہ خیز ثبوت فراہم کئے ہیں، انہیں کسی عدالت میں پیش کر کے کسی کو سزا دلانا تو بڑی دور کی بات ہے قابل سماعت ہی نہیں بنایا جا سکتا۔ ہمارے دانشوروں کو چاہئے تھا کہ دنیا کو بتاتے کہ بھارت نے اس دہشت گردی سے کیا فوائد سمیٹے اور مزید کیا فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ممبئی حادثے سے پہلے کشمیر میں غیر مسلح خالصتاً مقامی سطح پر زور دار عوامی تحریک جاری تھی، جسے خود بھارت نے Indigenous تحریک قرار دیا اور یورپ نے اس تحریک کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس تحریک سے بھارت زبردست پریشان ہو چکا تھا۔ یہ تحریک بمبئی حادثے کی نذر

ہو چکی ہے، جو بھارت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اُبامہ نے صدر کی حیثیت سے حلف اُٹھانے سے پہلے مسئلہ کشمیر کے حل پر زور دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس کام کے لئے اپنا خاص نمائندہ مقرر کریں گے جو فریقین سے گفتگو کر کے مسئلہ کشمیر کو حل کرانے کی کوشش کرے گا۔ بھارت کو اس بیان پر بڑی تشویش تھی۔ پہلے ایک وفد بنا کر امریکہ بھیجا گیا، جب وہ ناکام ہوا تو ممبئی ڈرامہ رچا کر بھارت مظلوم بن گیا۔ دانشوروں کا اصل فرض تو یہ ہے کہ دنیا کو بتائیں کہ اس شور شرابے میں اُس نمائندے کا کیا ہوا؟ رچرڈ ہالبروک جنہیں پاکستان بھارت اور افغانستان کے لئے نمائندہ بنایا گیا تھا، اس حادثے کے بعد حالات اور بھارتی لابی کے دباؤ کا اثر قبول کرتے ہوئے، اُن کے دائرہ اختیار سے بھارت کو نکال دیا گیا ہے۔ یہ بھی بھارت کی بہت بڑی کامیابی ہے اور یہ ممبئی حادثے کی بدولت اُسے ملی۔ دانشور دنیا کو یہ بھی بتائیں کہ پاک بھارت مذاکرات جن کے بارے میں بھارت کا رویہ یہ ہے کہ ایک عرصہ سے نشستند گفتند برخاستند کا سلسلہ چل رہا تھا، بھارت نے محسوس کر لیا تھا کہ مزید التوا اب ممکن نہیں رہا اور مذاکرات کے حوالہ سے اُسے کشمیر اور دوسرے تنازعات پر فیصلہ کن بات کرنا پڑے گی۔ اس حادثے کا بھارت نے پہلا فائدہ یہ حاصل کیا کہ ان مذاکرات کو غیر معینہ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا۔ بھارت بار بار یہ بھی کہہ رہا ہے کہ ممبئی حادثوں کا کشمیر سے کوئی تعلق نہ جوڑا جائے۔ ہمیں اپنے دانشوروں کو یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ سب کچھ جانتے ہیں، لیکن خوف، ذہنی مرعوبیت اور احساسِ کمتری نے اُنہیں بھارت کا ہمنوا بنا دیا ہے۔ انہیں خوف ہے، وہ سمجھتے ہیں ترلے منت کرنے سے بھارت کے جارحانہ رویہ کو صلح صفائی میں بدلہ جا سکتا ہے۔ اندر کے خوف نے انہیں انتہائی بزدل بنا دیا ہے اور وہ یہ بزدلی اور بے حمیتی عوام کو منتقل کر رہے ہیں۔ وہ عوام کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ڈرو بھارت سے کہ وہ ایک بڑی طاقت ہے اور اُسے امریکہ کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ لہٰذا ہاتھ جوڑ کر اور پاؤں پڑ کر یہ وقت نکالا جائے۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے قوم اُن کی اس خوف پر مبنی اور پسپائی کی پالیسی کو ناپسندیدگی سے دیکھ رہی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے مجھے میرے دانشوروں سے بچاؤ! مجھے میرے دانشوروں سے بچاؤ!!



اس آگ کو گل و گلزار میں بدل دو

ہمارے شمال مغرب میں لگی ہوئی آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور تیزی سے آگے بھی بڑھ رہے ہیں۔ امریکی ڈرون حملے بھی ہلاکتوں کا سبب بن رہے ہیں۔ فضائیہ کی بمباری اور گن شپ ہیلی کاپٹروں کی گولہ باری بھی جاری ہے۔ توپوں کے دہانے بھی کھلے ہیں اور انسانی لاشوں کے کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں۔ آباد بستیاں اور بارونق بازار کھنڈروں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ زندگی کیا شے ہے؟ موت سے بدتر ہو جائے تب بھی عزیز ہوتی ہے۔ ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ کسی خودکشی کرنے والے شخص کی ذہنی حالت مکمل طور پر درست نہیں ہوتی وگرنہ یہ فعل ممکن نہیں۔ اِس عزیز تر شے کو بچانے کے لیے لاکھوں بوڑھے، جوان، عورتیں اور مرد سروں پر گٹھڑیاں رکھے منزل نامعلوم ہونے کے باوجود چلے جا رہے ہیں۔ گھاس پھوس کی بنی جھونپڑی ہو یا شیش محل ہو، ہجرت مکانی انسان کا آخری فیصلہ ہوتا ہے۔

حیرت کی بات ہے جو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، جو بندگیٔ رب کا دعویٰ کرتے ہیں، جو دوسروں کو طاغوت قرار دیتے ہیں، اُن کے بارے میں بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کو جانوروں کی طرح ذبح کر رہے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سمجھانے بجھانے کی بجائے گولی کی زبان میں بات کرتے ہیں، جیسے انسانی زندگی ارزاں ترین شے ہو۔ سکولوں کو تباہ و برباد کر رہے ہیں کہ عورتوں کا علم حاصل کرنا جرم ہے۔ عورت کتنی ہی مجبور کیوں نہ ہو، اُس کے گھر فاقے پڑتے ہوں، تب بھی وہ باپردہ ہونے کے باوجود بچیوں کو تعلیم دیے اور زیر کفالت افراد کی دو وقت کی روٹی کے لیے باہر نہیں نکل سکتی۔ اگرچہ یہ باتیں اُس میڈیا کے ذریعے پہنچ رہی ہیں جو مغرب کے یا مغرب زدگان کے کنٹرول میں ہے۔ یقیناً اِس معاملہ میں حقائق کو توڑا مروڑا گیا ہو

گا، لیکن اگر کچھ نہ کچھ درست ہے، تب بھی انتہائی افسوسناک ہے اور اگر یہ صریحاً غلط ہے تو جھوٹا الزام لگانے والوں کی بھرپور اور زوردار تردید کیوں نہیں کی جارہی۔ یہ اعلان خاصا تشویشناک اور شبہ کو بڑھاتا ہے کہ F.M ریڈیو سے اعلان کیا جارہا ہے کہ 9 سال کی بچیوں اور چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہے۔

ہم اُن لوگوں کی باتوں کو تو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں جو سیکولرازم کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہیں یا مغرب اور اُس کی ٹیکنالوجی میں ترقی سے اتنے مرعوب ہو چکے ہیں اور اُن کی قوت سے اتنے خوف زدہ ہیں کہ وہ طاغوت کے حضور سر بسجود ہونے کو ہی اپنے لیے عافیت سمجھتے ہیں، لیکن صورت حال اتنی گھمبیر اور پیچیدہ ہو چکی ہے کہ یہ جاننا دشوار ہو رہا ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ شمالی و جنوبی وزیرستان، باجوڑ اور سوات میں قتل و غارت گری کا یوں بازار گرم ہے کہ نہ قاتل کو معلوم ہے کہ وہ کیوں قتل کر رہا ہے اور نہ مقتول کو معلوم ہے کہ اُسے کیوں مارا جارہا ہے۔ بہرحال ہم اِس مبہم صورت میں بھی اللہ اور رسول ﷺ کو ماننے والوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ وہ کسی صورت میں بھی دائرہ شریعت سے باہر نہ نکلیں۔ ہمیں انہیں بتانے کی ضرورت نہیں، وہ جانتے ہیں، قتلِ ناحق گناہ کبیرہ ہے۔ ایک ناحق قتل ساری انسانیت کو قتل کرنے کے مساوی ہے۔ خواتین کے حصول علم کا معاملہ ہو یا چار دیواری سے باہر آنے کا، حکمت سے اور تبلیغ کے احسن ذرائع سے انہیں شریعت کے دائرے میں لایا جائے۔ ہم کبھی اُنہیں یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ نفاذِ شریعت کے مطالبہ سے ایک انچ بھی پسپائی اختیار کریں، بلکہ بڑے اصرار سے کہیں گے کہ اِس مطالبہ پر پوری استقامت سے ڈٹے رہیں، البتہ مسئلہ لائحہ عمل کا اور طریقِ کار کا ہے۔ آج کے دور میں تبدیلی کے وہی طریقے آزمانے ہوں گے جن سے آج کی دنیا آشنا ہے، یعنی پُرامن احتجاج، دھرنا وغیرہ۔ اس لیے بھی کہ جدید ریاست کی قوت کا غیر مسلح لوگ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ البتہ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے، اِس پتھر کی دیوار سے بھی ہم اپنا سر پھوڑتے رہیں گے، حالانکہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ امریکی غلامی میں بہری، گونگی اور اندھی ہو چکی ہے۔



ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

اِس ایک سال میں جو کسی طرح ایک صدی سے کم نہیں لگ رہا، ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا آیا ہے۔ سارا سال چمن خزاں کی لپیٹ میں رہا۔ اب جا کر کہیں ایک پھول کھلا ہے۔ اُڑتے بادل، بہتی ندیاں، دمکتے ستارے، کائنات کا حسن گویا اِس وادی میں سمٹ آیا تھا۔ کِس ظالم کی نظرِ بد یہ سب کچھ ہڑپ کر گئی۔ مسحور کن مناظر آگ اور خون کے کھیل میں دھندلائے گئے۔ پھولوں کی مہک پر بارود کی بو غالب آ گئی۔ انسانی خون کے دھبے، بکھری ہوئی سر بریدہ لاشیں اِس حسین وادی کا مقدر نظر آنے لگیں۔ عمارتوں خصوصاً درس گاہوں کو گھاس پھونس کے ڈھیر کی طرح جلا دیا گیا۔ جہاں دنیا کے کونے کونے سے سیاح فطرت کے حسن کا نظارہ کرنے آتے تھے، وہ یوں سنسان ہو گیا جیسے بھوت پریت کی آماجگاہ ہو۔ بہرحال قانونِ فطرت ہے کہ ظلمت جب اپنی انتہا کو پہنچے تو ضیا کا راستہ کھلتا ہے۔ جب ظالم کا بازو کوڑے برساتے برساتے شل ہونے لگا اور معتوب کی استقامت رتی بھر متاثر نہ ہوئی بلکہ اُس نے گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر ہزار بار لعنت بھیجتے ہوئے شیر کی طرح زندہ رہنے کا فیصلہ کیا اور خم ٹھونک کر ٹینکوں اور طیاروں کے مقابلے میں بوسیدہ اسلحہ لے کر میدان میں آ گیا تو استحصالی اور سامراجی نظام کے تھکے ماندے ٹھیکہ داروں کے پاس سفید جھنڈا لہرا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ اسلحہ اگرچہ پرانا اور بوسیدہ تھا لیکن سینوں میں ایمان تازہ اور پختہ تھا اور انہیں اِس قرآنی خوشخبری پر یقینِ کامل تھا، ''خوف نہ کھاؤ اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہوئے۔'' ثبوت کے لئے اتنا کہنا ہی کفایت کرے گا کہ جنہوں نے حبہ بل پھاڑ کر پھینک دیا تھا، وہ خود شرعی نظام عدل ریگولیشن لانے پر مجبور ہوئے۔

اِس ریگولیشن کے خلاف جہاں تک امریکہ، مغرب اور دوسرے اسلام دشمنوں کے

واویلا کا تعلق ہے، بات قابلِ فہم ہے۔ دشمن کو دشمن کی تکلیف سے خوشی اور راحت سے دُکھ ہوتا ہے۔ مسلمان کا مسلمان کے خلاف بندوق تاننا اور پاکستان میں انتشار کا بڑھنا اور آگ کا بڑھکنا امریکی ایجنڈے کو تیزی سے آگے بڑھا سکتا ہے۔ پھر شرعی نظام کا قیام قبول کرنا ہوتا تو افغانستان کو تباہ و برباد کیوں کرتے، وہاں اربوں ڈالر کیوں جھونکتے اور اپنے فوجیوں کی انتہائی عزیز اور قیمتی جانیں کیوں کھپاتے، لہٰذا کوئی احمق ہی ہوگا جو اِس معاہدے پر امریکہ اور یورپ سے سخت ترین ردعمل کی توقع نہ رکھتا ہو۔ حیرت تو اپنے سیکولر دانشوروں اور سیاست دانوں پر ہے، اُن کی دُم پر کیوں پاؤں آ گیا ہے۔ شریعت سے آزاد عدلیہ سے سٹیٹس کو کے باغیوں سے تمہاری چڑ پرانی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تم وادیٔ سوات کا امن بھی اپنے اِس بغض پر قربان کر دو گے۔ چند دن پہلے تک تم سوات میں امن کے لیے مرے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم امن اِس طرح چاہتے تھے کہ وہاں سے اسلام کے نام لیواؤں کا بیج ختم کر دیا جائے اور شریعت کے حوالے سے آواز بھی اُٹھنی بند ہو جائے۔ اقتدار کے مزے لوٹنے والے سیاست دان اور اُن کی عطا کردہ مراعات سے فیض یاب ہونے والے دانشور کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے ہو جائیں۔ اُنہیں شدید خطرہ محسوس ہوا ہے کہ مالاکنڈ میں شرعی نظام، عدل کا قیام اگر بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا اور اسلام کا عادلانہ نظام مرحلہ وار سارے ملک میں نافذ ہو گیا اور ایسا نظام آ گیا جو چہرے دیکھ کر نہیں میرٹ کی بنیاد پر فیصلہ کرے گا، جس نظام میں خلیفہ وقت کو بھی اپنا استغاثہ لے کر قاضی کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔ (ہماری رائے میں قانون اُسے کہتے ہیں جو قہرمان اور کمزور پر یکساں نافذ ہو، جیسے چاند کی چاندنی، گھاس پھونس کی جھونپڑی اور محل پر یکساں برستی ہے۔) جہاں ایفائے عہد قرآن اور حدیث کا حکم سمجھ کر کیا جائے گا، جہاں بیت المال شیر مادر سمجھ کر ہضم نہیں کیا جائے گا۔ تو موجودہ استحصالی نظام اپنی موت آپ مر جائے گا۔ سوات میں نافذ کیے جانے والے عدل ریگولیشن کی خاص شقیں یہ ہیں۔ (i) کوئی قانون خلافِ شریعت نافذ نہیں کیا جا سکے گا۔ (ii) موجودہ قوانین میں جو خلاف شریعت ہیں اُنہیں موقوف کر دیا جائے گا (iii) قانون کے چار ماخذ ہوں گے: قران، سنت، قیاس اور اجماع امت (iv) قاضی کورٹس کے فیصلے کے خلاف ڈویژن کی سطح پر دارالقضا (شریعت بنچ) میں اپیل کی جا سکے گی (v) دیوانی مقدمات کا فیصلہ چھ ماہ میں اور فوجداری مقدمات کا فیصلہ چار ماہ میں کرنا ہوگا۔ ابھی تو شرعی عدل ایک محدود عدالتی دائرہ کار میں

نافذ ہوا ہے، اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں نافذ نہیں ہوا کہ سیکولرازم کے علمبرداروں کی چیخیں نکل گئی ہیں۔ بہرحال ہم فریقین کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دیتے ہیں اور اُس کے ساتھ اُنہیں انتباہ کرتے ہیں کہ وہ اِس معاہدے پر خلوص اور صدق دل سے عمل درآمد کریں۔ اسلام اور امن کے دشمن اِس معاہدے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ صدر صاحب کا گوروں کے کالے ردعمل پر اپنے دستخطوں کا معاہدے پر ثبت کرنے کو امن بحال ہونے سے مشروط کرنا اُن کی بدنیتی کی غمازی کرتا ہے۔ دشمنانِ اسلام اور پاکستان کے لئے ایک دو پرتشدد کارروائیاں کر دینا بہت مشکل نہیں ہے۔ تحریک نفاذِ شریعت محمدیؐ کے کارکنان کو بہت چوکس اور متحرک رہنا ہوگا۔ ہمیں سوات میں تمام اسلام دوست قوتوں سے توقع ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کو پورا کریں گے، تاکہ وادی سوات کی رونقیں واپس لوٹ آئیں۔

ہم فاٹا اور دوسرے آزاد علاقوں کے بارے میں بھی حکومت کو مشورہ دیں گے کہ وہاں بھی مذاکرات اور سیاسی عمل سے مسئلہ کو حل کرلیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ قبائلیوں کو فتح کرنے والا قبائلیوں سے شکست کھانے والوں سے زیادہ پچھتاتا ہے۔ کاش! سوات میں یہ معاہدہ کسی بڑے خون خرابہ سے پہلے کرلیا جاتا۔ کہتے ہیں کہ نادان بھی کرتا وہی ہے جو دانا کرتا ہے، لیکن خرابی بسیار کے بعد۔ آخر میں ہم یہ دعا کریں گے کہ اے اللہ رب العزت! سوات اور کوہستان میں نفاذِ شریعت پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد



اگر یہ صبح بھی صبح بے نور ثابت ہوئی تو.....؟

14 اگست 1947ء کو پاکستان نے متحدہ ہندوستان کی کوکھ سے جنم لیا۔ ''لے کر رہیں گے پاکستان اور پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ'' کے ولولہ انگیز نعروں نے مسلمانانِ ہند کے دِلوں کو ایسے سچے اور کھرے جذبہ سے معمور کر دیا تھا جس سے برصغیر ہند میں ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ایسا طوفان جس کے سامنے سفید سامراج کے سرغنہ برطانیہ کی عظیم سلطنت کی عسکری قوت اور ہندو اکثریت کی نمائندہ سیاسی جماعت کانگرس کی عوامی قوت تنکے کی طرح بہہ گئی اور مہاتما گاندھی کو اپنا تھوکا چاٹنا پڑا کہ ''پاکستان میری لاش پر بنے گا۔'' اور پاکستان اُن کی جیتی جاگتی آنکھوں کے سامنے معرضِ وجود میں آ گیا۔ پاکستان کا آغاز بُرا نہ تھا، عدالت عظمیٰ کو میاں رشید جیسا اُجلا اور Committed سربراہ میسر آ گیا۔ انھا میہ نے سیاسی سطح پر لیاقت علی خاں جیسا قائد ملا جن کے بارے میں کم از کم یہ بڑے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ نظریہ پاکستان کے حوالہ سے اُن کا ذہن واضح تھا۔ اِسی لیے بہت سی مراعات کے بدلے اسرائیل کو تسلیم کر لینے کے مطالبے پر اُن کا جواب تھا ''our souls are not for sale'' لیکن افسر شاہی انگریز کی تربیت یافتہ تھی۔ پھر یہ کہ چیف جسٹس میاں رشید اور مسلم لیگ کی قیادت میں اکثریت دیانت دار اور مخلص تھی لیکن اُن کا کوئی باقاعدہ دینی پس منظر نہیں تھا، لہٰذا اسلامی ریاست کے قیام کی طرف کوئی باقاعدہ پیش رفت نہ ہو سکی۔ دو سال بعد 1949 میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی دھمکی نے کام دکھایا اور قرارداد مقاصد منظور ہوئی، یعنی یہ پاکستان کا اسلامی جنم تھا۔ خیال تھا اب پاکستان کی گاڑی درست ٹریک پر چلے گی اور اسلامی فلاحی جمہوری ریاست بننے کی منزل حاصل کر لے گی، لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ کے مصداق نہ صرف یہ کہ کوئی امید بر نہ آئی بلکہ گاڑی مخالف سمت چلنے لگی اور منزل دور

سے دور ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ 1971ء میں اِس بے قابو گاڑی کو زبردست حادثہ پیش آیا اور ملک دو لخت ہو گیا اور بقول شخصے قائداعظم کا پاکستان دفن ہو گیا۔ ایک حصے نے پاکستان کا نام ہی خلیج بنگال میں ڈبو دیا، البتہ دوسرے حصے کو شروع شروع میں what remains of Pakistan کہا جانے لگا۔ پھر بنگلہ دیش کو تسلیم کر کے اِس بقایا پاکستان پر اکتفا کر لیا گیا۔ اِس سانحہ پر رویا پیٹا تو بہت گیا لیکن عبرت حاصل نہ کی گئی۔ بلکہ سیاسی اور فوجی حکمرانوں نے ایسا غیر اسلامی، غیر اخلاقی، غیر آئینی اور غیر قانونی طرزِ عمل اختیار کیا کہ 1971ء سے پہلے کے حکمران فرشتہ نظر آنے لگے۔ اِس دوران سیاسی اغراض کے لئے کبھی تحریک نظام مصطفیٰؐ کے نام پر اینٹی بھٹو تحریک P.N.A نے چلائی اور کبھی M.R.D نے بحالی جمہوریت کے نام پر مارشل لاء کے خلاف تحریک چلائی، لیکن کوئی تحریک حقیقی تبدیلی نہ لا سکی۔ مارشل لاء لگتے رہے اور عدلیہ انہیں نظریہ ضرورت کے تحت پوتر کرتی رہی۔ سر اٹھا کر چلنے والی کوئی رسم رواج نہ پا سکی۔ عدالتِ عظمیٰ کے جس بنچ نے مشرف کی حکومت کو جائز اور قانونی قرار دیا تھا جسٹس افتخار چوہدری بھی اُس کا حصہ تھے۔ پھر اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کے دل و دماغ میں کیا تبدیلی آئی کہ انہوں نے کلمۂ حق کہنے کے لئے جابر سلطان سے اجازت لینے کا سلسلہ منقطع کر دیا اور حکومت کے خلاف فیصلے صادر کرنا شروع کر دیے۔ خصوصاً پاکستان سٹیل ملز کی نجکاری اور لاپتہ افراد کے حوالہ سے فیصلوں نے مشرف کو مشتعل کر دیا۔ 9 مارچ 2007ء کا دن اِس لحاظ سے تاریخی ثابت ہوا کہ ایک جج جرنیلوں کے جمگھٹے میں اکڑ گیا اور اُن کے ڈرانے دھمکانے کے باوجود استعفاء دینے سے انکار کر دیا۔ وکلاء نے چیف جسٹس کی بحالی کی تحریک شروع کر دی۔ دو سال میں اِس تحریک میں جو نشیب و فراز آئے اُس سے قارئین اچھی طرح باخبر ہیں۔ بہت سے حوالوں سے یہ تحریک ایک منفرد تحریک تھی۔ مثلاً یہ پہلی تحریک تھی جو عدل کے نام پر چلی۔ شروع میں تحریک مکمل طور پر غیر سیاسی تھی اور محرکین میں کسی کا بھی ذاتی مفاد وابستہ نہیں تھا، بلکہ انہیں زبردست مالی نقصان ہو رہا تھا، کیونکہ وہ P.C.O ججوں کے سامنے پیش نہیں ہو رہے تھے۔ دو سال میں انہوں نے صحیح معنوں میں جان اور مال کی قربانی دی۔ یہ تحریک اِس لحاظ سے بھی بے مثل تھی کہ جس شخص کے حوالہ سے چلائی جا رہی تھی وہ چند بار صرف مختلف بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرنے کے لئے گھر سے نکلا وگرنہ اپنے اصولی موقف پر قائم رہتے ہوئے وہ خانہ نشین رہا اور ایک دنیا کٹ مرنے کے لئے بازاروں اور سڑکوں پر موجود رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ

بات اِس لیے آگے بڑھتی گئی کہ عوام اپنے حقوق اور عدل کے متلاشی تھے اور افتخار محمد چوہدری عدل کا سمبل بن چکا تھا۔ لہٰذا پہلے ایک سرکش جرنیل کا اقتدار اِس تحریک کی نظر ہوا، پھر سیاسی ورثہ کے حامل ایک متکبر منتخب صدر کو اپنی گردن جھکانی پڑی

ہم اُن لوگوں سے بھرپور اتفاق کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ 16 مارچ 2009ء کو ایک نیا پاکستان، ایک بدلا ہوا پاکستان وجود میں آ گیا، ظلم عدل کے سامنے سرنگوں ہو گیا، جبر کی قوتوں نے عوامی قوت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، قہرمان کمزوروں سے چت ہو گئے، پہلے معرکے میں فوجی وڈیروں کو شکست ہوئی اور دوسرے معرکے میں عوامی سیاست کے چمپئن ڈھیر ہوئے۔

14 اگست 1947ء ہو، یا 1949ء کا یوم قرارداد مقاصد ہو، یا 1977ء کی تحریک نفاذِ مصطفیٰ کی کامیابی ہو اِن میں سے کوئی بھی دن پاکستان کا پستی اور زوال کی طرف سفر کو نہ روک سکا، لیکن کیا 16 مارچ 2009ء کا دن جیسے یوم افتخار قرار دیا گیا ہے وہ ہمیں بحیثیت قوم باعثِ افتخار بنا دے گا؟ ہاں اور ایک زوردار ہاں کہنے کے لئے ہمارے پاس بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ عدل وقسط ایسا ٹونک ہے جس کے ہوتے ہوئے کوئی معاشرہ بیمار یا کمزور نہیں ہو سکتا اور معاشرہ اگر زندہ اور توانا ہو تو طبیب بڑھتے جاتے ہیں اور خبیث محدوم ہوتے جاتے ہیں اور ہمیں اصل ضرورت ایسے ہی ایک طبیب معاشرہ کی ہے جو اندرونی اور بیرونی شیطانی قوتوں سے نبرد آزما ہو سکے۔ یہاں اِس بات کا ذکر از حد ضروری ہے کہ ہم بعض واقعات کو اتفاقات زمانہ کے ذیل میں لے لیتے ہیں حالانکہ اللہ رب العزت کے ہاں ہر بات طے شدہ منصوبے اور طریقے کے مطابق ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم نہیں سمجھتے کہ یہ بھی محض اتفاق ہے کہ پاکستان نزولِ قرآن کے مہینے میں معرضِ وجود میں آیا اور جابر قوتوں کے خلاف عدل کے متلاشیوں کو فتح ربیع اوّل کے مہینے میں ہوئی۔ جب سراپا عدل اور رحمت اِس دنیا میں تشریف لائے یعنی پاکستان کے اوّل جنم کا تعلق قرآن سے ہے اور اُس کے جنم ثانی کا تعلق حاملِ قرآن سے ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ قرآن اور سنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر ہم پاکستانی مسلمان اپنی اصلی منزل یعنی اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کے لئے رواں دواں ہوں۔ ہم آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اِس تحریک نے توقعات کا کوہ ہمالیہ کھڑا کر دیا ہے اگر عوامی توقعات پوری نہ ہوئی ظالم، جابر، قاہر، بدیانت، خائن اور اقربا پرور یونہی دندناتے رہے تو پھر کیا ہوگا اگر یہ صبح بھی صبحِ بے نور رہی تو پھر کیا ہوگا.....؟



صور میں ماری جانے والی دوسری پھونک

اُمت مسلمہ پر کیا بیت رہی ہے، مصائب والام کی برکھا برس رہی ہے۔ لیکن اکابرین اُمت سیاسی ہوں یا مذہبی لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ گراں خواب یہ رہنما کیسی ارزاں آرزوئیں پال رہے ہیں۔ کرسی کے اندھا دھند طواف میں مصروف، غیر ملکی آقاؤں کے سامنے سجدہ ریز، عملی طور پر بلھے شاہ کے اس شعر کی منہ بولتی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ بلھیا اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور۔ عوام اگرچہ بے بس اور بے اختیار ہیں لیکن ان کا حال بھی کوئی اچھا نہیں۔ وہ بھی حال مست اور مال مست ہیں۔ کوئی اذان اُنہیں بیدار کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی۔ کشمیر، فلسطین، چیچنیا، افغانستان، سنکیانگ، سوات، شمالی اور جنوبی وزیرستان سے اُٹھنے والی دلدوز چیخیں اُن کے کانوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتیں۔ ابوغریب کی فاطمہ اور ڈاکٹر عافیہ کی عزت و آبرو کی دشمنوں نے دھجیاں بکھیر دیں، لیکن ہماری غیرت وحمیت نے انگڑائی لینا گوارا نہ کیا۔ سیاسی جماعتیں تو رنگ رلیوں میں مصروف ہیں، مذہبی جماعتوں کا رول بھی کسی طرح حوصلہ افزا نہیں۔ کوئی بڑی اجتماعیت نظر نہیں آتی، البتہ اجتماعیت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں جگہ جگہ سجی ہیں۔ لیڈران گنت ہیں، کارکن خال خال نظر آتے ہیں۔ قول وفعل کا تضاد شرمناک صورت حال اختیار کر چکا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ خونِ مسلم ارزاں ہی نہیں، بے قیمت اور بے وقعت ہو چکا ہے۔ انسان اور انسان میں اتنا بڑا فرق تو کبھی بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ دورِ جہالت میں بھی یہ صورت حال نہ تھی۔ رسالت مآب ﷺ کی آمد سے پہلے اوس اور خزرج میں سے خزرج بڑا قبیلہ تھا، لہٰذا خزرج کے ایک آدمی کی زندگی اوس کے تین افراد کے مساوی سمجھی جاتی تھی، یعنی کوئی نسبت تناسب تو تھا۔ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ دور میں جبکہ مساوات کا شور وغوغا کان پھاڑ رہا ہے، دعویٰ یہ ہے کہ مذہب کا

ریاست سے کوئی تعلق نہیں، سیکولرازم کو اپنا ایمان بتایا جاتا ہے، رنگ و نسل اور مذہب کی بنیاد پر امتیاز ظاہراً جرم ہے، لیکن عملاً کیا ہو رہا ہے۔ کسی گورے کی کسی کالی ریاست میں غیر طبعی موت واقع ہو جائے تو طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کی گز بھر لمبی زبان زہریلے ناگ کی طرح ڈسنے لگتی ہے۔ لیکن دنیا بھر میں مسلمان یوں مر مر کر گر رہے ہیں، جیسے خزاں رسیدہ پتے جھڑتے ہیں۔ مصر کی مروا شیر بنی جو اپنے خاوند کے ساتھ جرمنی میں رہائش پذیر تھی، اُسے ہمسائے جرمن نوجوان نے محض حجاب پہننے پر دہشت گرد کہا۔ میاں بیوی نے اس ہمسائے کے خلاف ڈی فیمیشن (Defemation) کا مقدمہ دائر کر دیا۔ نوجوان کو 780 یورو جرمانہ ہوا لیکن اُس نے عدالت میں کھڑی حجاب پہنی مروا پر خنجر کے اٹھارہ وار کئے۔ مصر میں ایک احتجاجی مظاہرہ ہوا، لیکن مصر کے صدر حسنی مبارک نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ شاید اس لئے کہ جرمنی اور مصر بہت بڑے ٹریڈ پارٹنر ہیں۔ ایران کے سوا مسلم دنیا کے کسی حصہ سے کسی قسم کا احتجاج نہیں ہوا۔ الیکٹرانک میڈیا خاموش ہے۔ وہاں سے خبر تک جاری نہیں ہوئی۔ مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت سے تو خیر کوئی توقع بھی نہیں تھی، عوامی سطح پر بھی کوئی احتجاج سامنے نہیں آیا۔ شہیدِ حجاب اللہ کے حضور پہنچ چکی ہیں اور عدالت ربانی میں ایک اور کیس ہمارے خلاف دائر ہو چکا ہے۔ فرانس کے صدر سرکوزی نے برقعہ کے خلاف ہرزہ سرائی کی ہے۔ آسٹریلیا کی عدالت اور چین کی حکومت نے وہاں کے مسلمانوں پر جمعہ کے اجتماع اور نماز پر پابندی عائد کر دی ہے۔ ڈاکٹر عافیہ کے پاؤں میں قرآن حکیم رکھا جاتا ہے، اُس کی بینائی ختم ہونے کو ہے، لیکن وہ قرآن پر پاؤں رکھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ جب اُس سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ تمہارے پاؤں میں قرآن مجید ہے، تو وہ پاکیزہ روح کہتی ہے قرآن کی تو مجھے خوشبو آ جاتی ہے۔ لیکن اُمتِ محمدؐ کے خاص و عام پر قبرستان کا سا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ہمارے آباء بت شکن تھے۔ اُنہوں نے بت فروش بننے سے انکار کر دیا تھا، لیکن ہم اپنے دینی بھائیوں کا خون بیچ رہے ہیں اور بہنوں کی عصمت کے بیوپاری بن گئے ہیں۔ کس قیامت کا انتظار ہے، جو ہماری غیرت کو جگا دے، جو ہماری حمیت کو جھنجھوڑ سکے۔ فاطمہ اور عافیہ کی چیخیں صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہیں۔ کسی محمد بن قاسم کے ظہور کے دور دور تک آثار نہیں۔ حمیت اور تیمور کے درمیان سمندر حائل ہو چکے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُمت مسلمہ کے لئے صور میں پہلی پھونک ماری جا چکی ہے، جس نے اسے

بے جان کر دیا ہے۔ ہے کوئی جماعت، گروہ یا قوم جو صور میں دوسری پھونک مارے اور یہ اُمت زندہ ہو کر اپنے ہدف کی طرف لپکے۔ پیدائشی مسلمان مسلم سے مومن بنے، مجاہد بنے اور باطل سے ٹکرا جائے۔ لکھ کر دیا جا سکتا ہے کہ طاغوت ضربِ مومن کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ باطل کا پاش پاش ہونا اُس کی تقدیر ہے۔ ضرورت مسلم کے مومن بننے کی ہے، مومنین صالحین کو جماعت میں پرو دینے کی ہے۔ ضرورت پختہ شوی کی ہے۔ مامور میں خوئے اطاعت ہو اور امیر دل نواز، یہ سب کچھ ہو تو راہی اور منزل میں اتنا فاصلہ نہیں ہے، جتنا سمجھا جا رہا ہے۔ درحقیقت بے یقینی اور عدم توکل کا گرد و غبار حائل ہے جس سے منزل دور نہ ہونے کے باوجود راہی کی نظروں سے اوجھل ہے۔ بہر حال زمینی حقائق کچھ بھی ہوں، اندھیروں اور تاریکیوں کے پردے کتنے ہی دبیز کیوں نہ ہوں، سر کی آنکھیں کچھ بھی دیکھ رہی ہوں، عقل کا تقاضا جو چاہے ہو، ہوگا وہ جس کی خبر صادق المصدوق نے دی ہے یعنی یہ کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے اللہ کا پسندیدہ دین یعنی اسلام اس دنیا کے ہر ہر گھر میں گھر والے کی عزت یا ذلت کے ساتھ داخل ہوگا۔ اب فیصلہ ہمیں کرنا ہے، آیا ہم اس کا ذریعہ اور واسطہ بنتے ہیں یا نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ آفتابِ رسالت تو سب کے لئے طلوع ہوا، لیکن عمر بن خطاب ایمان لا کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گئے اور عمرو بن ہشام انکار کر کے ابو جہل بن گیا۔



ہے کوئی.....

بندے مسلسل کتوں کو کاٹتے چلے جا رہے ہیں اور خبریں دھرا دھر بن رہی ہیں۔ قوم متحد ہو کر یہ ترانہ الاپ رہی ہے ''آٹا آٹا کر دی میں آپ آٹا ہوئی''۔ امتیاز نے اپنا ریٹائرڈ بریگیڈ جس جرأت اور بہادری سے ''بحر کیچڑ'' میں اتارا ہے، معلوم ہوتا ہے نشان حیدر نہ پا سکے تو تمغہ جرأت تو وہ پڑا ہے۔ آصف تلاشِ زر میں در بدر ہو رہے ہیں۔ بیت میں مال نہ ہو تو ذمہ داران بیت المال کی تشویش قابل فہم ہے۔ پھر یہ کہ سرکاری خزانہ بھرا ہوگا تو بہتوں کا بھلا ہوگا، آخر چراغ سے چراغ جلے تو روشنی ہوتی ہے۔ اُدھر پاکستان میں امریکی سفیرہ این میری ڈبلیو پیٹرسن بیچاری شب و روز مصروف ہیں کیونکہ پاکستان کی امداد کا لوگر کیری بل کانگرس منظور کرنے کو ہے۔ لہٰذا تقسیم مال کے لیے اسلام آباد میں کئی ایکڑوں پر محیط سفارت خانہ کی تیاری اشد ضروری ہے، جو ہنگامی بنیادوں پر کی جا رہی ہے۔ علاوہ ازیں اسلام آباد میں 200 بنگلے کرائے پر حاصل کئے جا چکے ہیں جن کا کرایہ ڈالروں میں ادا کرنا ہوگا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے امریکی وزارت خارجہ کا جس نے پاکستان کو اپنے سفارت کاروں کے لیے نان فیملی سٹیشن قرار دیا ہوا ہے وگرنہ سارا اسلام آباد ڈالروں میں کرائے پر حاصل کر لیا جاتا۔ اگرچہ یار لوگ اب بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام آباد کی گڈ گورننس کب کی کرائے پر چڑھ چکی ہے۔ رہ گئی بات بلیک واٹر کی تو اس نے تو اپنا نام ہی بدل لیا ہے اور مُردوں کو برا بھلا کہنا ہماری روایات کے خلاف ہے۔ روایات کی بات چل نکلی ہے تو یہ بھی جان لیں، ہم پابندی سے روایات نبھا رہے ہیں۔ پٹھان لڑنے بھڑنے کی روایت نبھا رہے ہیں۔ پنجابی چڑھتے سورج کی پوجا کرنے کی، ایم کیو ایم رنگ بدلنے کی اور سندھی گھر بیٹھے واویلہ کرنے کی اور بلوچ خالی پیٹ پگ کا شملہ اونچا رکھنے کی روایت نبھا رہے ہیں۔ البتہ ہماری صحبت سے

ہمارا اتحادی امریکہ بالکل فیض یاب نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ صحبت اثر رکھتی ہے۔ امریکہ کی روایت یہ تھی کہ وہ کام نکل جانے پر منہ پھیر لیتا تھا۔ آج وہ قدم قدم پر منہ پھیر رہا ہے۔ ہم ایک فوجی آپریشن سے اُس کا منہ سیدھا کرتے ہیں، وہ گنتی کے ڈالر پھینکتا ہے اور پھر منہ پھیر لیتا ہے۔ ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ ''لقوہ'' کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے کہ اُس کا منہ سیدھا ہونے کو ہی نہیں آتا۔

حیران ہوں، روؤں دل کو کہ پیٹوں جگر کو میں آہ! یہ خبر نامہ ہم نے طنزیہ انداز میں آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ درحقیقت یہ وہ چیخ و پکار ہے جو قوم کا درد رکھنے والا ہر شخص کر رہا ہے۔ قوم کے جسد پر اتنی ضربیں لگ رہی ہیں کہ روتے روتے ہنسی آجاتی ہے اور بے وقت کی ہنسی ایسے ہی گُل کھلاتی ہے۔ آپ نے آس پاس یا دنیا بھر میں دور دراز کہیں کوئی قوم آپ کو ایسی نظر آتی ہے جو بدترین حالات سے دوچار ہو، جسے دشمن نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہو، جس کے عوام کی کثیر تعداد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی کے دن پورے کر رہی ہو، جنہیں پینے کا صاف پانی دستیاب نہ ہو، جس کا ہر پیدا ہونے والا بچہ کئی ہزار ڈالر کا قرض اپنے سر لیے دنیا میں وارد ہوتا ہو۔ لیکن اُس قوم اور ملک کے رہنماؤں کو اٹھکیلیاں سوجھ رہی ہوں۔ وہ قومی اثاثوں کو لوٹنے اور سرکاری خزانے کو شیر مادر کی طرح ہضم کرنے میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہوں۔ یہ لوگ مسند اقتدار کے لیے آپس میں یوں ٹکراتے ہیں جیسے لڑکھڑاتے ہاتھوں میں جام ٹکراتے ہیں اور اس جنگ میں وہ قومی وسائل اور مسائل سب کچھ جھونک دیتے ہیں۔ وہ جاہل عورتوں کی طرح لڑتے ہیں لیکن سمجھ دار مہاجنوں کی طرح باہمی اتفاق سے عوام کے جسم سے گوشت نوچتے ہیں اور اُن کی رگوں کا خون چوستے ہیں اور اس بات سے مطلقاً بے فکر اور بے غم ہیں کہ آسمان پر کس کی بربادیوں کے مشورے ہو رہے ہیں۔ وہ وطن عزیز کی سلامتی کے درپے امریکہ کو اپنا اتحادی بنائے بیٹھے ہیں۔ حکومت اپنے ان آقاؤں سے پوچھ کر حکومت کرتی ہے اور اپوزیشن اُن سے پوچھ کر اپوزیشن کرتی ہے۔ باہم گتھم گتھا ہونے والے یہ سیاست دان امریکہ کے حضور جب صف باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں تو کندھے سے کندھا ملائے ہوتے ہیں۔ لیکن مکمل طور پر بے قصور اور معصوم خود یہ قوم بھی نہیں، اُس کی حالت یہ ہے کہ وہ ع ''میری دنیا لُٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا'' کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ وہ ان نام نہاد رہنماؤں کو ظلم و ستم کی کھلی چھٹی دیئے ہوئے ہے۔ وہ حکمرانوں سے اپنے حقوق چھیننے

اور بزورِ بازو حاصل کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر میدان میں نکلنے کی بجائے بادشاہ کے محل کے سامنے اکٹھے ہو کر پُل پر جوتیاں مارنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ہم مسلسل قلم کی نوک سے عوامی جسد میں کچوکے لگا رہے ہیں، لیکن یہ سوئی ہوئی قوم بس پہلو بدل لیتی ہے یا زیادہ سے زیادہ ماتھے پر شکن ڈال کر ''نہ چھیڑ ملنگاں نوں'' بڑبڑاتی ہے اور پھر محوِ خواب ہو جاتی ہے۔ البتہ خواب بڑے حوصلہ افزا دیکھتی ہے۔ کبھی کشمیر پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنے کا اور کبھی دہلی کے لال قلعہ پر سبز ہلالی پرچم لہرانے کا، یہاں تک کہ امریکیوں کو مار بھگانے کا خواب دیکھنے سے بھی گریز نہیں کرتی۔ البتہ حالات نے جن کی نیندیں حرام کی ہوئی ہیں وہ بلوچستان کے سکولوں سے سبز ہلالی پرچم کے غائب ہونے پر ماتم کناں ہیں۔ وہ نصابی کتابوں سے جہاد کی آیات کھرچے جانے پر نظریہ پاکستان کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ جہادیوں اور فوجیوں کی جنگ میں اصل شہید کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ وہ ملک و قوم اور دین و ملت کے سینہ میں چھرا گھونپنے والے بازو پر ''اتحادی'' کا لگا ہوا سٹیکر پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ہم قلم ہاتھ میں تھامے سوچ رہے ہیں کہ ہے کوئی جو ہمیں سوئے ہوئے کو جگانا سکھا دے، ہے کوئی جو ایسا نشتر فراہم کر دے جو مریض کا کامیاب آپریشن کرے۔ ہے کوئی جو اس بحر کی موجوں میں اضطراب پیدا کر دے، ہے کوئی جو اس قوم کو کسی طوفان سے آشنا کر دے۔ ہے کوئی جو بھولا ہوا سبق یاد دلا دے۔ ہے کوئی۔ ہے کوئی۔ ہے کوئی۔ وگرنہ یاد رہے نیند اور موت کی وادی میں زیادہ فصل نہیں ہوتا۔



عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنیں

عید کے لغوی معنی چاہے کچھ بھی ہوں، بار بار لوٹ آنے والا دن یا خوشیوں کے بار بار لوٹنے کا دن، لیکن برصغیر میں اِس دن کو بلا امتیازِ مذہب انتہائی خوشی اور خوش نصیبی سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ جب ہندوستان میں فارسی کا طوطی بولتا تھا، سرکاری زبان فارسی تھی، اچھی فارسی لکھنا پڑھنا ادبیت یا دانشوری کا سراغ دیتی تھی تو خوش فہم قسم کے سائلوں کو یہ جواب بھی سننا پڑتا تھا "ہر روز عید نیست کہ حلوہ خوردن"۔ پھر جب شاہ جہاں نے عربی، فارسی، ہندی اور پنجابی کا مصالحہ ڈال کر اُردو نامی چاٹ تیار کی تو خوشی اور عید ہم معنی الفاظ ٹھہرے۔ جب فارسی زبان کا دیس نکالا ہوا تو اُردو کی عید ہوگئی۔ شاید اس لشکری زبان کا اثر ہے کہ پاکستان نے اِسے قومی زبان قرار دیا تو طالع آزماؤں نے جمہوری حکومتوں پر شب خون مارنا اپنا قانونی حق جانا۔ بہرحال اُردو کا ذکر تو جملہ معترضہ کے طور پر آ گیا تھا، بات عید کی ہو رہی تھی۔ عید کیا ہے؟ یہ آخرت کے لیے محنت کرنے والوں کا دُنیوی اجر ہے۔ علاوہ ازیں اِس میں اندرونی سکون اور روحانی خوشی کی صورت میں اُخروی اجر کی معمولی جھلک بھی موجود ہے جو روزہ دار پر ظاہر کی جاتی ہے۔ اِسے عید الفطر کہا جاتا ہے۔ فطرہ بندوں کا حق ہے اور دوگانہ نماز اللہ ربّ العزت کا شکر ادا کرنا ہے کہ اُس کی توفیق سے رمضان المبارک کے روزے رکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ فطرانہ نماز عید سے پہلے ادا کرنا ہوگا۔ گویا اللہ ربّ العزت نے اپنے غریب اور نادار بندوں کے حق کو اپنے حق (نماز دوگانہ) پر فائق کر دیا۔ عید کے روز چھوٹی بچیوں کا گانا اور شرعی حدود کے اندر کھیل تماشا دیکھنے کو بھی سندِ نبوی حاصل ہے۔

عید کا لفظ قرآن پاک میں صرف ایک جگہ سورۃ المائدہ کی آیت 114 میں آیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: (ترجمہ) ''عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم نے دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما کہ ہمارے لیے (وہ دن) عید قرار پائے، ہمارے اگلوں اور پچھلوں (سب) کے لیے اور وہ تیری طرف سے نشانی ہو۔ اور ہمیں رزق دے، تو بہتر رزق دینے والا ہے۔''

اگلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے فرماتا ہے: (ترجمہ) ''اللہ نے فرمایا میں تم پر ضرور خوان نازل فرماؤں گا، لیکن جو اس کے بعد تم میں سے کفر کرے گا، اسے ایسا عذاب دوں گا کہ اہل عالم میں سے کسی کو ایسا عذاب نہ دوں گا''۔ اس سے اللہ رب العزت کی یہ سنت ہمارے سامنے آئی کہ جب وہ مانگنے اور طلب کرنے پر کوئی شے روٹین اور نارمل طریقے سے ہٹ کر عطا کرتا ہے تو پھر اُس قوم کی بدعملی اور کفرانِ نعمت یا بدعہدی پر اُس کی گرفت اور پکڑ بھی فوری اور انتہائی شدید اور زبردست ہوتی ہے۔ پھر اُس سزا کو عام دنیوی پیمانوں سے ناپنا اور تولنا حماقت ہوگی۔

یقین کیجیے، پاکستان کا قیام بھی سیاسی معجزہ ہے۔ 1940ء تک پاکستان بحیثیت ایک ریاست مسلم لیگ کا مطالبہ بھی نہیں بن سکا تھا۔ مشہور زمانہ تاریخی قرارداد لاہور میں پاکستان کا نام تک نہیں تھا۔ انگریز حکمران پوری قوت کے ساتھ پاکستان کی مخالفت پر کمربستہ تھا۔ اور ہندو اکثریت کا بے تاج بادشاہ اور انتہائی ٹھنڈے مزاج کا حامل مہاتما گاندھی کہہ رہا تھا پاکستان میری لاش پر بنے گا۔ پھر بھی سات سال میں بے دست و پا اور وسائل سے تہی دامن مسلم اقلیت نے پاکستان بنا دیا۔ ہر قسم کے تعصبات کو الگ رکھ کر سچ سچ بتایئے، عقلی سطح پر یہ ممکن تھا؟ ہرگز ہرگز نہیں، ہم نے اللہ سے التجا کی کہ ہمیں ہندو سے الگ ایک آزاد ریاست عطا فرما دے، ہم اُس میں تیرا دین نافذ کریں گے۔ ہمارے بعض عقلیت پسند فرماتے ہیں کہ قائد اعظم کا مقصد کبھی ایک اسلامی ریاست کا قیام نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کا ایک الگ ملک چاہتے تھے تاکہ ہندو کے استحصال سے بچا جا سکے۔ اور ''پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ'' کا نعرہ چند چھوکروں نے لگایا تھا، مسلم لیگ نے کبھی اس نعرے کو نہیں اپنایا تھا۔ اور اپنے استدلال کی ساری عمارت قائد اعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر پر کھڑی کرتے ہیں، حالانکہ 25 جنوری 1948ء کو خود قائد

اعظم نے سیکولر طبقہ کی اس کھینچ تان کو شر پسندی اور تخریب کاری قرار دیا اور انہوں نے قرآن پاک کو پاکستان کا آئین قرار دیا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ تحریک پاکستان کو اگر اسلام کا ''تڑکا'' نہ لگتا تو وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکتی۔ اب اگر ہم اللہ سے کیے گئے اس عہد سے منحرف ہوتے ہیں تو اللہ کی انتہائی شدید پکڑ اور گرفت سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یاد رہے، اللہ اپنی سنت تبدیل نہیں کرتا۔

ہم قرآن کو ایک لاثانی کلام قرار دیتے ہیں، اسے حضور ﷺ کو عطا کیا گیا ایسا معجزہ قرار دیتے ہیں جو تا قیامت قائم رہے گا۔ یہ معجزہ اس لیے بھی ہے کہ اگلوں اور پچھلوں کی خبریں دیتا ہے اور ہر وقت اُنہیں رہنمائی دیتا ہے۔ یہ اُس ہستی کا کلام ہے جس کے ناموں میں سے ایک نام ''العادل'' ہے۔ وہ دو قوموں کے ایک جیسے رویے پر مختلف نتائج کیسے برآمد کرے گا! پھر یہ کہ ہمیں مصورِ پاکستان اور مفکرِ اسلام علامہ اقبال بھی پیشگی انتباہ کر چکے ہیں۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

اور یہ بھی یاد رہے، حشر میں معاملہ فرداً فرداً ہوگا لیکن اقوام کا قصہ زمین پر ہی چُکا دیا جاتا ہے۔ ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ خوشی کے اس موقع پر رنگ میں بھنگ ڈالیں، صرف اتنی گزارش ہے کہ آیئے اپنے عہد کی طرف لوٹیں۔ آیئے، تجدیدِ عہد کریں کہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست بنا کر دم لیں گے۔ موقع بڑا مناسب ہے، ماہ رمضان نے ہماری روحانی قوت میں اضافہ کیا ہے، نفسانی خواہشات کو کنٹرول کرنے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ عیدِ مومناں تو تب ہی ہوگی جب مملکت خداداد پاکستان صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنے گی۔

آج صورت حال یہ ہے کہ امریکہ ہمیں غلامی کے پنجے میں جکڑ کر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سیکولرازم کی طرف دھکیل رہا ہے۔ لہٰذا مومنینِ پاکستان کی عید اُس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ امریکہ سے سیاسی، معاشی، معاشرتی، نفسیاتی اور نظریاتی آزادی حاصل نہیں کرتے۔ ایسے ہی وقت کے لیے مصورِ پاکستان نے کہا تھا۔

عیدِ آزاداں، شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں، ہجومِ مومنیں!



ہر چند دانا کند.....

جمعیت علمائے اسلام کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن نے ایک نجی ٹیلی ویژن چینل کو انٹرویو کے دوران اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا امریکہ افغانستان سے جا رہا ہے؟ کہا ہے کہ امریکہ افغانستان سے جا نہیں رہا بلکہ پاکستان منتقل ہو رہا ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسی روشن اور عیاں حقیقت ہے جس کا ادراک ہمارے سیاسی رہنماؤں کے سوا ہر پاکستانی کو ہے۔ ادراک اور احساس نہ ہونے والی بات تو شاید درست نہ ہو، البتہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اُنہوں نے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ بلیک واٹر نامی انتہائی خطرناک اور رسوائے زمانہ تنظیم کی پاکستان میں موجودگی اب کوئی راز کی بات نہیں رہی۔ سینکڑوں کی تعداد میں اسلام آباد میں بنگلے کرائے پر لینے کی بات کی خود امریکی سفیرہ نے تصدیق کر دی ہے۔ اُنہوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ پشاور کا ایک فائیو سٹار ہوٹل خریدنے کے لیے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا امریکی سفارت خانہ اسلام آباد میں تعمیر ہو رہا ہے۔ جس کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ منی پینٹاگون ہوگا۔ درحقیقت سفارت خانہ کے نام سے فوجی اڈہ تعمیر کیا جا رہا ہے۔ صحافیوں کے بھیس میں انٹیلی جنس کے انتہائی مشتبہ لوگ پاکستان آ جا رہے ہیں۔ بعض امریکیوں کو حساس علاقوں میں پُراسرار حرکات کرنے پر جب ڈی پورٹ کیا گیا تو امریکہ میں ہمارے سفارت خانہ نے اُنہیں دوبارہ ویزہ جاری کر دیا۔ یہ بھی خبر گرم ہے کہ ہیوز نامی گاڑی جس کے ذریعے عراق میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا وہ 200 کی تعداد میں پورٹ قاسم پر اَن لوڈ ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کو جو 7 لاکھ ایکڑ زمین کاشتکاری کے لیے فروخت کی جا رہی ہے اس میں بھی برادرِ اسلامی ممالک کی حیثیت فرنٹ مین کی ہے، اصل خریدکنندگان امریکہ اور

یورپ ہیں۔اس زمین کی پیداوار میں پاکستانی عوام کو کوئی حصہ نہیں ملے گا۔یعنی پاکستان کی زرخیز زمین اور میٹھا پانی غیر پاکستانیوں کا پیٹ بھرے گا اور شاید یہی اناج اور پھل پاکستان کو دوبارہ اُن ممالک سے درآمد کرنا پڑے۔قصہ کوتاہ پاکستان کے ہاتھ پاؤں جکڑنے اور اُسے باندھ کر ذبح کرنے کے پروگرام پر مرحلہ وار عمل شروع ہو چکا ہے۔

جہاں تک مرکزی حکومت اور ایوانِ صدر کا تعلق ہے وہ ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے فلسفہ پر عمل پیرا ہے اور ان تمام خطرات سے آنکھیں بند کر کے صرف اُن منصوبہ جات پر دن رات محنت ہو رہی ہے جن سے کِک بیکس وصول ہو سکتی ہیں۔لہٰذا 2 کھرب روپے کے خرچ سے پرانے بجلی گھر کرائے پر حاصل کیے جا رہے ہیں۔اور جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس سے نصف قیمت پر ہم نئے بجلی گھر خرید کر لا سکتے ہیں، اُن کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی۔یہ بات اب ثابت ہو گئی ہے کہ حکمران سمجھ رہے ہیں کہ یہ ایوان اقتدار میں اُن کی آخری باری ہے۔چنانچہ اُنہوں نے یہ ماٹو اختیار کیا ہے ''نچوڑو، بٹورو اور دوڑو'' نہ ہم اس ملک میں ہوں گے نہ ہمیں اس کی سلامتی کا غم کھائے گا۔لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی کے بڑوں کا طرزِ عمل قابلِ فہم ہے۔ہمارے لیے اصل مسئلہ مسلم لیگ (ن) اور اُس کے قائد محمد نواز شریف کا طرزِ عمل ہے۔وہاں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہے۔ایسے محسوس ہوتا ہے گھر کا بڑا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ گھر کو لوٹا جا رہا ہے، اس کی بنیادوں پر کلہاڑا چلایا جا رہا ہے، اُس کے دروازے دشمن پر کھولے جا رہے ہیں، اہل خانہ کی عزت و ناموس دشمن کے رحم و کرم پر ہے، دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست قرار دیا جا رہا ہے، لیکن نواز شریف کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں۔ہم حیران ہیں کہ کسی بے زبان کا گھونسلہ خطرہ میں ہو تو وہ چیخ و پکار شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو اپنی جان پر کھیل جاتا ہے لیکن سترہ کروڑ عوام کے گھونسلے کو تتر بتر کرنے کی سازشیں ہو رہی ہیں اور وہ ٹک ٹک دیدم کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

ہماری رائے میں موجودہ سیاسی لیڈروں سے کسی بہتری اور خیر کی توقع کرنا حماقت ہے، ان کی اکثریت سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئی ہے، یہ کیونکر غریب عوام کا سوچیں گے اور جس مقصد کے لیے پاکستان معرض وجود میں آیا تھا یعنی اس خطۂ زمین میں اسلام کا عادلانہ نظام قائم کیا جائے، یہ کب وہ پورا ہونے دیں گے۔اس لیے کہ یہ مثالی نظام اُن کے مفادات پر کاری ضرب لگائے گا۔سوال یہ ہے کہ وہ قوم جو گردن گردن قرضے کی دلدل میں پھنس چکی ہو، جو بنیادی ضروریات کی

تکمیل کے لیے بھی غیروں کی محتاج بنادی گئی ہو، جو اکیسویں صدی میں بھی اندھیروں میں ڈوبی ہو وہ روایتی اور رسمی طریقوں سے اصلاح پذیر ہوسکتی ہے۔ انتخابی شعبدہ بازیوں اور اسٹیبلشمنٹ کی جادوگری سے جنم لینے والے سیاست دان اس یتیم قوم کی ناؤ کیسے ساحل پر پہنچائیں گے بلکہ وہ تو اسے بیچ دریا غرق کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اب تو بڑے بڑے رجائیت پسند بھی خونی انقلاب کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ ہماری گزارش صرف اتنی ہے کہ اگر استحصالی قوتیں حالات کا فائدہ اٹھا کر غیر اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہوگئیں تو یہ قوم کھائی سے نکل کر کھوہ (کنواں) میں گر پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کی جدوجہد ہمارا فرض بھی ہے اور ہماری ناگزیر ضرورت بھی۔ مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے۔ امریکی جنرل سٹینلے سے لے کر مائیک مولن تک اور رابرٹ گیٹس سے لے کر صدر اوبامہ تک یہ کہہ رہے ہیں کہ افغانستان میں جیت کا کوئی امکان نہیں۔ اگر افغانستان کا مستقبل طالبان ہی ہیں تو کیا عقلیت پسند یہ فرمانا مناسب سمجھیں گے کہ پاکستان کے لیے کون سی راہِ فرار ہوگی۔ ہم اُن کی خدمت میں یہ ضرب المثل پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ ہر چند دانا کند کند نادان، لیک بعد از خرابیٔ بسیار!



حضورؐ کا جو غدار ہے، موت کا حقدار ہے!

اگر چہ آقائے نامدار حضورِ انور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کا آخری نبی ہونا قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے اور احادیث مبارکہ میں بھی واضح اور واشگاف طور پر مذکور ہے۔ اُس کے باوجود آپؐ کے انتقال پُر ملال کے فوری بعد ہی نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن نہ صرف خلافت راشدہ کے دور میں بلکہ بعد ازاں عام مسلمان بادشاہوں کے دور میں بھی اِن کے خلاف جہاد اور قتال کیا گیا اور اللہ کی لعنت کے مستحق اِن کاذبین کو بدترین انجام سے دوچار کیا گیا۔ بدقسمتی سے بدنصیب اور بد بخت مرزا غلام احمد (لعنۃ اللہ علیہ) نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو ہندوستان میں انگریز حکمران تھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں نے جس جذبہ حُریت کا مظاہرہ کیا تھا اُس نے انگریزوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ چالاک اور عیار انگریز یہ جان گیا کہ ہندوستان میں اپنے اقتدار کو مضبوط، مستحکم اور پائیدار بنانے کے لیے مسلمان کو دبانا اور اُس کے جذبہ جہاد کو کچلنا لازم ہوگا۔ قادیان سے اُٹھنے والے فتنے کے بارے میں تجزیہ نگاروں اور مؤرخین کی دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی تخم ریزی ہی انگریز نے کی تھی اور یہ پودا آغاز سے ہی انگریز کا لگایا ہوا تھا اور دوسری یہ کہ جب مرزا غلام احمد قادیانی جہاد کی فرضیت کا انکاری ہوا تب انگریز نے اُسے گود لے لیا اُس کا پشتیبان بن گیا، اس لیے کہ انگریز اپنے اقتدار و اختیار اور بے مہار قوت کے باوجود مسلمان کے جذبہ جہاد سے خوفزدہ اور لرزاں رہتا تھا۔ حکمرانوں کی پشت پناہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاذب و مرتد مرزا بہت دلیر ہو گیا اور اُس نے صحابہ کرام اور اہل بیت رضی اللہ عنہم کے بارے میں بیہودہ گوئی بھی کی اور غیر شائستہ تحریریں بھی لکھ ڈالیں۔ اور اپنے بارے میں وہ کچھ کہہ دیا کہ کسی بدنصیب کی مت ماری گئی ہو اور اُس کی آنکھوں پر جہالت کے دبیز پردے پڑ گئے ہوں تو بات

لک ہے وگرنہ ایک عاقل و بالغ اور غور و فکر کرنے والا انسان محسوس کرے گا کہ اِس شخص کا دماغی
ازن درست نہیں رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان
عرصِ وجود میں آئی تھی، تو مسلمان حکمران اِس شجرِ خبیثہ کو جڑ سے کاٹ دیتے۔ انگریز کے دور میں
ادیانیت قبول کرنے والوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جاتا، اور آئندہ سے اسلامی ریاست
کستان کے کسی مسلمان شہری کو قادیانیت اختیار کرنے پر مرتد قرار دے کر اسلامی شریعت کے
طابق اُس کی سزا نافذ کی جاتی۔ لیکن بدقسمتی سے حکمران اپنا یہ دینی فریضہ ادا نہ کر سکے، بلکہ ایک
امور قادیانی کو پاکستان کا وزیر خارجہ بنا دیا گیا اور وہ خفیہ طور پر اور کھلم کھلا قادیانیت کو پھلنے پھولنے
یں مدد دینے لگا۔ 1974ء میں جب پاکستان کی قومی اسمبلی میں جماعت احمدیہ کے سربراہ کو اپنا
موقف بیان کرنے کا موقعہ دیا گیا جس میں اُس نے اقرارِ جرم کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہم مرزا
غلام احمد کو نبی مانتے ہیں۔ اِس پر عوام کی نمائندہ اسمبلی نے اُنہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا اور
اُن کے مسلمان کہلوانے اور لکھنے پر آئینی طور پر پابندی لگا دی گئی۔

ہمیں قادیانیت کو موضوع گفتگو بنانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ حال ہی میں
ایک جماعت کے قائد نے آئین کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے برملا اعلان کیا ہے کہ وہ
قادیانیوں کو مسلمان سمجھتا ہے اور وہ اُن کے سربراہِ جماعت کی وفات پر تعزیت کر چکا ہے، اگر کوئی
اِسے کفر کہتا ہے تو میں اس کفر کا اعادہ کرتے ہوئے دہراتا ہوں کہ میں قادیانیوں کو مسلمان سمجھتا
ہوں۔ ہم اُن کے اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے کہ اس کے لیے فتویٰ کا انداز اور زبان اختیار
کرنا پڑے گی اور ہم فتویٰ دینے کے اہل نہیں، جس کا کام اُسی کو ساجھے کے مصداق یہ مفتیان کرام
کا فریضہ ہے، وہ اس فریضہ کی ادائیگی کریں یا غفلت برتیں بہرصورت وہ اللہ رب العزت کو جوابدہ
ہیں۔ البتہ ہم اس جماعت کے کارکنان اور وابستگان کی خدمت میں عرض کرنا اپنا دینی ملی اور قومی
فریضہ سمجھیں گے کہ اپنے قائد کی اطاعت اور فرمانبرداری ایک پسندیدہ اور قابل تعریف عمل ہے
بشرطیکہ وہ اللہ اور رسول کے احکامات کے خلاف نہ ہو۔ ایک حدیثِ مبارکہ کا مفہوم ہے کہ مخلوق کی
فرمانبرداری خالق کی معصیت کر کے نہیں کی جا سکتی۔ صرف انبیاء اور رُسل معصوم ہوتے ہیں، باقی
سب سے خطا اور غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے، ہم جماعت، تنظیم اور
گروہ کے سربراہ کو قائد تو کہہ سکتے ہیں، لیکن یہ محدود معنی اور محدود مقاصد کے حوالہ سے ہوتا ہے۔

محمد علی جناح کو قائداعظم کہہ دیتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں اس لیے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے محض سیاسی قائد تھے۔ یعنی وہ مخصوص مسلمان جو ایک مخصوص جگہ پر رہتے تھے اُنہوں نے محمد علی جناح کو اپنے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے اپنا لیڈر تسلیم کرلیا۔

حقیقت میں ماضی، حال اور مستقبل کے تمام مسلمانوں کے، چاہے وہ دنیا کے کسی کونے میں تھے اور ہیں، اصلی، حقیقی، ابدی اور واحد رہنما اور قائداعظم تو حضورِ انور محمد ﷺ ہیں۔ بلکہ وہ تو بنی نوع انسان کے محسن اور رحمت للعالمین ہیں۔ یہ تو غیر مسلموں کی بدنصیبی ہے کہ وہ اُنہیں پہچان نہ سکے۔ ہماری رائے میں مسلمان جب یہ کہے کہ ''قائد کا جو غدار ہے۔ موت کا وہ حقدار ہے'' تو قائد سے مراد صرف حضور ﷺ کی ذاتِ مبارک ہونا چاہیے، کیونکہ نچلی سطح کے محدود معنی میں پکارے گئے سب قائدین خطا کے پتلے ہیں۔ اُن سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، اُن سے الگ ہوا جاسکتا ہے اور اگر وہ راہِ راست پر نہ آئیں، تو اُن کے خلاف مورچہ زن ہوا جاسکتا ہے، جبکہ حضورؐ کے کسی حکم کو دلی آمادگی سے قبول نہ کرنا بھی ایمان کی موت کا باعث بن سکتا ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کا اصلی نعرہ یہ ہونا چاہیے: حضورؐ کا جو غدار ہے، موت کا حقدار ہے!



ہم سب زرداری ہیں؟

مقولے اور محاورے انسانی زندگیوں کے نچوڑ ہوتے ہیں اور اجتماعی دانش کا اظہار ہوتے ہیں۔ یہ ضرب الامثال علاقائی بنیادوں پر حالات اور ماحول کی بنیاد پر بھی وجود میں آتے ہیں اور یونیورسل بھی ہوتے ہیں، اور معاشرہ بلاتفریق انہیں قبول کر لیتا ہے اور اگر کسی الہامی کتاب یا دینی شخصیات کی کسی بھی انداز کی تائید مل جائے تو یہ عوام کے ایمان کا جز بن جاتے ہیں۔ ایک پرانا مقولہ ہے کہ انسان اور معاشرے غلطیوں کے ارتکاب کرنے سے تباہ نہیں ہوتے بلکہ غلطیوں پر اصرار کرنے سے تباہ ہوتے ہیں۔ انسان کی فطرت، جبلت اور ہیئت کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ مقولہ بڑا معقول نظر آتا ہے۔ انسان کے ظاہر اور باطن پر نسیان کا غلبہ ہے لیکن خالق کائنات نے اِسے عقل، شعور اور تجزیہ کی صلاحیت بھی عطا کی ہے اور فیصلہ کرنے کی آزادی بھی دی ہے۔ لہٰذا اس دنیا کا پہیہ چلائے رکھنے کی یہی بہترین اور مکمل عملی صورت تھی کہ معافی اور تلافی کا موقع بھی فراہم کیا جائے اور کوئی آخری حد بھی قائم کی جائے۔ آج ہم پاکستان میں فرد، معاشرے اور ریاست کی سطح پر اس مقولے کی زد میں ہیں۔ ہم غلطیوں کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں لیکن لوٹنے اور پلٹنے کی راہ نہیں پا رہے یا نہیں پانا چاہتے۔ للّٰہیت، روحانیت، اور آخرت کا تصور تو مغرب میں دجالی فتنے نے تہذیبِ نو کا لبادہ اوڑھ کر کب کا ختم کر دیا ہوا ہے۔ اب اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی روشن خیالی، اعتدال پسندی اور لبرل سوچ جیسی خوبصورت اصطلاحات وضع کر کے مذکورہ تصور سے جان چھڑانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مزید برآں یہ کہ جہاد و قتال کی قبر کھود کر صوفی ازم کی چادر چڑھا دی جائے تاکہ اسلام پسند بھی خوش و خرم رہیں اور گلشن کا کاروبار بھی چلتا رہے۔

غلطیوں پر اصرار کے حوالہ سے ہم شخصی مثال قارئین کے سامنے صدر آصف علی

زرداری کی لائیں گے، کیونکہ آج کل وہ اس حوالہ سے زبانِ خلق پر عام ہیں۔ مسئلہ ججوں کی بحالی کا ہو یا این آر او کا، زرداری صاحب سو جوتوں کے ساتھ سو پیاز کا اہتمام باقاعدگی سے کر رہے ہیں۔ وہ بڑی آن بان شان کے ساتھ جمہوری طریقے سے صدر منتخب ہوئے، لیکن جس حالت کو ڈکٹیٹر پرویز مشرف 8 سال بعد پہنچا تھا، وہ ہائی جمپ لگا کر ایک سال میں ہی غیر مقبولیت اور ناپسندیدگی کے اُس مقام تک پہنچ گئے ہیں، لیکن سترھویں ترمیم کا مسئلہ ہو یا لاپتہ افراد کی گمشدگی کا وہ وہی انداز اپنا رہے ہیں کہ مجھے دیوار سے لگا کر یا زمین پر پٹخ کر اور ذلیل و رسوا کر کے جو چاہو کرالو، سیدھی اُنگلیوں گھی نکلے یہ اُن کی لغت میں نہیں ہے۔ اُنہیں دوستوں دشمنوں سب نے سمجھایا اور بجھایا کہ کرپشن کا اتنا تسلسل نہیں چلے گا اور اَت خدا دا ویر ہوتا ہے لیکن وہ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کا نعرہ لگا کر کرپشن کے ''بحر غلاظت'' میں ڈوبے جا رہے ہیں۔

آصف زرداری کے بارے میں ڈھٹائی اور غلطیوں کے اصرار کے حوالہ سے اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں ذرا رکیے! چلتی زبانوں اور پھسلتے قلم کو بریک لگائیں۔ آیئے، ذرا ہمت کر کے اپنے گریبان میں جھانکیں، ہمیں ایک چھوٹا سا آصف زرداری نظر آئے گا۔ جی ہاں ہم میں اکثریت کے اندر ایک آصف زرداری چھپا بیٹھا ہے اور بحیثیت قوم ہم غلطیوں کے ارتکاب اور اِن پر اصرار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی خود احتسابی کے لیے تیار نہیں، فرد نہ معاشرہ نہ ریاست، پھر سب کا مقدر یکساں کیوں نہ ہوگا؟ ہمارا اولین گناہ یہ تھا کہ ہم نے وطن کی بنیاد پر قومیت کی کامل نفی کر کے ہندوستان کو کاٹ کر پاکستان معرضِ وجود میں لائے تھے، لیکن پھر اُسی نظریہ کی نفی کرتے ہوئے پاکستانی قومیت کا واویلا کرنے لگے۔ ہم نے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی دھمکی پر قرار دادِ مقاصد منظور تو کر لی لیکن اُسے کبھی operative نہ ہونے دیا۔ سیاست دانوں نے اسلام کو اقتدار کے لیے سیڑھی کے طور پر تو استعمال کیا لیکن وہ اُسے ملک میں نافذ کرنے کے لیے کبھی سنجیدہ نظر نہ آئے۔ پاکستان کے قیام کے پچاس سال بعد ہمیں یاد آیا کہ پاکستان کا مطلب کیا: لا الہ الا اللہ کا نعرہ تو چند چھوکروں نے لگایا تھا۔ دکھ اور رنج کی بات تو یہ ہے کہ مذہبی، سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ وہ بطور انتخابی نشان تو کتاب لینا پسند کرتے ہیں لیکن خود منتخب ہو کر کتاب کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔ ہماری حکومتیں سود کو جاری و ساری رکھنے کے لیے عدالتی جنگ لڑتی ہیں اور عدالتیں حکومتی خوشنودی کے لیے فیصلے کو سرد خانے میں

ڈال دیتی ہیں۔ ہم تحریکِ نظام مصطفیٰ چلاتے ہیں لیکن بھٹو کو رخصت کر کے پوچھتے ہیں کون سا نظامِ مصطفیٰ؟ قصہ کوتاہ اپنی بنیادوں پر کلہاڑا چلانے کا ایک سلسلہ ہے جو رکنے کو نہیں آ رہا۔ آصف زرداری نامی ایک شخص غلطیوں کے اعادے سے اگر کھائی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے تو مسلمانانِ پاکستان اللہ سے اپنے کیے گئے عہد سے انحراف کے تسلسل سے ترقی اور خوشحالی کی منازل کس طرح طے کر لیں گے اور اہم ترین بات یہ ہے کہ روزِ محشر کس تاویل یا عذر کا سہارا لے سکیں گے؟

قارئین کرام! معاشرہ اور ریاست افراد کی اجتماعی ہیئت کو کہتے ہیں اور کیا خوب کہا ہے مصور پاکستان حضرت علامہ اقبال نے

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

آیئے! اپنے اندر سے زرداری نوچ پھینکیں، سابقہ غلطیوں پر اللہ سے معافی مانگیں، وہ بڑا غفور و رحیم ہے، اور عہد کریں کہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو قلبی اور ذہنی طور پر تسلیم کریں گے، اللہ کے رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں گے اور کتابِ مبین کو اپنا امام بنا کر صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے پاکستان میں اسلام کے عادلانہ نظام کو نافذ کریں گے۔ یہی راستہ مملکتِ خداداد پاکستان کو استحکام کی طرف لے جائے گا اور یہی ہماری دنیوی اور اُخروی نجات کا باعث بنے گا۔ زرداری کسی شخص کا نہیں ایک کردار کا نام ہے۔ زرداری کے انجام سے بچنے کے لیے زرداری والے کام چھوڑنے ہوں گے۔ یاد رکھیے، اللہ کی رضا اور اُس کا غضب ناموں اور عہدوں سے نہیں، نیت اور اعمال کے مطابق ہے۔ مزید برآں یہ کہ دنیوی عذاب میں گندم کے ساتھ گھن بھی پس جایا کرتا ہے۔ البتہ اُخروی اعتبار سے معاملہ انفرادی ہے۔ اگر دوسرے راہ راست پر نہیں آتے تو ہر شخص خود کو راہ راست پر رکھنے کی بھرپور کوشش کرے تاکہ ابدی زندگی میں تو فوز و فلاح کا مستحق ٹھہرے۔ وما علینا الا البلاغ!



نفرت کیوں؟

پاکستان میں امریکی سفیرہ محترمہ ڈبلیو این پیٹرسن نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ ہم پاکستان کو اتنی امداد دیتے ہیں، پھر بھی حیرت ہے کہ پاکستانی ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ یہی بات کچھ مختلف انداز میں امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے پاکستان کے دورہ کے دوران کہی۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ امریکی قیادت پاکستانیوں کی روز بروز بڑھتی نفرت کی وجہ کیوں نہیں سمجھ پا رہی۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر اُمت مسلمہ خصوصاً پاکستان کے بارے میں امریکہ اپنی پالیسیوں میں کوئی یوٹرن نہیں لیتا تو اگر امریکہ اپنے پورے خزانہ کا منہ پاکستان کی طرف کھول دے تب بھی امریکہ کے لئے پاکستانیوں کی نفرت میں کمی نہیں آئے گی۔ اُمتِ مسلمہ کے دکھوں کی کہانی تو بڑی طویل ہے اور گلے شکوے کی طویل فہرست ہے۔ اُسے ایک مضمون میں سمویا نہیں جا سکتا۔ ہم یہاں صرف پاکستان کے حوالے سے امریکی رویے کا ذکر کریں گے۔

پاکستان کی امریکہ کے بارے میں مایوسی کا آغاز 1962ء سے ہوا جب انڈیا چائنا سرحدی جھڑپوں کو عذر بنا کر امریکہ نے بھارت میں اسلحہ کے ڈھیر لگا دیئے۔ کشمیر کی سرحد اس وقت بھارتی افواج سے بالکل خالی تھی۔ پاکستانی افواج کو کشمیر میں واک اوور مل سکتا تھا لیکن امریکہ نے فوجی آمر ایوب خان کو کسی قسم کی کارروائی سے روک دیا۔ پاکستانیوں نے محسوس کیا کہ کشمیر جس کو قائداعظم نے پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا، اُسے حاصل کرنے کا سنہری موقع امریکی مداخلت کی وجہ سے کھو دیا گیا ہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ میں امریکہ نے پاکستان کو اسلحہ کی فراہمی روک کر پاکستانیوں پر دوسری ضرب لگائی۔ پاکستانیوں کے لئے یہ انکشاف بھی انتہائی کربناک تھا کہ 1971ء میں پاکستان کو دولخت کرنے میں امریکہ نے کلیدی کردار ادا کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ انکشاف اُس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے خود اپنی کتاب میں کیا جو چند سال پہلے شائع ہوئی ہے۔ سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے ایک بار پھر دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ پاکستان نے ماضی کو فراموش کر کے پُر جوش طریقہ سے تعاون کیا لیکن اپنے دشمن سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد امریکہ جس طرح پاکستان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلتا بنا، پاکستانی اس بے مروتی کو کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ پاکستانیوں کی امریکہ سے نفرت اُس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب امریکہ نے پاکستان کے ایٹمی تجربات کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کے لوگ بھولے اور سیدھے ضرور ہیں، احمق نہیں۔ وہ پاکستان کے ایٹمی اثاثہ جات کے بارے میں امریکی رویے اور طرز عمل کا نوٹس لے رہے ہیں۔ آخری بات جس نے پاکستان اور امریکہ کی راہیں جدا کر دیں، امریکہ کا افغانستان اور عراق پر حملہ، بش کا جنگ کے آغاز پر کروسیڈ کی اصطلاح استعمال کرنا اور عرب اسرائیل تعلقات میں امریکہ کا ڈنڈی مارنا ہے۔ یہ ایسے افعال ہیں کہ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستانی دنیا بھر میں امریکہ کو اپنا بدترین دشمن گردانتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں امریکی ڈرون حملے اس نفرت میں مزید شدت پیدا کر دیتے ہیں۔ نائن الیون کے سانحہ میں کوئی افغانی ملوث نہیں تھا، پھر بھی امریکہ نے افغانستان میں اُبھرتی اسلامی حکومت کو تہس نہس کر دیا۔

اب جبکہ امریکہ افغانستان میں بُری طرح پھنس گیا ہے تو بجائے اس کے جرأت مندانہ انداز میں اپنی شکست کو تسلیم کرے اور واپس لوٹ جائے اپنی بلا پاکستان کے سر تھوپنا چاہتا ہے۔ پشاور اور اسلام آباد میں رسوائے زمانہ تنظیم بلیک واٹر کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ امریکہ پاکستان میں کسی بڑی واردات کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے۔ پاکستانیوں کی رائے میں امریکہ پاکستانی حکومتوں کو ڈالروں کا لالچ اپنے ہی شہری مارنے پر مجبور کر رہا ہے۔ جہاں تک اُس کی امداد کا تعلق ہے وہ بھی عام شہری تک نہیں پہنچتی۔ درحقیقت بدعنوان قیادت کو کھلا پلا کر امریکہ اس خطے میں اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قیادت کی بدعنوانیوں کا بوجھ عام شہری کے کاندھوں پر منتقل ہو جاتا ہے۔ جب IMF کی طرف سے بجلی کے بل بڑھانے کا مطالبہ آتا ہے تو عوام کے غیظ و غضب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ کو اگر پاکستانیوں کے دل جیتنے ہیں تو اُنہیں اپنے رویے میں

ہمالائی تبدیلی لانی ہوگی۔ اُنہیں جہاں اپنے سٹریٹیجک مفادات کا تحفظ رکھنا ہوگا وہاں پاکستان کی حکومتوں کی بجائے پاکستان کے 18 کروڑ عوام کے مفادات کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت یکسر بند کرنا ہوگی۔ امریکہ پاکستان کو مالی امداد دینے کا پابند نہیں لیکن اگر مالی امداد کا کوئی معاہدہ طے پائے تو اُسے باوقار اور باعزت طریقہ اختیار کرنا ہوگا اور اگر وہ پاکستان سے دوستی کا دعویدار ہے تو اُسے اپنے دوست کے بارے میں مہذب زبان اختیار کرنی چاہیے۔ یہ دستاویز دوستی ظاہر کرے نہ کہ غلامی کا طوق بنا کر پاکستانیوں کے گلے میں ڈال دی جائے۔ پھر یہ کہ بھارت اور پاکستان سے یکساں سلوک کرنا ہوگا۔ اُسے مشرقِ وسطیٰ میں قیام امن کے لئے عدل کے تقاضے پورے کرنا ہوں گے۔ ایٹمی اسلحہ اگر عالمی امن کے لیے خطرہ ہے تو صرف پاکستان کے ایٹمی اثاثہ جات کے پیچھے ہاتھ دھو کر نہ پڑے، ساری دنیا کو اس خوفناک ہتھیار سے پاک کرنے کی مہم چلائے اور خود اس سلسلے میں پہل کرے۔ اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایشیائی لوگ اس خطرناک ہتھیار کو سنبھالنے کے قابل نہیں تو سارے جنوبی ایشیا سے اسے پاک کرے۔ صرف پاکستانی ایٹم بم کو اسلامی بم کا نام دے کر اس کے خلاف میڈیا میں مہم چلانے سے تو پاکستانیوں کا دل جیتا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک امریکہ کے دماغ سے عالمی تھانیدار بننے کا خناس نہیں نکلتا، دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

✿✿✿

N.D.WیاN.R.O

ایک اسلامی ریاست میں عدلیہ یقیناً فعال ترین ادارہ ہوگا۔ عدلیہ آزاد اور مستحکم ہونے کے علاوہ بیدار اور چوکنا بھی ہوگی۔ اُس کا رویہ حکمران اور عام آدمی کے لیے مساوی ہوگا۔ اُس کے دروازے سب پر کھلے ہوں گے۔ یعنی قانون اندھا ہوگا لیکن انصاف ہوتا نظر آئے گا اور بلا امتیاز ہوگا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسری نظیر پیش کی جاسکے کہ اقلیتی مذہب سے تعلق رکھنے والا ایک شہری مسلمان حاکمِ وقت کو عدالت میں طلب کروالے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ قاضی غیر مسلم کے حق میں فیصلہ دے اور مسلمان حکمران اُسے بلا چون و چرا تسلیم کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں سے عدل کو نکال دیا جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ عدل بنا اسلام ایک بے روح جسم ہے، ایک ایسا ڈھانچہ جسے اُس کی جوہری قوت سے محروم کر دیا گیا ہو۔ اللہ ربّ العزت نے قرآن مجید میں بدترین گناہ شرک کو عظیم ظلم قرار دیا ہے۔ ظلم عدل کا مقابل اور متضاد لفظ ہے۔ گویا عدل اجتماعی اور معاشرتی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہی نہیں فرد کے عقائد کی درستگی کے لیے بنیاد کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں عدل انسان کو صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ اور اُس کا پسندیدہ دین اسلام حصولِ تقویٰ کو انسانی زندگی کا حاصل یا ہدف قرار دیتا ہے۔ اب کتنی غیر حقیقی اور مضحکہ خیز ہوگی یہ بات کہ فلاں شخص انتہائی صالح نیک اور متقی پرہیزگار ہے، اگرچہ وہ عادل نہیں ہے۔ گویا یہ کہنا بلا جواز نہیں ہے کہ عدل اسلام کی جوہری قوت ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر نیکی کا کسی نہ کسی طرح عدل سے تعلق جُڑ جاتا ہے اور ہر بدی اور شر کا ظلم سے تعلق بنتا نظر آئے گا۔ لہٰذا غیر عادل شخص قانونی طور پر مسلمان تو ہوسکتا ہے لیکن اسلام سے اُس کا حقیقی اور معنوی رشتہ منقطع ہو جاتا

ہے۔ زیادہ احتیاط برتنی ہو تو کم از کم یہ ضرور کہا جائے گا کہ اُس کا اسلام سے رشتہ بہت کمزور اور ثانوی درجہ کا ہے۔

عدل جرأت کا متقاضی ہے۔ کسی بزدل انسان کا عادل ہونا ناممکن نہ سہی انتہائی مشکل ضرور ہے۔ وہ زور آور استحصالی قوتوں کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ اور جرأت تو رندانہ بھی ہو تو بار آور ہوتی ہے۔ اس حوالہ سے مغرب اور امریکہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ وہاں عدل چونکہ قومیت اور کسی حد تک مذہب سے بالاتر نہیں ہو سکا لہٰذا وہ صرف قومی اور ملکی سطح پر اُس کے فوائد سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ مغرب اور امریکہ چونکہ عدل کو گلوبلائز نہیں کر سکے لہٰذا دوسری اقوام اور ممالک پر اُنہوں نے غلبہ تو حاصل کیا ہے لیکن عزت و احترام اور دلی محبت اور الفت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں، بلکہ دشمنی اور نفرت کا دائرہ وسیع کیا ہے۔

ہم نے اسلام اور عدل کا قصہ اس لیے چھیڑ لیا کہ ہم سے پرزور مطالبہ تھا کہ N.R.O پر قلم درازی کریں۔ وہ N.R.O جسے آخری عمر میں اور بڑھاپے کے عالم میں لاوارث چھوڑ دیا گیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جنہوں نے اس فولادی قلعہ میں پناہ لی ہوئی تھی وہ بھی نہ صرف یہ کہ ہجرت کر گئے بلکہ اُس پر سنگ باری کرنے والوں میں شامل ہو گئے ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

N.R.O یعنی قومی مفاہمتی آرڈیننس کیا ہے؟ کچھ مالدار اور بااختیار لوگوں نے اپنے اختیارات اور قوت کا غلط استعمال کرتے ہوئے ملک میں سرکاری وسائل کی لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کی تھی، ایک دوسرے طاقت ور نے بندوق کے زور پر اُن سے اقتدار و اختیار چھین لیا، اُنہیں جیل بھیج دیا یا ملک بدر کر دیا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ وہ بندوق بردار خود کمزور ہو گیا، اقتدار اُسے ہاتھ سے پھسلتا نظر آیا تو اُس نے اپنے اقتدار کو سہارا دینے کے لیے اُن راندۂ درگاہ لیڈروں میں سے کچھ کے ساتھ صلح صفائی کر لی۔ ایک قانون بنا دیا گیا کہ پچھلا کھایا پیا اور خون خرابہ سب معاف۔ آؤ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر خورد و نوش کے سلسلے کا از سرِ نو آغاز کریں۔ اس قانون کو N.R.O کا نام دیا گیا، حالانکہ اس کا نام N.D.W یعنی نیشنل ڈیتھ وارنٹ ہونا چاہیے تھا۔ ہم اس پر کیا تبصرہ کریں، ہمیں تو یہ سمجھ نہیں لگ رہی کہ بدنامی اور رسوائی میں کون سی کسر باقی رہ گئی تھی جو اس سیاہ قانون سے پوری کی گئی۔ کم از کم دورِ حاضر میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم

نے یوں کھلم کھلا اپنے چہرے پر کالک لگائی ہو۔ ہم تو صرف اس پر یہ تبصرہ کر سکتے ہیں کہ جس کتاب میں یہ قانون درج ہوگا اُسے کسی گلشن میں رکھ دیں، خزاں اُس کا مقدر بن جائے گی اور بہار کبھی لوٹ کر نہ آئے گی، سمندر میں بہا دیجئے تو سونامی کا باعث بنے گا، کسی پہاڑ پر رکھ دیں شرم سے دب اور پھٹ جائے گا، صحرا جل اُٹھے گا، جنگل کا بادشاہ دھاڑے گا کہ یہی ہے ناں وہ لوگ جو جنگل کے قانون کا طعنہ دیتے تھے، اب ہم شہر کے قانون کا طعنہ دیں گے۔ اندازہ کریں کتنی پائیدار اور سخت جان ہے پاک سرزمین جس نے اس قانون کو جنم دیا اور اس کے باسیوں کی حساسیت کا اندازہ کریں کہ ایسے قانون کے ہوتے ہوئے جیتے جاگتے اور اچھلتے کودتے ہیں۔ سپریم کورٹ کے فیصلہ پر ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ ع بہت دیر کی مہربان آتے آتے۔ بہرحال دیر آید درست آید کے مصداق ہم پوری قوم کو سپریم کورٹ کے اس فیصلہ پر مبارک دیتے ہیں اور ساری قوم خصوصاً مقتدر طبقات سے گذارش کریں گے کہ عدل تو ایک Bi-Product ہے، اُس گراں قدر اور بے قیمت نظام کو سمو چا اپنائے بغیر اندرونی و بیرونی دشمنوں میں گھرے ہوئے اس ملک کو بچانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے عدل جس کی جوہری قوت ہے۔ یقیناً اور لاکھ بار یقیناً اسلامی نظام ہی ایک ایسا نسخہ کیمیا ہے جو امت مسلمہ کو ذلت و رسوائی اور ظاہری و باطنی بیماریوں سے نجات دلا سکتا ہے۔



اسلام اور امن

پیغمبر اسلام پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔ یعنی عربی اسلام کی سرکاری زبان ہے۔ عربی کے اکثر الفاظ سہ حرفی مادہ سے بنتے ہیں۔ لفظ ایمان کا سہ حرفی مادہ امن ہے یعنی ایمان امن سے بنا ہے۔ قرآن مجید کا بنی نوع انسان سے پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے ہر ہر حرف اور لفظ پر دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے اور زبان سے اس کا اقرار کرے۔ ایسا کرنے والا مسلمان کہلائے گا۔ قرآن پاک میں اللہ کے مبارک ناموں میں دو نام السّلام اور المومن بھی ہیں، السلام کا ایک معنی سلامتی دینے والا ہے، دوسرا نام المومن امن سے مشتق ہے جس کے معنی خوف سے محفوظ ہونا ہے۔ مومن وہ ہے جو دوسرے کو امن دے۔ اللہ اس معنی میں المومن ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے۔ گویا مسلمان وہ ہے جو خود اور دوسروں کو امن اور سلامتی دے، اور اسلام ایسا دین ہے جو ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس میں امن بھی ہو اور جو سلامتی کا باعث بھی بنے۔

یہاں ایک وضاحت از حد ضروری ہے۔ اسلام محض ایک مذہب نہیں، ایک دین ہے جو مکمل نظامِ حیات رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ محض اخلاقیات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ شریعت کے نام سے مکمل قانونی ڈھانچہ بھی رکھتا ہے۔ امن و سلامتی کا زبردست پرچارک ہونے کے باوجود اسلام بنیادی تقاضوں سے انحراف پر نہ صرف کسی قسم کا سمجھوتا نہیں کرتا بلکہ قانون کو پوری قوت سے متحرک کرتا ہے۔ اسلام میں یہ تصور نہیں ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسار پر تھپڑ مارے تو اُس کے سامنے دوسرا رخسار کر دو۔ ہاں معافی اور تلافی کا تصور ہے اور متاثرہ فریق اپنے قانونی حق کو استعمال کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے، لہٰذا اس میں مکمل قانون سازی انسان کے فطری تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔ اسلام آزادی کا قائل ہے لیکن مادر پدر آزادی کو امن اور سلامتی کے لیے زہر قاتل گردانتا ہے۔ مثلاً ''لا اکراہ فی الدین'' کے قرآنی ضابطے کے مطابق آپ کسی کو زبردستی یعنی گن پوائنٹ پر مسلمان نہیں کر سکتے، لیکن جب ریاست کا کوئی شہری رضا و رغبت سے مسلمان ہو جائے تو اُسے اسلامی شریعت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا، کم از کم ارکانِ اربع کی سختی سے پابندی کرنی ہوگی۔ اسلام دین کو مذاق بنانا قطعی طور پر پسند نہیں کرتا اور واپسی کا کوئی راستہ نہیں دیتا، لہٰذا مرتد کی سزا قتل مقرر کی گئی۔ بنی نوع انسان کو ایک مستقل اور اٹل اصول عطا فرمایا گیا اور وہ ہے: ''لا طاعة المخلوق فی معصیة الخالق'' یعنی مخلوق میں سے کسی کی بھی ایسی اطاعت نہیں کی جا سکتی جس سے خالق کائنات اللہ رب العزت کی معصیت کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ مسلمان کے لیے ایک ایسے گھوڑے کی مثال بڑی مناسب رہے گی جسے 100 گز کی رسی سے کھونٹے سے باندھا گیا ہے۔ اب وہ کھونٹے کے اردگرد 100 گز تک جہاں چاہے بیٹھے، لیٹے یا دوڑے، لیکن وہ سو گز سے دور نہیں جا سکتا۔ اگر فطرت انسانی کا بغور جائزہ لیا جائے تو ہم لازماً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ مادر پدر آزادی معاشروں میں انتشار اور خلفشار پیدا کرتی ہے، جبکہ ریاستوں کے امن و امان کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اسلام چونکہ ایک مکمل نظام رکھتا ہے لہٰذا وہ اس جدید تصور کو قبول نہیں کرتا کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہونا چاہئے اور مذہب شہری کا انفرادی مسئلہ ہے۔ اسلامی ریاست میں اقلیتوں کو جان مال کا مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے، اُنہیں اپنے مذہبی فرائض کی ادائیگی کی مکمل اور کھلی اجازت ہوتی ہے۔ مسلمانوں سے زکوٰۃ اور غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے۔ شہری مسلمان ہو یا غیر مسلم، ریاست اُس کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کے پابند ہوتی ہے۔ ہر نظام کا ایک کیچ ورڈ ہوتا ہے۔ اسلام کا کیچ ورڈ عدل ہے، یعنی اسلامی نظام کی بنیاد عدل پر ہے۔ یہ اسلامی نظام کی برکات ہیں کہ ایک غیر مسلم شہری اسلامی ریاست کے مسلمان خلیفہ وقت کو عدالت میں طلب کروالیتا ہے۔ اور جب قاضی خلیفۂ وقت کے خلاف فیصلہ صادر کرتا ہے تو وہ اُسے من و عن تسلیم کرتا ہے۔

یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ قوانین اگر انسانی فطرت کے مطابق ہوں اور مقتدر قوتیں انصاف پر کاربند ہوں اور اس معاملے میں اپنوں اور غیروں میں امتیاز نہ برتیں تو دنیا امن کا گہوارہ

بن جائے۔ آج کی دنیا کا المیہ کیا ہے۔ امن کا جتنا ڈھنڈورا آج پیٹا جارہا ہے پہلے کبھی اتنا شور و غوغا نہیں سنا تھا۔ کسی سپریم قوت کا یہ بیان اخبارات میں شہ سرخی بنتا ہے۔ ''دنیا کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے اپنے تمام وسائل بروئے کار لائیں گے۔'' کہیں امن کی آشا میٹھے میٹھے بولوں کے ساتھ برصغیر میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ لیکن دنیا خطرناک سے خطرناک ہوتی چلی جارہی ہے۔ جنگیں، خونریزی، قتل و غارت معمول بن چکا ہے۔ امن کی پکار اور صدا لگانے والے مصنوعی پن اور منافقت کا مظاہرہ کررہے ہیں۔ وہ ظلم، جبر اور قوت سے دنیا پر من چاہا امن مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ وہ انسانوں اور اقوام کے درمیان تفریق چاہتے ہیں۔ وہ دلوں کو فتح کرنے کے قائل نہیں۔ لہٰذا تمام کوششیں نہ صرف یہ کہ اکارت جارہی ہیں بلکہ انسانوں میں دشمنی نفرت اور انتقام کا جذبہ جنم لے رہا ہے۔ دنیا کو امن کا گہوارہ بنانا ہے تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطے نہیں چلیں گے۔ کائنات میں امن کے لیے کائنات کے خالق کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس نے اپنی آخری کتاب اپنے آخری پیغمبر کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دی ہے۔ جس میں دیا گیا ضابطہ حیات حتمی آخری اور اٹل ہے۔ اس میں ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں، اگرچہ جس قدر آزادی اور رعایت اُس فریم ورک میں رہتے ہوئے حاصل کی جاسکتی ہے وہ کی جانی چاہیے۔ یہ دنیا جو کبھی ملوکیت اور فرعونیت کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی تھی، حالات کے جبر سے سرمایہ دارانہ جمہوریت کی گود میں جا گری۔ پھر وقت کی ٹھوکروں نے اسے اشتراکیت کے سپرد کردیا، لیکن اشتراکیت محض ایک سہانا خواب ثابت ہوئی۔ پھر جمہوریت کی طرف لوٹی ہے لیکن سرمایہ دارانہ جمہوریت کی ناؤ بھی اب ظلم و ستم اور جبر و تشدد کے سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ لہٰذا دنیا اب چاہے بھی تو اُسے اسلام کے دامن کے سوا کہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ امن کا لازوال تحفہ صرف اور صرف اسلامی نظام دنیا کو پیش کرسکتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ یہ خالق کا عطا کردہ نظام ہے اور رب کی بستی میں رب کا نظام ہی کارفرما ہوگا تو امن اور سلامتی کا دور دورہ ہوگا۔



.....انجامِ گلستاں کیا ہوگا!

صدرِ پاکستان کو عدالتوں کا سامنا کرنے سے استثناء حاصل ہے۔ صدر کو یہ استثناء حاصل نہیں ہے۔ ہے اور نہیں ہے کا ملک بھر میں شور وغوغا ہے۔ آئینی اور قانونی ماہرین کے دلائل ٹکرا رہے ہیں۔ ہم آئینی ماہر نہیں ہیں کہ کسی فریق کی طرف سے میدان میں اتریں، البتہ ہم یہ جانتے ہیں کہ انبیاء اور رُسل کے علاوہ اس دنیا فانی میں کوئی معصوم نہیں ہے۔ اور انسان خطا کا پتلا ہے، نسیان انسانی فطرت کا لازمہ ہے، لہٰذا خدا فراموشی یا خود فراموشی جب بھی غالب آتی ہے تو گناہ اور غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ معروف طریقہ تو یہ ہے کہ اگر ناحق الزام لگے تو اُسے رد کرو اور وقت کی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ غلطی سرزد ہوگئی ہے تو قبول کرو، جرم کی نوعیت کے حوالہ سے معافی بھی مل سکتی ہے، تلافی بھی کی جاسکتی ہے اور سزا بھی بھگتنی پڑ سکتی ہے۔ لیکن کسی شخص پر الزام بلکہ الزامات لگیں اور وہ جواباً کہے یا اُس کی طرف سے کہا جائے کہ اس شخص کو تو استثناء حاصل ہے، عجب بے ہودگی ہے، مکمل طور پر نان سنس ہے۔ کیا استثناء کا یہ مطلب سمجھا جائے کہ فلاں شخص کو یا فلاں منصب دار کو جرائم کے ارتکاب کا لائسنس دے دیا گیا ہے؟ کیا بندوق کے لائسنس کی طرح جرم کا لائسنس بھی رکھا جاسکتا ہے اور تقسیم کیا جاسکتا ہے؟ جرم کرو اور لائسنس دکھادو، جیسے کار ڈرائیور ٹریفک انسپکٹر کو ڈرائیونگ لائسنس دکھاتا ہے۔ صدر زرداری کے دفاع میں اگر پاکستان پیپلز پارٹی کا کوئی جیالا یہ کہے کہ میری سرکار نے تو کبھی ایک پیسہ کی کرپشن نہیں کی تو مخالف فریق چاہے اس پر آسمان گرنے کا خطرہ محسوس کرے اس دفاع کو بے ہودگی اور غیر اخلاقی جواب قرار نہیں دے سکتا۔ بال عدالت کی کورٹ میں چلا جائے گا اور فیصلہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ الزامات کا جواب یہ دیں کہ ملزم کو استثناء حاصل ہے تو یہ جہالت، بے ہودگی اور غیر شرعی ہونے کے

ساتھ ساتھ اعترافِ جرم کے مترادف بھی ہے۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ صدر صاحب کی مشاورتی فوجِ ظفر موج میں قانون دان اور آئین شناس قطار اندر قطار موجود ہیں۔ اعتزاز احسن اور ڈاکٹر بابر اعوان سمندر پی جانے والوں کے ہونٹ خشک ثابت کر دیتے ہیں۔ اُنہوں نے صرف چند کروڑ فیس لے کر پنجاب بنک لوٹ لینے والوں کو معصوم ثابت کرنے کے لئے اپنی قانونی مہارت بلکہ جگری (Jugglery) کا مظاہرہ کر کے اٹھارہ کروڑ پاکستانیوں سے داد وصول کی ہے۔ پھر صدر صاحب کو ڈر کس بات کا ہے اور وہ استثناء کی چھتری کیوں استعمال کرنا چاہتے ہیں؟ اگر وہ سچے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ جلسوں میں آستینیں چڑھا چڑھا کر سازشیوں سے نمٹنے کا اعلان کریں، بڑھکیں ماریں، وہ عدالتوں کا رخ کریں۔ اُنہیں خوف کس بات کا ہے؟ بزرگوں نے کہا ہے سانچ کو آنچ کیا! ہاں صرف ایک بات ہے، ایک خوف ہے، اب انصاف کی کرسی پر ایک ایسا دیوانہ بیٹھا ہے جس نے وردی پوش جرنیل کو کہہ دیا تھا "میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا"۔

پارلیمانی نظام میں پارٹی کا سربراہ جیت جانے کی صورت میں وزیراعظم بنتا ہے، پاکستان سمیت تمام دنیا بھر میں یہی ہوتا ہے، لیکن آصف علی زرداری نے پارٹی کا شریک چیئرمین ہونے کے باوجود صدر بننا پسند کیا۔ یہ نکتہ یقیناً قابلِ غور ہے، کیا اُن کے دل میں چور تھا؟ وہ جانتے تھے کہ N.R.O جیسا احمقانہ، غیر منطقی اور غیر فطری آرڈیننس قانون نہ بن سکا تو اُن کے گلے میں پھندا پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا وہ صدر بن کر آرٹیکل 248 کی چھتری تلے پناہ لے لیں، اس لئے کہ وزیراعظم کو یہ تحفظ حاصل نہیں ہے۔



آخر کب تک؟

یہ نکتہ شاید تا قیامت لاینحل رہے کہ 1947ء سے پہلے جب ہم سیاسی، عسکری اور معاشی طور پر انگریز کے باقاعدہ غلام تھے، اُس وقت ذہنی طور پر ہم مغرب کے اتنے غلام اور لکیر کے فقیر نہیں تھے جتنے آج آزادی کے 62 سال بعد ہیں۔ اُس دور میں خصوصاً معاشرتی سطح پر ایک قلیل طبقے کو چھوڑ کر اس خطے کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت مغربی تہذیب اور طرز معاشرت کے قریب نہیں پھٹکتی تھی۔ آج مسلمانانِ پاکستان کی عظیم اکثریت معاشرتی لحاظ سے مکمل طور پر مغربی تہذیب کی لپیٹ میں ہے۔ معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے خواص ہی نہیں عوام کی سطح پر بھی اس قدر مرعوبیت ہے کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا، صرف دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ خود کو تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ ثابت کرنے کے لئے مغرب کی نقالی لازم سمجھی جاتی ہے۔ خواتین نے بے ہودہ اور نیم عریاں لباس کو فیشن کا نام دے دیا اور مرد نکٹائی پہن کر صاحب کہلوانے پر پھولے نہیں سماتے۔ ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر ہم معاشرتی حوالے سے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہیں گے، صرف سیاسی حوالہ سے ہی چند گزارشات کریں گے۔ مغرب کا سیکولر جمہوری طرز حکومت آج سکہ رائج الوقت ہے، لیکن دنیا کے مختلف ممالک نے اپنے حالات، ماحول، جغرافیائی ہیئت اور اپنی تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرزِ حکومت کو اپنی ضروریات کے تحت ڈھال کر اپنایا ہے۔ برطانیہ میں پارلیمانی نظام ہے۔ یورپ میں کہیں متناسب نمائندگی ہے، کہیں صدر اور وزیراعظم دونوں موجود ہیں اور اختیارات کی ایک خاص تقسیم ہے۔ چین اور روس بھی جمہوریت کے دعویدار ہیں، اگرچہ وہاں پر شہری حکومت سازی کے لئے ووٹ نہیں دے سکتے، صرف پارٹی کے ارکان ووٹ ڈالتے ہیں۔ لیکن ہم نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ آزادی کے بعد

اپنے سابقہ حکمرانوں کی طرح پارلیمانی جمہوری طرز حکومت کا ڈول ڈال دیا۔ اگرچہ یہی غلطی بھارت نے بھی کی لیکن بعض وجوہات کی بناء پر اُنہیں یہ غلطی اتنی مہنگی نہ پڑی۔ اولاً اس لیے کہ اُنہوں نے آزادی کے فوراً بعد جمہوریت دشمن جاگیرداری نظام کی جڑ کاٹ دی۔ ثانیاً یہ کہ جس طرزِ حکومت کو اُنہوں نے اپنایا یعنی جمہوریت وہ اس کے ساتھ مخلص رہے۔ بھارت کے سیاست دان بھاگ بھاگ کر جی ایچ کیو نہیں جاتے کہ مخالف سیاست دانوں کی شکایتیں لگائیں اور ثالثاً یہ کہ ہندو کے پاس اپنا کوئی نظام نہیں تھا، اسے کہیں نہ کہیں سے تو نظام مستعار لینا ہی تھا، لہٰذا سکہ رائج الوقت کو اپنے ہاں نافذ کرلیا جس سے اُنہیں دنیا کی مدد بھی دستیاب ہوگئی۔ لیکن ہم نے اُس کی بھی نہ سنی جنہیں ہم مصورِ پاکستان کہتے ہیں۔ جو اس دارِفانی سے کوچ کرنے سے پہلے کہہ گئے ع ''خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی''۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جمہوریت پر ایمان کے جتنے نعرے ہمارے سیاست دانوں نے مارے، یورپ اور امریکہ میں کسی نے نہیں مارے ہوں گے۔ ''جمہوریت ہماری سیاست ہے''، ''جمہوریت بہترین انتقام ہے''، ''بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے بہتر ہے''۔ ہمارے ہاں کسی چور ڈاکو بلکہ زانی اور قاتل کو اتنا قابلِ مذمت نہیں سمجھا جاتا جتنا جمہوریت کی شان میں گستاخی کرنے والے کو سمجھا جاتا ہے۔ اور عملاً جو سلوک ہم نے جمہوریت کے ساتھ کیا، اس پر مرحوم شورش کاشمیری نے آج سے 40 سال قبل اُس وقت کی سیاست دیکھ کر کہا تھا

مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو!
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں!

ذرا تصور کریں، شورش کاشمیری زندہ ہوتے تو آج پاکستان کی سیاست دیکھ کر کیا کہتے۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ کبھی وزیراعظم اور صدر تلواریں نکال کر میدان میں کود پڑتے ہیں، کہیں صوبے میں گورنر اور وزیراعلیٰ اکھاڑے میں اُترے ہوتے ہیں، کبھی جج کبھی جرنیل اور کہیں جرنلسٹ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ کبھی عدالت عظمیٰ کے جج چینی کا بھاؤ طے کرتے ہیں، کبھی جرنیل بلدیاتی نظام وضع کرتے ہیں۔ ایک افراتفری ہے، ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی ہے، کوئی اپنے کام کی طرف متوجہ نہیں، صرف دوسروں کی غلطیاں نکال رہا ہے۔ اقتدار اور وسائل کی بندر بانٹ کا انداز ایسا ہی ہے جیسے اندھا ریوڑیاں بانٹ رہا ہو۔ کسی انتہائی اہم اور حساس ذمہ داری

کے لئے انتخاب کرنا ہو تو سب سے بڑا میرٹ جیل کا ساتھی ہوتا ہے۔

آہ یہ اس قوم کے فرزندوں کا حال ہے۔ وہ قوم بھکاری بنی ہوئی ہے اور طرزِ حکومت اور نظامِ زندگی کی بھیک مانگتی پھرتی ہے جسے قرآن اور سنت رسول کی صورت میں مکمل نظام حیات دیا گیا ہے۔ بلاتشبیہہ عرض کئے دیتے ہیں اُس شخص کو کیا کہیے گا جو اپنے ہیرے، جواہرات کی کان کو تالا لگا دے، جو اپنے گھر کے نیچے بہتی دودھ اور شہد کی نہروں سے منہ پھیر لے اور کشکول پکڑے، گداگری کے لئے دوسروں کے در پر رُسوا ہو رہا ہو۔ کیا کہیں گے اُس شخص کو جو بغل میں کتاب رکھے اور ابوجہل کہلائے۔ کیا کہیں گے اس شخص کو جو روشنی کے مینار کی طرف پشت کر لے اور تاریکیوں میں ٹھوکریں کھا رہا ہو۔ دریا کے کنارے اگر کوئی پیاسا رہے تو کوئی اسے کیسے سیراب کرے گا؟

کب تک ہم حالات کا رونا روئیں گے، کب تک ہم نوحے پڑھتے رہیں گے، کب تک محض لعن طعن پر گزارا کریں گے، کب تک محض خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔ کب تک ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہیں گے۔ کب تک آسائشیں ہمارا دامن تھام کر ہمیں روکتی رہیں گی۔ کب تک ہم میدان میں اترنے سے کتراتے رہیں گے۔ کب تک ہم اس دقیانوسی نظام تلے پستے رہیں گے۔ کب تک ڈاکٹر عافیہ پکارتی رہے گی۔ کب تک ڈرون حملے ہمارا جسد لہولہان کرتے رہیں گے۔ کب تک ہماری غیرت وحمیت پر چرکے لگتے رہیں گے۔ کب تک ''ایڈ'' کے نشے میں ہم مدہوش رہیں گے۔ کب تک قدرت صرف نظر کرتی رہے گی، کب تک بکرے کی ماں خیر منائے گی۔ کب تک، آخر کب تک.....؟؟؟



تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ

امریکہ کا صدر منتخب ہوتے ہی اوباما کا یہ رجحان بڑا واضح نظر آیا کہ وہ امریکہ کے اندرونی مسائل خصوصاً معاشی صورتِ حال پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ اس ایجنڈے پر یکسوئی سے کام کرنے کے لیے ضروری تھا کہ امریکہ بیرونِ ملک جن مسائل میں پھنسا ہوا ہے، اُن سے نجات حاصل کی جائے۔ بش اینڈ کمپنی نے افغانستان اور عراق پر حملہ کر کے امریکیوں کی جان عذاب میں ڈالی ہوئی تھی۔ عراق میں Divide and rule کی پالیسی اپناتے ہوئے اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کو باہم تصادم کی راہ پر ڈال کر امریکہ کسی قدر کامیابی حاصل کر چکا تھا لیکن افغانستان کا کانٹا امریکی حلق میں بُری طرح پھنسا ہوا تھا، جسے وہ نہ نکال پا رہا تھا اور نہ نگل جانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ اگر صدر اوباما اپنی ذاتی سوچ اور خواہش کی تکمیل کی قوت رکھتا اور صحیح معنوں میں مقتدر اور بااختیار صدر ہوتا تو وہ افغانستان کے حوالہ سے کیا پالیسی بناتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اوباما تو بہت سی وجوہات کی بنا پر ایک کمزور سیاہ فام صدر ہے۔ کوئی مضبوط سیاسی کیریئر کا حامل سفید فام صدر بھی یہودی شکنجہ سے آزاد ہو کر اپنی انڈی پینڈنٹ رائے کو بروئے عمل نہیں لا سکتا۔ خصوصاً اگر معاملہ عالم اسلام سے متعلق ہو تو یہود کی طرف سے دی گئی لائن کو رد کرنا، یہ اپنے اقتدار کو ہی نہیں اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈالنے والی بات ہے۔ ان ہی حالات کا تقاضا تھا کہ صدر اوباما نے نئی افغان پالیسی فریم کرنے کے لیے بڑی وسیع مشاورت کا اہتمام کیا۔ اس مشاورت میں اُن ہاکس (Hawks) کو بھی شامل کیا گیا جو قوت کے بھرپور استعمال سے اور بدترین تباہی پھیلا کر افغانستان میں مطلوبہ نتائج یعنی امریکہ کی واضح عسکری فتح چاہتے ہیں، اور وہ فاختائیں (Doves) بھی شامل تھیں، جو امریکی عوام کو جنگ کی مصیبتوں سے بچانا چاہتی تھیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ امریکی فاختاؤں کا جنگ ختم کرنے اور فوج واپس بلانے کا مشورہ امن پسندی یا افغانیوں سے ہمدردی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ امریکہ کے جانی و مالی نقصان کے ناقابلِ برداشت ہونے کی وجہ سے تھا اور اُنہیں افغانستان میں امریکہ کی کامیابی کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ اتنے وسیع پیمانے پر مشاورت بھی صدر اوباما کے لیے مصیبت بن گئی، اس لیے کہ انتہائی متضاد مشورے دیئے گئے۔ لہٰذا ایک ایسی نئی افغان پالیسی ترتیب دینے کا فیصلہ کیا گیا جو امریکہ کے مفاد میں بھی ہو اور سب کو مطمئن بھی کیا جا سکے۔

نئی افغان پالیسی کا نچوڑ اور خلاصہ یہ تھا کہ مزید افواج بھیج کر اور قوت کے بھرپور استعمال کے ساتھ ایک معین مدت میں مکمل فتح حاصل کی جائے، لیکن اگر اُس معین مدت میں مکمل فتح حاصل نہ ہو سکے تو کم از کم طالبان کی قوت کو اتنا کمزور کر دے کہ وہ مذاکرات کرنے پر مجبور ہو جائیں اور امریکی افواج کی باعزت واپسی ممکن ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پاکستان کا بازو بھی پوری قوت سے مروڑا جائے اور اُسے مجبور کیا جائے وہ امریکہ کو افغانستان میں مطلوبہ نتائج کے حصول کے لیے صدق دل سے اپنی قوت اور صلاحیت کا بھرپور استعمال کرے۔ علاوہ ازیں دنیا بھر میں سفارتی کوششیں بھی بروئے کار لائی جائیں۔ چنانچہ بیلجیم کانفرنس، استنبول کانفرنس اور آخر میں بہت بڑی سطح پر لندن کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس دوران امریکہ کے سیاسی اور عسکری اکابرین نے اسلام آباد کے بے دریغ دورے کیے اور پاکستان کی

عسکری قیادت پر دباؤ ڈالنے کا ہر حربہ استعمال کیا گیا، یہ بات اتنی واضح اور عیاں ہو چکی ہے کہ اب اس کو دوٹوک انداز میں کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ ہماری سیاسی قیادت اور سول حکمران اپنی نا اہلی، نالائقی اور اپنی کرتوتوں کی وجہ سے سائیڈ لائن ہو چکے ہیں۔ لہٰذا امریکہ اُنہیں گھاس ڈالنے کو تیار نہیں۔ ہماری سپاہ چاہے عام سپاہی ہو یا اعلیٰ ترین افسر اُن کی تربیت کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے اذہان میں یہ بات راسخ ہو چکی ہوتی ہے کہ اُن کا صرف ایک دشمن ہے اور وہ بھارت ہے۔ حالانکہ اُنہیں اصلاً یہ باور کرانے کی ضرورت تھی کہ ہر وہ ملک، قوم اور فوج اُن کی دشمن ہے جو اسلام کی دشمن ہو، جو مسلمان کی دشمن ہو۔ امریکہ نے جب پاکستان کا بازو سختی سے مروڑا یعنی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے کروڑوں ڈالر کے بل روک لیے، معاشی امداد بھی روک دی اور دھمکیاں بھی دی گئیں اور تعاون کی صورت میں بھرپور مدد کا عندیہ بھی دیا یعنی گاجر اور چھڑی

کا بلا لحاظ استعمال کیا گیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی قیادت نے اپنے تئیں موقع غنیمت جانا اور بھارت کو افغانستان کے معاملے میں سائڈ لائن کرنے اور اسلحہ کی ترسیل جاری رکھنے اور مشرقی سرحدوں پر امن کی ضمانت کے عوض افغان طالبان کے خلاف کھلم کھلا اور یکسو ہو کر امریکہ کی مدد کرنے کی ہامی بھر لی۔ ہماری قیادت یہ سمجھتی ہے کہ اگر بھارت کوئی مہم جوئی نہ کرے تو پاکستان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ ملک کے مختلف حصوں میں طالبان کی پے در پے گرفتاریاں شاید اسی معاہدہ کا حصہ ہیں۔ اگرچہ یہ نکتہ نظر بھی سامنے آیا ہے کہ یہ اُن طالبان کی گرفتاریاں ہوئی ہیں جو پاکستان کو بائی پاس کر کے امریکہ سے مذاکرات کرنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو، واللہ اعلم۔ معلوم ہوتا ہے کہ نئی افغان پالیسی کو یوں بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا گیا کہ فوجی کمک کے ساتھ افغان طالبان پر پوری قوت سے ضرب لگائی جائے، خصوصاً جنوبی افغانستان میں طالبان کی قوت کو کچل کر ہلمند اور قندھار جیسے علاقوں میں بھی امریکہ کی بالادستی قائم کر لی جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو افغانستان سے امریکی فوجوں کو نکال لیا جائے اور افغانستان میں ایک کٹھ پتلی حکومت کے ذریعے اس علاقہ سے امریکی مفادات کی تکمیل کا اگلا مرحلہ شروع کیا جائے۔ اگر یہ اطلاعات درست ہیں تو ہماری رائے میں پاکستان نے بہت بڑے خسارے کا سودا کیا ہے۔ ہمیں پختہ یقین ہے اور ہم پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کو بھی بتائے دیتے ہیں کہ افغانستان میں طالبان کو مکمل شکست سے دوچار کر دینا یا افغانستان میں کوئی ایسا سیٹ اپ قائم کر دینا جس میں طالبانِ افغانستان کو نظر انداز کر دیا گیا ہو مشکل ہی نہیں قریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اگر دل کی آنکھیں بالکل اندھی نہیں ہو گئیں اور سر کی آنکھیں ڈالروں کی چمک سے چندیا نہیں گئیں اور مادی وسائل کی لامحدود خواہشات نے اذہان کو ماؤف نہیں کر دیا، تو یہ بات اب تک ہماری سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ ساری عیسائی دنیا اور لادینی قوتیں سپریم پاور آف دی ورلڈ کی سربراہی اور کمان میں بے سروسامان طالبان پر نہ صرف فتح نہیں حاصل کر سکے بلکہ اُن کی شکست نوشتۂ دیوار ہے، جسے صرف آنکھیں کھول کر پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ صرف اور صرف اللہ کی مدد ہے کہ اُنیسویں صدی کے لوگ اکیسویں صدی کے لوگوں اور اُن کی ٹیکنالوجی کو شکستِ فاش دے رہے ہیں۔ جس فوج کو تائید ایزدی حاصل ہو اُس سے لڑنا حماقت ہے، جہالت ہے اور محض ہلاکت ہے۔ زمینی حقائق کو بھی مدنظر رکھ کر ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ہم تاریخ کے خلاف جنگ کیوں کر رہے ہیں۔ تاریخ کا یہ

فیصلہ ہے، چاہے ہم اس کو سنہری حروف میں لکھیں یا ردِ عمل میں سیاہی کے ساتھ، کہ جو قوم مرنا جانتی ہے وہی زندہ رہتی ہے۔ اُسے کوئی موت سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ اُس کی آزادی کوئی نہیں چھین سکتا۔ لہٰذا امریکہ کی نئی افغان پالیسی اور پاکستان کی قلابازیوں پر ہمارا تبصرہ ہے، تدبیر کند بندہ

اِک شخص سارے شہر کو ویراں کر گیا

مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا تھا ''زندگی بھڑک اُٹھنے اور بجھ جانے کا نام نہیں سلگنے کا نام ہے۔'' تنظیم اسلامی کے بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے حقیقت میں زندگی کی شمع کو دونوں کناروں سے جلایا، زندگی سلگ سلگ کر گزاری۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فرد بجھ گیا، زیرِ زمین چلا گیا اور سپردِ خاک ہوا، ظاہراً منزل تو نہ پا سکا لیکن نشانِ راہ پر چراغاں کر گیا کہ دین کے خادم ٹھوکروں سے بچ کر منزل کی طرف بڑھنے میں آسانی محسوس کریں۔ عالم اسلام کا ایک حصہ خصوصاً مسلمانانِ پاک و ہند اور امریکہ و یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد اب یہ نہیں کہہ سکتی کہ منزل دھندلی ہے۔ اقامتِ دین کی فرضیت اگرچہ مولانا مودودی کی تحریروں سے مسلمانوں پر کسی قدر آشکار ہو چکی تھی، لیکن عوامی سطح پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اِس کا باقاعدہ ڈھنڈورا پیٹا اور شب و روز اِس کی نشر و اشاعت کے لیے ایک کر دیے۔ ایک مسلمان کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں واضح کیں۔ قرآنِ پاک اور سیرتِ مطہرہ سے ثابت کیا کہ اسلام محض ارکانِ اربعہ کی ادائیگی کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی گوشوں میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اسلام محض مذہب نہیں بلکہ ایک مکمل دین ہے جو اپنا نفاذ اور غلبہ چاہتا ہے۔

والدین کو یہ نام کس قدر عزیز تھا کہ اسرار احمد نامی دو بچوں کو لگاتار محمد سے سیدھے لحد میں اُتارنے کے باوجود کسی قسم کی توہم پرستی کا شکار نہ ہوئے اور بیسویں صدی کے بتیسویں سال کے اپریل کی چھبیس کو جب اُن کی گود پھر ہری ہوئی تو نومولود کا نام بھی اسرار احمد رکھ دیا۔ 21 اپریل 1938ء کو جب مفکرِ اسلام علامہ اقبال اِس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تو ''ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات'' کے مصداق چھ سالہ اسرار احمد نے اِسے قومی صدمے کے طور پر محسوس

کیا۔ ہائی سکول کی تعلیم اپنے آبائی ضلع حصار (بھارت) میں مکمل کی۔ میٹرک کا امتحان متحدہ ہندوستان کی پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران ہی اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے ذہنی اور قلبی رشتہ استوار ہوا اور احیائے اسلام کے لیے عملی جدوجہد کی امنگ سینے میں پرورش پائی۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (M.S.F) کے فعال کارکن اور جنرل سیکرٹری رہے۔ اسی حیثیت سے قائداعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے دوران ہی جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھا اور مولانا مودودی سے ذہنی قربت بڑھی۔ علامہ اقبال کی ملی شاعری اور مولانا مودودی کی تحریروں سے دین کا انقلابی نظریہ اور اسلام کا Socio Poltical System جس کی بنیاد عدل پر ہے، نوجوان اسرار احمد کے قلب ذہن میں راسخ ہو گیا۔ اُن کی سوچ کا یہ رُخ بننے لگا کہ فقہی اسلام پر بھی بآسانی اور احسن طریقے سے صرف اسی صورت میں عمل ہوسکتا ہے جبکہ ریاست میں اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی قائم ہو۔

اسرار احمد قیام پاکستان کے موقع پر براستہ سلیمانکی قافلے کے ساتھ بیس دن پیدل سفر کر کے اپنے خاندان سمیت پاکستان پہنچے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف ایس سی کیا۔ اور ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ پاکستان آنے کے بعد جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو غور سے پڑھنے اور مولانا مودودی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت حاصل کی اور مختلف ذمہ داریوں سے گزرتے ہوئے بالآخر اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے ناظم اعلیٰ بن گئے۔ قرآن حکیم کے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ تو لڑکپن سے تھا۔ قرآن کے سمندر میں غوطے لگا کر موتی دریافت کرنے کا ذوق پاکستان آ کر بڑھتا چلا گیا۔ عربی زبان سیکھی، کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات کا گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اگرچہ وہ باقاعدہ کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل تو نہیں تھے البتہ بعض جید علماء کی صحبت سے فیض اُٹھاتے رہے۔ علامہ اقبال،

ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا فراہی، مولانا اصلاحی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریریں اور خطابات کو حرزِ جان بنایا۔ جس کا نقد نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اللہ کے پاک کلام سے ایک خصوصی ذہنی اور دلی لگاؤ پیدا ہو گیا۔ بقول محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے قرآن نے اُنھیں Possess کر لیا۔ طالب علمی کے دوران درس قرآن کی ذمہ داری مستقلاً اُن کی تھی۔ اپنے

خطابات میں بھی قرآنی آیات کو ہیرے اور موتی کی طرح جڑ دیتے تھے۔ قرآن کے مدرس کی حیثیت سے اُن کی شہرت جمعیت سے وابستگی کے دوران چہار سو پھیل چکی تھی۔ میڈیکل کی تعلیم مکمل ہوئی تو ایک دن بھی جماعتی زندگی سے علیحدہ رہنا پسند نہ کیا اور جماعت اسلامی میں شرکت کر لی۔ رکنیت کا مرحلہ طے کیا اور جلد ہی جماعت اسلامی منٹگمری کی امارت اُنہیں سونپ دی گئی۔ اپنی آنکھیں اور ذہن کو کھلا رکھنا، غور و فکر کرتے رہنا، حالات کا تنقیدی جائزہ لینا اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ دینی امور کے حوالہ سے ماضی کی طرف نگاہ کرنے اور اسلاف سے رشتہ و تعلق قائم کرنے کے قائل تھے اور دنیوی امور میں جدید سے جدید تر علوم کے حصول پر زور دیتے تھے۔ اُنہوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ جماعت اسلامی اپنی تاسیس کے وقت جو نظریہ اور اصول اپنائے ہوئے تھی، وقت گزرنے کے ساتھ اُن سے انحراف ہونا شروع ہو چکا ہے۔ بالآخر یہ آتش فشاں 1956-1957ء میں ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں پھٹ گیا۔ پچیس سالہ نوجوان نے جماعت اسلامی کے بانی امیر مولانا مودودی کے سامنے کھڑے ہو کر سوا دو گھنٹے اپنے موقف اور جماعت اسلامی کے نظریاتی انحراف پر دلائل دیئے۔ بہر حال بات نہ بن سکی اور ڈاکٹر اسرار احمد جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے۔

1971ء تک غمِ روزگار سے بھی نبٹتے رہے اور شہر بہ شہر اور قریہ قریہ دروسِ قرآن کا سلسلہ بھی جاری رہا یعنی زندگی چکی کے دو پاٹوں میں گزرتی اور پستی رہی۔ 1971ء میں خانہ کعبہ میں ایک ایسا فیصلہ لیا جو وہی شخص کر سکتا ہے جو کسی شے کے عشق میں عقل و خرد کے تمام دلائل مسترد کر دے۔ جو کسی حساب کتاب میں نہ پڑے اور بے خطر حصولِ منزل کے لیے میدان میں کود جائے۔ یعنی یہ کہ آئندہ صرف اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں گا۔ لہٰذا واپسی پر کلینک کو تالا لگا دیا۔

1972ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم کی، لیکن ساتھ ہی واضح کر دیا کہ ہمارا مقصد ایک ایسی جماعت کا قیام ہے جو صحیح اسلامی انقلابی جماعت ہو گی، جو پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کے قیام کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یوں تو ہر کلمہ گو ڈاکٹر اسرار احمد کا مخاطب تھا لیکن وہ پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو دینی علوم سے آراستہ کرنے کے زیادہ آرزومند تھے تاکہ جب اسلامی انقلاب برپا ہو اور ایک اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آئے تو ایسی قیادت میسر ہو سکے جو دین کی بنیادی تعلیم، اس کے اوامر و نواہی، اس کے محکمات اور مسلمات سے بھی بخوبی

آگاہ ہو اور عصر حاضر کے تقاضوں سے بھی اچھی طرح آشنا ہو۔ آج قرآن اکیڈمی جہاں قائم ہے، اُس کا بھی اصل مقصد یہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے طلبہ کا قرب رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شدید خواہش تھی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان دین کا علم حاصل کر کے تحقیقی کام کریں، تاکہ اسلام پر ہونے والے طاغوتی حملوں کا مدلل اور علمی جواب دیا جائے۔ اس لیے کہ آج کا انسان محض وعظ و نصیحت سے قائل نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب کی سوچ یہ تھی کہ قرآن پاک میں انسانی زندگی کے سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کو اوّلیت بھی دی گئی ہے اور اُن پر بڑی تفصیل سے روشنی بھی ڈالی گئی ہے۔ لہٰذا اصلاح کا آغاز یہاں سے ہونا چاہیے۔ وہ اِس نقطۂ نظر کے شدید مخالف تھے کہ سیاسی اور معاشی نظام سدھر گیا تو سماجی اور معاشرتی گوشہ خود بخود درست ہو جائے گا۔ ان کا پختہ ایمان تھا کہ گھر وہ پہلا یونٹ ہے جو اصلاح کا پہلا ٹارگٹ ہونا چاہیے۔ اِس کی اصلاح کے بغیر بات آگے نہیں بڑھ سکتی۔ رزقِ حلال پر قناعت کرنے والا گھرانہ خود طاغوتی اور سرکش شیطانی قوتوں کے خلاف ایک بہت بڑا مورچہ ہے۔ شادی بیاہ کی فرسودہ رسوم کے خلاف اُن کی چلائی ہوئی تحریک ہزاروں گھرانوں میں جہالت کے اندھیرے دور کرنے اور سنتِ رسول ﷺ کے چراغ سے اُنہیں منور کرنے کا باعث بنی۔ آغاز میں اِس تحریک کو بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، لیکن آج لاکھوں نہیں تو ہزاروں خاندان یقیناً ایسے ہیں، جو وسائل رکھنے کے باوجود بچی کا نکاح مسجد میں کرتے ہیں، مسجد سے ہی دلہن کی رخصت کرتے ہیں اور کسی قسم کے کھانے کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ تمام تقاریب صرف ایک ولیمہ کی مسنون تقریب میں سمیٹ دیتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک کو محض پڑھنا یا سننا بلکہ صرف اُس کی زیارت کرنا بھی باعثِ برکت اور ثواب ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اگر اُسے سمجھ کر اور معنی جان کر پڑھا یا سنا جائے تو سونے پر سہاگہ ہے اور اُسی صورت میں اُس سے رہنمائی حاصل کرنا ممکن ہوگا۔ دروس قرآن کا بھی اصل مقصد قرآن کا پیغام لوگوں کے اذہان و قلوب میں اُتارنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے سوچا کہ ماہِ رمضان میں لوگ قرآن کی طرف زیادہ راغب ہوتے ہیں۔ ماحول اور فضا میں روحانیت غالب ہوتی ہے۔ چنانچہ نمازِ تراویح کے دوران وقفوں میں قرآنِ پاک کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کیا جائے۔ یہ ایک کٹھن منزل تھی لیکن اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے بہ حسن و خوبی یہ ذمہ داری نبھائی اور اپنے شاگردوں کو بھی حکم دیا۔ لہٰذا اب ہر سال رمضان میں پاکستان میں درجنوں مساجد

میں روحانی بارش مسلمانوں کے دلوں کو تر کرتی ہے، جو بندگیٔ رب اور عشقِ رسول ﷺ کے بیج بو دینے کے لیے انتہائی موافق اور سازگار ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب قرآن کا پیغام عام کرنے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے حوالہ سے جس لگن اور جس انداز سے کام کرتے تھے، اس پر ہم سمجھتے ہیں کہ دین کا کام کرنے والے بعض شہداء، صدیقین اور صالحین کو مجنون اور دیوانہ کا جو طعنہ یا خطاب دیا جاتا ہے، وہ کوئی ایسا غلط نہیں ہے۔ اس لیے کہ عقل و خرد یا حکمت کے نام پر مصلحت اِس طرح کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی کہ دنیا ہی نہیں اپنی جان پر بھی اپنے مشن کو ترجیح دی جائے۔ ہم آخر میں تمام اُن حضرات سے جو ڈاکٹر صاحب سے احترام و محبت کا رشتہ رکھتے ہیں، جنہیں ڈاکٹر صاحب کا دنیا سے اُٹھ جانے کا شدید رنج و دکھ پہنچا ہے، گزارش کریں گے کہ ہر انسان فانی ہے اور دنیا دارالامتحان ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحب کی مغفرت اور درجات کی بلندی کی دعا کریں کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ صرف انبیاء معصوم ہوتے ہیں۔ ہر انسان خطا کار اور گناہ گار ہے، لہٰذا مغفرت کی دعا کا محتاج ہے۔

اُن سے محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ اُن کا ہر عقیدت مند اُن کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے خلوص اور دلجمعی کے ساتھ جدوجہد کرے۔ اگر پاکستان میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو جائے تو جہاں اُن کی روح کو قرار نصیب ہوگا وہاں امتِ مسلمہ کے ہر فرد کے لیے دین پر چلنا آسان ہو جائے گا۔ یہی ڈاکٹر اسرار احمد کی زندگی کا اصل ہدف اور مشن تھا جس کی تکمیل کے لیے جدوجہد اب ہماری ذمہ داری ہوگی۔

''ریاست ہوگی ماں کے جیسی''

پاکستان کی تریسٹھ سالہ تاریخ میں کرپشن فری حکومت کا کبھی کوئی تصور نہیں رہا بلکہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' کے مصداق بعض طبقات کی کوششوں کے باوجود ہر نئی حکومت نے کرپشن میں ترقی کی منازل تیزی سے طے کیں۔ ہر نئے دور میں لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ سابقہ حکومت تو اتنی کرپٹ نہ تھی، نہ میرٹ کی اتنی مٹی پلید ہوئی تھی، نہ اقربا پروری کی اتنی شہادتیں سامنے آئی تھیں۔ لیکن ایک بات کم وبیش تمام سابقہ حکومتوں میں مشترک تھی، وہ یہ کہ جب حکومت کے کسی منظورِ نظر پر کرپشن کا الزام لگتا تو حکومت اُسے بچانے کے لئے عوام کی نظروں سے اوجھل کر دیتی تھی۔ حکومتی جماعت اُسے پچھلی صفوں میں دھکیل دیتی تھی۔ جھوٹی سچی کمیٹی کے قیام سے لوگوں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ حکمران معاملے کو ٹالنے اور اپنے ساتھی کو بچانے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔ لیکن موجودہ حکومت دو لحاظ سے نئی تاریخ رقم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایک یہ کہ کرپشن اتنی عام اور زیادہ کر دی جائے کہ کوئی آنے والی حکومت اُن کا ریکارڈ نہ توڑ سکے۔ یہ لوگ ع ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے فارمولے کو سامنے رکھتے ہوئے لوٹ مار کو آخری حد تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اقتدار میں یہ اُن کی آخری باری ہے۔ لہٰذا ''اب نہیں تو کبھی نہیں'' کا نعرہ لگا کر کرپشن کے سمندر میں غوطہ زن ہیں، بلکہ یہ بھی کہہ دیا جائے کہ خود کرپشن کے سمندر کی صورت اختیار کر گئے ہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔ دوسری بات انتہائی خطرناک ہے اور پاکستان ہی نہیں شاید دنیا بھر میں کہیں اس کی نظیر نہیں ملے گی، وہ یہ کہ جس حکومتی اہلکار پر کرپشن، جعل سازی اور خیانت کا الزام لگے یہاں تک کہ عدالت میں جرم ثابت ہو جائے، اُسے سزا دینے کی بجائے ترقی دے دی جائے اور مختلف انعامات سے نوازا

جائے۔ چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔ صدر کے امریکی دورے کے دوران یہ رپورٹ آئی کہ دو وزیر ایک کلب میں گئے جہاں ایک بھارتی رقاصہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ہمارے وزیروں نے اس رقاصہ پر پندرہ ہزار ڈالر نچھاور کر دیئے۔ وہ نشے میں دھت تھے اور اس حال میں ایک امریکی سے الجھ بھی پڑے۔ پہلے اس خبر کی تردید کی گئی لیکن جب ایک ویڈیو فلم کے ذریعے جرم ثابت ہو گیا تو ان میں سے ایک وزیر کو اہم تر وزارت سونپ دی گئی۔ ایک وزیر کے بارے میں جب معلوم ہوا کہ اُس نے مجرموں سے یہ کہہ کر ساڑھے تین کروڑ روپیہ وصول کیا ہے کہ وہ جج سے سودا بازی کر کے انہیں بری کروا دے گا۔ اس خبر کے منظرِ عام آنے پر اس وزیر کو بھی ایک اہم تر وزارت سے نواز دیا گیا۔ بعد ازاں جب یہ معلوم ہوا کہ اس وزیر کی ڈاکٹری کی ڈگری بھی جعلی ہے تو اُسے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جعلی ڈگری پر قومی اسمبلی سے استعفا دینے والے کو دوبارہ ٹکٹ جاری کیا گیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ خود وزیرِ اعظم اُس جعل ساز کو سپورٹ کرنے اُس کے حلقہ میں جا پہنچے۔ یہ ہے وہ نئی ادا اور انتہائی خطرناک بات جو موجودہ حکومت نے بطور پالیسی اپنائی ہے۔ یعنی کرپشن کو تقدس دیا جا رہا ہے۔ کرپٹ افراد کو عزت اور تکریم دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ آپ جرم کریں، اگر عدالت سزا بھی دے دے گی تو صدر عدالت کے احکامات کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے سزا معاف کر دیں گے۔ عزت، عہدہ اور منصب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو جعل سازی کریں، کسی واردات کا ارتکاب کریں اور اگر آپ کے خلاف سینکڑوں افراد کے قتلِ عام کا مقدمہ ہے، فراڈ اور بھتہ خوری کے الزامات ہیں تو آپ سات سمندر پار نہ صرف مقیم ہو جائیں بلکہ وہاں اپنی جماعت کا سیکرٹریٹ قائم کریں۔ صدرِ مملکت خود وہاں شرفِ باریابی کے لئے حاضر ہوں گے۔

ایک فرمانِ نبویؐ کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ تم برائی کا حکم دو گے اور نیکی سے روکو گے۔ سوال یہ ہے کیا موجودہ حکومت نے حقیقتاً یہ طرزِ عمل اختیار کر لیا ہے؟ فرض کریں، حکومت کے دفاع میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے چند بدکردار افراد کو عہدوں اور مراعات سے نوازا ضرور ہے لیکن کہیں بُرائی کا حکم نہیں دیا، تب بھی اس حقیقت سے انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ بدکردار اہلکار کو انعامات سے نواز کر حکومت نے بُرائی کی عملی ترغیب دی ہے۔ کیا ایسی صورت میں حکومت کی بقا کا کوئی جواز بنتا ہے، یہ ایک عملی سوال ہے۔ ہماری رائے میں حالات جس ڈگر تک

پہنچ چکے ہیں اور جس کردار کے لوگ سیاست میں در آئے ہیں اور اپوزیشن کی بداعمالیاں بھی لوگوں کے سامنے آ چکی ہیں، محض اس حکومت کو گرانے کا چنداں فائدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ حقیقت میں یہ نظام ہی مکمل طور پر گل سڑ چکا ہے اور اس کی سڑاند سے معاشرے میں حد درجہ تعفن پیدا ہو چکا ہے۔ شریف انسان کے لئے سانس لینا دشوار ہے۔ بدی نوازی کا حکومتی رویہ عوام میں بھی سرایت کر رہا ہے۔ یہ نظام اُس عمارت کی مانند ہے جو مکمل طور پر خستہ ہو چکی ہے۔ اُس کی جزوی مرمت اور لیپا پوتی وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔ اسے تعمیرِ نو کے لئے زمین بوس کرنا ہوگا۔ اس نظام کی وجہ سے ہمارا معاشرہ ایک ایسی دیوار کی مانند ہے جس کی اینٹوں کے درمیان سے سیمنٹ نکل چکا ہو یا اپنی افادیت کھو چکا ہو۔ اینٹیں ایک دوسرے سے لاتعلق ہو چکی ہیں، ایسی دیوار کے مستقبل کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ سوال یہ ہے کہ اس گرتی ہوئی دیوار کو آخری دھکا کیسے دیا جائے۔ اگر حالات سے تنگ آئے لوگ بے قابو ہجوم کی صورت میں آتش زنی، سنگ باری اور لوٹ مار شروع کر دیں گے، تاجر ٹیکس دینا بند کر دیں گے، مزدور ہڑتال پر چلے جائیں تو نظام کا خاتمہ تو ہو جائے گا لیکن ہم کھوسے نکل کر کھاتے میں پڑ جائیں گے۔ یعنی ایک چھوٹی مصیبت سے نکل کر بڑی اور مہلک تر مصیبت میں پھنس جائیں گے اور ایک ایسے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے جس سے نجات پانا شاید ممکن نہ ہو۔ لہٰذا وہ لوگ جو خونی انقلاب اور کرغیزستان کے حالات کی مثالیں دے رہے ہیں، دوست نہیں دشمن ہیں۔ ہمیں ایک صالح انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک عوام دوست انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایک فطری تبدیلی کی ضرورت ہے جس کے لئے منظم جماعت ناگزیر ہے۔ ایسی جماعت جس کے کارکن تربیت یافتہ ہوں اور خوفِ خدا رکھتے ہوں۔ جس کا لیڈر ایک ہو اور اللہ اور رسول ﷺ کی غلامی کے سوا کسی کی غلامی کا تصور نہ رکھتا ہو۔ جو ہمدرد اور غمخوار ہو، جو ریاست کے حوالہ سے خلافت راشدہ کے دور کو آئیڈیل سمجھتا ہو۔ جو خلافت منہاج النبوۃ کا قائل ہو۔ جو عوام کی نگہداشت اولاد کی طرح کرے۔ پھر ہوگی ریاست ماں کے جیسی۔



رمضان، قرآن، مسلمان اور پاکستان

رمضان المبارک کی آمد آمد ہے۔ یہ مہینہ جسے سید الشہور کہا گیا ہے اس کی فضیلت اور اہمیت کا ذکر قرآن میں ہے اور احادیث مبارکہ میں ہے۔ علماء و فضلا اِسے اپنے اپنے انداز میں اور نئی جہتوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لہٰذا عالم اسلام کے ایک ایک فرد پر روزہ کی اہمیت و فضیلت اتنی واضح ہے کہ ہم اُس میں کچھ اضافہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ سوال یہ ہے کہ رمضان کیوں اہم اور افضل ہے؟ ظاہر ہے اس لیے کہ اس میں اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید نازل ہوئی۔ قرآن مجید کیوں اتنا مقدس ہے اور ہدایت کا واحد منبع کیوں قرار دیا گیا ہے؟ اس لیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کی مانند اللہ کا کلام بھی لاثانی ہے۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہر شے عزت، احترام، فضیلت اور تقدس صرف اللہ سے نسبت کی بنا پر حاصل کرتی ہے۔ اللہ کو نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ ہی کوئی عام انسان براہِ راست اور بلاواسطہ ہدایت حاصل کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ہماری یہ قسمت بھی نہ تھی کہ ہم اللہ کے آخری رسول ﷺ کا دیدار کر سکتے۔ لہٰذا اپنے ایمان کو قائم رکھنے اور اُس کی بڑھوتری کے لیے قرآنِ پاک سے چمٹ جانے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ ہی نہیں۔ قرآن جب یہ کہتا ہے کہ اُسوۂ رسول تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے تو سنتِ رسول کو دانتوں سے پکڑ لینا حصولِ ہدایت اور اللہ کے قرب کا واحد راستہ رہ جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ رب العزت انسان سے ایمان کے بعد جس چیز کا مطالبہ کرتا ہے وہ خلوص ہے، یعنی جس اللہ پر ایمان لائے ہو اُس کے رسول ﷺ اور اُسے عطا کی گئی کتاب کے احکامات پر انتہائی خلوص اور نیک نیتی سے عمل کرو۔ ایسی صورت میں بشری تقاضوں کی وجہ سے کمی بیشی یا کوتاہی قابل معافی ہے۔

اسلام کے ارکانِ اربعہ کا ہر رکن مسلمان کے لیے فرض ہے۔ نماز کو تو عماد الدین قرار دیا

گیا ہے۔ لیکن ماہ رمضان اور روزہ دار کی فضیلت جس انداز میں قرآن اور احادیث مبارکہ میں وارد ہوئی ہے وہ یقیناً منفرد اور امتیازی ہے۔ غور کرنے سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ روزہ دار کو جس طرح صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، وہ ہر دوسری فرض عبادت سے بڑھ کر ہے۔ روزہ کی زد انسان کے بنیادی حیوانی اور جبلی تقاضوں کی تکمیل پر پڑتی ہے۔ مثلاً پیٹ کی آگ کو بجھانا اور جنسی خواہش کی تکمیل عام دنوں میں ایک مسلمان جب چاہے جائز طریقے سے کرسکتا ہے، جبکہ ماہ رمضان میں طلوع سحر سے غروبِ آفتاب تک اِن جبلی تقاضوں کو جائز طریقے سے بھی پورا کرنے پر پابندی ہوگی۔ حقیقت میں روزہ مسلمان کی روحانی شخصیت کا اُس کی حیوانی شخصیت پر غلبہ حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ روحانی شخصیت کے مزید نکھار کے لیے رات کے قیام کی ترغیب دی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کو اِس مشقت میں کیوں ڈالا گیا؟ اس کے دو ہی جواب ہوسکتے ہیں: اول یہ کہ اللہ کے بندے ماہ رمضان کی بدولت اُس کی مغفرت حاصل کرسکیں، اجر کمائیں اور جنت کی نعمتوں سے استفادہ کریں۔ دوسرا یہ کہ قرآن نازل ہوا ہے تاکہ فرد اور معاشرہ ہدایت حاصل کرسکے، اور قرآن کے عطا کردہ عادلانہ نظام کو عملی تعبیر دی جائے۔ لیکن اگر معاشرہ بے راہرو رہتا ہے تو چیدہ چیدہ افراد کا ہدایت پاجانا منشائے الٰہی کو پورا نہیں کرتا۔ نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں سو کے قریب افراد کے ایمان لے آنے کے باوجود ہر دم اپنی دعوت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ آپؐ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ قرآن کے نظام کو نافذ کرنے کے لیے زبردست محنت و مشقت اور نظم و ضبط کی ضرورت تھی۔ ایسے صابر اور شاکر لوگوں کی اشد ضرورت تھی جو اپنے جبلی تقاضوں پر قابو پانے کی تربیت حاصل کرچکے ہوں۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ غزوۂ احزاب میں صحابہؓ پیٹ پر پتھر باندھ کر دشمن کے راستے کی دیوار بنے رہے۔ ہمیں رمضان کے روزے اصلاً اپنے رب کو راضی کرنے کے لیے رکھنے چاہئیں، اس دعا کے ساتھ کہ اے رب ہمارے! اپنے اس بابرکت ماہ کے طفیل ہماری مغفرت فرما، ہمیں روحانی ترفع عطا فرما، ہماری اس حاضری کو شرفِ قبولیت بخش اور اپنی رحمت سے اجرِ عظیم عطا فرما، پھر اس قرآن کے نظام کو بالفعل دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اس تربیت اور مشقت کو بروئے کار لائیں۔

ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انسانوں کی ہدایت اور نظامِ عدل اجتماعی کا نفاذ ہمارے دین کا اصلی اور حقیقی مطالبہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے پہلے بہت سے انبیاء افراد کی معقول تعداد کو راہ

ہدایت پر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن وہ باطل نظام کا خاتمہ کر کے اللہ کے نظام کو نافذ کرنے میں ظاہری طور پر کامیاب نہ ہو سکے، لہٰذا ان کی اقوام کو نسیاً منسیا کر دیا گیا۔ آج بھی اگرچہ لوگوں میں مذہبی رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ مسجدوں میں رونقیں بڑھ گئی ہیں۔ روزوں کا اہتمام لوگ بڑے ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ حج اور عمرہ کے لیے تو جہاز میں نشست نہیں ملتی، لیکن بحیثیت مجموعی امت مسلمہ زوال اور پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ذلت و رسوائی اُن کا مقدر بن گئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے نماز روزہ جیسے فرائض کی ادائیگی ایک روٹین بنالی ہے۔ ہمارا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ اُخروی نجات اور روحانی ترفع کے علاوہ اِن فرائض کی ادائیگی درحقیقت ہمیں وہ قوت اور طاقت فراہم کرتی ہے جسے بروئے کار لا کر ہمیں موجودہ باطل نظام کو تہس نہس کر کے اُس عادلانہ نظام کے لیے جدوجہد تیز تر کرنی ہے جو محمود و ایاز میں فرق مٹا دیتا ہے۔ ارکانِ اسلام کی ادائیگی کرنا لیکن قرآن کے نظام کے قیام کے لیے جدوجہد نہ کرنا، اس پر یہ مثال کسی حد تک منطبق ہوتی ہے کہ کوئی پہلوان خوب ورزش کرے، اچھی خوراک کھائے لیکن دنگل لڑنے کے لیے اکھاڑے میں نہ اترے۔ عقلی طور پر بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ باطل اور ظالمانہ نظام میں چند ہدایت یافتہ انسانوں کی حیثیت وہی ہوگی جو تنکوں کی سیلاب میں ہوتی ہے اور اگر نظام عادلانہ اور انسانی فطرت کے قریب ہوگا تو انسانوں کی اکثریت کا راہ ہدایت پر چلنا کسی قدر آسان ہوگا۔

پیارے وطن پاکستان کا بھی اس وقت صرف اور صرف یہ مسئلہ ہے کہ لوگوں کا انفرادی سطح پر مذہب کی طرف رجحان ہے لیکن نظام کو بدلنے اور عادلانہ بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں، جس کا نتیجہ ہے کہ ہمیں کئی خداؤں کو سجدہ کرنا پڑ رہا ہے۔ لوگ نماز بھی پڑھتے ہیں، روزہ بھی رکھتے ہیں لیکن اُس سے قوت حاصل کر کے شیطانی نظام کو ختم کر کے اللہ کے نظام کے نفاذ کی کوشش نہیں کر رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دو سو سالہ انگریز کی غلامی نے مسلمان کے تصورِ دین کو زبردست زک پہنچائی ہے۔ وہ اسلام کو بھی عیسائیت کی طرح محض ایک مذہب سمجھنے لگا جس میں صرف پوجا پاٹ ہے۔ قرآنِ پاک میں لفظ ''مذہب'' استعمال ہی نہیں ہوا۔ اسلام دین ہے یعنی ایک مکمل نظام رکھتا ہے۔ عبادات دین کا ایک انتہائی اہم جز ہیں لیکن دین کی مغلوبیت کی کوئی شکل نہیں ہوتی، دین اگر غالب ہے تب ہی وہ دین کہلا سکے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کا بنیادی فریضہ یہ ہوا کہ عبادات کے ذریعے

روحانی قوت حاصل کریں، دنیوی وسائل کو بھرپور طور پر استعمال کریں اور اسلام کو غالب کریں۔ اللہ رب العزت قرآن پاک میں فرماتا ہے: ''ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل) تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور لوہا پیدا کیا۔ اس میں (اسلحۂ جنگ کے لحاظ سے) خطرہ بھی شدید ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کر لے، بیشک اللہ قوی (اور) غالب ہے۔'' (الحدید:25) ہم مسلمانوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ کہیں نماز اور روزے کی پابندی کے باوجود ہم ادھورا کام تو نہیں کر رہے۔ بقول شاعر

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی



طعنہ دیں گے بُت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

پاکستان کو مملکت خداداد کہا جاتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بالکل درست کہا جاتا ہے، اس لیے کہ دوسرے ممالک کی طرح اس کا کوئی تاریخی پس منظر نہیں ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے اس کی ہیئت یوں ہے کہ ایک بڑے ملک کے دو اطراف سے ٹکڑے کاٹ کر ایک ملک بنا دیا گیا۔ اِس کے باسیوں کی معاشرت اور بود و باش میں بُعد المشرقین ہے۔ اِس ملک میں سفر کریں، ہر پچاس سو کلومیٹر کے بعد زبان بدل جاتی ہے یعنی کوئی لسانی بنیاد نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اِن سب لوگوں کا مل جل کر ایک قوم بن جانے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

مختلف معاشرت، مختلف تہذیب کے حامل اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ایک قوم کی صورت اس لیے اختیار کر گئے کہ اُن کا مذہب ایک تھا۔ وہ دین اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان کہلاتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار کرنے والوں پر ترس آتا ہے جو کہتے ہیں کہ اسلام پاکستان کی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا فراموش کو جو سب سے بڑی سزا ملتی ہے وہ خود فراموشی ہے۔ یہ بھی مان لیتے ہیں کہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کا نعرہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے نہیں لگایا گیا تھا بلکہ چند چھوکروں نے یہ ''گستاخی'' کی تھی۔ لیکن ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' کا نعرہ مسلم لیگ کا آفیشل نعرہ تھا یا نہیں؟ ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی اِس تاریخی حقیقت سے انکار کر سکتا ہے۔ اگر مذہب بنیاد نہیں تھا تو یہ پکار صرف مسلمان کو کیوں لگائی گئی۔ بہر حال ہم اس پر زیادہ بحث نہیں کرتے، کیونکہ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جاگے ہوئے کو کون جگائے۔ وہم کا علاج تو شاید سقراط اور بقراط کے پاس ہو، میں نہ مانوں کا علاج تو کسی کے پاس نہیں ہوتا۔ البتہ ایک پنجابی محاورہ ہے ''ڈنڈا پیر بگڑے تگڑیاں دا'' (بگڑے ہوئے لوگوں کا

علاج صرف قوت کے استعمال سے ہوسکتا ہے۔)

بات اور طرف نکل گئی، ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے، اور اِس سے انکار روزِ روشن میں سورج کے وجود سے انکار کے مترادف ہے۔ حیرت ہے اور حد درجہ حیرت ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والی یہ مملکتِ خداداد آج دنیا کے سامنے یوں پڑی ہے جیسے جنگل میں کسی خونخوار درندے کے سامنے بکری کا بچہ ہو۔ لاغر اور کمزور ہونے کی وجہ سے جس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوں، جو منمنا کر دوسروں سے زندگی کی بھیک مانگ رہا ہو، جو خود اپنے رزق کا بندوبست نہ کرسکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم پاکستانی مسلمانوں کے لیے عزت، احترام، حمیت اور غیرت بے معنی الفاظ بن چکے ہیں۔ ہماری حالت غریب کی جورو سے بدتر ہے۔ ہم عالمی گداگر بن کر در در دستک دے رہے ہیں۔ کوئی چند ٹکرے ہمارے کشکول میں ڈال دیتا ہے اور کوئی بُری طرح ٹھکرا دیتا ہے۔ برطانیہ کے وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے جس طرح ہمارے ازلی دشمن کے کندھے سے کندھا ملا کر جن الفاظ میں ہمیں رگیدا ہے اور جو صلواتیں ہمیں سنائی ہیں، ہم پھر بھی بے مزہ نہیں ہوئے اور بھاگے بھاگے اُس کے در پر جا پہنچے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اس واقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے شیطان ہم پر بُری طرح حملہ آور ہوا ہے کہ اب تو اِس قوم کے مستقبل سے مایوس ہو جاؤ، اب تمہارے پاس بچا کیا ہے۔ اُدھر حکمران ہماری عزت کا یوں دھیلا کروا رہے ہیں، اِدھر آسمان ہم پر قہر بن کر برس رہا ہے۔ چند دن پہلے جو ہم پانی پانی کرتے ہوئے ایک دوسرے کے گریبان پکڑ رہے تھے، آج اسی پانی میں ڈوبے جا رہے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ڈوب پھر غریب ہی رہا ہے۔ جانور مر رہے ہیں، فصلیں تباہ ہو رہی ہیں، مکان مکینوں کے سروں پر گر رہے ہیں۔ کراچی تک ابھی پانی نہیں پہنچا تو وہاں ٹارگٹ کلنگ کا ''مشغلہ'' جاری ہے۔ ایک ایک دن میں چالیس چالیس اور پچاس پچاس کا سکور ہو رہا ہے۔ نہ مرنے والا جانتا ہے، اُسے کیوں مارا جا رہا ہے، نہ مارنے والا جانتا ہے کہ وہ کس کو کیوں مار رہا ہے۔ خونِ مسلم بہہ رہا ہے۔ مارکیٹیں اور بازار قبرستان کی طرح سنسان اور خاموش ہیں۔ اور تو اور ہم دشمنانِ اسلام کے اتحادی بن کر اپنے مسلمان بھائیوں اور ہم وطنوں پر بم گراتے ہیں اور بستیوں کی بستیاں تہس نہس کر کے اتحادیوں سے ڈالر وصول کرتے ہیں۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! ہم نے خودکشی کو اپنا ہدف اور اپنی منزل کیوں بنا لیا ہے۔

یہ کوئی نہ بوجھے جانے والی پہیلی نہیں ہے۔ ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ ہمارے

کرتوتوں کا نتیجہ ہیں۔ یہ ظلم ہم خود کمار ہے ہیں۔ ہم کلمہ گو مسلمان ہو کر اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کو رد کر رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانانِ پاکستان کے مسائل اور مصائب کا حل انفرادی اور اجتماعی سطح پر اللہ کی طرف رجوع کرنے میں اور اسلام کے عادلانہ نظا کے نفاذ میں ہے۔ ہم اِن سطور میں بار بار عوام اور حکمرانوں کو اس طرف توجہ دلا چکے ہیں اور دلاتے رہیں گے، لیکن آج مملکت خداداد پاکستان کے حالات پر نگاہ ڈالتے ہوئے ہم اضطراب اور دل گرفتگی کی کیفیت میں اللہ رب العزت سے استدعا کرتے ہیں کہ خدایا، تو ہم پر رحم فرما۔ تمام انسانوں کے دل تیری انگلیوں کے درمیان ہیں، تو ہمیں ہدایت عطا فرمادے، ہمیں اپنے دین سے مخلص کردے، ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہرگاہ اور ہردم تیرے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کریں، ہم نماز اور روزہ کی روح کو سمجھ سکیں، ہم جرأت اور بہادری میں اپنے اسلاف کی پیروی کرسکیں۔ اے اللہ! اب ہماری حالت اُس مریض جیسی ہے جسے دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت ہو۔ تو ہمارے سیئات کو حسنات میں بدل دے۔ اے اللہ! ہم سے معاملہ ہمارے اعمال کی بنیاد پر نہیں، اپنے رحیم وکریم ہونے کے حوالہ سے کر۔ اے اللہ! ہم جو کچھ بھی ہیں، تیرے محبوب نبی کی اُمت ہیں، تیرے آخری نبی کی آخری اُمت۔ اے زمین وآسمان کے رب! ہم مجبور اور بے بس ہیں اور تیرا معاملہ یہ ہے کہ تو کہتا ہے ''ہوجا'' اور وہ ''ہوجاتا ہے''۔ تو حیی وقیوم ہے، تو ہمیں بھی روحانی طور پر زندہ کردے اور ہمیں تھام لے کہ تو گرتوں کو تھام لینے والا ہے وگرنہ تیرے یہ دشمن تین خداؤں کو ماننے والے اور نبیوں کو قتل کرنے والے طعنہ دیں گے۔

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں



عافیہ انسانیت اور عافیت

عالمِ اسلام پر کیا بیت رہی ہے۔ قبلہ اوّل کو کھوئے ہوئے نصف صدی ہونے کو ہے۔ مسجد اقصیٰ میں نماز یہودیوں کی اجازت سے پڑھی جا سکتی ہے۔ فلسطینیوں کو بے گھر کر کے یہودی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ احتجاج کرنے والے فلسطینی لڑکوں پر اسرائیلی ٹینک گولے برسا رہے ہیں۔ فلسطینیوں کی ایک آبادی کو محاصرے میں لے کر اُنہیں زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم کر دیا گیا ہے۔ بچے دودھ اور دوا کے لیے بلک رہے ہیں۔ اِدھر جنوبی ایشیا میں یوں تو بھارت نے سارے ملک میں مسلمانوں کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے لیکن جنت نظیر وادیٔ کشمیر میں کشمیری نوجوانوں کا اتنا خون زمین میں جذب ہو چکا ہے کہ اگر آنے والے دنوں میں ٹھنڈے پانی کے چشمے خون اگلنے لگیں تو کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہزاروں نوجوان لاپتہ ہیں جنہیں کسی عدالتی کارروائی کے بغیر جیلوں میں اذیتیں دے کر ہلاک کیا جا رہا ہے۔ ایسی لرزا دینے والی اذیتیں کہ جس نوجوان قیدی کو موت اپنی آغوش میں لے لے دوسرے قیدی اُس کی قسمت پر رشک کرتے ہیں۔ بھارتی فوجیوں کو قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس گھر میں چاہیں بلا اجازت بغیر وارنٹ داخل ہو سکتے ہیں۔ اِسی آڑ میں ہزاروں کشمیری دوشیزاؤں کی عصمت بھارتی درندے تار تار کر چکے ہیں۔ معاشی طور پر کشمیریوں کو تباہ کرنے کے لیے امن و امان قائم کرنے کا بہانہ بنا کر کرفیو لگا دیا جاتا ہے۔ افغانستان اور عراق میں امریکہ مسلمانوں کا قتلِ عام کر کے سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر قتل و غارت کی ایسی تاریخ رقم کر رہا ہے کہ انسانی تاریخ ماضی میں ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ کتنے قتل کر لیے ہوں گے چنگیز خاں اور ہلاکو خان نے تیر و تفنگ سے؟ امریکہ ایک ڈیزی کٹر سے انسانی لاشوں کے ٹکڑے فضا میں پھیلا دیتا تھا، کسی کا سر درخت کی شاخوں پر لٹکا ہوتا

تھا اور کسی کا دھڑ پہاڑ کی چوٹی سے ملتا تھا۔ فاسفورس بموں سے گاؤں کے گاؤں جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔ ایسے وحشت ناک حملوں سے دونوں ممالک پر قبضہ کیا لیکن جب وہاں سے آزادی کی خاطر مزاحمت شروع ہوئی تو اُسے دہشت گردی کا نام دے کر خون کی ہولی کھیلی اور اب تک کھیل رہا ہے۔

مغرب جمہوریت کو انسانی ترقی کی معراج قرار دیتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت انسان کے ذہنی اور شعوری ارتقا کی انتہا ہے، انسان کی آزادی، انسانوں کے مابین مساوات اور اُن کے حقوق کے حوالہ سے جمہوریت سے آگے کچھ نہیں ہے۔ جمہوری ممالک میں انسانی جان کا ہی احترام نہیں بلکہ حیوانوں کے تحفظ کے لیے انجمنیں ہیں، لیکن جمہوریت کے ساتھ یہ عجیب مذاق ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت ہے جو کشمیر میں انسانی خون کو انتہائی بیدردی سے بہا رہا ہے۔ امریکہ دنیا کی عظیم ترین جمہوریت سمجھی جاتی ہے۔ امریکی جمہوریت کو اپنے ایمان کا حصہ قرار دیتے ہیں، لیکن یہی امریکہ انسانوں کا سب سے بڑا قاتل ہے، اس کی انسانی خون کی پیاس مٹنے کو نہیں آ رہی۔ اسرائیل دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریت ہے لیکن کسی سے کم خونخوار نہیں ہے۔ عالم اسلام پر یہ کیا بیت رہی ہے۔ مسلمان کا خون دنیا کی ارزاں ترین شے کیوں بن گئی ہے؟ مسلمان عورت کی عزت سے کھیلنا اتنا آسان کیوں ہو گیا ہے؟ اس کی حقیقت جاننے سے پہلے ایک کہاوت سن لیں۔ ایک آرے سے ایک درخت کو کاٹا جا رہا تھا، کسی نے درخت سے کہا تو اتنا بڑا درخت اور ایک چھوٹا سا لوہے کا بلیڈ تجھے کاٹے جا رہا ہے؟ درخت نے کہا اس بلیڈ کی کیا جرأت ہے کہ یہ مجھے کاٹے، درحقیقت میرا بھائی لکڑی کا وہ دستہ جو اس بلیڈ کی پشت پر نصب ہے میں اُس کے ہاتھوں مارا جا رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم کفر کی پشت پر موجود ننگِ ملت، ننگِ وطن، اور قوم فروش مسلمان حکمران مسلمانوں کی ذلت و رسوائی اور قتل و غارت کے ذمہ دار ہیں۔ قومی اور ملی مفاد کے یہ سوداگر مسلمان کے خون اور عزت کی قیمت وصول کر رہے ہیں۔ امریکی ایجنٹ مشرف نے پاک سرزمین اور فضا افغانیوں کے قتل عام کے لیے امریکہ کے حوالے کر دی۔ شمالی اتحاد نے امریکہ کو افغانستان میں خوش آمدید کہا۔ کرزئی افغانیوں کی کھوپڑیوں پر تخت سجا کر بیٹھ گیا۔ کشمیر میں شیخ عبداللہ خاندان کشمیریوں کی لاشوں پر رقصاں ہے۔ یہ خاندان اپنی مسلمان بہنوں اور کشمیر کی بیٹیوں کی عزت و عصمت بھارتی درندوں کے ہاتھوں تباہ و برباد کروانے کے لیے اُن سے مکمل تعاون کر رہا ہے۔ محبوبہ مفتی کیا خوب نام ہے، کشمیر میں اپوزیشن کا رول ادا کرتے ہوئے عمر عبداللہ

کو ناقص منتظم کا طعنہ دے رہی ہیں۔

تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ امریکی عدالت نے ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو 86 سال قید کی سزا سنادی ہے۔ قوم کی اس انتہائی ذہین اور نیک بچی کو ہمارے ایک بد بخت بدقماش اور بدنیت حکمران نے اپنی کرسی کی مضبوطی کی خاطر اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ شائستگی اور قلم کی حرمت اجازت نہیں دیتی وگرنہ موجودہ حکمرانوں کے لیے کچھ بڑھ کر القاب استعمال کیے جانے چاہئیں تھے، کیونکہ بقول عافیہ کی بہن کے مشرف نے عافیہ کو ایک بار بیچا تھا انہوں نے اسے بار بار بیچا ہے۔ یعنی جان بوجھ کر ایسے مواقع گنوا دیئے جن سے فائدہ اُٹھا کر اُسے رہا کروایا جاسکتا تھا۔ کاش! عزت وعصمت، غیرت وحمیت اور شرافت کے نام سے نا آشنا مشرف کو اُس وقت تصور میں اپنی بیٹی آجاتی جب اُس نے عافیہ کو کراچی سے اسلام آباد جاتے ہوئے ایجنسیوں کے ذریعے اُٹھوا کر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ لیکن ایسا کیونکر ممکن تھا؟ بے غیرتی ایمان کا وہی حشر کرتی ہے جو آگ سوکھی لکڑی کا کرتی ہے۔ کسی کو اچھا لگے یا برا، اس لیے کہ عوام کو کوئی دوش دینا فیشن کے خلاف ہے، جمہوری تقاضوں کے خلاف ہے، لیکن اللہ کرے ہمارا قلم اُس روز ٹوٹ جائے، اُس کی سیاہی سوکھ جائے جب ہم حق بات لکھنے سے گریز کریں۔ اُس قلم کی سیاہی قلمکار کے منہ پر تھوپ دینی چاہیے جو اقتدار کی طاقت یا عوام کی ناراضگی کے ڈر سے جان بوجھ کر خلافِ حقیقت بات لکھے۔ ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ اگرچہ اصل اور بڑے مجرم تو مسلمان حکمران ہی ہیں لیکن عام مسلمان کا جرم بھی قابلِ گرفت ہے کہ وہ خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔ اگرچہ ہم سمجھتے ہیں کہ عام مسلمان شہری کو بڑی مجبوریاں ہیں، اُس کے راستے میں ایسے کانٹے بچھا دیئے گئے ہیں کہ وہ اُنہیں چنتا ہوا زندگی تمام کر لیتا ہے، لیکن پھر بھی اُسے جاننا چاہیے کہ قومیں افراد سے بنتی ہیں، ہمت جرأت اور قربانی کے بغیر کوئی منزل حاصل نہیں ہوتی۔ خون کے دریا عبور کیے بغیر اور مصائب والآم کے پہاڑ سر کیے بغیر منزل ہاتھ نہیں لگ سکتی۔ اُسے اِن منافقوں کے خلاف جہاد کرنا ہوگا اور عالم کفر کے خلاف قتال کے لیے قوت فراہم کرنا ہوگی۔ یہی ہمارے اسلام کا تقاضا ہے، یہی ہمارے ایمان کا تقاضا ہے۔ شیطانی قوتوں کا راستہ نہ روکا گیا تو یہ ہمیں صفحہ ہستی سے مٹانے سے گریز نہیں کریں گی۔ حکمرانوں کی غیرت جاگنے کا کوئی امکان نہیں عوام ہی کو اٹھنا ہوگا، لیکن اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے، اس سے پہلے کہ

رکاوٹیں دیوارِ چین کی صورت اختیار کر جائیں، اس سے پہلے کہ موت کے آثار واضح ہو جائیں کہ ایسی صورت میں توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، آیئے، سب مل کر توبہ کریں، اپنے انفرادی اور اجتماعی گناہوں کی معافی مانگیں۔ آیئے، رجوع کریں اللہ قادرِ مطلق کی جانب، آیئے، اللہ کی کتاب کو اپنا امام بنائیں۔ آیئے، رسول اللہ ﷺ کی سنت کو اوڑھنا بچھونا بنالیں۔ یہی دنیوی سربلندی اور اُخروی نجات کا راستہ ہے۔ ہم آخر میں قارئین کو ایک خوشخبری سنائے دیتے ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی کریں معلوم ہوگا کہ جب کوئی سپر پاور زوال پذیر ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے اخلاقی لحاظ سے زوال پذیر ہوتی ہے۔ عافیہ جیسی بے گناہ اور معصوم خاتون کو ظالمانہ انداز میں سزا دینا اخلاقی گراوٹ کی انتہا اور امریکی قوت کے زوال کا آغاز ہے۔ امریکی مظالم سے دنیا کو نجات حاصل ہوگی تو عافیہ ان شاءاللہ انسانیت کے لیے عافیت کا باعث بنے گی۔ ان شاءاللہ!



اے ٹیپو سلطان کے بیٹو.....

''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے''۔ ٹیپو سلطان کا لگایا ہوا یہ نعرۂ مستانہ دو صدیوں سے زائد عرصہ سے پاک و ہند کی فضاؤں میں گونج رہا ہے۔ 2001ء میں نائن الیون کے موقع پر یہ نعرہ اگر صدر مشرف اور اُس کے کاسہ لیسوں کے کانوں تک پہنچ جاتا تو ایٹمی قوت کی حامل پاکستانی قوم (اس نام کی کوئی قوم اگر اب بھی وجود رکھتی ہے) آج یوں سسک سسک کر دم نہ توڑ رہی ہوتی۔ فرد ہو یا قوم بزدلی اور بے غیرتی دو ایسے اوصاف ہیں جن کا نتیجہ ذلت و رسوائی، شکست و ریخت اور ہزیمت کے سوا کچھ نکل ہی نہیں سکتا۔ عزت و احترام اور وقار اس قوم سے یوں غائب ہوئے ہیں جیسے طلوعِ آفتاب سے تاریکیاں پسپا ہو جاتی ہیں۔ بزدلی اور بے غیرتی انسان کو بانجھ کر دیتی ہیں۔ انسان ایسی بنجر زمین کی مانند ہو جاتا جو طویل مدت سے بارانِ رحمت سے محروم ہو۔ آج ہم دیوار کے ساتھ لگائے جا چکے ہیں۔ ہمیں اُس امریکہ اور مغرب نے دیوار سے لگایا ہے جسے ہمارے ڈھول کی تھاپ پر تالیاں بجاتے ہوئے مسخرے حکمران اپنا اتحادی کہتے ہیں۔ حکمران کا کردار ماں کے کردار جیسا ہونا چاہیے، ڈائن یا سانپ جیسا نہیں جو اپنے بچوں کو کھا جاتے ہیں۔ یہ اظہار جذبات نہیں اظہارِ حقیقت ہے۔ کیا پاکستانی قوم پر ہونے والے ڈرون حملے جس میں بچے، بوڑھے اور عورتیں شہید ہو رہی ہیں ہمارے حکمرانوں کی رضامندی اور اجازت سے نہیں ہو رہے؟ تو پھر آج نیٹو کے ہیلی کاپٹروں سے گولہ باری پر احتجاج کس بات کا کیا جا رہا ہے۔ کس کو دھوکہ دے رہے ہیں زرداری اور گیلانی؟ کیوں اتنا احمق سمجھتے ہیں عوام کو؟ خصوصاً ہم یوسف رضا گیلانی سے مخاطب ہو کر کہیں گے کہ ہم آپ کے شجرہ نسب کو چیلنج نہیں کرتے۔ آپ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد ہوں گے لیکن ہم آپ کو انتباہ کیے دیتے ہیں کہ اللہ

رب العزت انسان کو اُس کے اعمال کے حوالہ سے پرکھتا ہے۔ فرمانِ خداوندی ہے: ﴿لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ کیا آپ جانتے نہیں کہ وہ ابولہب جس کے دونوں ہاتھ ٹوٹنے کی خبر مالک کائنات اپنے کلام میں دیتا ہے اور ہادی برحق، محسن انسانیت، محمد مصطفیٰ ﷺ جن پر خود اللہ اور اُس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں چچا بھتیجا تھے اور اِن کا شجرہ نسب ایک ہی تھا۔ ایک مقامِ محمود پر فائز ''بعد از خدا بزرگ توئی'' کا جائز حقدار اور ایک جہنم کی بدترین وادی کا مکین۔ اللہ ہمیں اور آپ کو معاف فرمائے، کوئی غلط فہمی ہمیں ہلاک نہ کردے۔

امریکیوں اور اہلِ مغرب کی دیدہ دلیری کا اندازہ کریں کہ ہماری سرزمین پر بمباری اُس وقت کر رہے ہیں جب ہمارے حکمران صف باندھ کر سی آئی اے کے سربراہ لیون پینٹا کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔ عوام جو مجبور و محکوم اور شائد مقہور و معتوب بھی ہیں، اُن کے خون پسینہ کی کمائی سے اُن ہی کے دشمن کی پذیرائی ہو رہی ہے اور اُسے پروٹوکول دیا جا رہا ہے۔ ظہرانوں اور عشائیوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ تُف ہے ایسے حکمرانوں پر اور ہدایت کی آرزو اور دعا ہے اُن عوام کے لیے جو ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کے مصداق بنے ہوئے ہیں۔

ہم صاف صاف بات کرنے کے قائل ہیں۔ ہم بہت سا شکوہ اور شکایات رکھنے کے باوجود اپنی عسکری قیادت سے ابھی مکمل طور پر مایوس نہیں ہوئے۔ ایک دنیا ہماری فوج کی جرأت، جنگی مہارت اور پیشہ وارانہ صلاحیت کی قائل ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ یہ صفات اگر ہیں تو انہیں بروئے کار لائیں۔ وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر مریض کے لیے اُس وقت تک جدوجہد کر سکتا ہے جب تک اُس کا سانس برقرار ہو۔ قوم کے پاؤں مریض کے سانس کی طرح اکھڑ رہے ہیں۔ ہمارا مطالبہ نہ نائن الیون کے موقع پر یہ تھا کہ امریکہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جائے نہ آج ہے۔ ہمارا تو صرف اور صرف یہ مطالبہ ہے کہ ہم چونکہ امریکہ کے برادر اسلامی ملک افغانستان پر حملہ کو جائز نہیں سمجھتے لہٰذا ہمیں اس حوالہ سے اُس کی کسی قسم اور کسی نوعیت کی کوئی مدد نہیں کرنی چاہیے۔ ہم افغانستان کے خلاف اپنی فضا، اپنی زمین اور اپنا سمندر استعمال نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اس جنگ میں تمہارے مخبر نہیں بن سکتے جسے آج کی جدید اصطلاح میں intelligence sharing کہتے ہیں۔



''ایں جا بیا!''

اگر چہ کسی کالم نگار یا اداریہ نویس کے لیے تنقیدی تحریر تائید کی نسبت خاصی آسان اور سہل ہوتی ہے لیکن کسی ابلیسی کردار کو زیرِ بحث لانا پڑ جائے تو اخلاقی تقاضوں کو ملحوظ رکھنے والے خوش تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں خود کو مقید کرنے والے قلمکار کے لیے بڑی مشکل بن جاتی ہے کہ وہ قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے کردار کی کرتوتوں کو اُن الفاظ کا لبادہ اوڑھائے جس کا وہ حقدار ہو اور جس سے اُس کے مکروہ کردار کی صحیح عکاسی ہو جائے۔ ایک اچھا اور خوش اخلاق قلمکار بھی بہر حال ایک انسان ہوتا ہے۔ جب اُسے کسی ننگِ دین، ننگِ ملت اور ننگِ وطن شخص کو زیرِ بحث لانا پڑ جائے تو جذبات کو قابو رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم خود کو اِس مشکل میں کسی صورت میں نہ ڈالتے اگر پاکستان کا جلاوطن یا صحیح تر الفاظ میں بھگوڑا سابق صدر پرویز مشرف انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیارِ غیر سے پاکستانی سیاست میں کودنے کا اعلان نہ کرتا۔ اُس کا یہ اعلان کہ ''پاکستان کو میری ضرورت ہے'' ہر غیرت مند پاکستانی کے لیے انتہائی شرمندگی اور ندامت کا باعث ہے۔ ہمیں مشرف کے سیاست میں حصہ لینے پر اعتراض کیوں ہوتا۔ ہمیں اعتراض اس حواس باختہ شخص کی بے ہودہ اور ناشائستہ گفتگو پر ہے جو اس نے اپنی ''آل پاکستان مسلم لیگ'' کے تاسیسی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کی ہے۔ ہمیں اعتراض اس بات پر ہے کہ اپنے ماضی پر اظہارِ ندامت کرنے کی بجائے اُس نے ایک بار پھر اپنے مذموم عزائم کا اظہار کیا، طالبانِ افغانستان اور غیور مسلمانوں کے خلاف اپنے خبث باطن کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اُس کی تاسیسی گفتگو پر اظہارِ خیال کریں ہم چاہیں گے کہ اِس قومی مجرم پر فردِ جرم عائد کریں۔

1۔ 12 اکتوبر 1999ء کو مشرف نے اپنے حلف کی خلاف ورزی کی اور آئین شکنی کر کے وقت کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

2۔ عوام کو دھوکہ دینے کے لیے ایک پُرکشش سات نکاتی ایجنڈا پیش کیا جس کی کسی ایک شق پر بھی نو سال میں عمل درآمد نہ کیا۔

3۔ صدر کا عہدہ سنبھالتے ہی دو عدد کتے گود لے کر امریکہ کو اپنے مخالفِ اسلام ہونے کی یقین دہانی کرائی۔

4۔ نائن الیون کے بعد ایک مکمل امریکی ایجنٹ کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ ملا عمر کی امارتِ اسلامیہ افغانستان کو تباہ و برباد کرنے میں امریکہ کا بھرپور ساتھ دیا۔

5۔ اپنے کور کمانڈرز اور فضائیہ کے سربراہ کو بتائے بغیر اپنے کچھ فضائی اڈے امریکہ کے حوالے کر دیئے۔ اپنے فضائی فوج کے سربراہ کو تین دن قید رکھا، بعد ازاں وہ ایک فضائی حادثہ میں ہلاک کر دیا گیا۔

6۔ امریکہ کے ریلیز کردہ اعداد و شمار کے مطابق ایک ماہ میں پاکستان کے ہوائی اڈوں سے افغانستان پر ستاون ہزار حملے کروائے۔

7۔ امریکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ایک بہت بڑا جرم یہ کیا کہ قبائلی علاقوں میں پاکستان کی فوج داخل کر دی حالانکہ آزادی کے وقت قائداعظم نے قبائلی عمائدین سے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان کبھی اِن علاقوں میں فوج داخل نہیں کرے گا۔

8۔ مشرف کے دور میں امریکہ نے پہلی مرتبہ ہماری فضائی اور زمینی سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ڈومہ ڈولہ پر میزائل برسائے جس سے ایک مدرسہ میں قرآن پڑھتے ننھے منھے درجنوں بچے شہید ہو گئے۔ مشرف نے انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس جرم کو اپنی فوج کے سر تھوپ دیا اور کہا کہ مدرسہ میں دہشت گرد چھپے ہوئے تھے اور یہ حملہ خود ہماری فضائیہ نے کیا ہے۔

9۔ سابق صدر پرویز مشرف کے بدترین جرائم میں سے ایک یہ تھا کہ اُس نے پاکستان کی انتہائی ذہین تعلیم یافتہ اور دینی شغف رکھنے والی بیٹی ڈاکٹر عافیہ کو کراچی سے اغوا کر کے امریکیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔

10۔ ڈاکٹر عبدالقدیر جس نے پاکستان کو ایٹمی صلاحیت کا تحفہ دیا، جو ہمیشہ پاکستانی قوم کے ہیرو رہے، اُنہیں محسنِ پاکستان بھی کہا جاتا ہے، اُنہیں امریکہ کے کہنے پر ذلیل وخوار کیا۔

11۔ عدلیہ کی مٹی پلید کی۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس کو ایک پولیس مین نے سر کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ ججوں کو گھروں میں نظر بند کیا گیا اور اُن سے بدسلوکی کی گئی۔

12۔ این آر او جیسا بدنام زمانہ قانون صدر مشرف کے دور ہی میں بنایا گیا جو دنیا بھر میں پاکستان کے لیے رسوائی کا باعث بنا۔

13۔ اکبر بگٹی ایک بلوچ سردار تھا، اُس میں بہت سی کمزوریاں ہوں گی لیکن وہ کبھی ریاست پاکستان کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتا تھا، اُسے ظالمانہ انداز میں قتل کر کے بلوچستان میں پاکستان سے علیحدگی کی تحریک کا جواز فراہم کیا۔

14۔ آخر میں ہم اُس کے بدترین جرم کا ذکر کریں گے۔ ایسا جرم جس کی تفصیل میں جانے سے ہمارا قلم کانپ رہا ہے۔ لال مسجد میں کارروائی کا جرم۔ جامعہ حفصہ کی طالبات کا خون بہانے کا جرم۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ غفور ورحیم ہے، وہ معافی طلب کرنے پر کوئی جرم بھی معاف کر سکتا ہے لیکن اگر مشرف اس جرم پر معافی طلب نہیں کرتا تو اس دنیا میں اس جرم کی سزا پائے بغیر قبر بھی اُس کا لاشہ قبول نہیں کرے گی۔ آخرت کی سزا تو بہر حال ہے۔ صدر مشرف نے اپنے دورِ حکومت میں جن سینکڑوں جرائم کا ارتکاب کیا اُن میں سے چند ایک قارئین کی نظر کیے ہیں۔ اُس کے دور میں حکومتی ایوان عیش وعشرت کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ بادہ خوری اور راگ ورنگ کی محفلوں کا انعقاد روزمرہ کا معمول تھا۔ حیا باختہ عورتوں کا سرکاری رہائش گاہوں میں مجمع لگا رہتا تھا۔ بہت سی ایسی وڈیو فلمیں موجود ہیں جن میں پرویز مشرف سر پر شراب کا گلاس رکھے سرِ محفل ناچتا دکھایا گیا ہے۔ دوسرے گویوں کے ساتھ مل کر گانا، طبلہ بجانا اُس کے مشاغل میں شامل تھا۔

یہ سب کچھ تحریر کرتے ہوئے ہمیں یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم خود کسی جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں، لیکن جب پرویز مشرف جیسا دین دشمن انسان سیاست میں کودنے کا اعلان کرے گا، جب وہ کہے گا کہ پاکستان کو اُس کی قیادت کی ضرورت ہے تو ہمارا قومی اور دینی فریضہ ہے کہ برائی کے اس سرچشمہ کے راستے کی دیوار بنیں۔ ہمارا فرض ہے کہ پاکستان کو اِس گھناؤنے کردار کے حامل شخص سے بچانے کی کوشش کریں۔ ہماری تحریریں گواہ ہیں کہ صرف سابقہ صدر پرویز

مشرف ہی نہیں موجودہ حکمرانوں سے بھی ہم نے کوئی رعایت نہیں کی اور اُن کے خلاف بھی قلمی جہاد کرنے سے گریز نہیں کیا۔ ہم انہیں بھی پرویزی دور کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ ہم ان شاء اللہ ہر جابر، ظالم اور غاصب کے خلاف کلمہ حق بلند کرتے رہیں گے۔ یاد رہے ہمارے نزدیک ہر وہ حکمران جابر، ظالم اور غاصب ہے جو مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں شریعت محمدیؐ نافذ نہیں کرتا یا اُس کے نفاذ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرتا ہے۔ پاکستان نفاذِ اسلام کے لیے معرض وجود میں آیا تھا۔ ہندوؤں سے الگ ہونے کا کوئی تک اور جواز ہی نہیں تھا اگر پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی ریاست نہیں بنانا تھا۔ لیکن آیئے سیکولر طبقات اور ملحد افراد کی یہ بات ایک منٹ کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں کہ اسلامی فلاحی ریاست نہیں بلکہ محض مسلمانوں کا الگ ملک بنانا تحریک پاکستان کا اصل ہدف تھا تب بھی ایک ایسی مملکت میں جہاں 95 فیصد سے زاید مسلمان آباد ہوں وہاں اسلامی نظام کا نفاذ اُس کے باسیوں کا قومی اور دینی فریضہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ ہم دعویٰ کریں محمد عربی ﷺ کے غلام ہونے کا، ہم دعویٰ کریں کہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے، لیکن ہم قرآن اور سنت سے ماخوذ نظام نافذ کرنے کی بجائے انگریزوں، امریکیوں اور اسرائیلیوں کے پیچھے بھاگیں، اِس سے بڑی منافقت اور حماقت کیا ہوگی؟ صاف صاف بات ہے ہمیں یا محمد ﷺ کا دین ماننا ہوگا یا اہل یورپ کا دین تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ منافقت فریب اور جھوٹ کی انتہا ہے کہ ہم کہیں کہ ہم ہیں تو مسلمان لیکن مسلمانوں کے ملک میں اسلام دشمن نظام رائج کریں گے۔ شیر گیدڑ کی کھال پہن لے اور گیدڑ جیسی حرکات کا ارتکاب کرنا شروع کر دے تو وہ شیر نہیں رہے گا۔ ہم نے آغاز میں وعدہ کیا تھا کہ ہم مشرف کی تقریر پر بھی تبصرہ کریں گے، لیکن جگہ کی کمی کی وجہ سے ممکن نہیں۔ یہ کڑوا گھونٹ پھر کبھی بھر لیں گے، اگرچہ دعا ہے کہ ایسی نوبت نہ آئے تو بہتر ہے۔ فی الحال ہم سابق صدر صاحب کو وہی جواب دیں گے جو مرزا غلام احمد قادیانی کذاب کو امیرِ افغانستان نے اپنی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت کے جواب میں دیا تھا یعنی ''ایں جا بیا!'' ترجمہ (یہاں تو آؤ!)



ہم شرمندہ نہیں!

جولین اسانج کی وکی لیکس نے بحرِ سیاست میں سونامی اُٹھا دیا ہے۔ جن ممالک کے حوالے سے ایک آدھ انکشاف ہوا ہے وہاں ردِعمل سامنے آیا ہے۔ اعلیٰ عہدیدار کی برطرفی کی خبر ہے۔ پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت کے بارے میں ہزاروں دستاویزی انکشافات ہیں۔ جولین اسانج اور اُس کی کمپنی کی انتظامیہ سمجھتی ہوگی کہ ہم پاکستانی حکمرانوں کی جس قدر تعداد میں اور جس قدر شرمناک حرکات کی دستاویزات میڈیا میں لا رہے ہیں حکومت پاکستان تو پرزے پرزے ہو جائے گی اس کے وزرا کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی ہوگی۔ اکثریت سیاست سے ہی ریٹائر ہو جائے گی۔ کتنے بے خبر ہیں یہ خبریں دینے والے۔ یہاں کرپشن کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے وزراء اور اعلیٰ سرکاری افسران بڑھکیں لگا رہے ہیں۔ ہے کوئی جو ہمارے راستے میں رکاوٹ بنے یا ہمیں میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت کرے۔ وہ ایسے انکشافات کو کوئی لفٹ نہیں کرواتے۔ اور تو اور ملک کے چیف ایگزیکٹو ملک کی نمائندہ اسمبلی کے لیڈر آف دی ہاؤس وزیر اعظم پاکستان ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اِن خبروں کو سنجیدہ نہیں لیتا۔ آہ ری قسمت، کیسے کیسے لوگ ہمارے حکمران بننے آ جاتے ہیں۔ اگر آپ اِن خبروں کو سنجیدہ نہیں لیتے جن کا تعلق ملکی سیاست میں غیروں کی مداخلت، نظام حکومت اور یہاں تک کہ ملکی سلامتی سے ہے تو پھر کن خبروں اور کن معاملات کو سنجیدہ لیں گے۔ کیا ہوگا اُس ملک اور اُس کی عوام کا مستقبل جس کے حکمران اور لیڈران مسخروں کی سی باتیں اور حرکتیں کریں، جو ہر وقت تالیاں پیٹتے نظر آئیں، جن کی تمام تر توجہ اپنے سوٹ بوٹ اور اپنے پروٹوکول پر ہو۔

دوسری طرف دانشوروں اور تجزیہ نگاروں نے صرف اِس بات کی رَٹ لگائی ہوئی ہے

کہ یہ ہماری توقعات کے عین مطابق ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے حکمران دوسروں کے غلام ہیں، خصوصاً امریکہ کی پاکستان کے اندرونی معاملات میں بے جا مداخلت سے کون بے خبر تھا۔ دوسرا یہ کہ جس کا کھائیں گے اُس کے سامنے پیٹ کو ننگا بھی کرنا پڑے گا۔ اگرچہ اِن تجزیہ نگاروں کی پہلی بات سے کسی قدر ہمیں بھی اتفاق ہے کہ آثار واضح ہیں اور فریقین (یعنی پاکستان اور امریکہ) کے اطوار بھی ظاہر کر رہے تھے کہ ہم اپنا غلامانہ کردار بااحسن وخوبی نبھا رہے ہیں۔ پاکستانی عوام کا یہ شک بھی صحیح نکلا کہ ڈرون حملے پاکستان کی اجازت بلکہ خواہش کے مطابق ہو رہے ہیں اور ہمارے حکمرانوں کے یہ بیان جھوٹ اور منافقت کا پلندہ ہیں کہ ہم ڈرون حملوں پر امریکہ سے احتجاج کرتے ہیں۔ اِن تمام تر شکوک وشبہات اور معلومات کے ہونے کے باوجود ہمیں وکی لیکس کے دستاویزی انکشافات سے جو دکھ پہنچا ہے وہ فطری ہے۔ اس کی مثال کچھ یوں دی جاسکتی ہے کہ کسی شخص کے طور طریقے یا اُس کی حرکات وسکنات اور رہن سہن سے شک کیا جارہا ہو کہ یہ چور ہے۔ بعض شہادتیں بھی ایسی دستیاب ہو جاتی ہیں کہ اِسے دیوار پھلانگتے یا نقب لگاتے دیکھا گیا ہے۔ لیکن جب وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے تو یقین کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ پہلے نہیں ہوسکتی۔ اگرچہ موقع پر پکڑے جانے سے پہلے بھی بعض لوگوں کو یقین کی حد تک شک تھا۔ لیکن ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جو بہت زیادہ حسن ظن رکھتے ہیں اور مشکوک حرکات کی تاویلات پر یقین کر لیتے ہیں۔ لیکن اِن دستاویزی ثبوتوں کے بعد حقیقت سامنے آ گئی ہے اور غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے سیاست دان اُن کا تعلق ایوانِ اقتدار سے ہو یا اپوزیشن سے سب رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں۔ یہ مسئلہ ثانوی ہے کہ یہ لیکج کیوں کی گئی ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس لیکج کو امریکی آشیر باد حاصل ہے یا نہیں؟ پاکستان کے لیے یہ نیا مسئلہ کھڑا کرنے والے اسرائیل اور ہندوستان ہیں یا یہ تیر اُس کمین گاہ سے چھوڑے گئے ہیں جس میں دوستی اور خیر خواہی کا اظہار کرنے والے چھپے بیٹھے ہیں؟ کوئی احمق سے احمق انسان بھی یہ شک نہیں کر سکتا کہ امریکی سفیرہ اپنی حکومت کو گمراہ کرنے کے لیے غلط، جھوٹی اور خلافِ واقعہ رپورٹیں ارسال کرتی ہوگی۔ لہٰذا وزیراعظم کا یہ کہنا کہ یہ انکشافات تصدیق شدہ نہیں ہیں اور میں انہیں سنجیدگی سے نہیں لیتا، احمقانہ اور جاہلانہ بھی ہے اور چوری کے ساتھ سینہ زوری کا مظاہرہ بھی۔ جہاں تک دوسری

بات کا تعلق ہے کہ اگر ہم دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے تو پھر پیٹ کو ننگا کرنا ہی پڑے گا۔ اولاً تو یہ کہ کس کتے نے ہمارے حکمرانوں کو کاٹا تھا جس کا تریاق صرف قرضوں کا حصول تھا۔ پھر یہ کہ کیا صرف دنیا میں پاکستان ہی مقروض ملک ہے جسے قرضے حاصل کرنے کے لیے غیروں کی مداخلت اور ایسی بے جا مداخلت قبول کرنا پڑتی ہے۔ بعض انکشافات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران خود سفیرہ صاحبہ سے رابطہ کرتے اور اپنے سیاسی حریفوں کی شکایت لگاتے تھے۔ ہمارے ایک سیاسی مذہبی رہنما محترمہ سفیرہ صاحبہ کے پاس وزیراعظم بننے کی درخواست لے کر گئے اور اُنہیں بتایا کہ اسمبلی میں اکثریت نہ ہونے کے باوجود آپ کے لیے یہ کوئی ایسا مشکل نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے عوامی نمائندوں کی اکثریت بکاؤ مال ہے۔ دوسرے ممالک قرضہ بھی لیتے ہیں اور قرض خواہ کی کچھ نہ کچھ مانتے بھی ہیں لیکن ایک حدِ فاصل قائم رکھتے ہیں، جبکہ اخلاقی دیوالیہ پن اور دنیا کی ہوس نے ہمارے حکمرانوں کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلاں طاقتور ملک کا سفارت کار یا فلاں ملک کا حکمران اگر مجھ سے بہت میٹھا بولا ہے یا اُس نے مجھ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے تو اس نے مجھ میں کوئی زبردست خوبی پائی ہے۔ اب یہ صاحب اپنے ملکی مفاد کو تج کر کے میرے لیے اقتدار کی راہ ہموار کرے گا یا میرے اقتدار کو مستحکم کر دے گا اور کسی کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ ہم وکی لیکس کا یا ذاتی طور پر جولین اسانج کا یا کسی بھی ملک کی دشمنی کا رونا کیا روئیں، حقیقت یہ ہے کہ پندرہ سو سال پہلے الصادق المصدوق خیر البشر نبی آخر الزمان ﷺ نے فرمایا تھا جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ جب کوئی قوم بگڑ جائے، ظلم عام ہو جائے، عدل اُٹھ جائے تو اللہ رب العزت اُس قوم کے بدترین اور رزیل لوگوں کو اُس قوم پر مسلط کر دیتا ہے۔ قوم آئینے کے روبرو کھڑی ہے اور اپنی شکل دیکھ کر انتہائی خوفزدہ ہے کہ یہ ڈائن کون ہے اور کیا چاہتی ہے۔ ہمیں سر بازار ننگا دیکھ کر دنیا قہقہے لگا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ یہ مسلمانی کا دعویٰ کرنے والے انسان بھی نہیں ہیں۔ ہر نیا دن پاکستان اور اہل پاکستان کو ایک نئی خبر سناتا ہے جو دنیا بھر میں اس قوم کی ذلت و رسوائی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ تعجب اور دکھ کی بات یہ ہے کہ نہ اہلِ اقتدار اور نہ عوام اس ذلت و رسوائی کی بنیادی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وجہ ہی سمجھ نہ آئے گی، اگر بیماری کی تشخیص ہی نہ کی جائے گی تو علاج کیسا اور شفا کیسی اور اصلاح کا کیا سوال۔ ہم اِن سطور میں پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ اولین اور بڑے مجرم یقیناً حکمران ہیں لیکن یہ حکمران عوام کے اعمال کا نتیجے کے طور

پر اُن پر مسلط ہوئے ہیں۔ لہٰذا چھوٹے اور مجرم نمبر 2 ہی سہی عوام کا کردار بھی مجرمانہ ہے۔ اس لیے معاشرے کی اصلاح اور اُسے نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے عوام کو اُٹھنا پڑے گا۔ ہم حالات کی نزاکت اور خطرات کا احساس دلاتے رہیں گے، عوام کو جھنجھوڑتے رہیں گے، آوازیں دیتے رہیں گے کہ آیئے، پہلے خود کو حقیقی مسلمان بنائیں پھر معاشرے اور ریاست میں اسلام کو نافذ کریں گے۔ مغربی تہذیب کا جو سانپ ہمیں ڈس گیا ہے اُس کا تریاق اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسلام اپنی ذات پر، اسلام اپنے گھر میں، اسلام محلے اور معاشرے میں، اسلام ریاست کے ہر ہر ستون کا ظاہر و باطن ہو جائے تو وکی لیکس ہمیں نہیں ہمارے حوالے سے دنیا کو شرمندہ کرے گا۔ وگرنہ ذلت اور بڑھے گی شرمندگی پھر نہ ہوگی۔

✿✿✿

''کراچی'' جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

روشنیوں کا شہر کراچی جسے ''منی پاکستان'' بھی کہا جاتا ہے آج مختلف عصبیتوں سے پیدا ہونے والی نفرت کی آگ میں بھسم ہو رہا ہے معاشرے کے دوسرے طبقات کے ساتھ خود حکمران بھی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یہ تماشا بنی خاموشی سے ہو رہی ہے جیسے مرنے والوں کا اُن سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ البتہ اُس وقت تھوڑا بہت رو پیٹ لیا جاتا ہے جب کوئی اپنا عزیز یا ہم پیشہ کسی اندھی گولی کا شکار ہو جاتا ہے۔ سیاسی لیڈروں اور حکومتی رہنماؤں نے چند بیانات اس حوالہ سے ریکارڈ کروائے ہوئے ہیں۔ ہر نئی واردات پر اور ہر نئے قتل پر اور دہشت گردی کے ہر نئے واقعہ پر وہ بیانات اخبارات اور دوسرے میڈیا کو جاری کر دیئے جاتے ہیں، مثلاً ہم مقتول کے اہل خانہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں، مجرموں کو عبرتناک سزا دی جائے گی، سارے شہر میں سیکیورٹی الرٹ کر دی گئی ہے اور دہشت گرد ہمارے حوصلے پست نہیں کر سکتے وغیرہ وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ عالیشان محلوں میں رہتے ہوئے اور لگژری گاڑیوں میں سفر انجوائے کرتے ہوئے اور سیکیورٹی گارڈز کے آہنی حصار میں محفوظ دل لگیاں کرتے ہوئے آپ کے حوصلے کیوں پست ہوں گے۔ پوچھئے اُن سے جن کا واحد کفیل اُن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر منوں مٹی تلے دفن ہو گیا۔ پوچھئے اُس نئی نویلی دلہن سے جس کے سر کا تاج نہ رہا، جسے بیوہ کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ پوچھئے اُن ننھے منے یتیم بچوں سے جن کے سر پر باپ کا سایہ نہ رہا۔ پوچھئے اُن بوڑھے والدین سے جن کا تندرست و توانا لختِ جگر خون میں نہا گیا، جن کا بڑھاپے میں عصا ٹوٹ گیا۔ پوچھئے اُن سے تمہارے اُن حوصلوں کا کیا بنا جو قیامِ پاکستان کے وقت ہمالیہ کی طرح بلند تھے، کیا بنا اُن ولولوں اور جذبوں کا جو اُس وقت تمہارے سینوں میں مچل رہے تھے۔ تم جب پاک

سرزمین پر قدم رکھتے تھے تو سربسجود ہو جاتے تھے، آنکھوں میں چمک آ جاتی تھی۔ کیا رشتہ تھا اتر پردیش، ممبئی، کلکتہ اور بھارت کے دور دراز شہروں سے کراچی اور پاکستان کے دوسروں شہروں میں ہجرت کر کے آنے والوں کا، سوائے اس کے کہ وہ ایک ہی رسول ﷺ کا کلمہ پڑھتے تھے اور کیا گناہ کیا تھا جنہوں نے اُنہیں جی آیاں نوں کہا تھا اور اُن کے لیے گھر بار کھول دیئے تھے۔ ہندوستان میں بسنے والا مسلمان ہزاروں میل کا سفر طے کر کے آیا تھا اور سفر بھی ایسا کٹھن کہ اللہ کی پناہ۔ تمام راستے بھارت کا ہندو اور سکھ بندوقیں اور کرپانیں لیے کھڑا ہے، جوان بیٹیوں کا ساتھ ہے، جان سے زیادہ اُن کی عزت کی فکر دامن گیر ہے، لیکن ایک جنون ہے، ایک جذبہ ہے جو سیلِ رواں کی طرح بہا آ رہا ہے۔ پھر یہ کہ اُن میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ منزل پر نہ عزیز و اقارب ہیں نہ دوست و آشنا ہیں لیکن وہ بھی صدیوں کی محلّہ داری چھوڑ کر اجنبیت کی طرف یوں بڑھتے چلے آ رہے ہیں جیسے وہاں کوئی اُن کا برسوں سے منتظر ہے۔ یہ نظریہ کا رشتہ تھا۔ یہ روح کا رشتہ تھا۔ یہ زمینی نہیں، آسمانی رشتہ تھا۔ یہ اسلام کا رشتہ تھا۔ اور یہ مقامی لوگ انصارِ مدینہ کی یاد تازہ کر رہے تھے، اپنے بچوں کو گُڑ چنے کھلانے والے دیگیں پکا پکا کر مہاجر کیمپوں میں لے جا رہے تھے، جیسے اُن کے آنگن میں بارات اتری ہو۔ اب حالات یکسر کیوں پلٹ گئے ہیں؟ کس کی نظر کراچی کو کھا گئی ہے؟ اِس چمن سے بہار کیوں روٹھ گئی؟ شہرِ کراچی کی روشنیاں کیوں بجھتی جا رہی ہیں؟ کراچی اندھیروں میں کیوں ڈوبا جا رہا ہے؟ محبت سے ایک دوسرے کو سینے سے لگانے والے ایک دوسرے کے سینے گولیوں سے کیوں چھلنی کر رہے ہیں؟ جو چہرے ایک دوسرے کو دیکھ کر کِھل اٹھتے تھے وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ کیوں پھیر لیتے ہیں؟ لاشیں اُٹھانے والے تھک گئے ہیں، لاشیں گرانے والے کیوں تازہ دم ہیں؟ آج یہ دیوانہ وار محبت مکروہ

نفرتوں میں کیوں تبدیل ہو چکی ہے؟ ہر دردِ دل رکھنے والا پکار پکار کر کہہ رہا ہے، کاش! اے کاش! ایسا نہ ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ کبھی کسی نے جَو بیج کر گندم کاٹی ہے؟ کبھی اُس راہی کو منزل ملی ہے جو منزل کے مخالف سمت سفر کر رہا ہو؟ یاد کرو اپنا وعدہ جب تم کہتے تھے کہ اے اللہ، ہمیں ایک قطعۂ زمین دے دے۔ ہم اُس کا نام پاکستان رکھیں گے جس کا مطلب لا الہ الا اللہ ہوگا۔ ہمارا قائد کہتا تھا، ہمارے پاس تیرہ سو سال پہلے بنا ہوا آئین موجود ہے۔ ہمیں کسی آئین کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مفکر علامہ اقبال کہتا تھا کہ مسلمانوں کو الگ ملک اسی لیے چاہیے تا کہ عرب

امپیریلزم کے دور میں اسلام کے چہرے پر جو پردے ڈال دیئے گئے تھے وہ اتار کر اسلام کا اصل روشن چہرہ لوگوں کو دکھایا جا سکے۔ پھر یہ کہ پاکستان کی خالق جماعت نعرہ زن تھی "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" ہندوستان بھر سے مسلمانوں نے اِسی لیے تو پاکستان ہجرت کی تھی، تا کہ وہ ایسے دیس میں آ جائیں جہاں اسلام کے احکامات پر چلنا ممکن ہو۔

دوسری طرف مقامی لوگوں کو مہاجروں کے بارے میں صرف یہ معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ وہ ہمارے دینی بھائی ہیں۔ بنگالی، پٹھان اور پنجابی کی معاشرت، ثقافت، بود و باش، زبان، رسم و رواج اور خوراک تک ہندوستانی مسلمان سے مختلف تھی۔ پھر ہندوستان کا مسلمان پاکستان کی طرف کیوں بھاگا؟ صرف اس لیے کہ وہ ایک دین سے منسلک تھا۔ جب اس دین کو پاکستانیوں نے جس میں مقامی اور مہاجر دونوں شامل ہیں، پاکستان میں نافذ کرنے کے لیے کچھ نہ کیا۔ جب اسلام جو دونوں کو جوڑنے کے لیے سیمنٹ کی حیثیت رکھتا تھا اُسے نکال کر الگ رکھ دیا گیا، اُس سے لاتعلقی اختیار کر لی گئی، نجی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر اسلام کو دیس نکالا دے دیا گیا۔ جب اُنہوں نے اُس رشتہ کو خیر باد کہہ دیا جس میں محمد ﷺ نے اُنہیں پرویا تھا۔ آسمانی اور روحانی رشتہ ختم ہوا تو زمینی اور مادی رشتوں نے تعلق محبت اور اپنائیت کی بنیاد فراہم کر دی۔ اب مہاجر مہاجر کا بھائی اور ہمدرد ہے۔ وہ غیر مہاجر کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور وہ ایم کیو ایم میں منظم ہوتا ہے۔ سندھی سندھی کا بھائی ہے۔ وہ مہاجر کو اپنی زمین پر مداخلت کار سمجھتا ہے۔ وہ جئے سندھ کا نعرہ لگاتا ہے۔ وہ خود کو "دھرتی کا سپوت" (son of the soil) کہتا ہے۔ ہم 1947ء میں زمین اور مادے کو لات مار کر نظریہ کی بنیاد پر باہم جڑے تھے۔ اب زمین اور مادہ ہدف ہیں جس کے لیے جنگ ہو رہی ہے۔ جنگ کے لیے پیسہ اور اسلحہ چاہیے۔ یہ ضرورت کوئی کرپشن سے پوری کر رہا ہے اور کوئی بھتہ وصول کر کے پوری کر رہا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ جب ہم مذہبوں میں جنگ ہو گی تو کسی غیر مذہب سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں ہو گا۔ مہاجر نے اگر سندھی پنجابی سے جنگ جیتنی ہے تو ہندو سے مدد لینے میں کوئی عار نہیں اور پٹھان نے اگر مہاجر کو شکست دینی ہے تو وہ امریکیوں سے کیوں نہ مدد لے، کیونکہ جنگ میں تو سب جائز ہے۔

لہٰذا کراچی کی رونقیں اگر واپس لانی ہیں، اگر اُس روٹھی ہوئی بہار کو پھر چمن کی زینت بنانا ہے، اگر چہروں کے پھر کھل اُٹھنے کی آرزو ہے تو پاکستان کو اُس کا مطلب فراہم کریں۔ مکہ مکرمہ

اور مدینہ منورہ کی آشیر باد حاصل کریں۔ اسلام کا عادلانہ نظام نافذ کریں۔ موجودہ حکومت کراچی کو امن فراہم کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اگر نئے انتخابات کے نتیجہ میں نئی حکومت برسر اقتدار آتی ہے تو اُس کی ناکامی بھی لازم ہے۔ اس لیے کہ بنیادی تبدیلی یعنی انقلاب برپا کیے بغیر امن وامان کا حصول ناممکن ہے۔ پولیس افسروں کے تبادلے، پولیس کی جگہ رینجرز کو لانا کوئی اے پی سی منعقد کرنا، یہ سب خود فریبی ہے۔ دِنوں کے وقفے کے بعد حالات بد سے بدتر ہوتے جائیں گے۔ اس تحریر کو محفوظ کرلیں۔ ہم اللہ پر توکل کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ نظامِ خلافت قائم کیے بغیر امن وامان کے قیام کا کوئی سوال نہیں۔ اے اہل کراچی! غیر اسلامی نظام فساد کی جڑ ہے۔ اِس جڑ کو اکھاڑ نہ پھینکا تو خاکم بدھن کراچی جل کر راکھ ہو جائے گا اور اگر اسلام نافذ ہو گیا تو اللہ اپنے نظام کی برکت سے کراچی کو محفوظ اور مامون رکھے گا۔ ان شاء اللہ!



شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات!

ملک کے مسائل جتنے گھمبیر اور پیچیدہ ہو چکے ہیں اور صورت حال جتنی تشویشناک ہے نہ صرف یہ کہ ایک سیاسی پارٹی کی حکومت بلکہ کل سیاسی قیادت بھی ان مسائل اور حالات سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تمام سیاسی جماعتیں، مذہبی جماعتیں، فوج، عدلیہ اور میڈیا مل بیٹھے تا کہ ملک کو اس خطرناک صورتحال سے نکال باہر کیا جا سکے۔ یہ ہے اُس تجویز کا لُب لباب جو ملک کی شاید سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ (ن) کے صدر شہباز شریف نے اپنے برادرِ بزرگ میاں نواز شریف کے مشورہ سے حکومت وقت کے آگے رکھی ہے۔ سکون اور ٹھہراؤ کی کیفیت ہو تو تالاب میں پھینکا گیا چھوٹا سا کنکر بھی ارتعاش پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن کسی دریا کی لہریں اگر پہلے ہی ہنگامہ خیز ہوں تو ارتعاش پیدا کرنے کے لیے کسی چٹان کو دریا میں دھکیلنا ہوگا۔ مذکورہ بالا تجویز دے کر میاں برادران نے ایک بڑی چٹان بلندی سے دریا میں گرا دی جس نے سب کو حیران بلکہ ششدر کر دیا ہے۔ ایک طوفان کھڑا ہو گیا ہے۔ اسے جمہوریت کی نفی قرار دیا جا رہا ہے۔ ایک مشہور و معروف سیاسی تجزیہ نگار نے اسے ایک فوجی کے میدانِ جنگ میں ہتھیار پھینکنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اسے جمہوریت دشمنی قرار دیا جا رہا ہے۔ البتہ یہ تبصرہ بھی سامنے آیا ہے کہ میاں برادران فوجی مداخلت کا خطرہ سونگھ رہے تھے لہٰذا فوجیوں کو ایسی کانفرنس میں onboard لے کر مارشل لاء کے نفاذ سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

12 اکتوبر 1999ء سے لے کر اس تجویز کے پیش کرنے سے پہلے تک میاں برادران نے کچھ ایسا انداز اختیار کیا ہوا تھا جیسے فوجی جرنیل کوئی اچھوت ہوں۔ اس ملک میں ہر شخص کو بولنے کا اور رائے دینے کا حق ہے، ہر کسی سے مشاورت ہو سکتی ہے، لیکن فوجی جرنیلوں سے کوئی بات نہیں

ہوگی، کوئی مشورہ نہیں ہوگا۔ کیری لوگر بل کی توہین آمیز شقوں کی مسلم لیگ (ن) سمیت ملک کے طول وعرض میں مخالفت ہوئی۔ فوج نے بھی عوامی جذبات کا ساتھ دیتے ہوئے اس کے خلاف ایک پریس ریلیز جاری کی، لیکن میاں نواز شریف سخت برہم ہوئے کہ فوج کو اس کی مخالفت میں میڈیا میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ موجودہ عدلیہ کے گو شریف فیملی سے بڑے مناسب تعلقات ہیں، لیکن عدلیہ کی حقیقی آزادی اور ایسی آزادی کہ وہ قدم قدم پر حکومت کو ٹوکے، میاں صاحب اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ اٹھارہویں ترمیم میں بعض شقیں جو عدلیہ کو بڑی ناگوار گزری ہیں مسلم لیگ (ن) کی مکمل حمایت سے شامل کی گئی تھیں۔ اس پس منظر میں میاں برادران کی طرف سے ایسی تجویز سامنے آنا کہ فوج اور عدلیہ کو سٹیک ہولڈرز تسلیم کرتے ہوئے کسی آل پارٹیز کانفرنس یا کسی بھی عنوان کے تحت اُنہیں ساتھ بٹھا کر ملک کے اہم ترین معاملات میں کوئی بنیادی فیصلے کیے جائیں، ایک انقلاب دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہ تجویز پیش کرتے ہوئے میاں برادران کی نیت کیا ہے، غیبوں کے راز اللہ ہی جانتا ہے۔ کیا وہ اس تجویز سے کوئی ذاتی یا سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں یا واقعتاً وہ ملک کو شدید خطرات میں گھرا ہوا دیکھ کر اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کی غیر سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے صرف اور صرف ملک کو بچانے کے لیے ایسی تجویز دینے پر مجبور ہوئے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہے ہم سمجھتے ہیں کہ اُن کی اس تجویز کو سنجیدگی سے لیا جانا چاہیے۔ مغربی جمہوریت جن کے لیے ایمان کی حیثیت رکھتی ہے، اولاً تو اس حوالہ سے اُن کا ہر ہر عمل اور کردار اُن کی منافقت کو عیاں کرتا ہے، لیکن فرض کریں کہ وہ جمہوریت سے مخلص بھی ہوتے تو پاکستان کے جینز میں جو بنیادی عنصر شامل ہے اور پاکستان کے وجود کے جو اجزائے ترکیبی ہیں، خالص مغربی جمہوریت بھی پاکستان کو ایک مضبوط اور مستحکم ملک نہیں بنا سکتی تھی۔

ہماری پُرزور رائے ہے کہ مجوزہ کانفرنس منعقد ہونی چاہیے، تمام سٹیک ہولڈرز سر جوڑ کر بیٹھیں اور پاکستان کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کے لیے کوئی مشترکہ اور متفقہ لائحہ عمل تیار کریں۔ ہماری کوئی حیثیت نہیں، ہم جانتے ہیں کہ نقار خانے میں طوطی کی کون سنے گا لیکن مشورہ امانت ہوتا ہے۔ ع شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات۔ ہم وہ بات ضرور کہیں گے جو ملک وقوم اور اُمت مسلمہ کے مفاد میں ہے۔ سب سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کونسی شے ہے جو اہل پاکستان

کے لیے قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے چار صوبے ہیں۔ لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو چاروں میں کم از کم چار مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان بنانا چاہتے ہیں۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ پاکستان میں بولی جانے والی واحد زبان ہے جو ہر صوبہ میں کچھ نہ کچھ سمجھی جاتی ہے، لیکن اردو کو بطورِ واحد قومی زبان تو قائداعظم جیسا غیر متنازعہ لیڈر اور فادر آف دی نیشن بھی بھلے وقتوں میں دوسروں سے منوا نہ سکا، آج یہ بات کون سا لیڈر منوا سکے گا؟ چاروں صوبوں کا کلچر مختلف ہے۔ رہن سہن، بود و باش یکسر مختلف ہے۔ یہاں تک کہ رسم و رواج مختلف ہیں۔ جغرافیائی سطح پر سندھ اور بلوچستان کو سمندر کا ساحل حاصل ہے، پنجاب land locked ہے۔ سابقہ صوبہ سرحد اور حالیہ خیبر پختون خواہ از سر تا پا افغانیوں سے مشابہت اور مماثلت رکھتا ہے۔ اُسے پنجاب اور سندھ سے کیا لینا دینا۔ اداروں پر نظر ڈالیں، تمام ادارے مردہ ہو چکے ہیں۔ کسی میں زندگی کی رمق نہیں۔ حکمرانوں نے اپنے ہاتھوں سے اُن کی گردن دبائی ہے اور انہیں موت کی نیند سلایا ہے۔ صرف فوج کا ادارہ بچا ہے، اگرچہ وہ بھی دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکا ہے، لیکن اِس ادارے کو پنجاب کے ساتھ زبردستی نتھی کر کے باقی صوبے اسے بھی ختم کرنے کے درپے ہیں۔ لسانی اور صوبائی عصبیت اور مذہبی فرقہ واریت کو غیر ملکی ایجنسیاں بڑی کامیابی سے ہوا دے رہی ہیں۔

سوچیے تو سہی، کونسی قدرِ مشترک ہے؟ کس شے کو نکتہ اتحاد بنا کر مشترکہ اور متفقہ لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا ہے اور عملی شکل دے کر ڈوبتی کشتی کو کنارے لگایا جا سکے گا؟ ان حالات میں وردی اور متحرک اور فعال جوڈیشری بھی سیاست دانوں کو کیا سہارا دے سکے گی؟ عین ممکن ہے کہ نشستند، گفتند اور برخاستند کشیدگی کو مزید بڑھا دے۔ پھر کیا ہونا چاہیے؟ کیا اس ملک کو خود کش دھماکوں سے جھلنے دیں؟ کیا مثالی کرپشن سے آنکھیں بند کر لیں تا کہ وہ ناؤ کو سمندر کی تہہ میں لے جائے؟ کیا نااہلی اور بیڈ گورننس کے ہاتھوں ملک تباہ ہوتے خاموشی سے دیکھتے رہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں! تصور میں خود کو 40 کی دہائی میں لے جائیں۔ بنگالیوں، سندھیوں، پنجابیوں، پٹھانوں اور بلوچوں میں یہ سب اختلافات موجود تھے۔ اگر یہ positive point موجود تھا کہ لوگوں کا اخلاق اور کردار بہتر تھا تو یہ منفی نکتہ بھی موجود تھا کہ انگریز حکمران اور دولت مند و منظم ہندو مخالفت میں ڈٹے ہوئے تھے۔ لیکن ایک نعرے نے اختلافات کو بھی زیر و کر دیا اور انگریز و ہندو کی مشترکہ قوت کو بھی

شکست فاش سے دو چار کر دیا، وہ نعرہ تھا: ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ!'' آج کے پاکستان پر نگاہ ڈالیں، اختلافات ہی اختلافات ہیں، لیکن تحفظِ ناموس رسالت کے لیے تحریک چلتی ہے تو خیبر سے کراچی تک ایک ہو جاتے ہیں، لیکن یہاں رک جایئے، ذرا ٹھہریے، ایک بہت بڑا فرق کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ اس نعرہ کو اب مکمل کرنا ہوگا اور اسے عملی شکل بھی دینا ہوگی۔ وگرنہ اب محض خالی خولی نعرہ الٹا اثر دکھائے گا۔ اب اس میں ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ کرنا ہوگا اور اسے شروع سے آخر تک اور چھوٹے سے بڑے تک سب پر یکساں عملاً نافذ کرنا ہوگا۔ یعنی پندرہ سو سال پہلے والا سماں پیدا کرنا ہوگا۔ خلیفہ وقت مخدوم نہیں خادم ہوگا، اُسے دریائے سندھ کے کنارے بھوکے مرنے والے کتے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لینا ہوگی۔ اُسے اپنے لمبے کُرتے کا حساب بھی سرِ عام دینا ہوگا۔ اُسے عام شہری بھی عدالتی کٹہرے میں کھڑا کر سکے گا۔ ہم ان سب سر جوڑ کر بیٹھنے والوں کو با آوازِ بلند بتائے دیتے ہیں کہ زبردستی کا پیدا کردہ مصنوعی اشتراک اور اتفاق کچے گھروندے کی مانند بادِ مخالف سے زمین بوس ہو جائے گا۔ بے بنیاد عمارت حوادث کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔ ''حی علی الصلوٰۃ حی علی الصلوٰۃ'' کی صدا ہی آقا اور غلام کو ایک صف میں کھڑا کر سکتی ہے اور کالے گورے اور عربی و عجمی کا فرق مٹا سکتی ہے۔ یہ معاشرہ انصاف کا بھوکا ہے، یہاں دیانت اور امانت کا قحط ہے، دیوار پھلانگ کر گن پوائنٹ پر لُوٹنے والوں سے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر پین پوائنٹ سے لوٹنے والے کہیں زیادہ بڑے ڈاکو ہیں۔ تمام برائیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے اسلام کے دامن میں پناہ لینی ہوگی۔ پاکستان اور اسلام لازم ملزوم ہیں۔ اسلام بحیثیت نظام نافذ نہیں ہوگا تو پاکستان اپنا جواز کھو بیٹھے گا۔ یاد رکھیے، جو شے اپنا جواز کھو بیٹھے اُس کا مقام کوڑا دان ہوتا ہے۔ کاش سیاست دان، فوج، عدلیہ اور میڈیا جان لیں کہ جسدِ پاکستان میں اسلام کی حیثیت روح کی ہے۔ موجودہ پاکستان ایک بے روح لاشہ ہے جسے ہم گھسیٹ رہے ہیں اور دنیا قہقہے مار مار کر اسے نوچ رہی ہے۔ آیئے! اپنی شناخت کریں، ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں صرف اسلامی نظام ہی محفوظ و مامون بنا سکتا ہے۔ وما علینا الا البلاغ!



ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

اُنیسویں صدی کے اواخر میں جب عالم اسلام بلاواسطہ یا بالواسطہ غیروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑا ہوا تھا، روس پر زارِ روس کے نام سے بدترین آمریت مسلط تھی، البتہ یورپ میں ایک صدی پہلے اگر معاشی سطح پر صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا تو سیاسی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کے سائے میں جمہوری طرزِ حکومت قائم ہو چکا تھا، ہماری رائے میں سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ایسے طرزِ حکومت کی ضرورت تھی جس میں اکثریتی عوام کو صحیح یا غلط طور پر احساسِ شرکت ہو۔ اسی دور سے میڈیا ایک قوت کی حیثیت سے ابھرنا شروع ہوا جس نے عوام اور پارلیمنٹ میں موجود سرمایہ داروں کے نمائندوں میں ربط پیدا کر دیا۔ جس سے اس احساس کو مزید تقویت ملی کہ حکومتی طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ اگرچہ عوام نہ اس وقت جان سکے اور شاید نہ آج تک جان سکے ہیں کہ ظاہراً مادر پدر آزاد میڈیا ساری اچھل کود تو سرمائے کی گود میں کرتا ہے۔ بہرحال ہم نے بات کا آغاز کیا تھا اُنیسویں صدی کے اواخر سے جب امریکہ میں ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے تقریباً ثلث صدی بعد دنیا کے ایک بڑے حصہ میں سرمایہ، جمہوریت اور میڈیا کو شدید لیکن عارضی چوٹ لگائی۔ ہماری مراد یکم مئی 1886ء کو شکاگو میں مزدوروں کو پیش آنے والے حادثہ سے ہے۔ اس روز مزدوروں نے ہڑتال کی، جلوس نکالا، اور بڑی سطح پر مظاہرہ کیا۔ 3 مئی کو یہ عمل دہرایا گیا تو پولیس کی فائرنگ سے 4 افراد ہلاک ہو گئے، جن کے سوگ میں 4 مئی کو پھر جلوس نکلا، جس پر پولیس نے شدید فائرنگ کی۔ کسی طرف سے ایک گرنیڈ بھی پھینکا گیا جس سے بہت سے افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ مزدوروں کے ہاتھوں میں سفید جھنڈے زمین پر گرے جن میں بہت سے مزدوروں کے خون سے سرخ نظر آنے لگے۔ اسی سرخ رنگ کو آنے والے انقلاب نے استعمال کیا اور آج تک

مزدور اِس حقیقت کو جانے بغیر سرخ جھنڈے لہراتے رہتے ہیں۔ ایک جرمن فلسفی کارل مارکس نے اِس واقعہ سے بہت پہلے اپنی کتاب DasCapital کے ذریعے محنت کو اصل قوت قرار دیتے ہوئے محنت کش کی حکومت کا آئیڈیا دیا تھا، وہ خود اپنی زندگی میں کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھی یہ نظام قائم نہ کر سکا، لیکن بہت سے پیروکار اُس کی زندگی میں اور بعد میں پیدا ہوئے جنہوں نے اس فلسفہ کو قبول کر لیا تھا۔ اُدھر یورپ اور امریکہ میں سرمایہ دارانہ جمہوریت بڑی مستحکم ہو چکی تھی اور غیر صنعتی یا پسماندہ دنیا بشمول عالم اسلام پر یورپ کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تسلط قائم تھا۔ لہٰذا کارل مارکس کے فلسفہ کے تحت دنیا میں جو شور اُٹھا وہ یورپ اور امریکا کو تو خاص متاثر نہ کر سکا لیکن روس جہاں زارِ روس کے ظلم اور کرپشن نے عوام میں بے زاری اور بے چینی پیدا کی ہوئی تھی، وہاں لینن نے اسی فلسفہ کو بنیاد بنا کر 1917ء میں سیاسی فتح حاصل کر لی۔ شکاگو کے ہلاک شدگان مزدوروں کے خون کو اِس انقلاب کے لیے خوب استعمال کیا گیا اور مزدور محنت کش اور کسان کی حکومت کے نام پر ایک پارٹی کی آمریت مسلط کر دی گئی، جس نے جبر سے مخالفین کی آواز دبا دی۔ میڈیا کو بھی سرکاری پارٹی کے تحت کر دیا گیا، جس کا کام صرف حکومتی کارکردگی پر واہ واہ کرنا تھا۔ اور سوویت یونین کے گرد ایک آئرن کرٹن تان کر اِسے دنیا سے الگ تھلگ کر دیا، جس کا کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوا کہ حکومت نے کم از کم ربع صدی بڑی یکسوئی اور محنت سے سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دے کر سوویت یونین کو ایک سپر قوت بنا دیا، خصوصاً عسکری اور دفاعی سطح پر وہ دوسری قوتوں سے پیچھے نہ رہا۔ اسی لیے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر عالمی سطح پر ہونے والی بندر بانٹ میں اُسے وسیع حصہ ملا اور مشرقی یورپ میں سوویت یونین کے نظام اور اُس کی برتری کو قبول کر لیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام بلند بانگ دعوؤں اور پروپیگنڈے کے باوجود مزدور اور محنت کش کو خوشحالی کم اور نعرے اور پُرفریب وعدے زیادہ ملے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بالشویک انقلاب کے نتیجہ میں بننے والی حکومتوں نے معاشی ترقی اور معاشی وسائل کی صحیح اور منصفانہ تقسیم کی بجائے عسکری اور اسلحی قوت میں اضافہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی۔ البتہ یورپ اور امریکہ کا صنعتکار اور سرمایہ دار حالات کے تیور پہچان چکا تھا۔ ذہین سرمایہ کار یہ سمجھ گیا تھا کہ سیاسی شعور اجاگر ہو جانے کے بعد معاشی استحصال صرف اِسی صورت قائم رکھا جا سکے گا جب خالی خولی نعرے نہیں انسانوں کو سوکھی روٹی کے ساتھ ساتھ کوئی شیرینی بھی دی جائے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک میں

سوشل سیکیورٹی سکیم، مزدوروں کے لیے مفت طبی امداد، اوورٹائم، بنیادی تعلیم، اولڈ ایج بینیفٹ فنڈ اور بہت سی دوسری سکیموں کا اعلان کیا گیا۔ پھر اُن پر عمل درآمد ہوتا بھی دکھائی دیا۔ لیکن یورپ کا جن پسماندہ ممالک پر سیاسی اور عسکری تسلط تھا وہاں جاگیرداری نظام اور وڈیرہ ازم کے ذریعے Divide and rule کی پالیسی اپنا کر اپنا حکومتی سلسلہ کامیابی سے جاری و ساری رکھا۔ پاکستان نے 1947ء میں سفید سامراج کے جبری استبداد سے آزادی حاصل کی تھی۔ لیکن افسوس وائے افسوس عوام تک آزادی کے ثمرات نہ پہنچ سکے، بلکہ بعض مایوس لوگ تو غلامی کے دنوں کو اچھے دن کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ یہ حال تو متوسط طبقے کا ہے۔ رہی بات مزدور اور محنت کش اور کسان کی تو جس شخص پر ہم مصورِ پاکستان ہونے کا ''الزام'' لگاتے ہیں، اگرچہ مزدور اور محنت کش دشمن پاکستان کے قیام سے پہلے ہی اللہ نے اُسے اِس فانی دنیا سے اُٹھالیا لیکن شاید اُس کی چھٹی حس، اُس کی بے پناہ بصیرت، اُس کی دور بینی اور دور اندیشی آنے والے وقت کا دھندلا سا نقشہ اُس پر واضح کر رہی تھی کہ اُس نے اللہ کے حضور یہ درخواست دی

تو قادر و عادل ہے، مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

آج پاکستان میں مزدور اور محنت کش طبقہ کے حالات دیکھ کر اِس شعر کی تلخی کس قدر کم دکھائی دیتی ہے۔ اللہ کی قدرت اور عدل کے حوالہ سے یہ درخواست کتنی کمزور اور کمتر نظر آتی ہے۔ ہم ڈر اور خوف محسوس کرتے ہیں کہ کسی ایسی گھڑی میں ہمارے قلم سے ایسے الفاظ نہ پھسل جائیں کہ وہ قبولیت کی گھڑی ہو، وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا حکمران، صنعتکار، وڈیرہ اور سرمایہ دار (اِلا ماشاءاللہ) جو سلوک پاکستان کے مزدور اور محنت کش سے کر رہا ہے اُس پر اللہ رب العزت کی صفتِ جبار اور قہار کو صدا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جو مزدور چند آنے (ایک روپے سے کم) مزدوری لیتا تھا، وہ آج کے سات ہزار روپیہ تنخواہ لینے والے سے زیادہ مطمئن اور سکھی دکھائی دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا طبقات شب و روز پلاننگ کرتے رہتے ہیں کہ کتنے زندہ بچے ہیں، کتنوں کو گور بُرد کرنے کے لیے اگلی پالیسی بنائی جائے۔ فیملی پلاننگ کی دوسری سکیمیں جب ناکام ہوئی ہیں تو شاید اس حکمت عملی کو بطور پالیسی اپنایا گیا ہے کہ پہلے متوسط طبقہ کو غربت کی طرف دھکیلو، پھر اِن غریبوں کو زندہ یا مردہ قبروں میں اتار دو۔

1976ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک لیبر پالیسی بنی تھی، پھر ہمیں لیبر پالیسی بنانے کی فرصت نہیں ملی۔ اگر چہ غیر اعلانیہ طور پر یہ طبقات ہر روز مزدور کش پالیسی ترتیب دیتے رہتے ہیں لیکن یہ بالا دست طبقات جان لیں کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ظلم ایک حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ خدارا اُس کے غفور ورحیم ہونے کو چیلنج مت کرو۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ بلی بھی اگر کارنر کر دی جائے اور اُسے بھاگنے کی راہ نہ ملے تو یہ کمزور جانور بڑی سے بڑی قوت پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ آتش فشاں کا لاوا پھٹ جائے، اِس سے پہلے کہ بھوکے اور ننگے انسان پر دیوانگی طاری ہو جائے، اِس سے پہلے کہ تمہارا سرمایہ تمہارے وسائل تمہاری جان کے دشمن ثابت ہوں اور اِس سے پہلے کہ صحیح راہ اور صحیح راستہ دکھانے والی قوتیں جواب دے جائیں یا مایوس ہو کر دیوانگی کو اپنا راستہ بنانے والوں کی راہ میں حائل نہ رہیں، مزدور، محنت کش اور کسان کو سہارا دو، زندگی کا سہارا، تا کہ اُن میں مرنے کی بجائے جینے کی اُمنگ پیدا ہو۔ یہی تمہاری دنیا اور آخرت کے لیے بہتر ہے۔

موقع کی مناسبت سے علامہ اقبال کا ایک اور شعر نذر قارئین ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!



پس چہ باید کرد؟

تباہی و بربادی کا وہ راستہ جو نائن الیون کے بعد امریکی جنگ کا حصہ بن کر صدر مشرف نے پاکستان کے لیے چنا تھا، اُس پر موجودہ حکومت استقامت سے گامزن ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتار میں تیزی آتی جارہی ہے۔ امریکہ نے یہ آگ جلائی تھی، پھر پاکستانیوں کو بطور ایندھن استعمال کرنا شروع کیا تھا۔ پاکستان کے عوام چیخ و پکار تو کر رہے ہیں، رو پیٹ تو رہے ہیں لیکن اِس آگ کا ایندھن بننے پر مجبور ہیں۔ امریکہ اپنے حواریوں سمیت آگ کے اِس الاؤ کے گرد وحشی جنگلیوں کی طرح تالیاں پیٹ رہا ہے اور ناچ رہا ہے، بالکل اُسی طرح جیسے کئی صدیاں پہلے کچھ بادشاہ اپنے مخالفین کو بھوکے شیروں کے پنجرے میں ڈال کر جام انڈیلتے اور قہقہے لگاتے تھے، لیکن ایک فرق ہے، بادشاہ کے یہ مخالف پکڑ دھکڑ کر زبردستی اِن پنجروں میں ڈالے جاتے تھے۔ پاکستان کے حکمران اپنے شہریوں کو اِس الاؤ میں جھونکتے ہوئے امریکیوں کے حضور کورنش بھی بجالا رہے ہیں اور اُن کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ پھیلتی ہوئی آگ قبائلی علاقوں خیبر پختون خوا کے بازاروں، تھانوں، پنجاب کے میدانوں سے ہوتی ہوئی ہماری افواج کے زمینی اور سمندری ہیڈ کوارٹروں تک جا پہنچی ہے۔ لیکن مقتدر حلقے مشرف کے طے کردہ اُس راستے سے پلٹنے بلکہ مڑ کر پیچھے دیکھنے کو بھی تیار نہیں۔ اُنہیں امریکیوں نے دن رات ایک ہی سبق رٹایا ہے۔ طالبان، طالبان۔ آنکھوں پر امریکی عینکیں چڑھائے ہمارے حکمرانوں کو سوتے جاگتے طالبان ہی آگ لگاتے نظر آتے ہیں۔ ہمارے حکمران طالبان پر نظر جمائے ہوئے ہیں اور بندوقیں تانے ہوئے ہیں۔ پیچھے سے امریکی اور اُس کے حواری آگ اور بھڑکا دیتے ہیں۔ لوگ ہم جیسے غیر دانشوروں، اعلیٰ ٹیکنالوجی سے ناآشنا اور ناواقف بندوں سے مسلسل پوچھے جارہے ہیں، کب اور کیسے بجھے گی

یہ آگ؟ کون بجھائے گا یہ آگ؟ لیکن وہ ہم سے یہ نہیں پوچھتے کہ کون لگا رہا ہے یہ آگ؟ اس لیے کہ وہ اپنی تمام تر سادہ لوحی کے باوجود اپنے دشمن کو جانتے اور پہچانتے ہیں، اسی لیے اُس سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہ کھلا راز جانتے حکمران بھی ہیں، لیکن ڈالروں کی چمک اور کرسی کی ہوس نے ذہن کو ماؤف اور منہ کو بند کر رکھا ہے۔ اُن کے جسم اُن کے ضمیر کے تابوت بن چکے ہیں۔ اُن پر قرآن کا یہ فتویٰ صد فی صد منطبق ہو رہا ہے کہ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، پس وہ لوٹ نہیں سکتے۔ لیکن چونکہ اللہ ربّ العالمین نے اِسی کتابِ زندہ میں ہمیں ہدایت فرمائی ہے اور ہمیں اپنی رحمت سے مایوس ہونے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا ہم کلمہ حق کہتے رہیں گے جب تک منہ میں زبان ہے، جب تک جان میں جان ہے۔ چاہے سروں پر سنگینوں کے سائے ہوں، چاہے قلم میں اپنا خون بھرنا پڑے۔

اِن پوچھنے والوں کی خدمت میں پہلی گزارش یہ ہے کہ اگرچہ حکمران اللہ کے بڑے اور اولین مجرم ہیں لیکن بریٔ الذمہ کوئی پاکستانی مسلمان نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عمارت اپنی بنیادوں پر کھڑی نہیں کی جائے گی اُس کے زمین بوس ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟ ہم نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیں ایک خطہ ارض عطا فرما دے، ہم اُسے اسلامی فلاحی ریاست بنائیں گے، ہم دورِ ملوکیت میں اسلام کے چہرے پر پڑے ہوئے پردے ہٹا دیں گے۔ کیا کچھ نہیں ہم نے کہا تھا۔ ہم نے تو پاکستان کا مطلب ہی یہ بتایا تھا کہ ''نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے۔'' اِسی لیے یہ مملکت خداداد کہلائی اور اُس نے رمضان کی ایک مقدس رات ہمیں یہ پاک خطہ عطا فرمایا۔ لیکن پھر ہم منحرف ہو گئے، ہم نے اعراض برتا، ہم نے منہ پھیر لیا۔ دنیا کی چکاچوند نے ہماری آنکھیں چندھیا دیں۔ لہٰذا کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم غلطی کا اعتراف کریں اور رجوع کریں۔ ہم لوٹیں، ہم توبہ کریں، اللہ رحیم و کریم بھی ہے اور توّاب بھی۔ اصولی طور پر یہ توبہ حکومت کی سربراہی اور امامت میں ہونی چاہیے۔ بعد ازاں فوری اقدام کے طور پر حکومت ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائے، جس میں پاکستان کی تمام مقتدر قوتیں سیاسی و مذہبی جماعتیں موجود ہوں اور وہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ سب سے پہلے اِس کنفیوژن کو دور کریں جو میڈیا نے پیدا کر دیا ہے کہ ہمارا دشمن ہے کون؟ اُسے Identify کریں، اِس لیے کہ اِس حوالہ سے اب کون سا ابہام رہ گیا ہے؟ ریمنڈ ڈیوس، سانحہ ایبٹ آباد اور پی این ایس مہران میں دشمن کے سپیشل فورسز کے کمانڈوز کی ماہرانہ کارروائی

سے اب بات واضح ہوگئی ہے کہ وہی قوتِ ثلاثہ امریکہ کی سربراہی میں دوستی اور اتحاد کی آڑ میں پاکستان میں دہشت گردی اور خونریزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لہٰذا عملاً پہلا کام یہ کیا جائے کہ افغان جنگ کے حوالہ سے امریکہ سے معذرت کر لی جائے کہ ہمیں اِس میں مزید نہ گھسیٹا جائے۔ مصیبت یہ ہے کہ جب اس جنگ سے کنارہ کشی کا کہا جاتا ہے تو ہمارا سیکولر طبقہ چیخ اُٹھتا ہے: کیا ہم امریکہ سے جنگ کریں گے؟ وہ سپریم پاور آف دی ورلڈ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کون سا عالمی قانون اور ضابطہ ہے کہ ہمیں مجبور کیا جائے کہ ہم امریکہ کے اتحادی بنیں اور جنگ سے الگ ہونا امریکہ سے جنگ مول لینا کیوں ہے؟ دوم یہ کہ وہ تمام ہوائی اڈے جو امریکہ کو دیئے گئے تھے، امریکہ سے واپس لیے جائیں۔ پھر یہ کہ اگر امریکہ ڈرون حملے بند نہ کرے تو جیسا کہ فضائیہ کی طرف سے کہا گیا ہے کہ ہم ڈرون گرا سکتے ہیں، یہ حملے بزور بازو بند کیے جائیں۔ ایک مناسب وقت یعنی ہفتہ دس روز کا وقت دے کر نیٹو سپلائی بند کر دی جائے۔ اِس کے علاوہ بھی کسی قسم کی لاجسٹک سپورٹ نہ مہیا کی جائے۔ انتہائی اہم نکتہ یہ ہے کہ امریکی امداد سے توبہ کریں۔ بعض عناصر اس حوالہ سے بھی ڈراتے ہیں، حالانکہ جب ایٹمی دھماکوں کے نتیجہ میں ہماری امداد بند ہوئی تھی تب بھی ہم زندہ رہے تھے۔ ماضی میں ہماری حکومت نے جو حماقت عظمیٰ کا مظاہرہ کیا تھا کہ بے شمار امریکیوں کو راتوں رات بغیر سیکیورٹی کلیرنس کے ویزے دے دیئے گئے تھے، اس حوالہ سے چونکہ ریمنڈ ڈیوس جیسے لوگوں کو ڈھونڈ نکالنا انتہائی مشکل ہوگا لہٰذا جب تک حالات نارمل نہ ہو جائیں امریکی سفارت خانہ کے عملہ اور قونصل خانوں کے عملہ کے علاوہ تمام امریکیوں کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا جائے اور سفارتی عملے کی نقل و حمل پر کڑی نگاہ رکھی جائے۔ چین سے سٹریٹیجک تعلقات کو بلند ترین سطح پر لے جایا جائے۔ ہم نے امریکی خواہش پر گوادر کی بندرگاہ سنگاپور کے حوالے کر دی ہوئی ہے۔ امریکہ اس بندرگاہ کو بائی پاس کی چلا رہا ہے۔ سنگاپور کی فرم نے معاہدے کی کئی بار خلاف ورزی کی ہے۔ معاہدے کے مطابق اُسے آپریٹ بھی نہیں کیا۔ لہٰذا اُس سے معاہدہ منسوخ کر کے چین کے ساتھ تعاون سے اس بندرگاہ کو آپریٹ کیا جائے۔ ہندوستان سے اُس وقت تک کسی قسم کے مذاکرات نہ کیے جائیں جب تک وہ افغانستان میں قائم تربیتی کیمپ ختم نہ کرے جہاں سے پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری کے لیے لوگوں کو گھسایا جاتا ہے اور اُس سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ کشمیر میں ظلم و ستم بند کرے اور وہاں کے عوام کی رائے کا احترام کرے۔ ہماری سرزمین سے کسی

دوسرے ملک میں کسی نوعیت کی دہشت گردی یا تخریب کاری نہ ہو اور اِسے سختی سے مانیٹر کیا جائے۔ پاکستان کی موجودہ حکومت اپنی توبہ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے پاکستان میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کرے، وگرنہ اُس کا حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں اور ایسے لوگوں کو برسرِ اقتدار لایا جائے جن کی اولین ترجیح پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست بنانا ہو۔ ہماری رائے میں ''پس چہ باید کرد'' کا یہی جواب ہے کہ نظریاتی سطح پر ہم صراطِ مستقیم پر آئیں اور عملی طور پر مذکورہ بالا اقدام کریں تو اللہ کی مدد آئے گی اور جب اللہ کی مدد آئے گی تو تمام دنیا مل کر بھی اسلامی فلاحی پاکستان کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گی۔ وما علینا الا البلاغ!



افواجِ پاکستان کے نام!

افواجِ پاکستان کے لیے بدترین وقت 1971ء کا وہ سانحہ تھا جب ایک فوجی حکمران کے عہد میں پاکستان شکست وریخت سے دوچار ہوا۔ فوجی سطح پر یہ ایک معمولی شکست نہیں تھی بلکہ کسی فوج کو جو بدترین انداز میں شکست ہو سکتی تھی وہ ہوئی یعنی وہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔ پاکستان کی فوج نے اپنے بدترین، ازلی اور پیدائشی دشمن کے سامنے ہتھیار پھینکے۔ پاکستان کو 1971ء کے بعد بھی بعض صدمات برداشت کرنے پڑے۔ ایسے مواقع پر لیڈران نے جوشِ خطابت میں اور لکھاریوں نے اپنی تحریر کو مزین کرنے کے لیے یقیناً یہ لکھا کہ یہ صدمہ یا یہ سانحہ کسی طرح 1971ء کے سانحے سے کم نہ تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ 1971ء سے بدتر سانحہ کا وقوع پذیر ہونا ممکن ہی نہیں۔ ایک ملک دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ہمیں اُس ہندو کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے جسے ہم دن رات بزدلی کے طعنے دیتے تھے۔ طنزیہ قہقہوں میں یہ نغمہ بکھیرا جاتا تھا کہ 'جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی' (یعنی جنگ کرنا عورتوں کے بس کی بات نہیں) پھر فلک نے یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ٹائیگر نیازی اپنی بیلٹ کھول کر اور اپنا خالی پستول جنرل اروڑا کو پیش کر رہا تھا۔ یہ ایک عظیم حادثہ تھا۔ قوم دھاڑیں مار مار کر روئی۔ مال روڈ پر لوگوں نے اپنے سر دیواروں کو مارے، اُس وقت فوج پر تنقید ہوئی، عوامی سطح پر برا بھلا کہا گیا، بعض مواقع پر آوازے کسے گئے، لیکن پاکستان کی تاریخ کے اس عظیم ترین حادثہ پر بھی فوج پر تنقید شدت اور طوالت کے حوالہ سے اتنی نہ تھی جتنی تنقید آج ہو رہی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ میڈیا خصوصاً الیکٹرانک میڈیا پر پاکستان کے کسی بھی ادارے پر آج تک اتنی شدید اور برہنہ تنقید نہیں ہوئی جتنی فوج پر ہو رہی ہے تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ 2 مئی اور 22 مئی کے واقعات یقیناً انتہائی سنگین تھے اور وہ افواجِ پاکستان کے کسی نہ کسی شعبہ یا شعبہ جات

کی غفلت، نااہلی اور مکمل ناکامی کے منہ بولتا ثبوت تھے۔ اس کے باوجود ہمارے لیے انتہائی حیران کن بات ہے کہ جس ادارے کے تقدس کو 1971ء جیسا سانحہ کوئی بہت بڑی زک نہ پہنچا سکا اور جو ماہ مئی سے پہلے تک ایک بار پھر مقدس گائے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اس سے پہلے اول تو کسی میں ہمت نہ تھی کہ کوئی اُس پر میڈیا میں تنقید کرے، اگر کبھی کبھار کوئی ہلکی پھلکی بات ہو بھی جاتی تھی تو فوج اور آئی ایس آئی کا نام لینے کی بجائے اسٹیبلشمنٹ اور حساس اداروں جیسے الفاظ کی آڑ لے کر کی جاتی تھی۔ ہم کسی پر کوئی الزام نہیں لگاتے، لیکن اس حقیقت کو کس طرح نظر انداز کر دیں کہ جونہی امریکہ اور افواجِ پاکستان کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوا افواجِ پاکستان پر الیکٹرانک میڈیا کے قریباً تمام نیوز چینل ٹوٹ پڑے۔ جیسے کوئی بند ٹوٹ گیا ہو یا لاوا پھٹ پڑا ہو۔

اب ہم افواجِ پاکستان سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں کوئی مانے نہ مانے یا ہم پر کسی قسم کا فتویٰ صادر کر دیا جائے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری افواج پاکستان کی جغرافیائی حفاظت اور سلامتی کے بارے میں مخلص بھی ہیں اور Dedicated بھی۔ یہاں تک کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا کہ ان کے سر پر تحفظ پاکستان کا جنون سوار ہے۔ لیکن صاف سیدھی اور کھری بات ہے کہ اس حوالہ سے انتہائی مخلص بلکہ جنونی ہونے کے باوجود افواجِ پاکستان ماضی میں نہ صرف یہ کہ ملک کی خود مختاری اور سرحدوں کی حفاظت میں ناکام رہیں بلکہ ان کی اپنی عزت اور توقیر کی الیکٹرانک میڈیا پر دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں اور فوج بے بس نظر آ رہی ہے۔ یہاں تک کہ کور کمانڈرز کانفرنس کے اختتام پر انتہائی محتاط انداز میں کسی فوجی دبدبہ کے بغیر جو اعلامیہ جاری کیا گیا ٹی وی اینکرز نے اُسے بھی چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ کیا کبھی کوئی تصور کر سکتا تھا کہ ایک این جی او کی سربراہ خاتون ٹی وی چینل پر ہاتھ جوڑ کر کہے گی کہ فوجیو! ہماری جان چھوڑ دو۔ پھر یہ کہ یا پاکستان بچالو یا فوج بچالو۔ آپ الیکٹرانک میڈیا اور بعض سیاسی اور غیر سیاسی شخصیات پر ایک چھوڑ درجنوں الزامات لگا دیں۔ آیئے فرض کر لیں کہ آپ کے تمام الزامات صد فی صد درست ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وجہ کچھ بھی ہو آپ اپنی عزت اور ملک کی خود مختاری کے تحفظ میں ناکام تو ہوئے ہیں، یہ سب کے سامنے ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صورت حال کو exploit کیا جا رہا ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ افواجِ پاکستان کو یہ دن کیوں دیکھنے پڑے؟ ہم ایک مثال سے بات سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اور وہ یہ کہ آپ کو ایک درخت سے

بڑی محبت ہے، آپ اس کے تنے، اُس کی شاخوں اور پھل کی بڑی محنت، توجہ اور اخلاص سے حفاظت کر رہے ہیں، لیکن اُس کی جڑوں سے لاتعلق ہیں اور جس زمین پر وہ کھڑا ہے اُسے آپ نظر انداز کر رہے ہیں، تو ساری محنت سارے خلوص کے باوجود انجام کیا ہوگا وہ نوشتہ دیوار ہے۔ ظاہر ہے بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے، اسی کی نظریاتی سرحدوں کو نظر انداز کر کے اِس کی جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت ناممکن ہے۔ خدارا! اِس کو مولویوں کی بات کہہ کر نظر انداز نہ کریں۔ پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ وہ اسلام جس کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: (ترجمہ) ''اللہ کے نزدیک اسلام ہی پسندیدہ دین ہے۔'' ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (ترجمہ) ''بے شک ساری عزت اللہ ہی کے لیے ہے۔'' ذرا سوچئے، کیا اللہ کسی سے عزت کروانے کا محتاج ہے؟ اُس کے دین کو عزت دینا اور اُسے قائم کرنا درحقیقت مطلوب ہے۔ اپنے انجام سے بے خبر لوگ کہتے ہیں کہ ستاون مسلم ممالک میں سے پاکستان پر ہی فرض ہے کہ وہ دین نافذ کرے۔ اِس کے دو جواب ہیں: پہلا یہ کہ دنیا کے کسی اور مسلمان ملک کا مطلب ''لا الٰہ الا اللہ'' نہیں بتایا گیا تھا، کسی نے آزادی سے پہلے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ایک آزاد خطہ عطا فرما دے، ہم اُس میں تیرا پسندیدہ دین اسلام نافذ کریں گے اور دوسرا یہ کہ باقی ستاون مسلم ممالک کی دنیا میں کونسی عزت ہے؟ ہمیں اللہ اور اُس کے دین سے غداری کی سزا مل رہی ہے اور پاکستان میں چونکہ فوج بلاشبہ مضبوط ترین، انتہائی طاقتور اور منظم ادارہ ہے اور اِس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت فوجی آمر کی ہو یا جمہوری سیاسی، پاکستان میں قوت کا اصل سرچشمہ فوج رہی ہے۔ لہٰذا زیادہ ذمہ داری بھی فوج کی ہے۔ ہم یہاں ایک وضاحت کر دیں کہ پاکستانی فوج کو اسلامی سپاہ بنانے کا ہرگز ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے، چاہے وہ بھارت ہو یا امریکہ، جنگ چھیڑ دیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آغاز سے ہی فوجی جوانوں کی تربیت اسلامی بنیادوں پر کی جائے۔ پریڈ ہو یا نہ ہو نماز سے غفلت پر کورٹ مارشل ہو۔ فوجیوں کے مختلف کورسز میں قرآن اور حدیث کی تعلیمات بھی ایک لازمی حصہ ہوں۔ اندرونِ ملک معاملہ ہو یا بیرونی ممالک سے تعلقات، سب فیصلے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیے جائیں گے، بالفاظ دیگر امور سلطنت میں قرآن وسنت کو مکمل بالادستی حاصل ہوگی۔ اور ہم یہ تجویز کرنے سے بھی گریز نہیں کریں گے کہ جس طرح بدقسمتی سے ترک فوج کی آئینی ذمہ داری ہے کہ وہ مانیٹر

کرے گی کہ ملک کو سیکولرازم کی بنیادوں پر چلایا جارہا ہے یا نہیں۔ آپ اگر پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے بھی محافظ بن جائیں تو آپ کے لیے خوش بختی کا معاملہ ہوگا۔ ہمیں یقینِ واثق ہے ایسی صورت میں بھی اگرچہ افواجِ پاکستان کو گھوڑے تیار رکھنے کی ذمہ داری خود ہی نبھانا ہوگی کیونکہ یہ بھی اللہ کا حکم ہے، لیکن پاکستان کی جغرافیائی سرحدوں کا ہی نہیں آپ کی عزت اور توقیر کا محافظ بھی اللہ ربّ العزت بن جائے گا۔ ان شاء اللہ۔ یاد رکھیے وہ اسباب کا محتاج نہیں بلکہ مسبب الاسباب ہے۔ وما علینا الا البلاغ!



سیکولر لابی کا سفید جھوٹ

روزنامہ ڈیلی ٹائمز نے اپنی 11 اگست کی اشاعت میں پہلے صفحہ پر دو اشتہارات شائع کیے ہیں۔ اِس سے پہلے کہ اِن اشتہارات کی تفصیل سے ہم قارئین کو آگاہ کریں، روزنامہ ڈیلی ٹائمز کا قارئین سے تعارف ضروری ہے۔ اِس لیے کہ لاہور سے نکلنے کے باوجود اہل لاہور سے اس کا تعارف نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ ایک انگریزی روزنامہ ہے اور پنجاب کے سابق گورنر سلمان تاثیر جو اپنے ایک محافظ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے، اُن کی ملکیت تھا۔ اب اُن کی بیٹی کے زیر نگرانی شائع ہوتا ہے۔ سرکولیشن انتہائی کم ہے، لہٰذا اشتہار بہت کم ملتے ہیں۔ مذکورہ بالا اشتہارات میں سے بھی ایک اخبار نے خود ہی Donate کیا ہے۔ لیکن آنجہانی چونکہ شاید درجن سے زائد تجارتی کمپنیوں کے مالک تھے، لہٰذا اخبار کے لیے وسائل کبھی مسئلہ نہ بنے۔ علاوہ ازیں اکثر و بیشتر حکومت وقت کے ساتھ رہے۔ بینظیر کے دشمن اور اُس کے قتل کے الزام میں ملوث صدر مشرف کے بھی چہیتے تھے اور بے نظیر کے خاوند صدر زرداری بھی اِن سے صدفی صد راضی تھے۔ عین ممکن ہے بعض قارئین اِس تعارف کو غیر ضروری سمجھیں لیکن جو اشتہار دیا گیا ہے، اِس حوالہ سے ضروری تھا کہ اُن عناصر کا پس منظر بیان کیا جائے جو اسلام اور مسلمان دشمنی کا کوئی موقع نہیں گنواتے۔ اِن اشتہارات میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی تصاویر ہیں اور اُن کی 11 اگست کی تقریر کا وہ حصہ ہے جس کا ہمارے سیکولر عناصر سہارا لے کر اپنے نظریات پھیلاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قائداعظم جب علامہ اقبال کے پُرزور اصرار پر لندن سے واپس ہندوستان آئے تو انہوں نے سینکڑوں تقریریں کیں جن میں اعداد و شمار کے ریکارڈ کے مطابق پاکستان کے قیام سے پہلے محققین نے ایک سو ایک (101) تقاریر ایسی الگ کی ہیں جن میں اُنہوں نے واضح طور پر کہا

کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں اُنہوں نے قیام پاکستان کے بعد اپنی 13 ماہ کی زندگی میں چودہ (14) تقاریر ایسی کیں جن میں واضح کیا کہ پاکستان کا آئین قرآن و سنت کی روشنی میں تیار کیا جائے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اِن تمام تقاریر کو یہاں نقل کیا جائے۔ لیکن اگر ہم 11 اگست والی تقریر اور 25 جنوری 1948 کی کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے متن کا مطالعہ کریں تو ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ قائداعظم کا منشا کیا تھا

"You are free; you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or to any other places of worship in this state of Pakistan. You will find that in course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is the personal faith of each individual. but in the political sense as citizens of the state."

25 جنوری 1948ء کو بار ایسوسی ایشن کراچی سے خطاب کرتے ہوئے اُنہوں نے کہا:

"Islamic principles today are as applicable to life as they were thirteen hundred years ago. He could not understand a section of the people who deliberately wanted to create mischief and propaganda that the constitution of Pakistan would not be made on the basis of Shariat."

قارئین کرام! 11 اگست کی تقریر ظاہر کر رہی ہے کہ قائداعظم اقلیتوں کو محض یہ یقین دہانی کروا رہے ہیں کہ پاکستان بننے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مذہبی آزادی کے حوالہ سے اُن سے کسی قسم کا امتیازی سلوک کیا جائے گا اور یہ بھی عین اسلام کے مطابق ہے۔ علاوہ ازیں محسوس ہوتا ہے کہ قائداعظم نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ایسی بات کہی جائے کہ عالمی برادری نوزائیدہ پاکستان کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائے۔ لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ بعض عناصر اُن کی 11 اگست کی تقریر کو

غلط معنی پہنا رہے ہیں تو اُنہوں نے 25 جنوری 1948ء کی اپنی تقریر میں شر انگیز پروپیگنڈا پھیلانے والوں کی خوب خبر لی اور سوچ سمجھ کر اسلامی نظام کی بجائے شریعت کے نفاذ کا ذکر کیا۔ لیکن بفرض محال ہم 11 اگست کی تقریر کے حوالہ سے سیکولر عناصر کا تھوڑی دیر کے لیے موقف تسلیم بھی کرلیں تو سوال یہ ہے کہ اُن کی 5 ماہ پہلے کہی گئی بات کو ترجیح دینی چاہیے یا بعد میں کی گئی بات کو؟ پھر یہ کہ ایک بات 101 مرتبہ پاکستان بننے سے پہلے اور 14 مرتبہ بعد میں کہی گئی اُس بات کو تسلیم کریں یا زندگی بھر میں صرف ایک مرتبہ کہی ہوئی ایک بات کو تسلیم کریں۔ درحقیقت قائداعظم نے زندگی بھر سیکولرازم کا لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ یہ ہم نہیں ریکارڈ کہہ رہا ہے۔ قائداعظم نے ایک مرتبہ کانگرس اور ہندوؤں کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم مذہب کو سیاست میں لے آئے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اِس پر فخر ہے۔

ہم ایک اور اہم تاریخی حقیقت اِن سیکولر حضرات کے سامنے لائیں گے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اُن علماء کرام میں شامل تھے جنہوں نے تحریک پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اُنہوں نے قیام پاکستان کے بعد وقت کی حکومت کو یاد دلانا شروع کیا کہ وہ تحریک پاکستان کے دوران اپنے وعدے کے مطابق اسلامی نظام نافذ کرے جس پر حکومت کچھ لیت ولعل سے کام لے رہی تھی۔ اس لیے کہ اسمبلی میں بیٹھے ٹوانے، ممدوٹ، مزاری اور لغاری محسوس کرتے تھے کہ اسلامی نظام تو تیشہ بن کر اُن کے پاؤں پر گرے گا۔ حکومتی تیور بھانپتے ہوئے مولانا نے اسمبلی میں ایک پُرجوش خطاب کیا اور قرارداد مقاصد کو منظور کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر مسلم لیگ نے (جو پاکستان کی بانی جماعت تھی اور اسمبلی میں اکثریت رکھتی تھی) یہ قرارداد منظور نہ کی اور اسلامی نظام نافذ نہ کیا تو میں باہر نکل کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ مسلم لیگ نے عوام کو دھوکہ دیا ہے اور وہ فریب کاری سے کام لے رہی ہے۔ قراردادِ مقاصد منظور ہوگئی تو اُس وقت کے کچھ سیکولر عناصر نے یہ تو کہا کہ آج ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے، اِس لیے کہ اِس دور میں ہم یہ قرارداد منظور کر رہے ہیں کہ (sovereignty belongs to God) اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ ہے یعنی ع اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں۔ مگر اُنہوں نے اِس بات سے انکار نہیں کیا کہ مسلم لیگ نے تحریک پاکستان کے دوران اسلامی نظام کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ ابھی پاکستان بنے صرف دو سال ہوئے تھے۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ تو کل کی بات ہے، ہم نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا، لیکن اُنہوں نے ایسا ہرگز

نہیں کہا۔ گویا وہ اسلامی نظام کے مخالف تو تھے لیکن یہ تسلیم کرتے تھے کہ تحریک پاکستان کے دوران اِس کے نفاذ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ معاملہ ابھی بالکل تازہ تازہ تھا اور دوسرا یہ کہ اُس زمانے کے سیکولر لوگوں میں بھی کچھ نہ کچھ اخلاقیات ابھی باقی تھیں۔

قائداعظم کے ذاتی معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ کو سیاست سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اُنہوں نے قائداعظم کی زندگی کے جو آخری الفاظ اپنی ذاتی ڈائری میں نقل کیے اور وہ 11 ستمبر 1988ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہوئے، وہ کچھ یوں تھے: ''تم جانتے ہو کہ جب مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا ہے، تو میری روح کو کس قدر اطمینان ہوتا ہے! یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا اسے کبھی نہیں کر سکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ یہ رسول خدا ﷺ کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا۔ اب یہ پاکستانیوں کا فرض ہے کہ وہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں، تاکہ خدا اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے۔''

ہمیں درحقیقت اِن سیکولر عناصر سے بڑی ہمدردی ہے۔ خصوصاً افغان طالبان کے ہاتھوں امریکہ کی عبرت ناک شکست کے بعد اِن کی حالت دیدنی ہے۔ وہ نصف صدی سے امریکہ کو گالیاں دے رہے تھے۔ امریکہ نے جب افغانستان میں امارت اسلامیہ کی حکومت ختم کر کے وہاں غاصبانہ اور جابرانہ قبضہ کیا تو اِن کی باچھیں کِھل گئیں۔ اُنہوں نے امریکہ زندہ باد کے پُرزور نعرے لگائے اور ایک اسلامی حکومت کے خاتمے پر جشن منائے۔ لیکن یہ نادان افغانوں کی تاریخ سے نابلد تھے۔ قصہ کوتاہ جب افغان طالبان نے امریکی سپر میسی کو اپنے پاؤں تلے روند دیا اور وہ واپس بھاگنے کی راہیں تلاش کر رہا ہے تو انہیں فکر پڑی ہے کہ کہیں افغان طالبان امریکہ سے فارغ ہو کر افغانستان سے باہر کا رخ نہ کریں۔ لہٰذا انہوں نے پہلے ہی چیخ و پکار شروع کر دی ہے۔ ہم افغانوں کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے اِنہیں یقین دلاتے ہیں کہ طالبان ایسا نہیں کریں گے۔ البتہ اب آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام اب اِس خطہ کا مقدر ہے۔ یہ لوگ جتنی جلد اِس حقیقت کو تسلیم کر لیں گے اُتنا ہی اُن کے لیے بہتر ہوگا۔ بہرحال ہمارے یہ سیکولرازم کے عاشق بھائی سمجھیں نہ سمجھیں، یورپ سمجھ چکا ہے اور وہاں برپا ہونے والے ہنگاموں کی پشت پر یہی سوچ ہے جس کا ہم ان شاءاللہ کسی وقت تجزیہ کریں گے۔



عُرْوَةُ الْوُثْقٰی

اللہ ربُّ العزت اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے: (ترجمہ) ''اللہ کے نزدیک اسلام ہی پسندیدہ دین ہے۔'' اگر ہم اللہ اور اُس کی آخری کتاب قرآنِ مجید فرقانِ حمید پر قلبی تصدیق کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک، کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے بعد تمام سابقہ مذاہب اور ادیان کو رد کر دیا ہے۔ اگرچہ ہر نبی کے سچے پیروکار مسلمان ہی کہلائیں گے لیکن چونکہ قرآن حکیم سے پہلے نازل ہونے والے آسمانی صحیفے اپنی اصل شکل اور متن کے ساتھ محفوظ نہ رہ سکے اور وقت گزرنے کے ساتھ طاغوتی اور شیطانی قوتوں نے اُن میں تحریف کر دی، لہٰذا انفرادی سطح پر تو چیدہ چیدہ اپنے نبی اور اپنے مذہب کے سچے پیروکار تو یقیناً دنیا میں رہے، لیکن بحیثیت مجموعی کوئی مذہب اور کوئی الہامی کتاب اپنی اصل شکل اور تعلیمات کے ساتھ محفوظ نہ رہی۔ اللہ رب العزت نے یہ شرف صرف اپنے آخری کلام قرآنِ پاک کو عطا کیا کہ اس کے متن کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی، اور اِس کی وجہ بآسانی سمجھ آنے والی ہے۔ حضور اکرم ﷺ انبیا اور رسل کی سنہری زنجیر کی آخری کڑی تھے اور آپؐ پر نازل ہونے والی کتاب قرآن پاک آخری کتاب تھی اور اسلام آخری دین تھا یعنی وہ دین جس کا حضرت آدم علیہ السلام کے دنیا میں تشریف لانے سے آغاز ہوا تھا اور اُسے حضور ﷺ کی بعثت سے حتمی اور آخری شکل دے دی گئی، اگرچہ اِس سے قبل مختلف قوموں پر اُن کے رسولوں کی وساطت سے مختلف شریعت نازل اور نافذ ہوتی رہی لیکن از اول تا آخر دین ایک ہی تھا۔ لہٰذا اسلام کی دعوت کو رد کرنا گویا اللہ کے حتمی اور آخری فیصلے کو رد کرنا ہے۔

اسلام کے پانچ ارکان ہیں: کلمہ طیبہ، نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ اور حج۔ کلمہ طیبہ کی

حیثیت اسلام کی عمارت کے دروازے کی ہے۔ مسلمان وہی ہوگا اور کہلائے گا جو اِس دروازے سے داخل ہوگا۔ باقی چار ارکان وہ چار ستون ہیں جن پر اسلام کی شاندار اور نا قابل تبدیل عمارت کھڑی ہے۔ یعنی اِن ارکان میں کلی، جزوی اور انتہائی معمولی سطح پر بھی تبدیلی کرنے والا کچھ بھی ہوسکتا ہے، مسلمان نہیں ہوسکتا۔ یہ چار ارکان وہ عُرُوَۃُ الْوُثقٰی ہیں، جن کا تمسک ہی ایک کلمہ گو کو اِس عمارت کا مکین ہونے کا حق دے گا۔ اِن چار ارکان میں سے نماز کو ''عمادُالدّین'' کا درجہ دیا گیا لیکن نماز کے لیے صرف جسمانی سطح پر جہاد کی ضرورت ہے، مالی انفاق کی ضرورت نہیں۔ زکوٰۃ صرف مالی انفاق ہے۔ رمضان کے روزے بھی جسمانی ریاضت ہے۔ جبکہ حج واحد عبادت ہے جس میں جان، مال دونوں خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ حج پر ایک عبادت کی حیثیت سے بہت کچھ لکھا اور پڑھا جاچکا ہے۔ مناسک حج کیا ہیں؟ حج کی فرضیت، اہمیت اور فضیلت پر قرآن و سنت کی روشنی میں اتنے دلائل موجود ہیں اور دیئے جاچکے ہیں اور حج کے اخلاقی، معاشرتی، روحانی اور تربیتی پہلوؤں پر اتنا کچھ کہا اور لکھا جاچکا ہے کہ ہم اِس میں سے کسی قسم کا اضافہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ لیکن ہر وقت اور دور کا کوئی نہ کوئی نیا تقاضا ہوتا ہے یا زیادہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اُسی حوالے سے ایک مسلمان کے لیے جہاد کی بھی ایک نئی سمت متعین ہوتی ہے۔ اسلام ایک دین ہے جو اوامر اور نواہی کے حوالہ سے اللہ کے احکامات کی تکمیل چاہتا ہے، جو نبی اکرم ﷺ کے اقوال و افعال کی پیروی کو دین کا جزو لاینفک قرار دیتا ہے اور آپؐ کی رسالت کے تاقیامت قائم و دائم ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ اِس قلعہ میں خود کو بند کر کے اگر کوئی عقل و فہم کو استعمال کرتا ہے تو اسلام اِس کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ اُس کی تحسین بھی کرتا ہے۔ کیا خوبصورت کسی نے مثال دی ہے کہ مسلمان ایک ایسے گھوڑے کی مانند ہے جو ایک کھونٹے سے باندھ دیا گیا ہے۔ اب جس رسی سے وہ باندھا گیا ہے اُس کی لمبائی تک کھونٹے کے چاروں طرف گھوڑے کو اجازت ہے اور حق حاصل ہے کہ وہ بیٹھے دوڑے اور جو جی چاہے کرے لیکن وہ اُن حدود کو پھلانگ نہیں سکتا جو رسی کی لمبائی نے اُس کے لیے ایک دائرے کی صورت میں قائم کردی ہیں۔ جس نئے فتنے کا یا زیادہ ابھر کر سامنے آنے کا ہم نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے وہ ایسی عقلیت پسندی اور دانشوری کا بگھارنا ہے، جس سے گھوڑا اپنی حدود کو پھلانگ رہا ہے۔ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کو عقلی سطح پر justify کرنے کے لیے اور تہذیب نو کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے اِن نام نہاد مذہبی

سکالرز کو سب سے زیادہ مسئلہ حج کی عبادت کے حوالے سے آتا ہے۔ آخر سلے ہوئے کپڑے نہ پہننے کی کیا توجیہہ پیش کریں گے۔ اُنہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندو مٹی کے بنے ہوئے بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، پوجتے ہیں، تم مٹی کے بنے ہوئے ایک گھر کے گرد چکر کاٹتے رہتے ہو۔ پتھروں کی پوجا پاٹ کو برا بھلا کہتے ہو اور خود ایک پتھر کو چومنے کے لیے بعض اوقات جان کی بازی لگا دیتے ہو۔ خود ہی ایک عمارت نما دیوار سی بنا کر اُسے شیطان قرار دے دیتے ہو اور اُسے کنکریاں مار کر کہتے ہو کہ ہم نے شیطان کو کنکریاں ماری ہیں۔ ایک ہی دن میں اتنے جانور ذبح کر دیتے ہو جن کا گوشت کچھ نہ کچھ بلکہ کافی مقدار میں ضائع ہو جاتا ہے، جبکہ سال بھر لوگ اِس گوشت کو کھانے کے لیے ترستے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بتایئے خدارا بتایئے، کیا عقلی دلائل دیں گے۔ کیا justification ان کی آج آپ گلوبل تہذیب کو پیش کریں گے۔ اور یہ تو کوئی بات نہیں کہ جہاں محکمات کے خلاف کوئی الٹی سیدھی دلیل یا تاویل ہاتھ لگ گئی، اُس کا چرچا کر دیا اور باقی معاملات میں یا ٹال مٹول یا یہ کہہ کر پسپائی اختیار کر لی کہ بعض احکامات وقت کا تقاضا ہوتے ہیں اور اُن کا اطلاق محدود وقت تک ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دین ایک مکمل یونٹ ہے، ایک ایسا کُل ہے جس کا جز اُس سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام دشمن کافر ہوں یا کچھ لے دے کر معاملے کو نبٹانے اور سلجھانے کے قائل لوگ ہوں، اُنہیں اللہ رب العزت نے بھرپور اور منہ توڑ جواب اپنے کلامِ پاک میں مکمل سورۃ الکافرون کی صورت میں دیا ہے۔ خصوصاً اُس کا اختتام جو یوں کیا گیا ہے:
(ترجمہ) ''تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔'' لہٰذا نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج کلمہ گو کے لیے اُس عمارت کے ستون ہیں جس کے اندر رہ کر ہی وہ عافیت میں رہ سکتا ہے اور دین اسلام ایک ایسی وحدت ہے، ایک ایسا عُرْوَۃُ الْوُثْقٰی ہے جسے تھام کر انسان ہمیشہ ہمیشہ کی فلاح حاصل کر سکتا ہے۔ باقی تمام راستے انسان کو آگ میں جھونک دیں گے۔ اللہ رب العزت ہمیں حقیقی اسلام کی نعمت سے نوازے۔ آمین یاربّ العالمین!

آخر میں ہماری قارئین سے درخواست ہے کہ وہ سال میں کم از کم ایک بار خصوصاً ایام حج کے دوران اگر خطبہ حجۃ الوداع کا اردو ترجمہ ہی پڑھ لیا کریں تو یو این او کا چارٹر اور انسانی حقوق اور خصوصاً حقوقِ نسواں کی بڑی بڑی تنظیمیں، اُن کے منشور اور منصوبے آپ کو اِس قدر ہیچ اور کمتر لگیں گے کہ وہ کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

نوٹ: راقم گناہوں کے پہاڑ اپنے کندھوں پر لادے صرف اپنے ربّ کریم کی کریمی کے سہارے حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونے کو ہے۔ آپ اللہ سے میرے لیے دعا کریں کہ وہ میرے لیے تمام مراحل کا طے کرنا آسان بنادے اور ہر معاملے میں اپنی رحمت سے آسانیاں پیدا فرمادے اور وہ حقیقی زادِراہ یعنی تقویٰ فراہم کردے۔ راقم بھی اُس در پر حاضر ہوکر اپنے قارئین کے لیے دُعا کرے گا۔ جب سے حج کا عزم کیا ہے غالب کے شعر کا یہ مصرعہ ع' کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب' ذہن سے چپک گیا ہے۔ بہرحال ہم سب کے لیے عُرْوَۃُ الْوُثْقٰی اللہ رب العزت کی صفتِ رحمت ہے، اور اُس کی نظرِ کرم کے ہم سب محتاج ہیں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے اور دنیا و آخرت میں ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین ثم آمین!



16 دسمبر 1971ء سے

16 دسمبر 2011ء تک کا سفر

آج سے ٹھیک 40 سال قبل پاکستان دولخت ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔ پاکستان کی یہ شکست وریخت اس طرح ہوتی کہ آخری فوجی آخری گولی چلا کر تحفظ وطن کا فریضہ ادا کرتا ہوا شہید ہو جاتا تب بھی شکست کا داغ ہمارے دامن پر لگتا، تب بھی رنج والم کی فضا ہوتی، تب بھی ماحول سوگوار ہوتا، دل صدمے سے دوچار ہوتے۔ لیکن ہزاروں فوجیوں کا اپنے ازلی دشمن کے سامنے سر جھکائے ہتھیار ڈالنا بدترین شکست کے ساتھ ساتھ بدترین ذلت و رسوائی بھی تھی۔ یہ فوجی عام فوجی نہیں تھے بلکہ اپنی مشقوں کے دوران اللہ کی کبریائی کا نعرہ لگانے والے تھے۔ یہ وہ فوج تھی جس کا ماٹو جہاد تھا۔ جنگ میں کسی کو فتح ہوتی ہے اور کوئی شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ اِس کھیل میں بھی ہار جیت ہے۔ ایسا نہیں کہ مسلمان فوج کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ امت مسلمہ کی تاریخ اگرچہ بہادری اور فتوحات سے عبارت ہے لیکن بہت سے مواقع پر شکست بھی ہوئی۔ دور جانے کی ضرورت نہیں اِسی ہندوستان میں شہاب الدین غوری کو ترائوڑی کی جنگ میں شکست ہوئی۔ ٹیپو سلطان نے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا لیکن جیتے جی دشمن کے آگے سر نہیں جھکایا۔ شہاب الدین غوری نے جب تک شکست کا بدلہ نہ لیا بادشاہ ہونے کے باوجود زمین پر سویا اور دنیا کی تمام آسائشیں ترک کر دیں۔ لہٰذا مسئلہ محض شکست کا نہیں ذلت ورسوائی کو جان بچانے کی خاطر قبول کرنے کا ہے۔ دفاعی ماہرین کا دعویٰ ہے کہ نصف لاکھ کے قریب پاکستانی فوج جس کے پاس ابھی معقول تعداد میں ساز وسامان بھی تھا اگر کھلی جنگ سے پیچھے ہٹ

کر بھارتی قابض افواج کے خلاف گوریلا وار شروع کر دیتی تو وہ بڑی آسانی سے مزید چھ ماہ تک بھارتی افواج کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ حصول مقصد اور فرض کی انجام دہی میں جان دے دینے والے کو کبھی دوش نہیں دیا جاتا۔ قابل مذمت بلکہ قابل نفرت رویہ یہ ہے کہ بہادری سے لڑتے ہوئے سر کٹوانے کی بجائے غیر کے آگے سر جھکا دیا جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جنہوں نے سر جھکانے سے انکار کیا اُن کو شکست ہو بھی جائے تو عارضی اور وقتی ہوتی ہے۔ وہ ایک میدان میں لڑائی ہارتے ہیں، مکمل جنگ میں شکست نہیں کھاتے۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان طاقت کا عدم توازن ہے، لیکن وہ کبھی اتنا نہیں بڑھا کہ بلا مقابلہ میدان دشمن کے حوالے کر دیا جاتا۔ بہر حال پاکستان کو اپنے ازلی دشمن سے ذلت آمیز اور عبرت ناک شکست ہوئی۔ صد افسوس کہ ایسی رسوا کن شکست بھی سبق آموز ثابت نہ ہوئی۔ ہم نے اول تو تجزیہ ہی نہ کیا کہ شکست کیوں ہوئی۔ نصف لاکھ کے لگ بھگ فوج کو ہتھیار کیوں ڈالنے پڑے؟ اور جنہوں نے تجزیہ کیا بھی تو وہ بڑا سرسری اور سطحی تھا اور ایک ہی وجہ بیان کی گئی کہ مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل نہ کرنے کی وجہ سے اور فوجی ٹولے کے اقتدار کی ہوس کی وجہ سے پاکستان دولخت ہوا۔ 1970ء کے انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہ کرنے سے ہمیں یہ ذلت اُٹھانا پڑی۔ ہم اس بات کو اِس حد تک تو تسلیم کرتے ہیں کہ مجیب الرحمٰن کی انتخابات میں فتح کو تسلیم کرنے سے اور اقتدار اُس کے حوالے کر دینے سے پاکستان کی شکست و ریخت فوری طور پر نہ ہوتی۔ البتہ یہ چند ماہ یا ایک آدھ سال سے زیادہ مؤخر نہ ہوتی، بلکہ عین ممکن ہے کہ جن بین الاقوامی حالات کی وجہ سے اور امریکہ نے اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر آگے بڑھ کر مغربی پاکستان کو مکمل تباہی سے بچایا تھا اور بھارت سوویت یونین کے دباؤ کی وجہ سے جنگ بند کرنے پر مجبور ہوا تھا، چند ماہ یا سال بعد وہ حالات نہ رہتے اور مغربی پاکستان بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مجیب الرحمٰن اور فوج کی کسی صورت بن نہ آتی اور مغربی پاکستان کے عوام کو اپنے حکمران کی بھارت سے دوستی کی روش کبھی قبول نہ ہوتی، جس سے مجیب الرحمٰن اقتدار میں زیادہ دیر نہ رہ سکتا اور مجیب الرحمٰن کی اقتدار سے رخصتی مشرقی پاکستان میں اس سے بڑا طوفان اُٹھاتی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ جمہوری اقدار پر عمل نہ کرنے سے اور انتخابی نتائج کو تسلیم نہ کرنے سے پاکستان شکست و ریخت سے دوچار ہوا غلط ہے۔ ایسی صورت میں صرف ٹائمنگ کا فرق واقع ہوتا۔ لیکن اپنی کج روی اور مفاد پرستی کا اندازہ کیجیے کہ جو ادھوری اور غلط تشخیص کی تھی اُس کے مطابق

بھی علاج کرنے کی کوشش نہیں کی اور 1971ء کے بعد بھی جمہوریت پر دو مرتبہ شب خون مارا گیا، اور دونوں مرتبہ سیاسی اپوزیشن فوج کی پشت پر تھی۔

مشرقی پاکستان کیوں بنگلہ دیش بن گیا؟ ہمیں پوری دیانت داری سے اس کا جائزہ لینا ہوگا۔ اِس لیے کہ آج پھر پاکستان 40 سال پہلے جیسے حالات سے دوچار ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج اُس دور سے بھی زیادہ حالات دگرگوں ہیں۔ سندھ کارڈ کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ بلوچستان میں تو حالات قابو سے باہر ہو رہے ہیں اور آزاد بلوچستان کی تحریک اس نہج تک پہنچ چکی ہے کہ وہاں پاکستان کا نام لینا یا جھنڈا لہرانا جان داؤ پر لگانے والی بات ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہمیں تحریک پاکستان کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہمیں اجزائے پاکستان کے مجتمع ہونے اور اُس کی جغرافیائی ہیئت کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ مشرقی پاکستان تو ہندوستان کے بنگال کا ایک حصہ تھا۔ 1947ء میں جب پاکستان بنا تو بنگال کا مسلم اکثریت والا حصہ کاٹ کر مشرقی پاکستان بنا دیا گیا۔ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے پندرہ سو میل دور تھا۔ اُن کی زبان بنگالی تھی جو مغربی پاکستان میں قطعی طور پر سمجھی نہیں جاتی تھی۔ اُن کا لباس مغربی پاکستانیوں سے مکمل طور پر مختلف تھا۔ اُن کی خورد و نوش مغربی پاکستان والوں سے بالکل مختلف تھی۔ علاقائی ثقافت میں بھی ایک دوسرے سے کوسوں دور تھے۔ گویا اُن کی ہر شے مختلف تھی۔ اور پاکستان دنیا کا واحد ملک تھا جس کا ایک حصہ دوسرے حصے سے ہزاروں میل دور تھا۔ صرف اسلام واحد مشترکہ بنیاد تھی، جس نے تمام دوریوں کو رد کر کے اُنہیں ایک قوم ایک ملک کی شکل دی تھی، یعنی اسلام ایک واحد سیمنٹ تھا جس نے اِن دونوں کو جوڑ دیا۔ بدقسمتی سے سول اور فوجی حکمرانوں نے غیر ملکی قوتوں کو خوش کرنے کے لیے اور اپنے مفادات کے حصول اور اپنے اقتدار کو بیرونی سہارا دینے کے لیے اسلام کو پس پشت ڈال دیا۔ گویا اِن دونوں کے درمیان سے سیمنٹ نکال کر اُنہیں الگ الگ کر دیا۔ کبھی پاکستانیت کا پرچار کر کے اور کبھی اردو زبان کو قومی زبان قرار دے کر مصنوعی طور پر جوڑ قائم رکھنے کی کوشش کی گئی، جو ظاہر ہے بُری طرح ناکام ہوئیں۔ آج پھر ملکی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ اِس لیے کہ ہم نے نہ 1971ء کی شکست و ریخت کی حقیقی وجہ سمجھی اور نہ ہی اسلام کے دامن کو تھامنے کی کوئی شعوری یا غیر شعوری کوشش کی۔ آج بھی ہم 1971ء کے انداز میں تباہی و بربادی سے بچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسباب ایک جیسے ہوں گے تو نتائج کیسے

مختلف ہو سکتے ہیں؟ اِس مرتبہ تو ہم نے طالبانِ افغانستان کے مقابلے میں امریکہ کا اتحادی بن کر ایک کبیرہ گناہ کا مزید اضافہ کرلیا ہے۔ اگر 26 نومبر کے حادثہ نے سیاسی اور عسکری قیادت کی آنکھیں امریکہ کے حوالہ سے کھولی ہیں تو لِلّٰہ انہیں پوری طرح کھولیں، اپنی تباہی و بربادی اور ذلت و رسوائی کی حقیقی وجوہات جاننے کی کوشش کریں۔ امریکہ سے ناطہ توڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑیں۔ طالبانِ افغانستان نے امریکہ جیسی قوت کو ناکوں چنے چبوائے ہیں تو صرف اِس وجہ سے کہ اُنہیں اللہ کی مدد حاصل تھی، وگرنہ کہاں سپریم پاور آف دی ورلڈ اور کہاں دنیا کے پسماندہ اور غریب ترین ملک کے چند ہزار بے سروسامان افراد! ہم بھی اِن حالات سے سرخرو ہو کر اور کامیاب و کامران ہو کر نکل سکتے ہیں۔ ہم نے 16 دسمبر 1971ء کے بعد بھی اپنا رخ تبدیل نہیں کیا اور غلط سمت تیزی سے سفر کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں صراطِ مستقیم کی طرف باگیں موڑنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اللہ اور رسولؐ کے پسندیدہ دین اسلام کو اوڑھنا بچھونا بنانے کی ضرورت ہے۔ اپنی زندگی سے غیر شرعی اعمال نکال دینے کی اور انفرادی اور اجتماعی سطح پر دین کے نفاذ کی اور پھر اللہ پر توکل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم موجود اور آنکھوں سے نظر آنے والی اشیاء کے حقیقت ہونے سے زیادہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اگر ہم انفرادی اور اجتماعی سطح پر حقیقی مسلمان اور مومن بن جائیں تو ایک امریکہ کیا کل دنیا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ان شاء اللہ! آزمائش شرط ہے۔



کہاں ہیں وہ لوگ؟

کہاں ہیں وہ لوگ جو نام نہاد دہشت گردی کے خلاف بے چہرہ اور بے سروپا جنگ کو اپنی اور پاکستان کی جنگ کہتے تھے؟ کہاں ہیں وہ لوگ جو امریکہ کو اپنا دوست قرار دیتے تھے اور اُس کے فرنٹ لائن اتحادی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو اپنے قبائلی مسلمان بھائیوں کے ظالمانہ اور وحشیانہ قتل عام پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور میڈیا پر بڑھ چڑھ کر کہتے تھے آج اتنے دہشت گرد ہلاک کر دیئے گئے۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو سفید سامراج کے افغانستان پر جابرانہ اور غاصبانہ قبضہ کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والوں پر طعن کرتے تھے اور اُن کے بارے میں ٹیلی ویژن چینلز پر توہین آمیز اور بیہودہ گفتگو کرتے تھے۔ جنہوں نے لفظ طالبان کو گالی بنا دیا تھا اور میڈیا پر مجاہدینِ افغانستان کے بارے میں ایسا تاثر قائم کر دیا تھا جیسے وہ وحشی درندے ہوں، جیسے وہ انسانیت کے دشمن ہوں، جیسے جنگ کی آگ اُن ہی کی بھڑکائی ہوئی ہے، جیسے خطے کا امن انہوں نے ہی غارت کیا ہے۔ حالانکہ اِس خطے پر بارود کی بارش تو امریکہ کر رہا تھا۔ سمارٹ بموں اور ڈیزی کٹر جیسے مہلک اور تباہ کن ہتھیاروں کا استعمال تو امریکہ کر رہا تھا۔ افغانستان میں ہنستی کھیلتی بستیوں کو تو امریکی طیاروں کی بمباری نے راکھ کے ڈھیر میں بدلا تھا اور یہی کام وہ پاکستان میں ڈرون حملوں سے کر رہا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ عوام کی اکثریت بھی اُن کے بہکاوے میں آ کر طالبان کے بارے میں غلط تاثر قائم کر چکی تھی۔ پاکستان میں ہونے والی ہر دہشت گردی اور تخریب کاری اُن کے کھاتے میں ڈال دی جاتی تھی۔ اسلام سے بیر رکھنے والے اِن نام نہاد دانشوروں اور متعصب، جانبدار میڈیا اداکاروں کا گروار "سب سے پہلے پاکستان" کا جھوٹا اور منافقانہ نعرہ لگانے والا بزدل جرنیل پرویز مشرف پاکستان سے راہ فرار اختیار کر چکا ہے۔ ہم اِن

لوگوں سے سوال کرتے ہیں کہ جب ریمنڈ ڈیوس کا معاملہ سامنے آیا، پھر ایبٹ آباد آپریشن ہوا جس کے بعد ہماری عسکری قیادت کی آنکھوں سے پٹی اتری اور جب PNS کراچی کے سانحہ پر تحقیقات میں امریکہ کی پروردہ تنظیم جنداللہ کے ملوث ہونے کا انکشاف ہوا تو امریکی اور پاکستان کی عسکری قیادت میں تناؤ آیا، جس کے نتیجہ میں ISI نے سی آئی اے سے ناتا توڑا اور امریکیوں کو بلا اجازت پاکستان میں گھومنے پھرنے سے روکا گیا تب پاکستان میں دہشت گردی اور تخریب کاری ختم کیوں ہوگئی۔ پھر وہ طالبانِ پاکستان اچانک غائب کیوں ہوگئے جو کبھی لاہور کی بارونق مارکیٹوں کے دھماکوں سے اُڑائے جانے کے فوراً بعد حادثہ کی ذمہ داری قبول کرتے تھے۔

جن لوگوں کے بارے میں ہم نے آغاز میں سوال کیا ہے کہ وہ کہاں ہیں۔ قارئین نوٹ کرلیں کہ وہ کہیں نہیں گئے، یہیں موجود ہیں۔ حالات کی تبدیلی نے بلکہ صحیح تر الفاظ میں عوام اور خواص پر حقیقت منکشف ہونے اور اصل مجرموں کے چہرے سے پردہ اُٹھنے پر انہوں نے مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کی ہے۔ اُن کا جھوٹ کھل گیا ہے۔ اُنہیں عوامی غیظ وغضب سے بچنا ہے، لیکن اُن کی سامراج دوستی اور مسلم دشمنی میں فرق نہیں آیا۔ اُنہوں نے صرف میڈیا پر گفتگو کا رخ پھیر دیا ہے۔ وہ دانشور اور تبصرہ کار جو سوات آپریشن کرنے پر اور جنوبی وزیرستان پر پاکستانی فوج کے حملہ آور ہونے پر فوج کے مداح بلکہ عاشق ہوگئے تھے، انہوں نے طالبان کے بارے میں تو چپ سادھ لی ہے، البتہ اب انہوں نے اپنی توپوں کا رخ فوج کی طرف کرلیا ہے۔ اب اُنہیں رسول حکومت کی فوج پر بالادستی کا اصول یاد آ گیا ہے۔ اب وہ بات بات پر فوج اور آئی ایس آئی کے سربراہ کا استعفا طلب کرتے ہیں۔ اب وہ اپنے آقا امریکہ بہادر کی نئی حکمت عملی کا انتظار کررہے ہیں اور امریکہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ افغانستان میں اپنی ذلت آمیز شکست کے زخم تو چاٹ رہا ہے لیکن اپنے عوام کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے پاکستان کو تباہ و برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ اپنی چالبازیوں سے پاکستان کی سیاسی حکومت اور عسکری قیادت کو آمنے سامنے لے آیا ہے۔ لہٰذا امریکہ کچھ انتظار کرے گا۔ اگر پاکستان کی فوج اور حکومت باہم جنگ میں ملک کو تباہ کرتے ہیں تو اُس کا کام بغیر ہینگ اور پھٹکری لگائے نکل آئے گا، وگرنہ وہ خود میدان میں اترے گا اس لیے کہ یہودیوں کا دباؤ بھی ہے اور ناک کا مسئلہ بھی ہے۔

قارئین کرام! ہم نے طاغوتی قوتوں کے ہمنوا سیکولر دانشوروں اور سیاسی حکومت کے

بارے میں جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا اصل مقصد یہ ہے کہ محبِّ وطن اور اسلام دوست پاکستانیوں خصوصاً اسلامی جماعتوں کی توجہ اِس جانب مبذول کروائیں کہ پاکستان کا دفاع ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر نہیں ہوسکتا اور سچی بات یہ ہے کہ اسلام پسند جماعتوں کے اس اتحاد سے بھی نہیں ہوسکتا چاہے اس کا نام ''دفاع پاکستان کونسل'' رکھیں یا کوئی اور نام رکھ لیں۔ اس لیے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کا دفاع نظریہ پاکستان کی عملی تعبیر یعنی نفاذ اسلام کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پاکستان میں سیکولر نظامِ حکومت پاکستان کے جواز ہی کو ختم کر دیتا ہے اور جس چیز کا حقیقی جواز ختم ہو جائے اُسے مصنوعی طریقوں سے کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اِس امید پر دفاع پاکستان کے نام سے متحد ہونے والی اسلامی جماعتوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسے خوش آئند قرار دیتے ہیں کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ اتحاد پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی طرف بڑھے گا اور بالآخر ''محمدیؐ ورلڈ آرڈر'' قائم کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی جائے گی۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو، لیکن اگر انتخابات کی صدا لگنے پر یہ جماعتیں پاور پالیٹکس میں اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے اس تحریک کو بیچ میں چھوڑ گئیں یا کسی غیر آئینی قدم سے اِس حکومت کو ختم کرنے پر اس تحریک سے لاتعلق ہوگئیں اور اِس تحریک سے وہی سلوک کیا جو ضیاء الحق کا مارشل لا لگنے پر پاکستان قومی اتحاد نے تحریک نظام مصطفیٰ سے کیا تھا تو ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے بے پروا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ تحریک دفاع پاکستان کی بجائے پاکستان کی مکمل تباہی کا باعث بنے گی۔ اور غیروں کا یہ طعن حقیقت سمجھا جائے گا کہ بعض نادیدہ قوتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اِس اتحاد کو استعمال کر رہی تھیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اسلام کے نام پر بننے والی یہ جماعتیں پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کے حوالے سے عملاً اپنا خلوص ثابت کریں گی۔

ہم اسلامی جماعتوں کے قائدین اور کارکنان سے ایک اور گزارش کریں گے کہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ اس پر حقیقت پسندانہ انداز میں غور فرمائیں کہ اُن کے انتخابی سیاست اور پاور پالیٹکس میں حصہ لینے سے پاکستان میں اسلامی کاز کو فائدہ ہوا یا نقصان--ایک موہوم سی امید جو ہم نے زبردستی قائم کی تھی کہ اگر تمام اسلامی جماعتیں متحد ہو کر انتخابات میں حصہ لیں تو شاید کامیاب ہو جائیں اور کامیاب ہو کر اسلامی نظام کو پاکستان میں نافذ کر دیں۔ لیکن ہمارا یہ خدشہ درست ثابت ہوا کہ اول تو ان کا جیتنا مشکل ہے اور اگر جیت بھی گئے تو پھر بھی یہ سیکولرازم کا حصہ

بننے پر مجبور ہوں گے۔ ایم ایم اے کی صورت میں دونوں باتیں درست ثابت ہوئیں۔ مرکز میں ایم ایم اے کامیاب نہ ہوسکی اور صوبہ سرحد (موجودہ پختونخوا) میں کامیاب ہوکر اسلام کے حوالہ سے رتی بھر کوئی کام نہ کرسکی۔ مرکز میں ایم ایم اے کی اتحادی حکومت نے حقوق نسواں بل منظور کیا اور ایم ایم اے کے جغادری لیڈر بھی ایک آدھ مخالفانہ بیان دینے کے سوا عملاً کچھ نہ کر پائے۔ لہٰذا ہمارے پاس نفاذِ اسلام کے حوالہ سے ایک ہی راستہ ہے کہ خود انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلام کے زریں اصول اپنائیں اور متحد ہوکر ایک احتجاجی تحریک کے ذریعے اِس ملک میں اُن لوگوں کے خلاف قولی اور عملی جہاد کریں جو کبھی سوویت یونین کے ایجنٹ بن کر اور کبھی امریکہ کے اتحادی بن کر اسلام کا راستہ روک رہے ہیں۔ یہ لوگ ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر عوام کو گمراہ کررہے ہیں۔ ہمیں ''سب سے پہلے اسلام'' کا نعرہ لگانا ہوگا۔ پاکستان صرف اسلام کی پناہ میں زندہ اور محفوظ اور پُرامن رہ سکتا ہے۔ جان لیجئے کہ ظاہراً طالبان دشمن اور حقیقتاً اسلام دشمن عناصر نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کی ہے، اپنی سوچ نہیں بدلی، اپنا قبلہ نہیں بدلا۔



خدارا سوچیے تو سہی!

پنجابی کی مشہور ضرب المثل ہے سیانا کاں گو بروچ گردا اے (چالاک کوا گندگی میں جا گرتا ہے) صدر زرداری سے زیادہ شاید ہی کسی اور پر یہ ضرب المثل منطبق ہوتی ہو۔ صدر مشرف کے دور میں عدلیہ خصوصاً چیف جسٹس افتخار چودھری کی بحالی میں پاکستان پیپلز پارٹی سمیت تمام اپوزیشن نے بھرپور حصہ لیا۔ 2008ء کے انتخابات ہوئے تو عام تاثر یہی تھا کہ مسلم لیگ (ن) کامیاب ہو کر حکومت بنائے یا پاکستان پیپلز پارٹی یہ دونوں سیاسی قوتیں پہلا کام یہ کریں گی کہ چیف جسٹس افتخار چودھری کو بیک جنبش قلم بحال کر دیں گی، لیکن صدر آصف زرداری جو بے نظیر کی حادثاتی موت کی وجہ سے اقتدار اُچک لینے میں کامیاب ہو گئے تھے انہوں نے چیف جسٹس کی بحالی کے حوالہ سے لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا، لیکن بالآخر ایک عوامی لانگ مارچ کے نتیجہ میں اور عسکری قوتوں کے دباؤ سے مجبور ہو کر اُنہیں بادلِ نخواستہ چیف جسٹس کو بحال کرنا پڑا۔ حالانکہ آصف زرداری میڈیا کو آف دی ریکارڈ کہتے تھے کہ وہ افتخار چودھری کو کسی قیمت پر بھی بطور چیف جسٹس بحال نہیں کریں گے۔ طاقت اور اقتدار کے گھمنڈ میں بحالی کے بعد بھی انہوں نے کبھی دلی طور پر افتخار چودھری کی اس حیثیت کو قبول نہ کیا، حالانکہ اعتزاز احسن مروجہ پروٹوکول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چیف جسٹس کو بے نظیر کی تعزیت کے بہانے ایوانِ صدر لے گئے تھے۔ ہماری رائے میں آصف زرداری کی سوچ یہ تھی کہ جو شخص فوجی آمر کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا تھا وہ میری بدعنوانی، کرپشن اور میرٹ کے خلاف احکامات کو کیسے قانونی جواز فراہم کرے گا، لہٰذا میرے راستے کی رکاوٹ ثابت ہو گا۔ اور سچ پوچھیے تو یہی ہوا۔ پی پی پی اور آصف زرداری کا طرزِ حکومت دیکھیں تو جو بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم چونکہ عوامی

مینڈیٹ حاصل کر کے آئے ہیں لہٰذا ہم جو چاہیں کریں کرپشن اور لوٹ مار کے تمام ریکارڈ توڑ دیں، نفع بخش حکومتی اداروں کا بھی دیوالیہ نکال دیں، میرٹ کی دھجیاں بکھیر دیں، ملکی قوانین کو پاؤں تلے روند دیں یا ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیں، کوئی اعتراض کیوں کرے؟ ہم پانچ سال کا پٹہ لکھوا کر آئے ہیں۔ چیف جسٹس افتخار چودھری ایک ظالم اور غاصب فوجی آمر کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے وہ سویلین حکومت کو کیوں گھاس ڈالیں گے۔ لہٰذا ہماری عدلیہ اور انتظامیہ ایک دوسرے کے خلاف کھل کر میدان میں اتر آئی ہیں اور دمادم مست قلندر کے آوازے لگ چکے ہیں۔

اللہ ربّ العزت ہمیں توفیق دے اور اپنے رحم و کرم سے نوازے کہ ہم ہمیشہ ضمیر کی صدا پر لبیک کہیں اور قلم کی لاج رکھیں اور کسی کی دوستی یا دشمنی ہمیں حق و انصاف کی بات کہنے اور لکھنے سے باز نہ رکھے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا جنگ میں عدلیہ اور چیف جسٹس ننانوے فیصد (99%) حق پر ہیں، لیکن ایک اعتراض گیلانی زرداری حکومت کا بھی درست نظر آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اُن کی حکومت کے خلاف ہر مقدمہ اور ہر رِٹ سپریم کورٹ فوری طور پر اور آگے بڑھ کر وصول کرتا ہے اور دنوں میں سماعت بھی شروع ہو جاتی ہے، لیکن نواز شریف وغیرہ کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمات کئی سال سے کولڈ سٹوریج میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایئر مارشل اصغر خان کی دائر کردہ رِٹ کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پی پی پی کے اِس اعتراض کا سپریم کورٹ کو فوری نوٹس لینا چاہیے تاکہ عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے ہوں۔

بہرحال قریباً چار سال سیاسی چال بازیاں کرنے والے اور اپنے پتّے انتہائی مہارت سے کھیلنے والے اور نواز شریف کو بیوقوف بنانے والے آصف زرداری مکمل طور پر عدلیہ کے گھیرے میں آ چکے ہیں، گویا چالاک کوّا اپنے اصلی ٹھکانے کی طرف رواں دواں ہے۔

قارئین کرام! یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عدل اور احتساب کے فقدان بلکہ نایاب ہونے سے پاکستان مسائلستان بن چکا ہے۔ لہٰذا کہیں فقر انسانوں کو کفر کی طرف لے جا رہا ہے اور کہیں دولت کے انبار عیاشی اور بدمعاشی کا سبب بن رہے ہیں۔ اِس پس منظر میں ایک جماعت یا تحریک، انصاف جس کے نام کا حصہ ہے، عوام الناس میں بڑی مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور بقول اسی جماعت کے سربراہ کے اُن کا سونامی سب کو بہا کر لے جا رہا ہے۔ اور اب اِن

صاحب نے اپنے پروگرام کو خلافت اور اسلام کا تڑکا بھی لگانا شروع کر دیا ہے۔ پاکستان کو اسلامی فلاحی مملکت بنانے کا دعویٰ بھی ہے اور کوئی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہ بنانے کے عزم کا اظہار بھی کیا گیا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی ہے کہ وہ عورتوں کے لباس کے بارے میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔ اس اعلان پر عورتوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ علاوہ ازیں معیشت سے سود کو نکالنے کے حوالے سے کوئی اعلان یا دعویٰ سامنے نہیں آیا۔ ہم حُسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے انصاف کی پکار لگانے، معاشرے کو بدعنوانی اور کرپشن سے پاک کرنے اور ہر سطح پر میرٹ کا لحاظ رکھنے کے موصوف کے عزم کی تحسین کرتے ہوئے اُن کی خدمت میں عرض کرنا چاہیں گے کہ یورپ میں سکنڈے نیوین ممالک میں داخلی طور پر یعنی اپنے شہریوں کو مکمل انصاف دیا جاتا ہے۔ سوشل سیکیورٹی کا نظام ہے، علم حاصل کرنے اور ہنر سکھانے کے لیے غریب ترین افراد کے لیے بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ ہسپتالوں میں سربراہانِ مملکت اور عام شہریوں سے ایک جیسا سلوک ہوتا ہے۔ محترم! آپ اس سے زیادہ پاکستانی عوام کو کیا دے سکیں گے؟ ان ہی سہولتوں کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ کہنے سے دریغ نہیں کرتے کہ اسلام کی عملی شکل دیکھنی ہو تو ان ممالک میں جایئے۔ ان گوشوں کے حوالہ سے دیکھا جائے تو اتنی غلط بات بھی نہیں ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ ہونے کے باوجود انہوں نے اسلام سے جو باتیں سیکھیں وہ اُنہیں فائدہ دے رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ جتنا بے چین، غیر مطمئن اور مضطرب معاشرہ وہاں کا ہے شاید افریقی ممالک کا بھی نہ ہو۔ ہم مبالغہ نہیں کر رہے ہیں، حقیقت بیان کر رہے ہیں۔ کیا خواب آور دوائیوں کا استعمال سب سے زیادہ ان ہی ممالک میں نہیں؟ کیا وہاں خودکشیاں کسی غریب اور پسماندہ ملک سے زیادہ نہیں ہوتیں؟ کسی زمانے میں وہاں طلاق کی شرح باقی دنیا سے بہت زیادہ تھی۔ اس مسئلہ سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ شادی کرنا بند کر دی، یعنی نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ گھریلو نظام تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ جانوروں اور حیوانوں کی طرح اکثر انسانی بچوں کو اپنے باپ کا بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے؟ آزادیٔ نسواں کے نام پر عورت کو کمرشل آئیٹم بنا دیا گیا ہے۔ سکنڈے نیوین ممالک میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہے، لیکن یورپ اور خصوصاً امریکہ میں جرائم ایشیائی ممالک سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ گویا سائنس اور ٹیکنالوجی میں انتہائی ترقی یافتہ اقوام عدل، میرٹ اور گڈ گورننس اپنانے کے باوجود انسانیت کو سکون اور چین فراہم نہیں کر سکے۔

ہماری رائے میں اس کی دو وجوہات ہیں۔ اولاً یہ کہ مذکورہ اوصاف انہوں نے اپنے ہم مذہب، ہم وطن اور زیادہ سے زیادہ اپنے خطے کی حد تک محدود کر دیے، جبکہ اسلام عدل و انصاف اور امانت و دیانت کے معاملے میں مذہب، نسل، قوم اور وطن سے بالاتر رہنے کا حکم دیتا ہے۔ کسی مسلمان کو کسی غیر مسلم سے زیادتی یا بددیانتی کی قطعی طور پر اجازت نہیں۔ اور عدل و انصاف کی ایسی ایسی مثالیں پیش کیں کہ مؤرخین اور محققین ششدر رہ جاتے ہیں۔ قاضی اسلامی ریاست کے سربراہ کے خلاف اور ذمی کے حق میں فیصلہ دیتا ہے تو سربراہِ مملکت فیصلے کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے، وغیرہ۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے ریاست اور مذہب کو بالکل الگ الگ کر دیا، جس سے عریانی، فحاشی اور اخلاقی بے راہروی کا سیلاب امڈ آیا، جو کسی مذہب میں بھی جائز نہیں، البتہ اسلام اس حوالہ سے سخت ترین کارروائی کا حکم دیتا ہے۔ سود جو انسان کو آدم خور بنا دیتا ہے کسی بھی الہامی مذہب میں جائز نہیں، لیکن اسلام اسے اللہ اور رسول سے جنگ قرار دیتا ہے۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حقیقی عدل کا نفاذ اور مکمل طور پر غیر استحصالی معاشرے کا قیام انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں سے ممکن ہی نہیں۔ یہ صرف رب کی زمین پر رب کا نظام نافذ ہونے سے ہی ممکن ہوگا، وگرنہ خلا کے سفر طے کرنے اور چاند پر قدم رکھنے کے باوجود معاشرے کو اطمینان، سکون اور حقیقی خوشی نہیں دی جا سکے گی اور انسان مختلف نظاموں کے مابین فٹ بال بنا رہے گا۔ زرداری اگر عدلیہ کا نشانہ بنتے ہیں تو عمران خان سرمایہ دار کی دہشت گردی سے بچ نہ سکیں گے۔ لہٰذا کسی قسم کی پیوند کاری کرنے کی بجائے کھل کر مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کی جائے جو انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکمل ضابطہ حیات فراہم کرتا ہے۔ خدارا سوچیے تو سہی سوشلزم اور کمیونزم کے ناکام ہونے اور سرمایہ دارانہ نظام کے انسانیت دشمن ثابت ہو جانے کے بعد آپ کے پاس چارۂ کار ہی کیا رہ جاتا ہے!



سرمائے اور محنت میں توازن کی ضرورت

اُنیسویں صدی کے اواخر میں جب عالم اسلام بلاواسطہ یا بالواسطہ غیروں کے پنجۂ استبداد میں جکڑا ہوا تھا، روس پر زارِ روس کے نام سے بدترین آمریت مسلط تھی۔ البتہ یورپ میں ایک صدی پہلے اگر معاشی سطح پر صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا تو سیاسی سطح پر سرمایہ دارانہ نظام کے سائے میں جمہوری طرزِ حکومت قائم ہو چکا تھا۔ ہماری رائے میں سرمایہ دارانہ نظام کو ایک ایسے طرزِ حکومت کی ضرورت تھی جس میں اکثریتی عوام کو صحیح یا غلط طور پر احساسِ شرکت ہو۔ اسی دور سے میڈیا ایک قوت کی حیثیت سے ابھرنا شروع ہوا، جس نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر موجود سرمایہ داروں کے نمائندوں میں ربط پیدا کر دیا، اور مخصوص قوتیں یہ تاثر دینے میں کامیاب ہو گئیں کہ حکومتی طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ اگرچہ عوام نہ اس وقت جان سکے اور شاید نہ آج تک جان سکے ہیں کہ ظاہراً مادر پدر آزاد میڈیا ساری اچھل کود تو سرمائے کی گود میں کرتا ہے۔ بہرحال ہم نے بات کا آغاز کیا تھا اُنیسویں صدی کے اواخر سے جب امریکہ میں ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے تقریباً ثلث صدی بعد دنیا کے ایک بڑے حصہ میں سرمایہ، جمہوریت اور میڈیا کو شدید لیکن عارضی چوٹ لگائی۔ ہماری مراد یکم مئی 1886ء کو شکاگو میں مزدوروں کو پیش آنے والے حادثہ سے ہے۔ اس روز مزدوروں نے ہڑتال کی، جلوس نکالا، اور بڑی سطح پر مظاہرہ کیا۔ 3 مئی کو یہ عمل دہرایا گیا تو پولیس کی فائرنگ سے 4 افراد ہلاک ہو گئے، جن کے سوگ میں 4 مئی کو پھر جلوس نکلا، جس پر پولیس نے شدید فائرنگ کی۔ کسی طرف سے ایک گرنیڈ بھی پھینکا گیا جس سے بہت سے افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ مزدوروں کے ہاتھوں میں سفید جھنڈے زمین پر گرے، جن میں بہت سے مزدوروں کے خون سے سرخ نظر آنے لگے۔ اسی سرخ رنگ کو آنے والے انقلاب نے استعمال

کیا اور آج تک مزدور اِس حقیقت کو جانے بغیر سرخ جھنڈے لہراتے رہتے ہیں۔

ایک جرمن فلسفی کارل مارکس نے اِس واقعہ سے بہت پہلے اپنی کتاب DasCapital کے ذریعے محنت کو اصل قوت قرار دیتے ہوئے محنت کش کی حکومت کا آئیڈیا دیا تھا۔ وہ خود اپنی زندگی میں کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھی یہ نظام قائم نہ کر سکا، لیکن بہت سے پیروکار اُس کی زندگی میں اور بعد میں پیدا ہوئے جنہوں نے اس فلسفہ کو قبول کر لیا تھا۔ اُدھر یورپ اور امریکہ میں سرمایہ دارانہ جمہوریت بڑی مستحکم ہو چکی تھی اور غیر صنعتی یا پسماندہ دنیا بشمول عالم اسلام پر یورپ کا بلاواسطہ یا بالواسطہ تسلط قائم تھا۔ لہٰذا کارل مارکس کے فلسفہ کے تحت دنیا میں جو شور اُٹھا وہ یورپ اور امریکا کو تو خاص متاثر نہ کر سکا لیکن روس جہاں زار روس کے ظلم اور کرپشن نے عوام میں بے زاری اور بے چینی پیدا کی ہوئی تھی، وہاں لینن نے اسی فلسفہ کو بنیاد بنا کر 1917ء میں سیاسی فتح حاصل کر لی۔ شکاگو کے ہلاک شدگان مزدوروں کے خون کو اِس انقلاب کے لیے خوب استعمال کیا گیا اور مزدور محنت کش اور کسان کی حکومت کے نام پر ایک پارٹی کی آمریت مسلط کر دی گئی، جس نے جبر سے مخالفین کی آواز دبا دی۔ میڈیا کو بھی سرکاری پارٹی کے تحت کر دیا گیا، جس کا کام صرف حکومتی کارکردگی پر واہ واہ کرنا تھا، اور سوویت یونین کے گرد ایک آئرن کرٹن تان کر اِسے دنیا سے الگ تھلگ کر دیا، جس کا کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوا کہ حکومت نے کم از کم ربع صدی بڑی یکسوئی اور محنت سے سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دے کر سوویت یونین کو ایک سپر قوت بنا دیا، خصوصاً عسکری اور دفاعی سطح پر وہ دوسری قوتوں سے پیچھے نہ رہا۔ اسی لیے دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر عالمی سطح پر ہونے والی بندر بانٹ میں اُسے وسیع حصہ ملا اور مشرقی یورپ میں سوویت یونین کے نظام اور اُس کی برتری کو قبول کر لیا گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام بلند بانگ دعوؤں اور پروپیگنڈے کے باوجود مزدور اور محنت کش کو خوشحالی کم اور نعرے اور پُرفریب وعدے زیادہ ملے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بالشویک انقلاب کے نتیجہ میں بننے والی حکومتوں نے معاشی ترقی اور معاشی وسائل کی صحیح اور منصفانہ تقسیم کی بجائے عسکری اور اسلحی قوت میں اضافہ پر ساری توجہ مرکوز کر دی۔ البتہ یورپ اور امریکہ کا صنعتکار اور سرمایہ دار حالات کے تیور پہچان چکا تھا۔ ذہین سرمایہ کار یہ سمجھ گیا تھا کہ سیاسی شعور اجاگر ہو جانے کے بعد معاشی استحصال صرف اِسی صورت قائم رکھا جا سکے گا جب خالی خولی نعرے نہیں انسانوں کو سوکھی روٹی کے ساتھ ساتھ کوئی شیرینی بھی دی جائے۔ چنانچہ

یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک میں سوشل سیکیورٹی سکیم، مزدوروں کے لیے مفت طبی امداد، اوور ٹائم، بنیادی تعلیم، اولڈ ایج بینیفٹ فنڈ اور بہت سی دوسری سکیموں کا اعلان کیا گیا۔ پھر اُن پر عمل درآمد ہوتا بھی دکھائی دیا۔ لیکن یورپ کا جن پسماندہ ممالک پر سیاسی اور عسکری تسلط تھا وہاں اُس نے جاگیرداری نظام اور وڈیرہ ازم کے ذریعے Divide and rule کی پالیسی اپنا کر اپنا حکومتی سلسلہ کامیابی سے جاری وساری رکھا۔

پاکستان نے 1947ء میں سفید سامراج کے جبر واستبداد سے آزادی حاصل کی تھی۔ لیکن افسوس وائے افسوس عوام تک آزادی کے ثمرات نہ پہنچ سکے، بلکہ بعض مایوس لوگ تو غلامی کے دنوں کو اچھے دن کہہ کر یاد کرتے ہیں۔ یہ حال تو متوسط طبقے کا ہے۔ رہی بات مزدور، محنت کش اور کسان کی تو جس شخص پر ہم مصورِ پاکستان ہونے کا ''الزام'' لگاتے ہیں، اگرچہ پاکستان کے قیام سے پہلے ہی اللہ نے اُسے اِس فانی دنیا سے اُٹھا لیا لیکن شاید اُس کی چھٹی حس، اُس کی بے پناہ بصیرت، اُس کی دور بینی اور دور اندیشی آنے والے وقت کا دھندلا سا نقشہ اُس پر واضح کر رہی تھی کہ اُس نے اللہ کے حضور یہ درخواست دی۔

تو قادر و عادل ہے، مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

آج پاکستان میں مزدور اور محنت کش طبقہ کے حالات دیکھ کر اِس شعر کی تلخی بھی بدقسمت مزدور اور محنت کش کے حالات کی صحیح عکاسی کرتی دکھائی نہیں دیتی۔ استحصال اور ظلم تمام حدود پھلانگ چکا ہے۔ ہم ڈر اور خوف محسوس کرتے ہیں کہ کسی ایسی گھڑی میں ہمارے قلم سے ایسے الفاظ نہ پھسل جائیں کہ وہ قبولیت کی گھڑی ہو، وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا حکمران، صنعتکار، وڈیرہ اور سرمایہ دار (اِلا ماشاءاللہ) جو سلوک پاکستان کے مزدور اور محنت کش سے کر رہا ہے، اُس پر اللہ رب العزت کی صفتِ جبار اور قہار کو صدا دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جو مزدور چند آنے (ایک روپے سے کم) مزدوری لیتا تھا، وہ آج کے سات ہزار روپیہ تنخواہ لینے والے سے زیادہ مطمئن اور سکھی دکھائی دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا طبقات شب و روز پلاننگ کرتے رہتے ہیں کہ کتنے زندہ بچے ہیں، کتنوں کو گور بُرد کرنے کے لیے اگلی پالیسی بنائی جائے۔ فیملی پلاننگ کی دوسری سکیمیں جب ناکام ہوئی ہیں تو شاید اس حکمت عملی کو بطور پالیسی

اپنایا گیا ہے کہ پہلے متوسط طبقہ کو غربت کی طرف دھکیلو، پھر اِن غریبوں کو زندہ یا مردہ قبروں میں اتار دو۔ 1976ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک لیبر پالیسی بنی تھی، پھر ہمیں لیبر پالیسی بنانے کی فرصت نہیں ملی۔ اگرچہ غیر علانیہ طور پر یہ طبقات ہر روز مزدور کُش پالیسی ترتیب دیتے رہتے ہیں، لیکن یہ بالادست طبقات جان لیں کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ظلم ایک حد تک برداشت کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔ اللہ رب العزت کے غفور و رحیم ہونے کو غلط معنی مت پہناؤ۔ زمینی حقائق یہ ہیں کہ بلی بھی اگر کارنر کر دی جائے اور اُسے بھاگنے کی راہ نہ ملے تو یہ کمزور جانور بڑی سے بڑی قوت پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اِس سے پہلے کہ آتش فشاں کا لاوا پھٹ جائے، اِس سے پہلے کہ بھوکے اور ننگے انسان پر دیوانگی طاری ہو جائے، اِس سے پہلے کہ تمہارا سرمایہ، تمہارے وسائل تمہاری جان کے دشمن ثابت ہوں اور اِس سے پہلے کہ صحیح راہ دکھانے والی قوتیں جواب دے جائیں یا مایوس ہو کر دیوانگی کو اپنا راستہ بنانے والوں کی راہ میں حائل نہ رہیں، مزدور، محنت کش اور کسان کو سہارا دو، زندگی کا سہارا، تاکہ اُن میں مرنے کی بجائے جینے کی اُمنگ پیدا ہو۔ البتہ اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مزدور کو کھلی چھٹی دے دی جائے۔ دونوں کو عدل کا راستہ اختیار کرنا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ کسی باطل نظام کے زیرِ سایہ عدل کیسے قائم ہو، کیونکہ نظامِ عدل اجتماعی کے نفاذ کے بغیر عدل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ صرف خالق کائنات کا دیا ہوا نظام ہی سرمایہ اور محنت کی کشمکش کو ختم کر سکتا اور حقوق و فرائض میں توازن پیدا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس نظام کو قائم کرنے کی توفیق دے، تاکہ کوئی ایک طبقہ بھی دوسرے کا استحصال نہ کر سکے۔



کرپشن کے سمندر میں شہزادوں کی کشتی رانی

اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں مال اور اولاد کو انسان کے لیے آزمائش قرار دیا ہے۔ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو یہ محبت انسان کی ازلی کمزوری دکھائی دیتی ہے۔ انبیاء اور صالحین کے سوا بہت کم انسان اس آزمائش میں پورے اترتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے نہ اولاد سے محبت سے منع فرمایا ہے اور نہ حلال و جائز ذرائع سے مال کمانے سے روکا ہے۔ اصل مسئلہ اس محبت کو حدود و قیود اور قانون و ضابطے کے دائرے میں رکھنے کا ہے۔ انسان اس محبت کی بنا پر حدود و قیود کو کیوں پھلانگتا ہے اور قانون و ضابطے کیوں توڑتا ہے؟ غور کیجیے تو معلوم ہوگا درحقیقت انسان کو اپنی ذات سے انتہائی محبت ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اولاد میری ہی جان و جسم کا تسلسل ہے اور میری اور میری نسل کی حفاظت کے لیے مال ناگزیر ہے۔ یہ محبت اُس صورت میں کنٹرول میں رہ سکتی ہے اور انسان کو ظلم و زیادتی سے روک سکتی ہے اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کے راستے میں حائل ہو سکتی ہے اگر اُس کے ذہن و قلب میں کوئی اور محبت سما جائے یا خوف چھا جائے یا کسی عظیم ہستی پر اُس کا بھروسا اتنا قوی ہو جائے کہ اُسے اپنی ذات کے تحفظ کا یقین ہو جائے۔ ایک مسلمان کی ایمانی کیفیت جتنی بہتر ہوگی، اللہ پر اُسے جتنا زیادہ بھروسا ہوگا، آخرت کا جس قدر خوف اُس پر طاری ہوگا، وہ مال اور اولاد کی محبت کو اتنا زیادہ کنٹرول کر سکے گا اور ایک قوم پرست کو جتنی زیادہ محبت اپنی قوم، اپنی سرزمین اور اپنے کلچر سے ہوگی، اتنا ہی وہ مال و اولاد کی محبت پر کنٹرول کرنے پر قادر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جہاں ہمیں اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے، اپنی قوم اپنے وطن کی خاطر قربانیاں دینے والے بھی کثیر تعداد میں ملیں گے۔ یہ بات الگ ہے اور صدفی صد درست بھی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و

مال کی قربانی دینے والے صرف اس دنیوی زندگی میں سرخرو نہیں ہوتے بلکہ اُخروی اور ابدی زندگی میں بھی کامیاب و کامران ٹھہرتے ہیں۔

اللہ رب العزت نے مسلمانانِ پاکستان کو اپنی خصوصی رحمت سے نوازا۔ اُن کے دین کو اُن کی قومیت کی بنیاد بنا دیا۔ دنیا کے ایک سو ننانوے ممالک میں پاکستان واحد ملک ہے جسے لاالٰہ الااللہ کا عنوان دے دیا گیا۔ یوں کہہ لیجیے کہ اُس کے ماتھے پر کلمۂ طیبہ کندہ کر دیا گیا۔ یہ اعزاز کسی دوسرے اسلامی ملک کو بھی حاصل نہیں۔ جب مسلمانانِ پاکستان کا تعلق اپنے دین سے کمزور ہوا اور پاکستان تو حاصل ہی کیا گیا تھا قومیت کی نفی کر کے تو پاکستانیت سے تعلق کمزور ہونا فطری اور منطقی تھا۔ یہ جو ہم روزمرہ کی زندگی میں اس طرح کے جملے سنتے ہیں ''کھا جاؤ، کوئی بات نہیں سرکاری مال ہے'' یا ''یہ پاکستان ہے، یہاں سب چلتا ہے''۔ یہ اُس تعلق کے کمزور پڑنے کا نتیجہ ہے کہ عوام کی زبان سے یہ جملے نکلتے ہیں۔ اب پاکستان غیر کی ایک کھیتی ہے یا ایک ایسا جنگل ہے جہاں طاقت اصل قانون ہے۔ لہٰذا حکمران (حکمران سے مراد ہر وہ طبقہ یا شخص ہے جو کسی نہ کسی شعبہ میں طاقت رکھتا ہے) پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جو ایک بدنیت، بددیانت اور ایمان سے عاری انسان غیر کے مال کے ساتھ کرے گا۔ اُنہوں نے جب محسوس کیا کہ اُن کے اپنے تو صرف دو ہاتھ ہی ہیں اور مال سمیٹنے میں دوسرا سبقت نہ لے جائے تو انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اس میدان میں اتارا اور خود ان کے تحفظ کا فریضہ انجام دینے لگے۔ پرویز مشرف کے دور میں مونس الٰہی نے لوٹ مار کے حوالے سے جس ہنرمندی کا مظاہرہ کیا تھا اور جس تندہی سے مالِ مفت سمیٹا تھا، فرزندان اور وارثانِ چودھری ظہور الٰہی نے اُس کے تحفظ کے لیے ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی سے پیار و محبت کی پینگیں بڑھائیں اور بالآخر اتحاد کر لیا۔ جبکہ ظہور الٰہی خاندان کی خواتین ہی نہیں بچے بھی پیپلز پارٹی کو ظہور الٰہی کا قاتل سمجھتے ہیں۔ حمزہ شریف اور سلمان شریف اور میاں شریف کے خاندان کے دوسرے شہزادے بھی لنگوٹ کس کر میدان میں اترے ہوئے ہیں اور اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ گیلانی صاحب نے صرف بیٹوں پر اکتفا نہیں کیا، سارے خاندان کو ہی اس سونے کی کان میں کان کنوں کی حیثیت سے داخل کر دیا ہے اور وہ وزیراعظم کی طرف سے لگائی ہوئی ذمہ داری احسن طریقے سے ادا کر رہے ہیں۔ بیوروکریٹس کی اولاد تو ایک عرصہ سے پڑھے لکھے انداز میں اس کام میں مصروف تھی۔ وہ بھی سیاسی شہزادوں سے

مکمل تعاون کر رہے ہیں۔ ابھی اور بہت سوں کا ذکر ہوتا کہ ارسلان افتخار بیچ میں آ ٹپکے ہیں۔ شواہد تو یہی ظاہر کرتے ہیں کہ انہوں نے بھی خوب ہاتھ رنگے ہیں لیکن ان کا معاملہ اس لحاظ سے الگ لگتا ہے کہ انہیں والد محترم کی آشیر باد حاصل نہ تھی، نہ ہی وہ انہیں تحفظ دے رہے تھے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ چیف جسٹس نے ملک ریاض کے حق میں کسی سطح پر بھی کوئی فیصلہ نہ دیا۔ البتہ یہ بات ہمیں بڑی عجیب لگی کہ چیف صاحب نے جناتی قوتوں سے تصادم مول لیا ہوا تھا۔ وہ صدر، وزیراعظم اور اُن کے وزراء اور اُن کے لاڈلے سروس کے لوگوں کو ہی نہ للکار رہے تھے بلکہ آج کل اُن کا غضب لاپتہ افراد کے حوالے سے فوج پر بھی نازل ہو رہا تھا اور وہ اس سے بالکل بے خبر رہے کہ ان کی چارپائی تلے کیا ہو رہا ہے۔ انہوں نے کیسے فرض کر لیا کہ لٹیروں کا ٹولہ اس سے صرفِ نظر کرے گا اور اپنا اگلا پچھلا حساب نہیں چکائے گا۔ چیف صاحب یقیناً ایک اچھے اور نیک نیت منصف ہوں گے لیکن ایک باپ کی حیثیت سے وہ بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔

بہرحال کرپشن کے سمندر میں بہت سے شہزادے کشتی رانی کر رہے ہیں اور اپنی پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہم نے دلی لوٹنے کا محاورہ سنا ہوا ہے۔ دہلی لوٹتے دیکھی نہیں تھی لیکن اب اسلام آباد بلکہ پاکستان کا چپہ چپہ لوٹا جاتا دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ تحریر کرتے ہوئے خوشی نہیں بلکہ بہت دکھ ہو رہا ہے۔ انسان مال اور اولاد کی محبت میں اس طرح اندھا ہو جائے اور سوچ وفکر اور عقل سے اس قدر عاری ہو جائے کہ موت اور آخرت کی بات تو بعد کی ہے دنیا میں اس شجر پر اس بے دردی سے کلہاڑا چلائے جس کے سائے میں وہ بیٹھا ہے، یقیناً یہ بہت دکھ کی بات ہے اور دنیا و آخرت کا اس میں خسارہ ہے۔ البتہ ایک بات ہماری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کوڑ کباڑ اور گندگی کے ڈھیر کو یکجا کر رہا ہے۔ وہ ضرور کسی کو سامنے لائے گا جو اس ڈھیر کو نذرِ آتش کر کے خاک اور راکھ میں بدل دے گا۔ جس سے حکمران اور اُن کے شہزادے اپنی منطقی انجام کو پہنچ جائیں گے۔ اب وہ وقت دور نہیں ہے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں۔ اللہ تعالیٰ شر سے خیر برآمد کرے گا۔ ان شاء اللہ!



خس کم ہنوز جہاں ناپاک

فارسی کا ایک محاورہ ہے ''خس کم جہاں پاک'' لیکن اس تحریر کا عنوان باندھتے ہوئے ہم نے جس طرح اسے بگاڑا ہے یعنی خس کم ہنوز جہاں ناپاک، اس پر فارسی اور اچھی اردو سے شغف رکھنے والے حضرات سے ہم معذرت خواہ ہیں، لیکن نیم خواندہ قسم کے لوگوں کی طرف سے ہم پر یہ اعتراض وارد ہوتا رہتا ہے کہ ہم بعض اوقات ملی جلی اردو فارسی لکھتے ہیں جس سے ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ ہم چونکہ خود بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا ان کا اطمینان بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ ''خس'' کے لغوی معنی ہیں سوکھی ہوئی گھاس جسے گھاس پھوس بھی کہا جاتا ہے۔ جب کوئی باغبان زمین کو اس سے پاک کر دیتا ہے تو وہ روئیدگی کے حوالہ سے پاک ہو جاتی ہے۔ فارسی کا یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی نالائق یا نکما شخص جو خیر کی بجائے شر کا باعث بن رہا ہو، کہیں چلا جائے، غائب ہو جائے یا انتقال کر جائے تو کہا جاتا ہے ''خس کم جہاں پاک'' اور ہم نے ''خس کم ہنوز جہاں ناپاک'' تحریر کر کے جو تصرف کیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ ہم اس مظلوم، محروم اور قابل رحم قوم کو بتانا چاہتے ہیں کہ ایک کرپٹ اور نااہل وزیراعظم کی رخصتی سے خس یقیناً کم ہوا ہے، لیکن ابھی جہاں پاک نہیں ہوا۔ خس نے چمن کا گھیراؤ کیا ہوا ہے۔ مکمل صفائی ابھی بہت دور کی بات لگتی ہے۔ اسے تو ہم بمشکل آغاز کہہ سکتے ہیں۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے۔ دل کی بات کہیں تو حقیقت یہ ہے کہ ملک کیا ہے خس کا ایک ڈھیر ہے۔

گیلانی صاحب بڑی مشکل سے ایوانِ اقتدار سے نکلے ہیں بلکہ صحیح تر الفاظ میں نکالے گئے ہیں۔ اقتدار سے چمٹے رہنے کی خواہش نے انہیں بہت رسوا کیا اور وہ کوچۂ اقتدار سے بڑے بے آبرو ہو کر نکلے ہیں۔ ان کی چار سالہ حکمرانی نے عوام کو مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ کے سوا کچھ نہیں دیا۔

وہ خوش شکل تھے، اُجلے سوٹ پہنتے تھے، لیکن ان کا اندازِ حکمرانی انتہائی بدصورت تھا۔ انہوں نے داخلی سطح پر قوم کو اندھیروں میں دھکیل دیا اور خارجی سطح پر پاکستان کی ذلت و رسوائی میں اضافے کا باعث بنے۔ ہمارا ماضی گواہ ہے کہ ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ چلے جانے والوں کو برا بھلا کہا جائے یا سارا بوجھ ان پر ڈال دیا جائے، لیکن اندازہ کیجیے کہ ہم اُس حکمران پر کن الفاظ میں تبصرہ کریں جس کے ملک کی خودمختاری اور آزادی کو ایک دوسرا ملک بڑی طرح روند ڈالے اور اپنے کسی دشمن کو ہلاک کر دے اور وہ حکمران اسے عظیم فتح قرار دے۔ ہماری مراد اور ہمارا اشارہ ایبٹ آباد پر امریکی ہیلی کاپٹروں کے حملے کی طرف ہے۔ وہ کیسی بدقسمت قوم ہوگی اور وہ کتنا بدبخت حکمران ہوگا جو کسی دوسری قوت کو یہ پیغام دے کہ تم ڈرون حملے یا کسی بھی قسم کے حملے کرتے رہو، ہم عوامی سطح پر اور اسمبلی میں اس کی مذمت کرتے رہیں گے، لیکن آپ کے کام میں مزاحم نہیں ہوں گے۔ کسی حکمران کا ظاہری جسم کتنا ہی خوبصورت اور اس کی جلد کتنی ہی گوری کیوں نہ ہو، لیکن اس کا باطن اگر اس قدر سیاہ ہو اور وہ بیت المال پر دن دہاڑے ڈاکہ زنی کرتا ہو، کسی سپر قوت کو اپنے عوام کا خون بطور تاوان ادا کرتا ہو اور اُس کے اہل خانہ قومی خزانے کو یوں لوٹ رہے ہوں جیسے غیر مہذب اور وحشی فوج مفتوح علاقے کو لوٹتی ہے تو ہم ایسے حکمران کی رخصتی پر رنجیدہ کیوں ہوں۔ ہاں ہم رنجیدہ ہیں مگر اس بات پر کہ مستقبل قریب میں ہمیں اندازِ حکمرانی بدلتا نظر نہیں آتا۔ کرپشن کیسے اور کیوں ختم ہوگی؟ لوڈ شیڈنگ اور مہنگائی سے کیسے جان چھوٹے گی؟ اس لیے کہ گدی نشین تو جا رہا ہے، لیکن شنید ہے کہ کرپشن کا راجہ آ رہا ہے اور بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر آ رہا ہے اور منکر کی معراج سے وصل کی خواہش لیے آ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں سرمایہ دارانہ نظام مغربی جمہوریت کو ڈھال بنا کر اپنے عزائم کی تکمیل کر رہا ہے۔ وہاں عوام کی اکثریت ایک گھوڑے کی مانند سرمایہ داری کے تانگہ میں جتی ہوتی ہے، لیکن وہاں کا تانگہ بان سمجھتا ہے کہ ارتکازِ دولت کے لیے اور اپنے اقتدار و کنٹرول کو مضبوط، مستحکم بلکہ دائمی بنانے کے لیے اس جُتے ہوئے گھوڑے (یعنی عوام کی اکثریت) کو زندہ ہی نہیں اتنا توانا بھی رکھنا ہوگا کہ ہمارا کام محنت و مشقت بلکہ کسی حد تک خوش دلی سے کر سکے۔ وہ مرغی کو ذبح نہیں کرنا چاہتے، وہ اس کے انڈے کھانا چاہتے ہیں۔ مغرب کا سرمایہ دار اپنے ابلیسی عزائم کی تکمیل میں کچھ اصول و ضوابط کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ باطل پر کچھ نہ کچھ

حق کا رنگ نہ چڑھایا تو اس کی اصلیت جلد سامنے آ جائے گی۔ ہمارا ایمان ہے کہ حقیقت اور اصلیت تو پھر بھی سامنے آ جائے گی لیکن اس عیاری اور شعبدہ بازی سے وہ کچھ عرصہ تک عوام کی اکثریت کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہمیں بہرحال پاکستان سے مطلب ہے اور پاکستان کا سرمایہ دار، وڈیرہ اور جاگیردار تو کند چھری سے اپنی مرغی کو ذبح کرنے پر تلا ہوا ہے۔

لہٰذا ہمارا سوال یہاں کی سیاسی و غیر سیاسی مذہبی جماعتوں اور مخلص افراد سے یہ ہے کہ کیا یہ سارا تماشا دیکھ کر اور گاؤ اور خر کی آمد و رفت کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر کے بھی وہ کسی حقیقی تبدیلی کی امید لگائے ہوئے ہیں۔ کیا اب بھی سوچ یہی ہے کہ democratic process یعنی جمہوری لائحہ عمل اختیار کرنے سے پاکستان میں انقلاب آ جائے گا؟ کیا اب بھی آنکھیں نہیں کھلیں؟ کیا کسی حادثے اور سانحہ کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ یہ حقیقت آشکار ہو کہ تبدیلی کے لیے انقلاب ناگزیر ہے۔ جمہوری لائحہ عمل سے تو کوئی راجہ، کوئی مخدوم، کوئی شریف، کوئی چودھری سٹیٹس کو کے دوام کے لیے آئے گا۔ نعروں میں تو اختلاف ہو گا مگر عزائم اور ہدف یقیناً ایک جیسے ہوں گے۔ ہم کتنا عرصہ خود فریبی میں مبتلا رہیں گے؟ کب تک حقیقت سے آنکھیں چرائیں گے؟ کسی زمانے میں ہم نے سافٹ انقلاب کے لیے اپنے دل اور دماغ میں زبردستی جگہ پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ ہم بہت زیادہ rigidity کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں اسلام کے نفاذ سے غرض ہے۔ اپنے منہج ہی کو درست ثابت کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی دوسرے ذریعے سے (یعنی سافٹ انقلاب وغیرہ سے) حقیقی اسلام کا نفاذ ہو جائے تو ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہم آم کھانے سے غرض رکھتے ہیں، پیڑ گننے سے نہیں۔ لیکن جو صورت حال اب سامنے آ رہی ہے اور حالات کا رخ جو سمت اختیار کر رہا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام صرف منہج انقلاب نبویؐ کی پیروی میں ہی ممکن ہے اور یہ اب کوئی کہنے والی بات نہیں رہ گئی، بلکہ نوشتۂ دیوار ہے اور اندھوں پر بھی واضح ہو رہا ہے کہ پاکستان کا مستقبل صرف اور صرف اسلام سے وابستہ ہے، پاکستان کا آج بھی مطلب لا الٰہ الا اللہ ہے۔ وگرنہ پاکستان بے مطلب اور بے مقصد ہو جاتا ہے اور قدرت کے کارخانے میں بے مقصد چیزوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔



دینی جماعتوں کے لیے لمحہ فکریہ!

گزشتہ پینسٹھ سالوں میں پاکستان میں مختلف حکومتوں کے ادوار پر نگاہ ڈالیں۔ آپ حتمی طور پر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ کسی ایک حکومت کا بھی خاتمہ بالخیر نہیں ہوا۔ سب کا انجام اس حالت میں ہوا کہ وہ عوام میں نہ صرف غیر مقبول ہو گئی تھیں بلکہ اکثر کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ عوامی نفرت کا نشانہ بن چکی تھیں۔ ہم بات ایوب خان کی حکومت سے شروع کرتے ہیں کہ اس سے پہلے کے ادوارِ حکومت پر تبصرہ ماضی بعید کی بات ہو گی۔ ایوب خان کی فوجی حکومت ملک میں پہلا مارشل لاء تھا۔ عوام نے اِس کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ بعض حلقوں نے ایوب خان کو ملک کا نجات دہندہ قرار دیا۔ لیکن حکومت کے آخری دنوں میں پاکستان کی سڑکوں پر صدر ایوب کے نام کے ساتھ جو لاحقے لگائے گئے وہ مہذب زبان اور قلم سے ادا نہیں کیے جا سکتے۔ اکثریت کی زبان پر ایک ہی جملہ تھا ایوب خان تمام مسائل اور برائیوں کی جڑ ہے، ایوب خان کے بعد سب اچھا ہو گا۔ یحییٰ خان کا انجام اچھا کیا ہوتا، اس کا تو آغاز بھی اچھا نہ تھا۔ اس کے دور میں پاکستان دولخت ہوا۔ اُس دور میں اگر یہ شخص عوام کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اس کا تکہ بوٹی کر دیتے۔ یحییٰ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو آئے اور بڑی دھوم دھام سے عوام کے کندھوں پر سوار ہو کر آئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کئی عشرے تک ان کا سکہ چلے گا، لیکن پانچ سال سے بھی کم عرصہ میں ان کے خلاف ایک ایسی تحریک ملک کے کونے کونے میں برپا ہوئی جس کی نظیر آج تک نہیں ملتی۔ لہٰذا فوج کے آسان شکار بنے۔ وہ کہتے تھے مجھے نکالا گیا تو ہمالیہ روئے گا، لیکن جب کان پکڑ کر انہیں حکومت سے نکالا گیا تو شاید ہی ملک کے کسی حصہ میں معمولی سطح کا بھی احتجاج ہوا ہو، یہاں تک کہ ان کی پھانسی پر بھی جیالے غائب تھے۔ البتہ چند خاکروبوں نے خود کو نذرِ آتش کیا اور احتجاج تمام ہوا۔ بھٹو کے

خلاف بھی تحریک کے دوران سیاست دان خصوصاً ہمارے دینی رہنما جگہ جگہ عوام کو بتا رہے تھے کہ بھٹو اصل مسئلہ ہے، اس کے بعد دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہوں گی، اشیائے ضرورت کی قیمتیں کم ہو جائیں گی اور راوی چین ہی چین لکھے گا۔ بہر حال عوام کی قسمت کا فیصلہ کرنے اور آئین میں ترمیم کرنے کا حق مردِ حق ضیاء الحق کو دے دیا گیا۔ وہ گیارہ سال لوگوں کو اسلامی نظام کی نوید سناتے رہے، لیکن حق بات یہ ہے کہ اسلام کے حوالہ سے ان کا طرزِ عمل میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا..... بہر حال وہ جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوئے۔ کوئی انہیں شہید قرار دیتا اور کوئی کہتا کہ اللہ کے غضب سے وہ جلا کر راکھ کر دیے گئے، واللہ اعلم!

پھر یہ آواز گونجی کہ پاکستان کے مسائل کا حل جمہوریت میں ہے۔ جمہوریت ایسا ''معجزہ'' ہے جس سے سب کچھ خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ دینی جماعتوں سمیت سب سیاسی جماعتوں نے ایک بار پھر جمہوریت کی چادر اوڑھ لی۔ ایک بار پھر ہمیں معلوم ہوا کہ تمام مسائل کا حل جمہوریت میں ہے۔ دو بار اقتدار میں آ کر بے نظیر نے اور دو مرتبہ ہی نواز شریف نے جمہوریت میں سے پاکستان کے مسائل کا حل نکالنا چاہا مگر دونوں مرتبہ خود مسئلہ بن کر ملک بدر ہوئے۔ کسی پاکستانی نے، کسی عاشقِ جمہوریت نے اُن کی رخصتی پر ایک آنسو بھی نہ بہایا۔ اب پرویزی دور شروع ہوا۔ پرویزیت نے تاریخ میں کب اسلام کا بھلا کیا تھا جو اب کرتی۔ پرویز کو تو لایا ہی اس لیے گیا تھا کہ نائن الیون کا ڈراما رچا کر مسلمانوں کے خلاف جو صلیبی جنگ شروع کرنا ہے اس میں پرویز ہی میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کرے گا اور عیسائی جنگجوؤں سے مل کر مسلمانوں کا قتل عام کرے گا۔ بہر حال عزت سے وہ بھی نہ نکلا۔ افغان جنگ کی وجہ سے دینی جماعتوں نے اسے غدار اعظم قرار دیا۔ البتہ ہم نے دینی جماعتوں کے ایک اجتماع کے سامنے یہ بات رکھی کہ پرویز یقیناً غدار ابن غدار ہے، لیکن ہمیں ایسا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کے بعد کوئی ایسی شخصیت مسلط نہ ہو جائے کہ پرویز کا کردار بھی دھندلا دے اور نیا آنے والا پاکستان، اسلام اور عوام دشمنی میں پرویز کو بھی مات کر دے۔ ہمارا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ آج پاکستانیوں کی اکثریت دہائیاں دے رہی ہے کہ اس زردار آصف سے تو پرویز ہی بہتر تھا۔ آج فضاؤں میں پھر یہ نعرے گونج رہے ہیں ''گو زرداری گو''۔ آج پھر کہا جا رہا ہے کہ زرداری ٹولے نے ملک لوٹ لیا، ملک تباہ و برباد ہو گیا۔ مہنگائی، بیروزگاری اور لوڈ شیڈنگ سے عوام تنگ آئے ہوئے ہیں۔ احتجاج گھیراؤ جلاؤ ہو رہا ہے۔ سیاسی

اور مذہبی جماعتیں ایک بار پھر ملک میں نئے انتخابات اور نئے حکمرانوں کو مسائل کا حل بتا رہی ہیں۔ ایک بار پھر عوام کو بتایا جا رہا ہے کہ تمام مصائب و آلام سے نجات حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے میں ہے۔

مکمل پس منظر بیان کرنے اور ایک طویل تمہید باندھنے کے بعد ہم عوام سے عرض کریں گے کہ آج پاکستان مسائل کی دلدل میں پھنس چکا ہے' معاشی لحاظ سے تباہ ہو چکا ہے' سیاسی عدم استحکام عروج پر ہے' ہماری خودمختاری اور آزادی ایک سوالیہ نشان بن چکی ہے، ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا وقار دنیا میں ختم ہو چکا ہے تو کیا اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ماضی میں اور آج بھی ہمارے حکمران بُرے لوگ تھے اور ہیں۔ یقیناً ایک وجہ یہ بھی ہے، لیکن اگر صرف یہی ایک وجہ ہے تو کیا نئے انتخابات سے یا نئے جرنیل کے مارشل لاء لگانے سے اچھے لوگ آسمان سے ٹپک پڑیں گے۔ کھلے ذہن' دیانت داری اور جذبہ حب الوطنی کے تحت مرض کی تشخیص کیجیے۔ اصل بیماری اور فساد کی جڑ وہ سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی جمہوریت ہے جسے ہم نے اپنے مغربی آقاؤں اور امریکہ سے درآمد کیا ہے اور اس باطل نظام کو بھی ایسے بھونڈے انداز سے چلایا گیا اور ایسے بدعنوان لوگوں کو اس نظام میں ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں کہ جو ایک آدھ خیر کی بات اس نظام میں تھی وہ بھی عنتر بود ہو گئی اور شر ہی کا باعث بنی۔

ہم عام سیاست دانوں سے کوئی توقع نہیں رکھتے، نہ سیکولر دانشوروں ہی سے مخاطب ہوتے ہیں بلکہ صرف دینی جماعتوں کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ وہ اپنی سوچ، اپنے طرزِ فکر اور اپنے لائحہ عمل پر غور کریں کہ وہ اس میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یا نہیں۔ ہماری رائے میں پرانی سوچ اور طرزِ عمل تو پہلے جیسے ہی نتائج برآمد کرے گا۔ کیا ہم طرزِ کہن پر ہی اڑے رہیں گے؟ کبھی بحالیٔ جمہوریت کی تحریک اور کبھی بدعنوان سیاست دانوں سے نجات کے لیے جی ایچ کیو سے درخواستیں۔ خدارا غور کیجیے، اصل مرض کی تشخیص کریں، حقائق تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ حقائق سے نظریں چرا کر محض نعرہ بازی سے اور جھوٹے وعدوں سے قوم کی حالت نہیں بدلی جا سکتی۔ قوم کی تبدیلی کے لیے فرد کی تبدیلی ناگزیر ہے۔ افراد کی سوچ اور کردار تبدیل ہو گا تو اجتماعی تبدیلی ممکن ہو گی۔ ہمیں اس ظالم سرمایہ دارانہ نظام کو تبدیل کرنا ہو گا اور انسانی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ نظام کبھی جمہوری ذرائع اختیار کرنے سے تبدیل نہیں ہوتے۔ جمہوریت تو موجود نظام کی رکھوالا ہوتی ہے۔

لہٰذا نظام کی تبدیلی کے لیے انقلاب ناگزیر ہے۔ اگر دینی جماعتیں اور ان کے قائدین اس نظریہ پر یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے قائم ہوا تھا تو براہِ کرم اسلامی انقلاب کے لیے کوشاں ہو جائیں۔ کیا پاکستان کی تاریخ گواہ نہیں ہے کہ جب بھی دینی جماعتوں نے متحد ہو کر پریشر گروپ کی صورت اختیار کی تو وقت کے فرعونوں کو اس کے سامنے جھکنا پڑا۔ ہم اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں کی مدد کے بغیر بھی پاکستان کی دینی جماعتیں متحد ہو کر اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے میدان میں کود پڑیں تو کامیابی ان شاءاللہ ان کے قدم چومے گی۔ البتہ شرط صرف یہ ہے کہ ان کے کارکنان خود اپنی ذات پر بھی اسلام نافذ کیے ہوئے ہوں۔ ہمیں اب ہوش میں آ جانا چاہیے۔ پاکستان ہر سطح پر تنزل کا شکار ہوتے ہوئے اب زمین سے آ لگا ہے۔ اب دو ہی راستے ہیں: یا تو وطن عزیز خدانخواستہ زمین میں دھنس جائے گا اور یا اس کی بلندیوں کی طرف پرواز کا آغاز ہوگا ان شاء اللہ۔ بلندیوں کی طرف پرواز صرف اس صورت میں ممکن ہوگی جب ہدف بلند ہوگا، جب عزائم بلند ہوں گے، جب جرأتیں اور حوصلے بلند ہوں گے۔ ہمیں انقلاب کے لیے نہ کسی نئے لائحہ عمل اور نہ کسی نئے منہج ہی کی ضرورت ہوگی۔ اسلامی انقلاب کے لیے منہج نبویؐ کی رہنمائی موجود ہوتے ہوئے کسی نئے منہج کو اپنانا حماقت عظمیٰ اور اپنی منزل کھوٹی کرنا ہے۔



عیدِ آزاداں یا عیدِ محکوماں

قرآن پاک سے یہ ثابت ہے کہ اللہ رب العزت نے انسانی ارواح کو جسد عطا کرنے سے پہلے ان کا ایک اجتماع کیا اور ان سے پوچھا: ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟'' انہوں نے اجتماعی طور پر اقرار کیا اور کہا ''کیوں نہیں''۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس دنیا میں آنے والے آخری انسان نے عالمِ ارواح میں یہ اقرار کیا تھا کہ اللہ ہی اس کا رب ہے۔ رب عربی میں مالک کو کہتے ہیں۔ گویا پوری انسانیت اللہ کی اقرار کردہ اور تسلیم شدہ غلام ہے۔ اللہ نے اس روح کو جسد دے کر اس فانی دنیا میں بھیجا تو اس اقرار کی یاددہانی کے لیے اور اسے تازگی بخشنے کے لیے ان ہی بندوں میں سے کچھ کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے بھیجا، تاکہ بندگیٔ رب کے شعور سے بہرہ ور بندوں کو آدابِ غلامی کے صحیح طریقے سکھائے جائیں۔ یہ خصوصی نمائندے انبیاء اور رسل کہلائے۔ ان میں سے بعض کو صحیفے اور کتابیں دے کر بھیجا گیا۔ ان انبیاء اور رسل نے انسانوں کو کس نوعیت کی دعوت دی اور الہامی صحیفے اور کتابیں کیا پکار پکار کر کہتی رہیں، ان کا خلاصہ اور نچوڑ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ یہ ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ ساری کائنات کا خالق، مالک، رازق، پروردگار اور مشکل کشا صرف اللہ ہے اور صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کا نہ کوئی ساجھی، کوئی ہمسر ہے نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے۔ انسان سب برابر ہیں۔ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی عربی کو عجمی پر برتری حاصل نہیں البتہ فضیلت کی بنیاد زہد اور تقویٰ ہے۔ کسی انسان کو دوسرے انسان کا مالی، جانی، معاشرتی اور سیاسی استحصال کرنے کی اجازت نہیں۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانوں کو احکاماتِ الٰہی اور انبیاء و رسل کے ذریعے لاگو کی گئی شریعت یعنی قانون اور ضابطے کا پابند ہونا ہوگا۔ لیکن انسانی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا

ہے انسان نے بالعموم باغیانہ روش اختیار کی۔ اپنی حد سے تجاوز کرتے ہوئے خدائی اختیارات اپنے لیے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہر فرعون، نمرود، ہٹلر اور بش کو عارضی کامیابی کے بعد ابدی ناکامی ہوئی اور عبرتناک انجام سے دوچار ہوئے، لیکن کسی نے تاریخ سے سبق نہیں سیکھا۔ ان میں سے ہر ایک نے انسانی حقوق غصب کرنے اور انسانوں کا استحصال کرنے کے لیے ایک جیسے بھی اور مختلف حربے بھی استعمال کیے، لیکن ناکامی ان سب کا مقدر بنی۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان انسان کے زرخرید غلام ہوتے تھے۔ غلام کی تمام تر توانائیاں اور صلاحیتیں بھی اپنے اِس مالک کے لیے وقف ہوتی تھیں حتیٰ کہ وہ اس کی جان کا مالک بھی ہوتا تھا۔ اگر کوئی مالک اپنے غلام کو قتل بھی کر دیتا تو یہ اس کا حق سمجھا جاتا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے دور مبارک میں غلامی کی تمام قسموں کو ختم کر دیا گیا سوائے جنگی قیدیوں کے، ان کی رہائی اور آزادی کے بھی کئی طریقے مقرر کر دیے گئے۔ پھر یہ کہ ان سے حُسنِ سلوک کی جس طرح اور جتنی تاکید کی گئی یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلامی کا پرانا تصور ایک طرح ختم ہو گیا۔ خلافت نے جب بادشاہت اور شہنشاہیت کا لبادہ اوڑھ لیا تو اقتدار اور کشور کشائی کی ہوس نے ریاستوں اور ممالک کو غلام یا باجگزار بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی ہندوستان میں مغل، تغلق اور لودھی وغیرہ واضح مثالیں ہیں۔

غیر اسلامی دنیا پہلے ہی ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کی قائل تھی۔ سترہویں صدی عیسوی میں دنیا بھر میں مسلمانوں کا زوال اپنے عروج پر پہنچ گیا اور تمام اسلامی ممالک بلاواسطہ یا بالواسطہ غیروں کے تسلط میں آ گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان ممالک میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں اور اس صدی کے وسط تک مسلمانوں نے جانی و مالی قربانیاں دے کر آزادی حاصل کی۔ ہم نے ہمیشہ ان کے جوش اور جذبے کو سراہا ہے لیکن آج اگر حالات کا معروضی جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہیں کہ مسلمان اگر آزادی حاصل کرنے اور غیروں کو اپنے ملکوں سے نکالنا چاہتے تھے تو غیر بھی اندازِ حکمرانی کو بدلنا اپنے لیے ناگزیر سمجھنے لگے تھے۔ بات کو اگر کھول کر بیان کیا جائے تو وہ یوں ہے کہ انیسویں صدی میں جمہوریت کے غلغلے اور بے تحاشا بڑھتی ہوئی آبادی نے ان حکمرانوں کے لیے کچھ مشکلات پیدا کی تھیں، لہٰذا اندازِ حکمرانی بدلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ حکمرانی کے لیے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا وسائل پر جابرانہ قبضہ کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا گیا کہ ریاست اور مذہب کا رشتہ کاٹ دیا گیا اور ان کے راستے

الگ کر دیے گئے، تا کہ کوئی اخلاقی یا ماورائی قدغن اِس تسلط کے راستے میں حائل نہ ہو سکے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور کاغذ کی کرنسی نے ان کے کام کو آسان کر دیا۔ مواصلات کی ترقی نے دنیا کو چھوٹا کر دیا تھا۔ حاصل شدہ وسائل سے میڈیا کو خریدا گیا اور نظریات کی خرید و فروخت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ظاہر ہے، وسائل پر قابض ہونے کی وجہ سے اسی گروپ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ اس حکمران گروپ نے ایک قدم اور بڑھایا اور سرمائے کو یکجا کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں ملٹی نیشنل کمپنیاں قائم ہو گئیں اور اس سرمایہ پرست نظام کے مقابلے میں جو نظام تھے اپنی کٹھ پتلی حکومتوں کے ذریعے ان پر حملہ آور ہوئے۔ سوشلزم اور کمیونزم اگرچہ انسانی استحصال ختم کرنے کے جھوٹے دعوے دار تھے تب بھی انہیں قبول نہیں تھے لہٰذا سوویت یونین کو نشانہ بنا کر اشتراکیت کا جنازہ نکال دیا گیا۔

یہ سرمایہ پرست گروپ باہم ضم ہوتے ہوئے اب سات بینکوں کے مالکان پر مشتمل ہے۔ یہ گروپ عالمی سطح پر بادشاہ گر بن چکا ہے اور دنیا کی حکومتوں کو کنٹرول کرتا ہے اور ان کی دفاعی قوت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسلامی نظام اگرچہ دنیا میں کسی ایک اسلامی ملک میں بھی نافذ نہیں، لیکن ایک انتہائی پرکشش اور فطری نظام تو ہے، لہٰذا تمام اسلام دشمن قوتیں مسلمان ممالک پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمان ممالک میں کسی ایسے شخص کو اقتدار کے قریب نہیں پھٹکنے دیا جاتا جو نظریاتی ہو اور اس مالیتی غلامی سے نکلنے کی سوچ رکھتا ہو۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان ممالک کے ظاہری مسلمان حکمران ان بینک کاروں کی غلام سپر قوتوں کے غلام ہیں یعنی امریکہ اور مغرب وغیرہ ان بینک کاروں کے غلام ہیں اور مسلمان حکمران امریکہ برطانیہ وغیرہ کے غلام ہیں۔ ہمیں کسی حد تک اندرونی سطح پر آزادی حاصل ہے اور اُن معاملات میں آزادی حاصل ہے جنہیں ہمارے انیسویں صدی کے حکمران جدید دور میں اپنے لیے دردِ سر سمجھنے لگے تھے۔ اور یہ بات ہمارے سامنے کھل کر سامنے آئی ہے کہ حقیقی آزادی ابھی کوسوں دور ہے۔ سابقہ آقاؤں نے جسمانی قبضہ چھوڑ کر جو ان کے لیے مسائل پیدا کر رہا تھا ذہنی اور نظریاتی قبضہ حاصل کر لیا تھا اور گزرتے ہوئے ہر دن میں اس تسلط اور قبضہ کو مستحکم کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت مسلمان ممالک کی حالت کسی کی کم اور کسی کی بیش اس بیل کی سی ہے جو ہل کے آگے جتا ہوا ہے۔ اسے کھانے کو ملے گا اگر وہ فرمانبرداری سے اپنی ڈیوٹی ادا کرتا رہے گا بلکہ اس سے بھی ایک

قدم آگے بیل کو صرف زمین کے مالک کی مانی ہوتی ہے۔ جبکہ مسلمان ممالک اس امریکہ اور یورپ کے غلام ہیں جو خود ان سات بینکاروں کے غلام ہیں۔ مسلمان حکمرانوں کے لیے کٹھ پتلی کا لفظ بھی غلامی کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ عالم اسلام اپنی گردن میں پڑے غلامی کے اس پھندے سے اُس وقت تک نجات حاصل نہیں کر سکتا جب تک سرمایہ پرستوں کے اِس گروپ کے بنائے ہوئے نظام کو تہہ و بالا نہ کر دے اور اُمت مسلمہ حقیقتاً وجود میں نہ آ جائے اور نظام خلافت کو بحال نہ کر دیا جائے۔ اُس وقت تک ہماری عید کیسی ہوگی۔ آیئے علامہ اقبال کے اس شعر پر غور کرتے ہیں اور پھر فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم کون سی عید منانے چلے ہیں۔

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مؤمنیں



عید کبھی رمضان سے پہلے نہیں آتی!

''عیدِ آزاداں یا عیدِ محکوماں'' کے عنوان سے لکھے جانے والے ندائے خلافت کے اداریے پر یہ اعتراض وارد ہوا ہے کہ خوشیوں سے ترسی ہوئی اس قوم کو عید کی خوشی تو منا لینے دیں۔ ہم اقرارِ جرم کرتے ہیں کہ یہ تحریر لکھ کر ہم نے پوری قوم کے نہ سہی لیکن بہت سے لوگوں کے رنگ میں بھنگ ڈالا ہے۔ اگرچہ اسی شمارے میں پروفیسر مولانا خلیل احمد نوری کے مرتب کردہ مضمون ''سرورِ کائنات ﷺ کی عید'' کے عنوان سے مضمون کو شائع کر کے ہم نے اپنے دینی بھائیوں کو یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ایک مسلمان کو آقائے نامدار کی پیروی میں عید کس طرح منانی چاہئے۔ عید کا لغوی معنی لوٹ لوٹ کر یا بار بار آنے والی شے ہے۔ ظاہری طور پر اس کے لغوی معنوں میں خوشی کا کوئی عنصر نہیں، لیکن یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مختلف مواقع پر آپؐ نے نہ صرف عید الفطر بلکہ عید الاضحیٰ کو بھی خوشی کا موقع قرار دیا۔ آپؐ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں کو دیکھا کہ وہ سال میں دو تہوار مذہبی جوش و خروش سے مناتے ہیں اور اس میں خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ آپؐ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ میں تمہیں اس سے بہتر دو دن دیتا ہوں۔ یہ دو دن عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے ہیں۔ لہٰذا اس میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ عیدین مسلمانوں کے لئے خوشی کے تہوار ہیں۔

آج کا مسلمان ان دو تہواروں پر ہی سنجیدگی سے غور کر لے تو حقیقت کھل کر اس کے سامنے آجائے گی کہ ان خوشیوں کی قیمت کیا ہے۔ ایک ذہین باپ نے اپنے بیٹے کو سمجھانے کے لئے کہا اور کیا خوب کہا ''بیٹا یاد رکھو، عید کبھی رمضان سے پہلے نہیں آتی''۔ تیس دنوں کے روزے، موسم کی شدت ہے، دن طویل ہے، اس حال میں چوبیس گھنٹوں میں 15، 16 گھنٹے حلال بھی

حرام ہے۔ باقی آٹھ گھنٹوں میں جو خورد و نوش کرنا ہے اس کے لئے محنت و مشقت بھی روزے کی حالت میں کرنا ہے۔ یہ سب کچھ عید الفطر کے لئے ہے۔ زندگی بھر خوشی کے حصول کے لئے کیا کچھ نہ کرنا ہوگا۔ زندگی بھر کی خوشی کے لئے زندگی بھر روزہ رکھنا ہوگا۔ ایسا روزہ جس کا افطار صرف انسان کی زندگی ختم ہونے سے ہی ممکن ہے۔ یہ روزہ آخری سانس تک چلتا ہے یعنی روزمرہ زندگی میں اللہ کی مستقل حرام اور ناجائز قرار دی گئی چیزوں کا روزہ۔ تمام غیر شرعی افعال سے بچنا بالکل اسی طرح جس طرح آپ رمضان کے روزہ میں حلال اشیاء کے کھانے اور جائز جنسی خواہش کی تکمیل سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ قرآن پاک میں جہاں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا اعلان ہے وہیں آیت میں آخری الفاظ ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ آئے ہیں۔ یعنی تقویٰ کا حصول روزہ کا اصل مقصد ہے۔ ماہ رمضان کے روزوں کی مشقت اور محنت بقایا گیارہ ماہ میں حرام سے بچنے کی مشق ہے۔ رہا سوال دوسری عید یعنی عید الاضحیٰ کا تو وہ قربانیوں کی بے نظیر داستان ہے۔ آج دنیا خصوصاً ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کثیر تعداد مل جائے گی جو اولاد کی خاطر شاید اپنی جان بھی قربان کرنے کو تیار ہو جائیں۔ سوچئے اور سلام پیش کیجئے اس عظیم ہستی کو جو خواب میں اشارہ ملنے پر بڑھاپے میں میسر آئی ہوئی نرینہ اولاد کو اللہ کے حضور قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔ جو آگ کے سرہانے کھڑا ہو کر کہے نہیں مانوں گا اللہ کے سوا کسی معبود کو، جو شیر خوار بچے اور جواں سال بیوی کو ویرانے میں اللہ کے سہارے چھوڑ آئے۔ اگر کوئی قوم رمضان کے بغیر عید کی طالب ہو تو اُس پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور جو قوم اپنی نفسانی خواہشات کو تو بے لگام چھوڑ دے لیکن جانوروں کی قربانی بڑھ چڑھ کر کرے اور عیدِ قربان منانے کا دعویٰ کرے تو اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے سنتِ ابراہیمیؑ کی ادائیگی نہیں کہا جا سکتا۔ سو عید الفطر ہو یا عید الاضحیٰ بلاشبہ یہ بڑے عظیم تہوار ہیں مگر یہ بے مقصد اور بلا جواز نہیں ہیں۔

ہمارے معترضین کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے بات عیدِ آزاداں سے بھی آگے بڑھا دی۔ اعتراض ایک لحاظ سے درست ہے، اس لئے کہ اب ہم نے عیدِ مومنین کی بات کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عید آزاداں تو مومنین ہی منا سکتے ہیں۔ اللہ کرے ہم اس حقیقت کو جان لیں کہ اسلام ایک دین ہے، ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، مذہب جس کا جزو لاینفک ہے۔ اسلام اگر غالب نہیں ہے اور یہ ضابطہ حیات اگر نافذ نہیں تو اجتماعی سطح پر قوم کا اسلام بھی سوالیہ نشان بن جاتا ہے۔ یاد رہے

انفرادی معاملہ مختلف ہوسکتا ہے۔کوئی شخص اپنی ذات میں مومن ہوسکتا ہے۔

زیرِ بحث مسئلہ یہ تھا قومی سطح پر ہم عیدِ آزاداں منا رہے ہیں یا عیدِ محکوماں۔اس کا جائزہ لینے کے لئے ہماری خواہش ہے کہ ہم کچھ دیر کے لئے قومی سطح پر آئینہ کے سامنے بیٹھیں، تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہم ہجوم مومنین بھی ہیں یا نہیں۔صدر مملکت سے آغاز کرتے ہیں۔اندازہ کیجئے اخلاقی اور ذہنی معیار کا کہ کرسی صدارت سنبھالتے ہی فرماتے ہیں عہد کوئی قرآن یا حدیث ہوتا ہے کہ اس سے انحراف نہیں ہوسکتا یعنی ملک کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز شخص عہد شکنی کو برائی ہی نہیں سمجھتا۔ان کے دورِ صدارت میں جو شخص جتنے بڑے مالی اسکینڈل میں ملوث ہوا عہدہ کے حوالہ سے اتنی ہی ترقی کرتا چلا گیا۔سابق وزیراعظم گیلانی کے نام کے ساتھ جب ایک ٹیلی وژن پر ہم نے MBBS کا لاحقہ دیکھا تو ہم سمجھے کہ شاید وہ ڈاکٹر ہیں، بعد میں معلوم ہوا کہ کرپشن کا ذکر ہو رہا تھا اور ان کے بارے میں کہا گیا کہ کرپشن میاں بیوی بچوں سمیت۔کون نہیں جانتا کہ ان کی اہلیہ پر بنک فراڈ کا الزام ہے۔ان کے بیٹوں کے خلاف مقدمات درج ہیں۔انہوں نے حاجیوں کو بھی نہ بخشا۔یہ فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔یہ تو ہم نے چاول کی دیگ سے ایک آدھ دانہ چیک کیا ہے۔پاکستان کے سیاست دانوں کی اکثریت کا یہی حال ہے۔جرنیلوں کے بارے میں بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس معاملے میں سیاست دانوں پر سبقت لے جا چکے ہیں۔بہت سے شواہد اِس دعویٰ کی تصدیق کرتے ہیں۔عدلیہ میں کچھ جج بہتر ہو سکتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ہماری عدالتوں میں انصاف بکتا ہے۔غیر ملکی اثاثہ جات میں ہمارے بیوروکریٹ سرفہرست ہیں۔ان میں سے بعض ہمارے صنعتکاروں اور بڑے کاروباریوں کو بھی پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔اب حکمرانوں کے آگے سے آئینہ اٹھا کر عوام کے سامنے رکھ دیں۔صنعت کار اور بڑے کاروباری ایک سال میں کئی کئی عمرہ ادا کرتے ہیں اور رمضان کا آخری عشرہ تو لازماً سعودی عرب میں گزرتا ہے، لیکن پاکستان میں سب سے زیادہ جعلی دوائیں بکتی ہیں۔خالص خوراک قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔جعلی ڈگریاں با آسانی دستیاب ہیں۔عدالتوں اور کچہریوں میں جھوٹے گواہوں کی دستیابی باقاعدہ ایک کاروبار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ڈاکٹر موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا مریض کی طرف اس وقت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے جب تک فیس ملنا یقینی نہ ہو جائے۔انجینئر اور سرکاری ٹھیکیدار بعض اوقات کاغذوں میں پُل تیار کر کے بعد ازاں سیلاب میں بہا دیتے ہیں۔جھوٹ،

غیبت اور بہتان تراشی کو ہم نے گناہوں کی فہرست سے خارج کر دیا ہوا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ آئینہ نے چغلی کھائی ہے کہ ہم بحیثیت مجموعی ہجومِ مومنین بھی نہیں بلکہ ہجومِ منافقین ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ قوم نیک اور مخلص افراد سے خالی ہو چکی ہے بلکہ قوم کا معاملہ بھی ایک فرد کی مانند ہوتا ہے۔ کوئی عام انسان مکمل نہیں ہوتا۔ اچھائیاں اور برائیاں ہر انسان میں ہوتی ہیں لیکن جس طرح ہم بُرا انسان اسے کہتے ہیں جس میں برائیاں زیادہ اور بڑی ہوں اور اچھائیاں کم ہوں، یہی معاملہ اقوام کا بھی ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی قوم کا کردار پرکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔

آخر میں یہ وضاحت لازم ہے کہ استحصالی نظام اور مقتدر لوگوں کے استحصالی ہتھکنڈوں نے اس قوم کے ایک بہت بڑے حصے کو بُری طرح پیس کر رکھ دیا ہے اور فقر نے انہیں کفر کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ گویا اس ایلیٹ کو اِن پسے ہوئے عوام کی بداعمالیوں کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا جائے گا۔ علاوہ ازیں ہم سمجھتے ہیں کہ اس وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے کہ ہمیں اپنی قوم اور ہم وطنوں سے خدانخواستہ کوئی دشمنی ہے۔ ملکی حالات اور اپنی دگرگوں حالت دیکھ کر اور دنیا بھر میں اپنی رسوائیوں کی داستانیں سن کر ہمارے دل میں درد اٹھتا ہے۔ اپنی ذلت اور جگ ہنسائی برداشت نہیں ہوتی۔ ہمیں صرف اپنے قلم پر اختیار ہے جو ظالم حقائق سے آنکھیں چرانے نہیں دیتا، جو بلی کے سامنے کبوتر کا آنکھیں بند کر لینا ہلاکت کو دعوت دینے کے مترادف سمجھتا ہے، جو جھوٹی تسلیوں اور سیاسی نعرہ بازی کو مسئلہ کا حل نہیں سمجھتا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے ہم مایوس نہیں ہیں۔ تاریکی اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی کہیں نہ کہیں سے روشنی کی کرنیں ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہیں۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب ہم عید آزاداں منائیں گے ان شاء اللہ۔ لیکن عید آئے گی رمضان کے بعد ہی۔ ان روزوں کے لئے ہمیں قوم کو تیار کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ہم اپنی سی کوشش جاری رکھیں گے۔ اللہ ہمیں اپنی کوششیں بڑھانے کی توفیق دے اور شرفِ قبولیت بخشے۔ (آمین ثم آمین)



شام جل رہا ہے لیکن.....

گزشتہ صدی کے اوائل میں اُمت مسلمہ کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اکثر مسلم ممالک بلاواسطہ اور کچھ بالواسطہ دوسری اقوام کے غلام ہو چکے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ یورپ میں صنعتی انقلاب اس سے پہلے ہی آ چکا تھا۔ صنعتی ترقی کو ممیز لگانے اور ایک دنیا پر اپنا تسلط جمانے اور اُسے اپنی تجارتی منڈی بنانے کے لیے انرجی کی دستیابی ناگزیر تھی۔ جزیرہ نمائے عرب میں سیال سونے (تیل) کی دریافت ہو چکی تھی لہٰذا بڑی قوتوں کی للچائی ہوئی نگاہیں عرب دنیا پر تھیں۔ عرب ازم کا نعرہ لگا کر اور علاقائی تعصب کو بڑھا چڑھا کر عرب دنیا کے حصے بخرے کیے گئے اور کئی جگہوں پر نئی سرحد بندی کی گئی۔

1917ء کے بالفور معاہدے کے تحت یہودیوں کو فلسطین میں بسنے اور جائیداد حاصل کرنے کا حق دے دیا گیا۔ گویا عربوں کا مستقل اور بدترین دشمن ان کے بیچ لا کر بٹھا دیا گیا۔ سائیکس پیکو معاہدے کے تحت یورپ نے جب عرب ممالک کی بندر بانٹ کی تو شام فرانس کے حصے میں آیا۔ فرانس نے ایک عرصہ تک وہاں حکومت کی۔ الاسد خاندان بنیادی طور پر انتہائی ابن الوقت خاندان تھا۔ انہوں نے بھی حکمرانوں یعنی فرانسیسیوں سے اپنے خاندانی تعلقات استوار کر لیے پھر ایک وقت آیا کہ الاسد خاندان فرانس ہی میں منتقل ہو گیا۔ فرانس نے شام کو آزادی دے دی لیکن فرانس کے شام پر اثرات قائم رہے۔ 1950ء میں الاسد خاندان کو واپس شام منتقل کر دیا گیا۔ حافظ الاسد نے شامی فضائیہ میں سروس اختیار کی۔ الاسد خاندان علوی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جو شام میں اقلیت میں ہے اور اس کا آبادی میں تناسب 15 فیصد سے زائد نہیں ہے۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران حافظ الاسد وزیر دفاع تھا۔ 1971ء میں حافظ الاسد

فرانس کی مدد سے برسر اقتدار آ گیا اور جلد ہی ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔ ایک ایسا ظالمانہ اور جابرانہ نظام قائم کیا جس کی جدید دور میں مثال نہیں مل سکتی۔ خفیہ ایجنسیاں ہر اس مرد یا عورت کو اٹھا کر لے جاتیں جو بھولے سے بھی حکومت کے خلاف ایک لفظ منہ سے نکال دیتے۔ اخوان المسلمون نے 1982ء میں بغاوت کر دی اس کے بعد بھی بعض مواقع پر اس ظالم حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی جسے بری طرح کچل دیا گیا۔ اکثر اپنے شہریوں پر فضائیہ کے ذریعے بمباری کر کے انہیں بہت بڑی تعداد میں ہلاک کر دیا جاتا۔ حافظ الاسد نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے بشار الاسد کی حکمرانی کی راہ ہموار کر دی تھی۔ 2000ء میں اپنے والد کی موت کے بعد بشار الاسد صدر بنا۔ صاحبزادے کے دور حکومت میں ظلم و ستم میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ساتھ ساتھ اقربا پروری اور کرپشن بھی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ گزشتہ دو سال سے مختلف عرب ممالک میں جو عوامی تحاریک کا سلسلہ شروع ہوا ہے جسے عرب بہار کا نام دیا جا رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ آنے والے وقت میں عربوں کے لیے بہار ثابت ہوتی ہے یا خزاں۔ بہر حال شام میں بھی الاسد خاندان کے خلاف عوامی جذبات کا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ بشار اپنے روایتی تشدد سے اسے کچل دینا چاہتے ہیں لیکن بُری طرح ناکام ہو رہے ہیں اور بشار الاسد کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ اس لیے بھی کہ مقامی عوامی تحریک اپنی جگہ لیکن شام عالمی قوتوں کی زور آزمائی کا میدان بن چکا ہے۔ روس اور چین موجودہ حکومت اور امریکہ و یورپ اپوزیشن اور عوامی تحریک کی حمایت میں آمنے سامنے آ گئے ہیں۔ ہماری رائے میں نہ روس و چین کی بشار الاسد سے عزیز داری ہے اور نہ امریکہ و یورپ کو بے دردی سے مارے جانے والے مسلمانوں سے رتی بھر ہمدردی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے عالمی مفادات کے حصول اور انرجی کے قدرتی وسائل پر قبضہ کی یہ جنگ ہے۔

وہ سوویت یونین جو جنگ عظیم اول اور دوم کے بعد ایک زبردست قوت کی حیثیت اختیار کر گیا تھا مشرقی یورپ، نصف سے زائد عرب، بھارت اور بہت سے دوسرے ممالک اس کے حلقہ اثر میں تھے بلکہ یہ بھی اگر کہہ دیا جائے کہ پوری غیر جانبدار تحریک اس کی مٹھی میں تھی تو غلط نہ ہوگا۔ اِس حوالہ سے دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کو ایک زبردست چیلنج کا سامنا تھا۔ لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام کے رکھوالوں نے اس پر باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ حملے شروع کیے۔ چین اور سوویت یونین میں اختلافات پیدا کیے گئے، ایک سازش کے تحت اسے افغانستان میں گھسیٹا گیا اور دنیا بھر میں یہ نعرہ لگا

کرالہامی مذاہب خطرہ میں ہیں۔اس کے خلاف ایک مذہبی محاذ قائم کیا گیا۔سوویت یونین نے بمشکل افغانستان کے کمبل سے نجات تو حاصل کر لی لیکن وہ سوویت یونین سے سکڑ کر صرف روس رہ گیا۔شکست وریخت اور معاشی بدحالی سے دوچار روس کو مردہ سمجھ کر نیٹو نے اگلا اعلانِ جنگ عالم اسلام کے خلاف کر دیا اور نائن الیون کا ڈرامہ رچا کر افغانستان میں داخل ہو گیا لیکن قرآن کی اس آیت کے مصداق ''یہ مکر کرتے ہیں اور اللہ اپنی چال چلتا ہے اور اللہ بہترین چال چلنے والا ہے''۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کی محافظ فوج جس نے نیٹو کے نام سے دنیا کا جینا محال کیا ہوا ہے وہ افغانستان میں بری طرح الجھ گئی اور دوسری طرف شکستہ حال روس کو پیوٹن جیسی شخصیت بطور لیڈر میسر آ گئی جس نے چند سالوں میں روس کو پھر ایک عالمی طاقت کی حیثیت سے کھڑا کر دیا۔لہٰذ اسرائیل امریکہ اور یورپ کو اب دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا ہے۔ایک طرف وہ توانائی کے حصول کی جنگ میں روس اور چین کو پیچھے دھکیل رہے ہیں دوسری طرف اگرچہ وہ افغانستان کے کمبل سے جان چھڑانا چاہتے ہیں لیکن چین اور روس کی وسطی ایشیا کی طرف پیش قدمی روکنے کے لیے کسی نہ کسی سطح پر افغانستان میں اپنی عسکری موجودگی کو یقینی بھی بنانا چاہتے ہیں اسی لیے طالبان سے مذاکرات کی شدید خواہش رکھتے ہیں۔

اسرائیل کے اپنے مقاصد ہیں وہ سمجھتا ہے کہ اگر روس کو شام سے نکال دیا جائے تو گریٹر اسرائیل کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔اس لیے کہ سارے مشرق وسطیٰ میں صرف شام کی بندرگاہ طرطوس پر روسی فوجی اڈہ اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔پھر یہ کہ شام سے روس کے نکل جانے سے ایران مخالف حکومت شام میں قائم ہو سکتی ہے جس سے ایران کمزور پڑ جائے گا۔ ہماری رائے میں روس کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ بشار الاسد کا اب ٹکے رہنا ممکن نہیں اور اسے عوامی اور انقلابی قوتوں سے راہ ورسم بڑھانی چاہیے اگر شامی اپوزیشن اپنے ملک کے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے ایک حد تک روسی مفادات کے تحفظ کی یقین دہانی کرائے تو روس کو ظالم بشار الاسد کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے اور شام کی انقلابی قوتوں کو بھی یہ بات سمجھنا چاہیے کہ امریکہ کی مسلمانوں سے محبت عارضی اور منافقت پر مبنی ہوتی ہے انہیں ماضی میں افغانستان کے جہادیوں سے امریکہ کی محبت اور مفاد حاصل کرنے کے بعد ان کا بدترین دشمن بنا جانا۔اس حوالہ سے امریکہ کے کردار کو دیکھنا چاہیے اور روس سے مناسب سطح پر اپنے تعلقات اُستوار کر کے بشار الاسد سے

نجات حاصل کرنی چاہیے اگر چہ ہم روس کو مسلمانوں کا دوست کسی صورت قرار نہیں دے سکتے ہیں لیکن lesser evil کی بنیاد پر شام کے مفادات کو ترجیح دیتے ہوئے روس سے معاملات کو بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آخر میں اُمت مسلمہ سے گزارش کریں گے کہ ہوش میں آئے' خوابِ خرگوش سے بیدار ہو اور یہ سمجھے کہ مشرق و مغرب میں محمد ﷺ کے نام لیواؤں کا کوئی دوست نہیں ایک ہی راستہ ہے وہ اپنے دوست خود بنیں' اپنے راستے کا انتخاب خود کریں' کبھی امریکہ اور کبھی روس کی آغوش میں گرنے کی بجائے کائنات کی سپریم قوت اللہ رب العزت کی پناہ حاصل کریں اس کے احکامات پر عمل پیرا ہو کر اس کی مدد و تائید حاصل کریں پھر یہ کہ جب تک علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

مسلم ممالک ایک بند مٹھی کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ دوسری عالمی قوتیں انہیں اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی رہیں گی۔ خون مسلم بہتا رہے گا اور فائدہ غیر مسلموں کو پہنچتا رہے گا۔ یہاں ایک اور بات کا اعادہ ضروری ہے اولاً اگر امت مسلمہ ایک متحد قوت بن کر ابھرتی ہے تو موجودہ استحصالی عالمی سیٹ اپ قائم نہیں رہ سکے گا اور فرض کریں رہ بھی جائے تو کیا موجودہ عالمی قوتیں ایک بامعنی اور متحد امت مسلمہ کے ہوتے ہوئے عالمی سطح پر من مانی کر سکیں گی؟ کیا کوئی سلامتی کونسل اپنے ویٹو سے ہمیں بے بس کر سکے گی؟ ہرگز ہرگز نہیں! لہٰذا اگر ہمیں عراق' لیبیا' شام اور کرزئی کا افغانستان بننے سے بچنا ہے تو پہلے انفرادی اور ریاستی سطح پر حقیقی مسلمان بننا ہوگا پھر اُمت مسلمہ کے لیے خلافت کا ایک مرکز قائم کر کے عالم اسلام کو ایک وحدت کی شکل دینا ہو گی۔ اگر اُمت مسلمہ ایک وحدت صورت اختیار نہیں کرتی تو عالمی استعمار ڈربے سے ایک ایک مرغی نکال کر ذبح کرتا رہے گا اور باری آنے سے پہلے تک بچ جانے والی مرغی خود کو خوش قسمت سمجھتی رہے گی۔ کل عراق اور لیبیا جل رہے تھے آج شام جل رہا ہے لیکن کیا ہم عالم اسلام کے راکھ کا ڈھیر بننے تک خاموش تماشائی بنیں رہیں گے۔



ہم مذاق اڑانے والوں کے لیے کافی ہیں!

ہمیں جب بھی سیرت پاک کے حوالہ سے کوئی تحریر لکھنا ہوتی ہے تو قلم تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ احساس کمتری کچھ اس انداز سے ذہن پر چھا جاتا ہے کہ لکھنا دشوار ہو جاتا ہے، لیکن ایک کام یقیناً اس سے بھی زیادہ مشکل اور بہت مشکل ہے۔ وہ یہ کہ کسی شاتم رسول کی مذمت، اس کے فعل سے اظہار نفرت اس شدت اور اس انداز سے کی جائے جس کا وہ حق رکھتا ہے۔ ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ دنیا کے کسی بھی شریف النفس اور دیانت دار لکھاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ بینک فراڈ میں ملوث مجرمانہ ذہنیت کے حامل ایک اسرائیلی نژاد امریکی اور اس کے ساتھیوں نے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوئے ایک فلم کے ذریعے کائنات کی مقدس ترین ہستی پر کیچڑ اچھالنے کی ناپاک اور گھناؤنی کوشش کی ہے۔ جہاں تک اس فعل کی مذمت کرنا اور اسے ہدف تنقید بنانا ہے ہم سطور بالا میں عرض کر چکے ہیں اس کے لیے ایسے صحیح' انتہائی مؤثر اور واضح الفاظ استعمال کرنا کہ مذمت کا حق ادا ہو جائے ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا ہم اس بدکردار' بدگو' فاسق و فاجر انسان نما مخلوق کا معاملہ اللہ رب العزت پر چھوڑتے ہیں کہ اللہ ہی انہیں وہ سزا دینے پر قادر ہے جس کے وہ حق دار ہیں۔ قرآن کریم کی سورۃ الحجر کی آیت 95 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ''ہم تمہیں اُن لوگوں (کے شر) سے بچانے کے لئے جو تم سے استہزاء کرتے ہیں، کافی ہیں۔'' اولاً ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دشمنانِ اسلام کی طرف سے آئے روز ایسی حرکات کیوں ہو رہی ہیں کہ کبھی قرآنی اوراق کی بے حرمتی کی جاتی ہے، کبھی بدبخت ٹیری جونز قرآن جلاتا ہے' کبھی آقائے نامدار کے خاکے شائع کیے جاتے ہیں۔ آپ کی ذاتِ مبارک پر سوانحی فلم بنانا ہی توہین آمیز فعل ہے چہ جائیکہ اس میں جھوٹا اور غلیظ مواد شامل کیا جائے۔ اور ثانیاً یہ کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ان دشمنوں اور شیطان کے

پیروکاروں سے کیسے نمٹا جائے۔ لیکن اس حوالہ سے اپنی رائے کے اظہار سے پہلے ہم یہ بھی اپنا قومی اور ملی فریضہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اس احتجاج کی آڑ میں املاک کو جلا رہے ہیں اور لوگوں کی گاڑیاں توڑ رہے ہیں' اور پولیس پر پتھراؤ کرتے ہیں ان کی بھرپور مذمت کریں، اس لیے کہ وہ غیر شعوری طور پر دشمنانِ دین کے ایجنڈے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ ہم اپنے ملک میں تخریب کاری کریں گے تو انہیں اور کیا چاہیے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ بد بخت اور بد طینت لوگ مزید ایسی مذموم حرکات کریں گے تا کہ ہم اپنے ملک میں گھیراؤ جلاؤ کرتے رہیں اور وہ اپنا ایجنڈا آگے بڑھا سکیں۔

اگر قارئین برا نہ مانیں تو ہم یہ کہنے کی جرأت کریں گے کہ ہم نام کے مسلمان خود اس کے ذمہ دار ہیں۔ ملعون سلمان رشدی نے زندگی میں ایک سچ بولا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مجھے قتل کر دیا جاتا تو ایسی فلم بننے کی نوبت نہ آتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملعون سلمان رشدی ایک سمبل ہے، ایک شیطانی نظام کا سمبل۔ یہ دنیوی اور ظاہری لحاظ سے بہت مضبوط اور طاقتور نظام ہے۔ اس شیطانی نظام سے ٹکر لیے بغیر اور اس سے تصادم مول لیے بغیر ہم ایسی مذموم' قابل نفرت اور اشتعال انگیز حرکات کا خاتمہ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ہم تو وہ کچھ بھی نہیں کر پا رہے جو حالت کمزوری میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر ستاون اسلامی ملک یہ اعلان کر دیں کہ عالمی سطح پر یہ قانون بنایا جائے کہ انبیاء و رسل اور الہامی کتابوں کی بے حرمتی اور توہین نہیں کی جا سکتی اور جو ملک یہ قانون نہیں بنائے گا۔ تمام اسلامی ممالک اس سے اپنے سفارتی اور تجارتی تعلقات منقطع کر لیں گے۔ تو مغربی دنیا کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ مسلمان حکمران اور سیکولر عناصر یہ تجویز سن کر امریکہ اور یورپ کے خوف سے کانپنے لگیں گے۔ مرعوب ذہنیت اور عملیت پسندی کب انہیں ایسا اقدام کرنے دے گی۔ لیکن ان لوگوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا اسلام دشمن قوتیں محض سفارتی اور تجارتی تعلقات توڑ لینے پر ستاون مسلمان ممالک کو نیست و نابود کر دیں گے۔ ناممکن ہے اس لیے کہ ان قوتوں کے بھی مسلمان ممالک سے مفادات وابستہ ہیں۔ مسائل ضرور کھڑے ہوں گے، تکالیف اور مصائب کا ضرور سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن امت مسلمہ ڈٹ جائے اور پسپائی اختیار کرنے سے صاف صاف انکار کر دے تو کم از کم یہ مطالبہ تسلیم کرنا بڑی قوتوں کی مجبوری بن جائے گا۔ البتہ یہ کہ اسلام دشمن قوتوں کا مستقل بنیادوں پر مقابلہ کرنے کے لیے امت مسلمہ کے لیے دندانِ شکن قوت بننا ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک نے پندرہ صدیاں پہلے یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ عیسائی اور یہودی کبھی

تمہارے دوست نہیں ہو سکتے، البتہ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ پھر ایک جگہ فرمایا کہ تمہاری دشمنی میں یہودی بہت شدت رکھتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائی یہودی گٹھ جوڑ میں یہودی عیسائی حکومتوں کو کھلم کھلا اور زیر زمین سازشوں سے مسلمانوں کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے اکساتے ہیں۔ نائن الیون کا ڈرامارچانا' عراق میں W.M.D یعنی وسیع تباہی مچانے والے ہتھیاروں کی موجودگی کا جھوٹا پروپیگنڈا کر کے امریکہ سے حملہ کروانا' یہودیوں کی سازش کا ہی نتیجہ ہے۔ لہٰذا ان اسلام دشمن قوتوں سے برسرپیکار ہونے کے لیے امت مسلمہ کو سیاسی اور عسکری طور پر خود کو مضبوط کرنا ہوگا۔ وگرنہ امریکہ اور یورپ میں قرآن اور صاحب قرآن کی توہین ہوتی رہے گی اور ردعمل میں ہم اُن کو منہ توڑ جواب دینے کی بجائے اپنے ہی اثاثہ جات کو جلاتے رہیں گے اور وہ ہماری پہنچ سے بالا بالا استہزائیہ رویے اختیار کر رکھیں گے۔

ہم نے سطور بالا میں پاکستان میں مظاہروں کے دوران پرتشدد واقعات کی پرزور مذمت کی ہے لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ صورت حال کو سنبھالنے میں حکومت نے بھی حد درجہ نااہلی اور بزدلی کا مظاہرہ کیا جس سے عوام کے غیظ وغضب میں اضافہ ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نمائندہ حکومت ہونے کی دعوے دار پاکستان پیپلز پارٹی اس خطہ کے مسلمانوں کا مزاج اور جذبات کو سمجھنے اور جاننے میں بری طرح ناکام رہی۔ وہ اس سارے عرصے میں دوسری مسلمان حکومتوں کا منہ دیکھتی رہی۔ یہاں کے لوگوں کا مذہب سے عملی تعلق اگرچہ کم ہے لیکن جذباتی لگاؤ عالم اسلام میں سب سے زیادہ ہے۔ خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ترکی میں ہوا۔ عرب اس سے براہِ راست متعلق تھے لیکن تحریک خلافت ہندوستان میں چلی اور ایسی چلی کہ مہاتما گاندھی کو بھی اس کا حصہ بننا پڑا۔ لہٰذا عوامی ردعمل کی ایک وجہ حکومت کی نااہلی بھی ہے۔ حکومت اگر درج ذیل اقدامات کرتی تو شاید عوام کے غیظ وغضب میں کمی ہو جاتی اور قیمتی جانیں بچ جاتیں:

(1) فوری طور پر امریکی سفیر کو طلب کر کے شدید احتجاج کیا جاتا۔

(2) فلمساز اور ڈائریکٹر کی گرفتاری کا امریکہ سے مطالبہ کیا جاتا کیونکہ انہوں نے فلم کی dubbing میں بددیانتی کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

(3) امریکی حکومت مطالبات تسلیم نہ کرتی تو امریکہ سے اپنے سفیر کو واپس بلایا جاتا اور امریکہ کے سفیر کو ملک سے نکلنے کا حکم دیا جاتا۔

(4) وزیر خارجہ پاکستان حنا ربانی کھر امریکہ کا دورہ مختصر کر کے احتجاجاً واپس آ جاتیں۔ بدقسمتی سے محترمہ اس دوران میں امریکہ سے اتحاد اور دوستی کے بیان دیتی رہیں۔

(5) پاکستان دہشت گردی کی جنگ میں امریکی اتحاد سے باہر آ جاتا۔ یہ ایک اچھا موقع تھا۔

(6) صدر زرداری نیویارک کا دورہ منسوخ کر دیتے۔

(7) پاکستان OIC کا اجلاس طلب کر کے عالم اسلام کے سامنے یہ مطالبہ رکھتا کہ عالمی سطح پر یہ قانون نافذ کیا جائے کہ انبیاء و رسلؑ اور الہامی کتب کی توہین سنگین جرم ہوگا۔ دوسرے مسلم ممالک اس پر راضی ہوتے یا نہ ہوتے پاکستان اپنا فرض ادا کرتا۔

(8) میڈیا پر مذہبی دانشور قسم کے لوگوں نے بھی اوٹ پٹانگ باتیں کر کے لوگوں کے غصے میں اضافہ کیا۔

(9) میڈیا پر مستند علماء کرام کو مدعو کر کے اس فلم کی کھلے انداز میں اور شدت کے ساتھ مذمت کی جاتی اور امریکی حکومت کے کسی نوع کے قدم نہ اٹھانے کی بھی مذمت کی جاتی۔ اس کے ساتھ علمائے کرام عوام کو سمجھاتے کہ اپنے جذبات کے اظہار میں اگر کوئی تخریبی کارروائی کرے گا اور معصوم لوگوں کے جان و مال کو نقصان پہنچائے گا تو اللہ اور رسول کی ناراضی مول لے گا۔

(10) یوم عشق رسولؐ کی بجائے اسے ''تحفظ ناموس رسالت'' کا نام دیا جاتا۔ اگر اس کے لیے کوئی دن طے کرنا ہی تھا تو اس سے پہلے امریکیوں کو یہاں سے رخصت کر دیا جاتا تاکہ یہ تاثر نہ پھیلتا کہ توہین رسالت کے باوجود حکومت امریکیوں کا تحفظ کر رہی ہے۔



ہندو صحافی سر میلا بوس کے انکشافات

میدان کھیل کا ہو یا جنگ کا، کوئی ٹیم کوئی جماعت کوئی قوم اور ملک یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اس کا مقدر صرف اور صرف فتح ہے۔ جنگوں کے حوالہ سے اُمت مسلمہ کا ریکارڈ انتہائی شاندار ہے۔ مسلمانوں کو ایک زمانے میں مسلسل فتوحات حاصل ہوئیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کو کبھی شکست نہیں ہوئی۔ بے شمار مواقع پر مسلمان شکست سے دوچار ہوئے اور دشمنوں کو فتح ہوئی۔ یہاں تک کہ غزوۂ اُحد میں نبی آخر الزمان ﷺ کی موجودگی میں جزوی اور وقتی نوعیت کی ہی سہی لیکن شکست تو ہوئی تھی۔ لیکن اور یہ بہت بڑا لیکن ہے کہ اُمت مسلمہ کی تاریخ میں ہمیں ڈھونڈے سے بھی ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا کہ مسلمانوں کی نصف لاکھ کے قریب فوج نے جس کے پاس مناسب اسلحہ بھی تھا، یوں دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہوں جیسے اکتالیس سال پہلے 16 دسمبر 1971ء کو پاکستان کی فوج نے ڈھاکہ میں بھارتی فوج کے سامنے ڈالے تھے۔ گویا اُمت مسلمہ پر جو یہ قیامت ٹوٹی اور اس کا دامن داغدار ہوا تو اس کی وجہ پاکستان بنا۔ اس عبرتناک اور ذلت آمیز شکست کا ذمہ دار کون تھا؟ کسی ایک فرد یا جماعت یا ادارہ کے سر شکست کا سہرا تو باندھا جا سکتا ہے لیکن پوری پاکستانی قوم اس کی بحیثیت مجموعی کسی نہ کسی درجہ میں ذمہ دار تھی اس حوالہ سے دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ بھارت کے کردار کا ذکر کیا جا سکتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس انجام تک پہنچانے میں بھارت کا فعال اور کلیدی رول تھا، لیکن بھارت کو دوش دینا یا اس کا گلہ کرنا حماقت عظمیٰ ہوگی۔ اس لیے کہ کون نہیں جانتا کہ روزِ اوّل سے ہی پاکستان بھارت کو کانٹے کی طرح چبھتا رہا ہے۔ ہماری رائے میں بنگلہ دیش کی عوام کو ذمہ دار ٹھہرانا بھی زیادہ صحیح نہیں، اس لیے کہ انہیں تو سمجھایا گیا تھا بلکہ ان کی برین واشنگ اس طرح کی گئی تھی کہ تمہیں مغربی پاکستان

والوں نے غلام بنالیا ہے، اٹھو اور آزادی حاصل کرو! اصلاً اس کے ذمہ دار حکمران تھے اور سب سے زیادہ ذمہ داری فوج پر آتی ہے، اس لیے کہ اُس وقت فوج حکومت پر بھی قابض تھی۔ رہ گئی بات سیاست دانوں کی تو ان سے خیر کی توقع رکھنا عبث ہے۔ سانحہ 71ء سے پہلے بھی ان کا رویہ غیر ذمہ دارانہ تھا، بعد ازاں بھی وہ ہمیشہ قوم کے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔ دیانت' امانت' اخلاق اور انصاف کے حوالہ سے ان کا سفر پستی کی طرف جاری ہے۔ اور ہمارے لیے خاصا مشکل ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ اس ملک کی تباہی و بربادی کی زیادہ ذمہ دار فوج ہے یا سیاست دان ہیں۔ اگر تاریخ پاکستان پر سرسری سی نگاہ ڈالیں تو قارئین بہتر فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم ایک دن کے لیے بھی اتنے صحت مند نہیں تھے کہ کوئی فعال رول ادا کر سکتے۔ لیاقت علی خان 4 سال تک سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آخر سازش کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار بیٹھے۔ اکتوبر 1958ء یعنی پہلے ایوب خانی مارشل لاء تک سیاست میں گندگی اور غلاظت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک رات میں ایک نئی سیاسی جماعت کا جنم لینا اور پارلیمنٹ کی اکثریت کا اس نئی جماعت کی گود میں جا بیٹھنا اِس بات کا واضح ثبوت ہے۔ حکومتیں کس طرح بدل رہی تھیں اس پر بھارت جیسے دشمن ملک کے وزیراعظم پنڈت نہرو کا یہ تبصرہ غلط نہ تھا ''میں اتنے کپڑے نہیں بدلتا جتنی پاکستان میں حکومتیں بدلتی ہیں''۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اکتوبر 1958ء میں پاکستان کی سلامتی پر ایسا وار ہوا جس کے نتیجہ میں مغروب پاکستان بالآخر 1971ء میں دولخت ہو گیا۔ اس موقع پر بھی ملک کے نوے فیصد سے زائد سیاست دانوں نے ہوسِ دنیا اور ہوسِ اقتدار میں اصولی اور جمہوری موقف کو نظر انداز کیا اور شب خون مارنے والے فوجی آمر سے آگے بڑھ کر تعاون کیا۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایوب خان کا دور تو ملک کی ترقی کے لحاظ سے سنہری دور رہا ہے۔ انہوں نے مشرقی پاکستان پر خصوصی توجہ دی جس کے معاشی سطح پر بڑے اچھے نتائج نکلے۔ لوگوں کو روزگار ملا' خوشحالی آئی' بحیثیت مجموعی پاکستان کی اقتصادی حالت بہتر ہو گئی، ہمارا ایک روپیہ بھارت کے 1.75 روپے کے مساوی تھا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ایوب خان کا اپنی حدود سے تجاوز کرنا اور حکومت پر قبضہ کرنا سقوطِ ڈھاکہ کی بنیادی وجہ بنا۔ حقیقت میں یہ بنگالی عوام کے جمہوری حق پر ڈاکہ ڈالا گیا تھا۔ وہ آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے اکثریت میں تھے، لہٰذا ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر قوی امکان تھا کہ بنگالی مرکز میں حکومت

کرتے۔ دشمن ہندو کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ انہوں نے بنگالیوں کو طعنہ دیا کہ تم مغربی پاکستان والوں خصوصاً پنجابیوں کے غلام ہو، کیونکہ فوج میں اکثریت پنجابیوں کی تھی۔ مغربی پاکستان تمہیں لوٹ کر کھا رہا ہے۔ تمہاری زبان، تمہاری ثقافت مٹ رہی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں میں کسی قدر حقیقت تھی، لیکن جھوٹے پروپیگنڈے اور مبالغہ آرائی سے رائی کا پہاڑ بنا دیا گیا، لہٰذا صنعتی ترقی 'روزگار کی فراہمی اور تجارت کی بڑھوتری سب کچھ آزادی کے حسین نعرے میں دب کر رہ گیا اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ چند روز یا ایک آدھ ماہ تک افسردگی اور سوگ کا ماحول رہا۔ عوام کو اس شکست وریخت کا اتنا دکھ ہوا کہ بعض افراد کو مال روڈ پر سر دیوار سے ٹکراتے دیکھا گیا، لیکن افسوس صد افسوس کہ یہ کیفیت جلد بدل گئی۔ عوام اور اقتدار کے ٹھیکیدار دونوں نہ صرف اسی پٹڑی پر واپس آ گئے بلکہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے بھاگنے لگے' کسی نے نصیحت نہ پکڑی' کسی نے عبرت حاصل نہ کی۔ فوج کو اقتدار اور حکومت کا چسکا پڑ چکا تھا اُس نے اِس ذلت آمیز شکست کے بعد بھی دو مارشل لاء لگائے اور جرنیلوں کی خوشحالی مثالی بن گئی۔ سیاست دانوں میں ہوسِ دنیا اور ہوسِ اقتدار اور بڑھ گئی۔ آج ہم معاشی' سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ پن کا شکار ہیں اور دفاعی لحاظ سے ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ہماری ٹانگیں کانپتی رہتی ہیں۔ ہم اپنی ان حرکات کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں، لیکن واپس لوٹنے کو تیار نہیں۔ فوج اور سیاست دان اپنے اپنے مورچے میں جمے بیٹھے ہیں۔ عوام ان پر لعن طعن کرتے ہیں، لیکن حصولِ دنیا کے لیے وہ بھی جائز ناجائز کوئی موقع ضائع نہیں کرتے۔ کوئی مڑ کر دیکھنے کو تیار نہیں کہ پاکستان کی حقیقی بنیاد کیا تھی؟ ہم نے تحریک پاکستان کے دوران کیا نعرہ لگایا تھا؟ اللہ سے کیا وعدہ کیا تھا؟ قیامِ پاکستان کے دو سال بعد پاس ہونے والی قراردادِ مقاصد کا ہم نے کیا حشر کیا؟ اللہ تعالیٰ ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے حوالہ سے ایک وضاحت ہم پر لازم ہے، اس لیے کہ کوئی فرد، کوئی جماعت یا ادارہ یا حکومت، چاہے برائی کا مجسمہ کیوں نہ ہو، غلط بیانی اور جھوٹا پروپیگنڈا اور مبالغہ آرائی اس کے بارے میں بھی نہیں ہونی چاہیے۔ حق اور سچ کا دامن اس صورت میں بھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔ 1971ء میں حکومت مخالف تحریک کے دوران اور سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستان کے فوجیوں کے مظالم کی ایسی لرزہ خیز داستانیں سنی گئیں جن میں معصوم انسانوں کا قتل عام' بنگالی عورتوں کی عصمت

دری اور لوٹ مار کی بڑی تفاصیل بتائی گئی تھیں۔ ہم نے اُس وقت بھی اسے کسی قدر مبالغہ آرائی اور فتنہ انگیزی قرار دیا تھا لیکن آج خود بھارت اور بنگلہ دیش کے صحافی اس جھوٹ اور بہتان تراشی کا پردہ چاک کر رہے ہیں۔

سرمیلا بوس ایک ہندو بنگلہ دیشی صحافی خاتون ہیں۔ انہوں نے بنگلہ دیش کی تحریک آزادی اور 71ء کی پاک بھارت جنگ کے حالات پر 6 سال تک آکسفورڈ یونیورسٹی کی ریسرچ سکالر کی حیثیت سے تحقیق کی ہے۔ وہ اپنی کتاب Dead Ranking میں لکھتی ہیں کہ پاکستانی فوج کی بنگالیوں کے قتل و غارت اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی کہانیاں ''را'' نے گھڑی تھیں۔ ان میں 95 فیصد جھوٹ تھا جو دنیا کو گمراہ کرنے اور پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے گھڑا گیا تھا۔ اس نوعیت کے اکا دکا واقعات ضرور ہوئے ہوں گے۔ وہ لکھتی ہیں کہ قتل و غارت اور خواتین کی عصمت دری درحقیقت فال آف ڈھاکہ کے بعد ہوا اور یہ سلوک بنگالیوں نے مکتی باہنی سے مل کر بہاریوں کے ساتھ کیا تھا۔ بھارتی طیاروں نے ایک یتیم خانہ پر بمباری کر کے بچوں کے قتل کا الزام پاکستان پر لگا دیا تھا۔ ہندو مصنفہ کی کتاب کا واضح تاثر ہے کہ یہ سب کچھ ایک ڈراما تھا جو عسکری فوائد حاصل کرنے کے لیے سٹیج کیا گیا تھا۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے!



اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں.....

امریکی ریاست کینٹی کٹ کے ایک پرائمری سکول میں ایک بیس سالہ نوجوان ایڈم لینزا نے اندھا دھند فائرنگ کر کے 5 سال سے لے کر 10 سال تک کے چھوٹے 20 بچوں اور سکول کی پرنسپل سمیت 27 افراد کو ہلاک کر دیا۔ اس بہیمانہ کارروائی کے لیے گھر سے نکلنے سے پہلے اس نے اپنی ماں کو قتل کیا۔ یہ ایک اندوہناک واقعہ تھا لیکن گزشتہ 5 سال میں ایسی دہشت گردی کے کم از کم بیس واقعات امریکہ میں پیش آ چکے ہیں۔ 2007ء میں ورجینیا میں ہونے والے سانحہ میں بتیس (32) افراد مارے گئے تھے۔ پھر امریکی ریاست لاراڈو کے ایک سینما گھر میں ایک شخص کی فائرنگ سے بارہ (12) افراد ہلاک ہوئے۔ ایک سکھ گوردوارے میں فائرنگ سے 6 افراد کو ہلاک کیا گیا۔ امریکہ اس سانحہ پر سوگ میں ڈوب گیا۔ امریکی پرچم سرنگوں کر دیا گیا۔ امریکی صدر ٹیلی ویژن پر باقاعدہ روئے اور کہا کہ یہ ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے۔

اُمت محمدیہ میں بلا عذر شرعی کسی عام انسان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے، جرم عظیم ہے چہ جائیکہ معصوم بچوں کا قتل عام کیا جائے۔ یہ انتہائی گھناؤنا اور مکروہ فعل ہے۔ فرعون ملعون کے جرائم کی طویل فہرست میں ایک جرم معصوم بچوں کا قتل عام بھی تھا۔ لہٰذا پورے امریکہ کا سوگ میں ڈوب جانا سمجھ آنے والی بات ہے۔ صدر امریکہ کا یہ کہنا کہ اسلحہ کی بہتات اور اس کے لیے لائسنس کا عام اجراء کے بارے میں سخت پالیسی بھی انتظامی اقدام ہیں جو یقیناً ہونے چاہئیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ کا اصل مسئلہ اُس کی اپنی فرعونیت اور رعونت ہے جو اُس کے زوال کا باعث بن رہی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرعون کو نہ صرف غرق کر کے ہلاک کیا بلکہ عبرت کے لئے اُس کی لاش کو بھی محفوظ کر لیا گیا۔ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ فرعون ہلاک ہوا لیکن فرعونیت دنیا میں آج بھی نظر آتی ہے ہم

امریکہ کے مقتدر طبقہ کی توجہ ایک تو اس طرف مبذول کروائیں گے کہ چھوٹی اور کمزور قوموں پر ظلم ڈھانے ان کے چھوٹے بڑوں پر آگ برسانے اور ان کی لاشوں کی بے حرمتی کرتے وقت یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایک سپریم قوت اس پوری کائنات کی بھی ہے۔ تمام دنیا کو تہس نہس کرنا سمندر کے پانی کو پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچا دینا اور بڑے بڑے ہیبت ناک پہاڑوں کو خس وخاشاک کی طرح اڑا دینا رب کائنات کے لیے اس سے کہیں زیادہ آسان ہے جتنا عام انسان کے لیے آنکھ جھپکنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات بات سمجھانے کے لیے ایسی مثالیں دی جاتی ہیں وگرنہ یہ کہ محدود کا لامحدود سے نسبت تناسب قائم کرنا سرے سے ہی غلط ہے۔ ویسے بھی خلاف قاعدہ ہے۔

اس سپریم قوت یعنی اللہ رب العزت کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں اور پنجابی کا ایک محاورہ ہے ''ات خدا داویر'' (یعنی جب برائی یا ظلم کی انتہا ہو جائے تو اللہ دشمن بن کر سامنے آتا ہے) یاد کریں، جب امریکہ نے ڈومہ ڈولا پر پہلا ڈرون حملہ کیا تو اسی (80) سے زائد چھوٹے معصوم بچے قرآن پڑھتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔ پھر بعد ازاں ڈرون حملوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا تو چھوٹے بڑے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بن گئے اور امریکہ رعونت اور حقارت کے ساتھ کہتا رہا کہ اتنے دہشت گرد مار دیے گئے ہیں۔ اسرائیل پھول جیسے فلسطینی بچوں کو شہید کرنے کی کبھی جرأت نہ کرے اگر اسے امریکہ کی پشت پناہی بلکہ اشیر باد حاصل نہ ہو۔ امریکہ بہادر کو معلوم ہونا چاہیے کہ آگ کا کام جلانا ہے جس کے گھر بھی لگے۔ اس تاریخی حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ دوسروں کے گھر جلاتے جلاتے اپنے دامن پر بھی چنگاری گر جاتی ہے۔ ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مغرب اور امریکہ نے مذہب کو جس طرح انسانی زندگی سے کاٹ کر پھینک دیا ہے۔ آخرت کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں۔ آزادی کے نعرے نے انسان کو ہر شے سے آزاد کر دیا ہے، یہاں تک کہ کپڑے اتار کر ننگ دھڑنگ پھرنا بھی آزادی کی ایک قسم ہے۔ شادی کے بغیر living together کا رواج عام ہو گیا ہے۔ منشیات کا استعمال عام ہے۔ طلاقوں کی بھرمار ہے۔ پرتشدد فلمیں، وڈیو گیمز اور ٹی وی شوز لوگوں کو ذہنی طور پر بُری طرح متاثر کر رہے ہیں۔ جنسی بے راہ روی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ماں بیٹا اور باپ بیٹی جیسے مقدس رشتے بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔ سرمایہ داری نظام کی ناکامی نے بھی امریکہ اور اہل یورپ کو انتہائی خوفناک طور پر متاثر کیا ہے۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے، جس سے سارا اقتصادی نظام ہی تلپٹ ہوتا نظر آ رہا ہے۔ لاکھوں انسانوں کا پرجوش طریقے سے occupy wallstreet تحریک میں حصہ

لینا اس نظام کی بدترین ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان تمام حالات نے ان ممالک کے لوگوں کے لیے معاشی اور معاشرتی مسائل پیدا کر دیے ہیں، جس نے لوگوں کو ذہنی ونفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔ وہ ساری دنیا کو اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے سے بھی نفرت کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ ان کا ذہنی سکون اور دل کا چین مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں تباہ ہو گیا ہوں تو دنیا میں کوئی باقی نہ بچے، میں ساری دنیا کو مار دوں۔

اندازہ کیجیے، اس نوجوان کی ذہنی کیفیت کا جس نے سب سے پہلے اپنی ماں کو مارا۔ پھر معصوم اور ننھے ننھے بچوں کا قتل عام کرنے چل پڑا۔ ماں سے تو بگڑے ہوئے نوجوان کا کوئی جھگڑا ہو سکتا ہے، ان معصوم بچوں سے جنہیں اس نے شاید پہلے کبھی دیکھا بھی نہ ہو، اس کا کیا جھگڑا ہو سکتا ہے۔ یہ سیدھا سادا معاملہ ہے اس ماحول کا' اس تہذیب کا، اس سوسائٹی کا جہاں حصول دنیا کی خواہش نے انسان سے سب کچھ یہاں تک کہ خدا بھی چھین لیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم مشرق کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں میں ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے جس نے ان ممالک کو اس تہذیب کو اس سوسائٹی کو اپنے لیے آئیڈیل بنایا ہوا ہے۔ مہذب دنیا اور مہذب سوسائٹی کہتے کہتے ان کی زبانیں سوکھتی ہیں۔ ان کی نقالی بڑے فخر سے کی جاتی ہے جبکہ ہم علامہ اقبال کے اس موقف سے صدفی صد اتفاق کرتے ہیں کہ

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ ہم کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیں گے؟ بے قابو خواہشات کی تکمیل کا راستہ، روحانی تقاضوں کو کچلنے والا طرزِ عمل اور طرزِ زندگی یا ہم اللہ کا قرب حاصل کرنے کے خواہاں ہوں گے، اور آخرت کے طالب ہوں گے اور دنیا میں نظامِ عدل اجتماعی قائم کرنے کی جدوجہد کریں گے۔ یاد رکھیے، امریکہ اور مغرب کو آئیڈیل بنائیں گے تو اس کا انجام کچھ اس طرح ہے کہ یہ تہذیب آپ اپنے خنجر سے خودکشی کرنے جا رہی ہے۔ ہماری عافیت اس میں ہے کہ زبان لا الٰہ الا اللہ کہے اور قلب و ذہن اس کی مکمل توثیق کرے اور محمد رسول اللہ ﷺ کی دل و جان سے پیروی کریں۔ باطل سے ٹکرانے اور حق پر جان نثار کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ اللہ کے دامن کو تھام لیں، دنیا ہمارے آگے سرنگوں ہوگی اور جنت ہماری منتظر ہوگی۔ تہذیب نو کے نونہالوں کی طرح موت نہیں بانٹیں گے بلکہ امن' سکون اور سلامتی کے سوداگر بنیں گے۔



دھرتی ماں؟

ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین نے لندن سے کراچی میں ایک اجتماع سے ٹیلی فونک خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کیا ہے کہ مہاجروں کو ان کے حقوق دیے جائیں، وگرنہ انہیں ایک الگ صوبہ بنا دیں اور اگر ایسا نہ ہوا تو بات الگ ملک تک جا سکتی ہے۔ ان کے اس بیان پر ملک بھر میں طوفان کھڑا ہو گیا خصوصاً سندھ میں قوم پرستوں نے اور پاکستان پیپلز پارٹی نے اسے سندھ کی تقسیم قرار دے کر سندھیوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ قرار دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ سندھ ہماری ماں ہے اور ماں کی تقسیم کوئی قبول نہیں کرتا۔ بلاول بھٹو نے سندھی میں کہا: مرسوں مرسوں پر سندھ نہ ڈیسو یعنی مرتے مر جائیں گے سندھ نہیں دیں گے"۔ اسی نوعیت کے بیان سندھی قوم پرستوں کے بھی سامنے آئے اور اندرون سندھ ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا۔ اتنے شدید ردعمل پر الطاف حسین دفاعی پوزیشن میں چلے گئے اور سندھ دن اور سندھ ٹو کا فارمولا پیش کر دیا، لیکن مذکورہ جماعتوں نے اس فارمولا کو بھی بری طرح رد کر دیا۔

الطاف حسین کے بیان کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں مہاجروں کے حقوق کا مطالبہ کیا ہے۔ دوسرے میں الگ صوبے کا مطالبہ کیا ہے اور آخر میں الگ ملک بنانے کی دھمکی دی ہے۔ ہماری رائے میں پہلے دو حصوں میں ان کے مطالبات حق بجانب ہیں، سوائے اس کے کہ وہ مہاجروں کی بجائے شہریوں کا لفظ استعمال کرتے اور کراچی و حیدر آباد کے شہریوں کے حقوق کا مطالبہ کرتے۔ انہیں 66 سال بعد مہاجرانہ ذہنیت سے اب بالاتر ہو جانا چاہیے۔ بہر حال ہر شخص، ہر گروہ اور ہر جماعت کو حق حاصل ہے کہ وہ جائز حقوق کا مطالبہ کرے اور اگر مطالبات پورے نہیں ہوتے تو الگ صوبہ بن جانے سے کون سا پہاڑ گر جائے گا، رہیں گے تو پاکستان ہی کا حصہ۔ تقسیم ہند کے

بعد بھارت میں کئی نئے صوبے بنے ہیں۔ آخر انگریز کے بنائے ہوئے صوبے اتنے مقدس کیوں سمجھے جانے لگے ہیں۔ البتہ الگ ملک بنانے کی باتیں کرنے سے درحقیقت ایم کیو ایم کی منافقت اور باطنی خباثت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب بھی ان کے سامنے جناح پور کے منصوبے کا ذکر ہوتا ہے تو وہ قسمیں کھانے لگتے ہیں، یہ ہم پر الزام ہے، یہ جھوٹ ہے۔ یہ دشمن ہمارے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ لیکن ہر تیسرے دن خود الطاف حسین یا ایم کیو ایم کے دوسرے ذمہ داران الگ ملک کی دھمکیاں بھی دیتے رہتے ہیں۔ یا تو صاف صاف کہیں کہ ہم لسانی بنیادوں پر نیا ملک بنانا چاہتے ہیں اور اگر اس کی تردید کرتے ہیں تو پھر بار بار اس بات کو زبان پر لانے سے باز رہیں۔

اب آجایئے ردعمل کی طرف، سندھ کے علاوہ دوسرے صوبوں سے تو رسمی سا ردعمل ہوا ہے۔ شدید بلکہ شدید ترین ردعمل تو پاکستان پیپلز پارٹی جس کی سندھ میں حکومت ہے اور سندھ قوم پرستوں کی طرف سے سامنے آیا ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی لسانی بنیادوں پر الگ صوبہ بنانے کی مخالفت کس منہ سے کر رہی ہے جبکہ پنجاب میں لسانی بنیاد پر ہی سرائیکی صوبے کے قیام کے لیے اپنے گزشتہ دورِ حکومت میں جہاد کرتی رہی ہے اور اگر انہیں پنجاب اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی تو وہ یہ کام کر گزرتی۔ سوال یہ ہے کہ جو کام پنجاب میں جائز اور حلال ہے وہی کام اسی بنیاد پر سندھ میں ناجائز اور حرام کیوں ہے۔ سندھ ماں ہے اور اس کی تقسیم گناہِ عظیم ہے تو پنجاب لاوارث اور یتیم کیوں ہے؟ یہ جو دھرتی کو ماں کہا جاتا ہے اس کے بارے میں ایک صاحب دانش کا ایک خوبصورت قول سامنے آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ دھرتی کو ماں کہنے والے اس کے فرزند جس قدر جلد اور جس انداز میں اس ماں سے بے وفائی کرتے ہیں اور برا وقت آنے پر اس ماں سے علیحدہ ہوتے ہیں بلکہ اس پر تین حرف بھیجتے ہیں اور اس سے لاتعلقی اختیار کرتے ہیں، شاید ہی کسی اور تعلق میں ایسی مکمل جدائی اور لاتعلقی سامنے آتی ہو۔ ہم اس قول کو صد فی صد درست سمجھتے ہیں۔ جب تک اس ماں کی چھاتیوں میں دودھ رہتا ہے، یہ نام نہاد فرزندانِ دھرتی اس سے چمٹے رہتے ہیں۔ اس کی کوکھ سے برآمد ہونے والے رزق سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے چشموں اور قریب سے گزرنے والے دریاؤں کے پانی پر ان کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان بستیاں دریاؤں کے سنگ بساتا تھا، زرخیز زمین سے پیٹ بھرتا تھا اور زندگی گزارتا تھا۔ لیکن جونہی کسی مقام پر چشمے خشک ہو جاتے یا دریا سوکھ جاتا،

زمینیں بنجر ہو جاتیں، رزق ناپید ہو جاتا تو انسان بوریا بستر لپیٹتے اور آگے کی راہ لیتے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے کہ ماں رو رہی ہے یا سو رہی ہے۔

کسی بھی علاقے کے لوگ اگر اپنی دھرتی کو ماں کہیں تو انہیں سو جواب دیے جا سکتے ہیں لیکن مسلمانانِ پاکستان اگر اپنی دھرتی کو ماں کہیں تو انہیں ایک اضافی مضبوط اور مدلل جواب دیا جا سکتا ہے۔ 1947ء سے پہلے جب بزرگ لے کر رہیں گے پاکستان اور تقسیم ہند کی باتیں کر رہے تھے تو ہندو کا جواب کیا تھا' ہندوستان ہماری ماں ہے ہم اپنی ماں کو تقسیم نہیں ہونے دیں گے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پاکستان کے قیام اور ہند کی تقسیم کا نعرہ بھی سب سے پہلے سندھ سے لگا۔ سندھ اسمبلی نے قراردادِ پاکستان منظور کی اور بالآخر ہندوؤں کی ماں ہندوستان کو یوں کاٹا جیسے کیک کاٹتے ہیں۔ اگر کل ہندوؤں کی ماں ہندوستان کو کاٹ دینا جائز اور درست تھا تو آج سندھ کی تقسیم کیوں تکلیف دے رہی ہے۔ آپ نے تو ہندوؤں کی ماں کو کاٹ کر علیحدہ ملک بنا لیا، سندھ کی تقسیم سے تو صرف نیا صوبہ بنے گا۔ پھر یہ کہ اگر پاکستان پیپلز پارٹی دیانت اور محنت سے سندھ کی شہری آبادی کی خدمت کرتی ہے تو کراچی اور حیدر آباد جیسے شہروں کے لوگ آج اگر ایم کیو ایم کو ووٹ دیتے ہیں تو کل وہ PPP کے گن گائیں گے، لہٰذا محنت اور خدمت کی ضرورت ہے۔ چکنی چپڑی باتوں سے کام نہیں بنے گا۔ پی پی پی کی کارکردگی سے تو اب دیہی سندھ بھی مایوس ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ماں دھرتی کا فلسفہ ہی غیر فطری ہے اور سیاسی استحصال کے لیے بطور نعرہ استعمال کیا جاتا ہے۔ خصوصاً مسلمان کا اس فلسفہ سے کیا تعلق جڑتا ہے۔ اسلام آفاقی دین ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک بعثت کل انسانیت کی طرف تھی۔ آپ آخری نبی اور رسول تھے اور آپ کی رسالت تا قیامت ہے۔ قرآن پاک تا قیامت محفوظ ہے۔ مسلمان کے لیے تمام دنیا کو مسجد بنا دیا گیا۔ مسلمان کو کسی خاص علاقے یا زمین سے باندھا نہیں گیا۔ مسلمانوں پر دن میں پانچ وقت نماز فرض ہے اور دنیا بھر میں ہر وقت کسی نہ کسی مقام پر فرض نماز کی ادائی ہو رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ سارا جہاں ہمارا ہے۔ اور یہ بات بھی عقل میں سماتی ہے کہ بالآخر اس آفاقی دین اسلام کا ہی عالمی غلبہ ہو گا اور شاید یہی وجہ ہے کہ سکندر اعظم، ہٹلر اور انگریزوں نے جو اپنے اپنے وقت کی عظیم ترین قوت تھے، دنیا کے بڑے حصے پر قبضہ کیا لیکن سب کے سب مکمل عالمی غلبہ حاصل کرنے میں ناکام ہوئے۔ عجب عبرت کا سامان ہے کہ امریکہ جو انسانی تاریخ کی سب سے بڑی عسکری، سیاسی اور

اقتصادی قوت کی حیثیت سے سامنے آیا تھا، نیو ورلڈ آرڈر کے نام سے عالمی غلبہ کا خواب دیکھ رہا تھا، وہ دنیا کی پسماندہ ترین افغان قوم سے شکست کھا کر اپنے زخم چاٹ رہا ہے۔ اگرچہ عالمی غلبہ کا خمار اُسے ابھی تک مدہوش کیے ہوئے ہے اور مست ہاتھی کی طرح دنیا میں تباہی و بربادی پھیلا رہا ہے، لیکن دیکھنے والوں نے بھانپ لیا ہے کہ یہ دریا بھی اب اتر رہا ہے۔ اس سیلابی ریلے کے آگے بھی بہت سی چٹانیں حائل ہیں۔ لہٰذا امریکہ کے ہاتھوں مزید تباہی و بربادی کی توقع تو ہے، لیکن عالمی غلبہ والا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ البتہ ہم مسلمانوں خصوصاً مسلمانانِ پاکستان کے لیے لمحہ فکریہ ہے جنہوں نے ملک اسلامی نظام کے قیام کا نعرہ لگا کر حاصل کیا تھا۔ اسلام کا عالمی غلبہ تو اٹل ہے، نوشتہ دیوار ہے، آنکھوں دیکھی چیز سے بھی بڑھ کر ایک حقیقت ہے، صرف اور صرف اس لیے کہ فرمانِ رسول مقبولؐ ہے جو صادق المصدوق تھے جن کی مبارک زبان سے حق کے سوا کچھ جاری نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب خود آپؐ کے دور میں اسلام کا عادلانہ نظام انسانی کوششوں سے قائم ہوا تھا تو آج یہ ماورائی انداز میں اور معجزانہ طور پر بغیر انسانی کوشش اور جدوجہد کے کیسے قائم اور نافذ ہو جائے گا؟ اگر یہ کوشش، یہ جہاد ہم نہیں کریں گے تو اللہ اپنی سنت کے مطابق ہماری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ وہ جس سے چاہے اور جیسے چاہے کام لے لے۔ کتنی بڑی بدنصیبی ہوگی اگر ہم ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر اسلامی نظام کے ثمرات پر بحث کرتے رہے اور کوئی اور میدان میں نکل کر عملی جہاد کرے اور اپنی ذات اور معاشرے میں اسلام کا نفاذ کر کے بازی لے جائے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ ایک ہونی ہے، شدنی ہے، پھر ہم اپنے کندھے پیچھے کر کے بدنصیب اور نامراد کیوں ٹھہریں۔ اور یہ بھی جان لیں کہ یہ خطہ دین اسلام سے کیسے منور ہوگا، اس طریقہ کار کے لیے بھی ہمیں سیرت نبوی کو دیکھنا ہوگا اور سنتِ رسولؐ ہی کی پیروی کرنا ہوگی۔ آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ کوئی دھرتی ہماری ماں نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنے حقیقی ماں باپ جنہوں نے ہمیں جنم دیا ہے اور وہ اولاد جو اللہ نے ہمیں عطا کی ہے انہیں بھی اللہ، رسول ﷺ اور اُس کے دین کے قیام کے لیے فدا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا ہوگا۔ اسی میں دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔



عاقلاں را اشارہ کافی است!

پاکستان کے سیاست دان، صحافی، دانشور، وکلاء اور فوجی جرنیل 1973ء کے آئین کا ذکر یوں کرتے ہیں جیسے کوئی مقدس صحیفہ ہو، کوئی آسمانی وحی ہو یا اس سے بھی برتر کوئی شے (نقل کفر کفر نباشد)۔ ہم نے جب 1973ء کے آئین کا جائزہ لیا تو ہمیں اس آئین اور ایک عام مسلمان پاکستانی شہری کے کردار اور طرزِ عمل میں حیرت انگیز مشابہت نظر آئی۔ یقیناً ہر معاشرے میں ذہنی لحاظ سے اور کردار کے حوالہ سے ہر طرح کے اچھے بُرے لوگ موجود ہوتے ہیں، لیکن ہم یہاں اکثریت کے حوالے سے بات کریں گے۔ جب پاکستان میں کسی مسلمان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کا اچھا سا نام رکھا جاتا ہے۔ پیغمبروں اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ناموں کو نقل کیا جاتا ہے۔ کان میں اذان اور اقامت کہنے کے لئے خاندان کے کسی بزرگ سے درخواست کی جاتی ہے۔ یہاں تک پہنچ کر اسلام کسی حد تک رک جاتا ہے۔ آپ کہہ سکتے کہ اسلام کے حوالہ سے وقفہ ہو جاتا ہے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے، والدین اپنی مالی حیثیت کے مطابق کسی اچھے مگر انگلش میڈیم سکول کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ بچہ اگرچہ دادی اماں سے اور نانا ابو سے کچھ نہ کچھ اسلام کی بات بھی سنتا رہتا ہے، اُن میں سے کوئی اُسے نماز پڑھتا بھی نظر آتا ہے، لیکن اُسے اصلاً اپنے سکول کی تعلیم پر فوکس کرنا ہوتا ہے۔ نماز فجر کے لئے بچے کی نیند کو خراب نہیں کیا جاتا، البتہ انتہائی لاڈلا اور نعم و ناز سے پلنے والا بچہ بھی سکول جانے سے انکار نہیں کر سکتا۔ والدین کا طرزِ عمل بچے کو یہ بات ذہن نشین کروا دیتا ہے کہ سکول جانے کے حوالہ سے اور تعلیم حاصل کرنے کے معاملہ میں کوئی سمجھوتا ممکن نہیں۔ بچہ جوان ہوتا ہے ہم تعلیم کو تو الزام نہیں دیتے، البتہ تربیت اور ماحول کے زیرِ اثر ہم اُسے ایک ایسا شہری بنتے دیکھتے ہیں جو جھوٹ، وعدہ خلافی، عہد شکنی

اور خیانت کو کوئی بڑا جرم نہیں سمجھتا۔ اگر سرکاری ملازمت ملی ہے تو سرکاری وسائل اور حکومتی خزانہ کا غلط استعمال ایک روٹین ہے۔ اگر تاجر بنا ہے تو اصل مقصد اور ہدف دولت کمانا ہے۔ جائز ناجائز یا حرام وحلال سے کوئی غرض نہیں۔ اپنے ہم وطن مسلمان بھائیوں کو غیر معیاری خوراک اور جعلی ادویات کھلا کر اُن کی زندگی سے کھیلنا ضمیر پر بوجھ نہیں بنتا۔ وکیل وہی کامیاب ہے جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار قانون کی پابندی صرف دوسروں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ مذہبی رہنما کا طرزِ عمل ''خود را فضیحت دیگراں را نصیحت'' جیسی ضرب المثل کی صحیح صحیح عکاسی کرتا ہے۔ حکمرانوں کے نزدیک عوام کی حیثیت بھیڑ بکریوں کے ریوڑ جیسی ہے۔

اب آیئے 1973ء کے آئین کی طرف! آرٹیکل 2 کے مطابق مذہب اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔ گویا یہ ریاست کا پیدائشی نام ہے۔ آرٹیکل A-2 اعلان کرتا ہے کہ قرارداد مقاصد مستقل احکام کا حصہ ہوگی۔ آرٹیکل 31 ایک پاکستانی مسلمان کو اسلامی طرز زندگی اپنانے میں مدد دینے کو ریاست کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیتا ہے۔ عربی زبان سیکھنے کی ترغیب دی جائے گی۔ آرٹیکل 227 تمام قوانین کو قرآن وسنت میں منضبط کرنا حکومت کی ایسی ذمہ داری قرار دیتا ہے جس پر وہ آئین کی رو سے عمل کرنے کی پابند ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل آئین کا حصہ ہے۔ اسلام کے حوالہ سے مجلس شوریٰ کو اپنی سفارشات پیش کرنا اسلامی نظریاتی کونسل کی آئینی ذمہ داری ہے اور مجلس شوریٰ پر لازم ہے کہ ان سفارشات کو چھ ماہ کے عرصہ میں قانون کی شکل دے۔ حکومت اور مجلس شوریٰ اس بات کی پابند ہے کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہ بنائے۔ مجلس شوریٰ کے ارکان جس عمارت میں بیٹھ کر قانون سازی کرتے ہیں، اُس کے ماتھے پر کلمہ طیبہ کندہ ہے۔ گویا وہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر رہی ہے۔ لیکن شومئی قسمت عملاً کیا ہو رہا ہے، اس عمارت کے مکین حقوق نسواں بل منظور کرتے ہیں، جسے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صد فی صد علماء غیر اسلامی، غیر شرعی قرار دیتے ہیں۔ پاکستان کی معیشت کا صد فی صد انحصار سودی لین دین پر ہے، جسے اللہ رب العزت اپنے اور اپنے رسولؐ کے خلاف جنگ قرار دیتا ہے۔ عریانی اور بے حیائی کا فروغ اور اُس میں حکومتی کردار آرٹیکل 31 کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ آج پاکستان میں عورت شمع محفل ہی نہیں، تجارتی اشتہارات کا

حصہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کیا جائے تو اسے عورت کے بنیادی حقوق کے خلاف قرار دیا جاتا ہے۔ صدر کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی عدالتی فیصلے کو کالعدم قرار دے کر سند یافتہ مجرم کو بھی بری کر سکتا ہے۔ اسلام میں قاتل کو مقتول کے ورثاء کے رحم و کرم پر چھوڑا گیا ہے چاہیں تو جان کے بدلہ میں جان لینے کا مطالبہ کریں اور چاہیں تو خون بہا لے کر یا فی سبیل اللہ معاف کر دیں لیکن آئین پاکستان کے مطابق قاتل اور سزائے موت کا مستحق صدر سے رحم کی اپیل بھی کر سکتا ہے اور صدر اس کی سزا تبدیل کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسلام میں حکمران کا حساب اور محاسبہ سب سے کڑا اور سخت ہے۔ لیکن پاکستان میں صدر کو استثنا حاصل ہے۔ اسلام میں مسلمان پر زکوٰۃ اور عشر لاگو کیا جاتا ہے اور غیر مسلم کو جزیہ ادا کرنے کا پابند بنایا جاتا ہے۔ پاکستان میں بنکوں کے ذریعے زکوٰۃ کی وصولی کو مذاق بنا دیا گیا ہے اور جزیہ کو گالی سمجھا جاتا ہے۔ 1962ء میں ایک فوجی طالع آزما نے ہمارے عائلی قوانین میں ایسی تبدیلی کر دی جو صریحاً خلاف شریعت تھی۔ آج تک مملکت خداداد پاکستان کے مسلمان عوام ان اسلام دشمن قوانین کو برداشت کر رہے ہیں۔ بہر حال جو دوغلہ پن آئین میں ہے، ایسی ہی عملی منافقت پاکستان کے اکثریتی شہریوں میں بھی نظر آتی ہے۔ حج اور عمرہ کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے لیکن بد دیانتی اور عہد شکنی بھی عام ہے۔ اور یہ عبادات رشوت، بلیک مارکٹنگ اور سمگلنگ کے ذریعے حاصل ہونے والی دولت سے سرانجام دی جا رہی ہے۔ گویا پاکستانی مسلمانوں کی اکثریت اس آئین کے مطابق ڈھل چکی ہے جس میں بیک وقت اسلام بھی موجود ہے اور اسلام کی یکسر نفی بھی۔ لہٰذا میڈیا پر جو یہ بحث چل رہی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی ہے یا غیر اسلامی اس میں دونوں طرف کے لوگ سچے دکھائی دیتے ہیں۔

اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ قائداعظم نے تقسیم ہند سے پہلے ہی ایک بات بڑے دوٹوک انداز میں کہی تھی جب اُن سے پوچھا گیا کہ پاکستان کا آئین کیسا ہوگا تو انہوں نے برجستہ جواب دیا پاکستان کا آئین آج سے تیرہ سو سال پہلے بن گیا تھا۔ پاکستان کی اصل ضرورت یہ تھی کہ ہم اُس آسمانی آئین اور فرمودات رسول کی غیر مشروط بالادستی کو قبول کرتے ہوئے ایک ایسی مجلس شوریٰ تشکیل دیتے یا منتخب کرتے جس کا کام روزمرہ کے انتظامی امور کی انجام دہی کے لئے قانون سازی کرنا ہوتا۔ جدید دور میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں قرآن و سنت کی روشنی میں اُن کا حل تلاش کیا جاتا۔ اسرائیل اور برطانیہ مادی لحاظ سے انتہائی ترقی یافتہ ممالک ہیں، لیکن اُن کا کوئی

باقاعدہ آئین نہیں۔ وہ روایات سے یا ضروری قانون سازی سے کام چلاتے ہیں۔ اگر ریاست یہ رویہ اختیار کرتی کہ قرآن وسنت کی بالادستی ہوگی اور قانون سازی اُس کے تابع ہوگی، تب فرد بھی اپنی ذاتی زندگی کو اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے تابع کرتا اور روزمرہ کے مسائل کے حوالہ سے اپنے مسلک کے عالم سے رہنمائی حاصل کرتا۔ یہ ڈھنڈورا بہت پٹ چکا، اس پروپیگنڈا کو اب ختم ہونا چاہیے کہ کس کا اسلام نافذ کریں، بریلوی دیوبندی، اہل حدیث یا اہل تشیع کا۔ ہم سمجھتے ہیں 1951ء میں 31 علماء جن میں تمام مسالک کے اکابرین شامل تھے، 22 نکات پیش کر کے یہ مسئلہ حل کر چکے ہیں۔ آج بھی کوئی عالم دین کسی بھی مسلک سے اُس کا تعلق ہو، وہ اپنے ان اکابرین سے اعلان برأت نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی باقاعدہ آئین ناگزیر ہے تو طے ہونا چاہیے کہ قرار دادِ مقاصد کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی اور کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ عدالت سے رجوع کر سکے کہ آئین کا فلاں آرٹیکل یا اُس کی ذیلی شق قرآن وسنت کے خلاف ہے اور اس درخواست کو سننے کا حق صرف جید علماء کو ہوگا کہ وہ اس کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فیصلہ کریں۔ حکومت کا کوئی دوسرا ادارہ اُس فیصلے کے خلاف سماعت کا حق نہیں رکھے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ریاست پاکستان اور پاکستان کے شہری کو دوغلے پن سے نکالنے کا صرف یہی راستہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ جب مسجد نبوی میں خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے تشریف لاتے تو عبداللہ بن اُبی کھڑا ہو جاتا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بآواز بلند کہتا، محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، انہیں غور سے سنو۔ تاریخ نے اس شخص کو رئیس المنافقین قرار دیا ہے۔ عاقلاں را اشارہ کافی است!



پاکستان: اسلامی فلاحی ریاست یا مسلمانوں کا ملک؟

ریاست پاکستان بہت سے اعتبارات سے اس دنیا میں ایک منفرد ریاست ہے۔ یہ واحد ریاست ہے جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی۔ یہ واحد ریاست تھی جو دو حصوں میں منقسم تھی، جن کے درمیان اس کا ازلی اور ابدی دشمن ملک پھیلا ہوا تھا۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کی سلامتی کے حوالے سے اس کے اپنے باسی شکوک وشبہات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور بیرونی دنیا اس کے عالمی نقشے سے غائب ہونے کی تاریخیں دیتی رہتی ہے۔ یہ ایک ایسی ریاست ہے جس میں ایک سے زائد تعلیمی نظام رائج ہیں۔ بنیادی طور پر یہ زرعی ملک ہے، لیکن زراعت میں خود کفیل نہیں۔ صنعت اور ٹیکنالوجی کے حوالہ سے یہ پسماندہ ملک ہے، بہت سی بنیادی ضروریات دوسرے ممالک سے درآمد کرتا ہے، لیکن ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکا ہے اور ایٹمی ٹیکنالوجی میں بھارت جیسے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملک سے کہیں آگے ہے۔ پھر یہ کہ اہل پاکستان اپنی شناخت کے حوالہ سے متفق نہیں۔ ملک کی عظیم اکثریت خود کو اُمتِ مسلمہ کا حصہ سمجھتی ہے، اسلام کو پاکستان کی بنیاد اور اسلامی نظام کو نظریہ پاکستان کی عملی تعبیر خیال کرتی ہے، جبکہ ایک قلیل مگر انتہائی مؤثر گروہ پاکستان کو مسلمانوں کا ایسا ملک قرار دیتا ہے جو صرف ہندو کے معاشی استحصال سے بچنے کے لیے قائم کیا گیا۔ بانی پاکستان ان کے بقول سیکولر پاکستان چاہتے تھے۔ وہ قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی اسمبلی میں کی گئی تقریر کے ایک جز کو اپنے استدلال کی بنیاد بناتے ہیں۔ یہ گروہ اگرچہ قلیل ہے، لیکن اسٹیبلشمنٹ میں اثر ورسوخ رکھنے اور ذرائع ابلاغ پر بلاشرکت غیرے قبضہ کی وجہ سے بہت بڑا اور مؤثر دکھائی دیتا ہے۔ ہم اس تحریر میں اسی نکتہ کو زیر بحث لائیں گے کہ کیا بانیانِ پاکستان تحریک پاکستان کے کارکنان اور عوام جو گلی کوچوں اور بازاروں میں "لے کر رہیں گے

پاکستان'' اور ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ'' کے نعرے لگاتے ہوئے اس تحریک کے ہراول دستہ بنے ہوئے تھے وہ ہندوستان کو کاٹ کر ایک اسلامی فلاحی جمہوری ریاست کی تشکیل چاہتے تھے یا ہندو کے استحصال سے پاک محض مسلمانوں کا ایک ملک بنانا چاہتے تھے۔

ہماری سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ ہمارے یہ بزرگ پاکستان کو ایک ایسی اسلامی فلاحی جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے جس میں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی رائج ہوگا۔ اگر مسئلہ محض مسلمانوں کو ہندوؤں کے معاشی استحصال سے بچانا ہوتا تو یہ مقصد خون کے دریا بہائے اور عزتیں لٹائے بغیر بھی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ کون نہیں جانتا کہ کانگریس اور ہندوؤں کے باپو گاندھی تقسیم ہند کو بچانے کے لیے مسلم لیگ کی ہر شرط تسلیم کر لیتے، وہ سفید کاغذ پر دستخط کرنے پر تیار ہو جاتے۔ فرض کریں مسلم لیگ یہ تسلیم بھی کر لیتی کہ متحدہ ہندوستان میں کنفیڈرل نہیں بلکہ فیڈرل نظام حکومت ہوگا، لیکن جداگانہ انتخابات اور صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کر دیتی، مرکز کے پاس صرف کرنسی، دفاع اور امور خارجہ ہوتے تو کوئی ہمیں سمجھا دے کہ معاشی ہی نہیں سیاسی سطح پر بھی کانگریس مسلمانوں کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ آج پاکستان میں آئین میں اٹھارہویں ترمیم کے باوجود مرکز کے پاس بہت سے اختیارات ہیں۔ پھر بھی صوبے کنٹرول سے باہر ہو رہے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ پاکستان میں مرکز اور صوبے دونوں سطحوں پر عوام کا معاشی اور سیاسی استحصال خود مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ہندو کے معاشی استحصال سے بچانے کا واحد حل مکمل طور پر ایک الگ ریاست کا قیام لازم نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم نے تقسیم ہند سے پہلے ایک سو سے زائد ایسی تقاریر کیں، جن میں اسلام کا حوالہ یا نئے ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب قائداعظم سے پوچھا گیا کہ پاکستان کا آئین کیسا ہوگا تو قائد کا جواب تھا کہ ہمارا آئین تیرہ سو سال پہلے قرآن پاک کی صورت میں موجود ہے۔ 25 جنوری 1948ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے دوٹوک انداز میں فرمایا تھا:

> ''اسلامی اصول آج بھی ہماری زندگی کے لیے اسی طرح قابل عمل ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے قابل عمل تھے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ لوگوں کا ایک گروہ جان بوجھ کر فتنہ اندازی سے یہ بات کیوں پھیلانا چاہتا ہے کہ پاکستان کا آئین شریعت کی

بنیاد پر مدوّن نہیں کیا جائے گا۔''

سٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے معمارِ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا کہ

''اب آپ کو اسلام کا نظامِ معیشت تیار کرنا ہے' اس مغربی نظام معیشت نے انسان کو کوئی خیر اور بھلائی عطا نہیں کی۔''

قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کی 13 ماہ میں 14 تقاریر ایسی ہیں جن سے قائد کا یہ واضح رجحان سامنے آتا ہے کہ وہ پاکستان کو اسلامی نظریاتی جمہوری ریاست بنانا چاہتے تھے۔ قائداعظم نے اپنے انتہائی مختصر دور میں صرف ایک شعبہ ''ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن'' قائم کیا، علامہ اسد کو اس کا انچارج بنایا۔ اس شعبہ کو یہ کام تفویض کیا گیا کہ وہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالے گا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد علامہ اسد کو پاکستان سے باہر بھیج دیا گیا اور اُن کے شعبہ کو آگ لگا دی گئی جس سے سارا ریکارڈ جل کر خاکستر ہو گیا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ قائداعظم کی تقاریر اور تحاریر میں کہیں سیکولرازم کا لفظ نہ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی دیتا ہے۔ پھر یہ بھی اصرار کرنا کہ قائد پاکستان کو سیکولر ملک بنانا چاہتے تھے' ڈھٹائی اور بے شرمی کے سوا کیا ہے۔

جہاں تک قائد کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کے اس حصہ کا تعلق ہے جسے سیکولر عناصر دانتوں میں دبائے پھرتے ہیں، اگرچہ اس کی بہت سی تاویلات کی گئی ہیں، لیکن جدید تحقیق نے تو یہ بات مشکوک قرار دے دی ہے کہ قائد کی تقریر میں یہ حصہ شامل تھا بھی یا نہیں۔ پاکستان نے آل انڈیا ریڈیو سے جب یہ تقریر حوالے کرنے کی درخواست کی تو بھارتی حکومت نے جواب دیا کہ وہ اس کے ریکارڈ میں موجود نہیں۔ بعض محققین نے اسے برطانوی لائبریری میں ڈھونڈنے کی کوشش کی، وہاں بھی یہ موجود نہیں پائی گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سابق چیف جسٹس منیر جو انتہائی سیکولر ذہن رکھنے والے تھے تقریر کا یہ حصہ خود انہوں نے شامل کیا اور یہی تحریف شدہ تقریر کا متن پنجاب اسمبلی میں موجود ہے۔ واللہ اعلم!

آج ہر مخلص پاکستانی کے ذہن میں یہ سوال کلبلا رہا ہے کہ پاکستان کو قائم ہوئے چھیاسٹھ سال ہو چکے ہیں، لیکن گزشتہ کچھ عرصہ سے سیکولر عناصر کی دھاچوکڑی میں کیوں اضافہ ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمسایہ برادر ملک افغانستان میں طالبانِ افغانستان کے ہاتھوں امریکا کی درگت اور اب اس کا وہاں سے ساز و سامان چھوڑ کر فرار پاکستانی سیکولر عناصر کو بے تاب کر رہا ہے۔ کیونکہ

افغانستان سے امریکہ کے نکل جانے کے بعد وہاں افغان طالبان کا اقتدار نوشتۂ دیوار ہے۔ لہٰذا انہیں خوف یہ ہے کہ کہیں پاکستان بھی اس سے متاثر ہو کر اسلام کی راہ پر نہ چل نکلے، جو ان کے عیش و عشرت اور رقص و سرود کی محفلوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ اسی سوچ کی بنا پر یہ لوگ تحریک طالبان پاکستان سے مذاکرات کے سخت مخالف ہیں اور فوجی آپریشن کے ذریعے انہیں کچل دینے کے درپے ہیں۔ ہم اہل پاکستان کو انتباہ کرتے ہیں کہ پاکستان کا مقدر اسلام سے وابستہ ہے۔ اسلام اور پاکستان کو الگ الگ کرنے کی کوشش کی گئی تو اسلام کا کچھ نہیں بگڑے گا، اسے تا قیام قیامت قائم رہنا ہے، البتہ پاکستان کے بارے میں دشمنوں کی یہ پیشین گوئی پوری ہو سکتی ہے کہ مستقبل کے عالمی نقشہ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا پاکستان اور اہل پاکستان کی واحد پناہ گاہ اسلام ہے۔ اللہ رب العزت پاکستان کو اس کے دشمنوں سے بچائے اور اسے اپنے معماروں کی خواہش کے مطابق صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست بنائے۔



فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے

سابق صدر پرویز مشرف بالآخر اس فردِ جرم کی زد میں آ ہی گئے جس سے بچنے کے لیے ان کے وکلاء کئی حیلے بہانے کرتے اور عذر تراشتے رہے۔ انہوں نے کئی ماہ سے فوجی ہسپتال میں پناہ لی ہوئی تھی۔ ہم اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ الزام تو نہیں لگا سکتے کہ ان کی بیماری وغیرہ سب فراڈ تھا، البتہ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب بہ امر مجبوری انہیں عدالت میں پیش ہونا پڑا اور جس فردِ جرم کی زد میں آنے سے وہ بچنا چاہتے تھے وہ عائد ہو گئی تو وہ ہسپتال چھوڑ کر اپنے کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے اسلام آباد والے گھر پہنچ گئے لہٰذا حالات و واقعات سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ عدالت میں حاضری اور فردِ جرم کے عائد ہونے سے بچنے کے لیے ہسپتال میں مقیم تھے، جونہی یہ سب کچھ ہو گیا وہ واپس گھر چلے گئے۔ واللہ اعلم :

قوم کے سامنے پرویز مشرف کا جو جرم لایا جا رہا ہے وہ آئین شکنی ہے۔ اسے غداری قرار دے کر انہیں جمہوریت کا دشمن، منتخب عوامی حکومت پر شب خون مارنے والا طالع آزما ہونے کے ناتے کر قابل گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے۔ ہم ان پر لگائے جانے والے تمام الزامات کو درست سمجھتے ہیں، کسی بھی صورت میں ان کی اس آئین شکنی کو جائز اور درست نہیں سمجھتے۔ اگرچہ یہ بات بھی درست ہے کہ آئین ریاست کے لیے ہوتا ہے، ریاست آئین کے لیے نہیں ہوتی۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ ریاست اور آئین میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو ظاہر ہے ریاست کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن کیا 12 اکتوبر 1999ء کو یا 3 نومبر 2007ء کو ریاست کی سلامتی کو کوئی خطرہ تھا۔ ہرگز ہرگز ایسا خطرہ نہیں تھا لہٰذا یہ بات صد فی صد درست ہے کہ آرمی چیف پرویز مشرف نے محض اقتدار کی ہوس میں نواز حکومت کا خاتمہ کیا۔ لیکن چند سوالات نواز حکومت سے بھی

کیے جانے ضروری ہیں۔ حکومت 3 نومبر 2007ء کو نافذ کردہ ایمرجنسی کو مقدمہ کی بنیاد بنا رہی ہے اور 12 اکتوبر 1999ء کو نظر انداز کر رہی ہے۔ یہ انتہائی مضحکہ خیز صورتحال ہے۔ اگر 12 اکتوبر کا سانحہ رونما نہ ہوتا تو 3 نومبر کا حادثہ کیسے پیش آ جاتا۔ پھر یہ کہ کیا پرویز مشرف نے جہاز میں بیٹھے بیٹھے اکیلے ہی نواز حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ کیا آئین میں یہ درج نہیں ہے کہ قانونی حکومت کا تختہ الٹنے میں یعنی آئین شکنی میں جو بھی تعاون کرے گا اس پر آرٹیکل 6 کا اطلاق ہوگا۔ لہٰذا اس وقت کے تمام کور کمانڈرز اور پرویز مشرف کے مارشل لاء کو جائز قرار دینے والے تمام جج حضرات کو بھی کٹہرے میں کھڑے ہونا چاہیے۔

پرویز مشرف پر جن الزامات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی جا رہی ہے وہ درست ہونے کے باوجود انہیں غدار قرار دینا غلط ہے، انہیں صرف آئین شکنی کا مرتکب کہا جانا چاہیے۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہے کہ قومی ہی نہیں ملت اسلامیہ کے خلاف جس بدترین غداری اور ظلم کا اس شخص نے ارتکاب کیا ہے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا جا رہا۔ ان کے جس جرم کی وجہ سے آج پاکستان آگ میں جھلس رہا ہے اور برادر اسلامی ملک افغانستان تباہ و برباد ہو گیا ہے نہ عوام کی قابل ذکر اکثریت اور نہ ہی مقتدر حلقے اس جرم عظیم کی پاداش میں اسے کٹہرے میں لانے کو تیار ہیں۔ کیا کسی مسلمان ملک کے مسلمان حکمران کا یہ جرم کہ وہ کفار اور اسلام دشمن قوتوں کے ساتھ مل کر ایک اسلامی ریاست کو تباہ و برباد کر دے، لاکھوں مسلمان بھائیوں کو تہہ تیغ کر دے، قابل معافی جرم ہے؟ کیا نائن الیون کے حادثے میں کوئی ایک افغانی بھی ملوث تھا؟ کیا اسامہ بن لادن کے خلاف الزام کسی بھی سطح پر ثابت ہوا تھا؟ کیا کسی بھی سطح پر انصاف کے تقاضے پورے ہوئے؟ کیا کوئی ایسی عدالت قائم ہوئی جس میں سب کو صفائی کا موقع دیا گیا ہو؟ کیا قومی اور بین الاقوامی سطح پر کسی تحقیقاتی کمیشن نے طالبان کی حکومت پر نائن الیون میں ملوث ہونے کا شبہ تک ظاہر کیا؟ اس ساری صورت حال میں کسی اسلام دشمن قوت کے ساتھ مل کر اپنے مسلمان بھائیوں کے قتل عام میں صرف اس لیے تعاون کرنا کہ مسلمانوں کا یہ دشمن انتہائی طاقتور ہے، اگر اس کا ساتھ نہ دیا گیا تو وہ ہمیں بھی گزند پہنچائے گا اور اس حوالہ سے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگانا کیا یہ کوئی جرم نہیں؟

ہم سمجھتے ہیں کہ آج ہم پاکستانی مسلمان غضب الٰہی کا نشانہ ہی اس لیے بنے ہوئے ہیں کہ ہم نے امت مسلمہ سے اس غداری کو ہضم کر لیا' قومی عصبیت کو دینی عصبیت پر ترجیح دی۔ لہٰذا

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ قوم اور اُمت کے خلاف جرم کا ارتکاب کرنے والے پرویز مشرف کو قرار واقعی سزا دی جائے اور قوم اجتماعی سطح پر رجوع کرے' اپنے جرم کا اعتراف کر کے اللہ کے حضور توبہ کی درخواست کی جائے اور افغان بھائیوں سے ہونے والے ظلم کی جو تلافی ممکن ہو سکے وہ کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی تلافی کا صرف ایک طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ جس اسلامی ریاست کو تباہ و برباد کیا گیا تھا ہم اس کی بحالی میں ہر ممکن امداد کریں اور خود پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست میں تبدیل کریں اور جو اندرونی و بیرونی قوتیں اس کی راہ میں حائل ہوں' ان سے نبرد آزما ہوں۔ اگر پرویز مشرف کو آئین شکنی کا قومی مجرم سمجھ کر سزا دی گئی تو یاد رکھیے سندھ بھی ایک قومیت ہے، بلوچ بھی ایک قومیت ہے، لہٰذا ''سب سے پہلے سندھ'' اور ''سب سے پہلے بلوچستان'' کا نعرہ بھی لگ سکتا ہے۔ اگر زمینی بنیادوں پر رشتہ جوڑیں گے' اگر علاقائی عصبیت ''سب سے پہلے'' کی بنیاد ہے تو یہ رشتہ تو ہمارا ہندو کے ساتھ بھی تھا تو پھر متحدہ ہندوستان کے ٹکڑے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ خدارا اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام کے علاوہ کسی بھی دوسری شے کو پاکستان کی بنیاد سمجھا جائے گا اور اس بنیاد پر پاکستان کو متحد رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ مصنوعی اور جعلی ہو گی اور کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گی۔ اسی وجہ سے ہم تباہی کی طرف بڑھ رہے ہیں اور ہماری سلامتی خطرات سے دوچار ہے۔ اس فکر اور اس راہ کو اگر ہم نے ترک نہ کیا تو یہ خطرات بالآخر ایک حقیقت بن کر سامنے آئیں گے۔ قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں، یہی اللہ کی سنت رہی ہے۔ وہ افراد کے گناہوں سے اغماض برت لیتا ہے، لیکن ملت کے گناہوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

پرویز مشرف ایک شخص کا نام نہیں ایک سوچ کا نام ہے۔ صرف پرویز مشرف کو تختۂ دار پر لٹکانے سے مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ اس سوچ کو پھانسی چڑھانا ہو گا اور اس طرح دفن کر دینا ہو گا کہ یہ کبھی برسرِ زمین نہ آ سکے۔ مصر کے جمال عبدالناصر نے مصریوں کو فرعون کے بیٹے کہہ کر پکارا اور اس پر فخر کیا۔ نتیجہ سامنے آ گیا آج بھی مصری فوج کی گولیاں ہیں اور مصری مسلمانوں کے سینے ہیں یعنی باہم قتل و غارت گری ہو رہی ہے۔ عراق کے صدر صدام حسین نے خود کو نمرود کے ساتھ جوڑا، آج تک عراقی خون میں غلطاں ہیں اور ایک دوسرے کی گردنیں مار رہے ہیں۔ ایران کے شاہ رضا پہلوی نے پچیس سو سالہ جشن منایا۔ ایرانی' شاہ رضا کو تو بھگانے میں کامیاب ہو گئے، لیکن اس سوچ کو پوری طرح دفن نہ کر سکے۔ آج مرگ بر امریکہ اور مرگ بر اسرائیل کہنے والا ایران' امریکہ

سے دوستی کی بھیک مانگ رہا ہے اور یہودیوں کے بارے میں اپنا تھوکا ہوا چاٹ رہا ہے۔ پاکستانیوں نے بھی اُمت مسلمہ کے خلاف غداری پر پرویز کے گریبان میں ہاتھ نہ ڈالا اور "سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ لگانے کے باوجود اسے محض قومی مجرم اور آئین شکنی کا مجرم قرار دیا تو ہم خون کے دریا میں کیوں نہیں نہائیں گے۔ اس خونی سیلاب کے آگے بند ھ باندھنے کے لیے خود کو ہر سطح پر اسلام کے ساتھ منتھی کرنے کی ضرورت ہے۔ البتہ یہ زمینی حقیقت ہے جسے قبول کرنا ہماری مجبوری ہے کہ اس وقت امت مسلمہ ستاون اسلامی ممالک میں منقسم ہے۔ لہٰذا ہر اسلامی ملک کے باسی کو پہلے اپنے ہاں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا ایک فطری طریقہ ہوگا۔ پاکستان کا استحکام، سلامتی اور بقا اگر سیکولرزم کے ذریعے ممکن ہوتی تو پرویز مشرف اور زرداری سے بڑھ کر کون سیکولر ہوگا۔ اب تو حالات و واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کی دنیا اور آخرت دونوں نظریہ پاکستان کی عملی تعبیر سے سنور سکتی ہے۔ ہم اللہ رب العزت پر بھروسا کرتے ہوئے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان ممالک جو اغیار کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں اگر نظامِ خلافت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو جہاں وہ دنیا کی سپریم قوت بن کر اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ کو خود بھی تسلیم کریں گے وہ باقی دنیا سے بھی کروائیں گے۔ ان شاء اللہ! آیئے علامہ اقبال کے اس شعر پر غور کریں اور اجتماعی طور پر اپنا قبلہ درست کرنے کی کوشش کریں۔ فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف!



کیا پاکستان کا آئین اسلامی ہے؟

آج کل پاکستان میں ہر فورم پر یہ بحث چل نکلی ہے کہ آیا 1973ء کا آئین اسلامی ہے۔ اس بحث کا ایک پس منظر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سیکولر عناصر اپنی تمام تر کوشش اور حربوں کے باوجود نواز حکومت کو تحریک طالبان پاکستان سے مذاکرات کرنے سے روک نہ سکے تو یہ بحث ایک خاص مقصد سے چھیڑ دی گئی کہ ہمیں طالبان سے کیا بات کرنے کی ضرورت ہے، اگر ان کا مطالبہ پاکستان میں اسلام کا نفاذ ہے تو پاکستان میں تو پہلے ہی اسلامی آئین نافذ ہے، کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں۔ ہماری دائیں بازو کی جماعتیں ہی نہیں بلکہ باقاعدہ مذہبی جماعتیں بھی ان عناصر کی یہ چال نہ سمجھ سکیں اور یہ بیان دینا شروع کر دیے کہ 1973ء کا آئین اسلامی ہے اور ایک اسلامی جماعت کے اچھی بھلی سمجھ دار اور مشہور و معروف شخصیت نے یہ بیان بھی داغ دیا کہ نہ صرف یہ کہ 1973ء کا آئین اسلامی ہے بلکہ پاکستان میں اسلامی شریعت نافذ ہے۔ ایک مذہبی جماعت کے رہنما نے جن کی سیاسی بصیرت کے اپنے اور غیر سب معترف ہیں فرمایا کہ 1973ء کے آئین پر ہمارے بزرگوں کے دستخط ہیں، وہ غیر اسلامی کیسے ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان کی خدمت میں تو ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ کے بزرگوں نے اس آئین پر اس وقت دستخط کیے تھے جب انہیں یہ گارنٹی دی گئی تھی کہ 10 سال کے عرصہ میں یعنی 1983ء تک تمام غیر اسلامی قوانین ختم کر دیے جائیں گے اور آئین کے آرٹیکل 203(D) میں یہ طے کرا لیا گیا کہ ''عدالت یا تو خود اپنی تحریک یا پاکستان کے کسی شہری یا وفاقی حکومت یا کسی صوبائی حکومت کی درخواست پر اس سوال کا جائزہ لے سکے گی اور فیصلہ کر سکے گی کہ آیا کوئی قانون یا قانون کا کوئی حکم ان اسلامی احکام کے خلاف ہے یا نہیں جس طرح کہ قرآن پاک اور رسول ﷺ کی سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ ہم اس قانون سازی کا ذکر کریں جو قرآن وسنت کے خلاف ہوئی، ہم چاہیں گے کہ آئین کے بعض ان آرٹیکل کا ذکر کردیں جو واضح طور پر خلاف اسلام ہیں۔ آئین کے آرٹیکل 45 کا متن یہ ہے: ''صدر کو کسی عدالت' ٹریبونل یا دیگر ہیئت مجاز کی دی ہوئی سزا کو معاف کرنے' ملتوی کرنے اور کچھ عرصہ کے لیے روکنے' اس میں تخفیف کرنے یا اس کو تبدیل کرنے کا اختیار ہوگا۔'' ویسے تو یہ آرٹیکل عام انصاف کے تقاضوں کے خلاف بھی ہے کہ ایک شخص کے خلاف ایک کیس طویل عرصہ تک چلتا ہے' گواہیاں دی جاتی ہیں' استغاثہ الزام ثابت کرتا ہے۔ جج اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر کے ایک فیصلہ کرتا ہے۔ اس سارے طریقہ کار میں وقت اور وسائل صرف ہوتے ہیں اور صدارتی محل میں بیٹھے ہوئے ایک شخص کو یہ حق دے دیا جائے کہ اس سب کچھ پر خط تنسیخ پھیر دے، جبکہ اسلام میں سربراہِ مملکت عدالتی کارروائی میں دخل اندازی نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی عدلیہ اور انتظامیہ صرف اسی صورت میں الگ رہ سکتی ہیں۔ شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں قاتل کو معاف کرنے کا حق صرف مقتول کے ورثا کو دیا گیا ہے۔ وہ چاہیں تو اسے فی سبیل اللہ یا دیت وصول کر کے معاف کر سکتے ہیں۔ اسلام کا یہ قانون انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی خود معاف کر دیتا ہے تو اس کے دل سے کدورت بھی نکل جاتی ہے اور اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ جبکہ ریاست کے معاف کر دینے کی صورت میں ورثاء میں انتقام کی آگ مزید بھڑک اٹھتی ہے۔ جس سے وہ خود بدلہ لینے اور جان کے بدلے جان لینے پر تل جاتے ہیں، جس سے قتل وغارت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

آئین کے آرٹیکل 248 کے مطابق صدر یا کسی گورنر کے خلاف اس کے عہدے کی میعاد کے دوران کسی عدالت میں کوئی فوجداری مقدمات نہ قائم کیے جائیں گے اور نہ ہی جاری کیے جائیں گے۔ صدر یا کسی گورنر کے عہدے کی معیاد کے دوران کسی عدالت کی طرف سے اس کی گرفتاری یا قید کے لیے کوئی حکم جاری نہیں ہوگا۔ یہ آرٹیکل صریحاً خلاف اسلام ہے۔ اسلام میں تو سربراہِ مملکت یا علاقے کے گورنر کا پہلے احتساب کیا جاتا ہے اور سب کے لیے قانونی مساوات ہے۔ کسی کو قانون سے بالاتر قرار نہیں دیا جاتا، بلکہ حکمرانوں پر خصوصی نگاہ رکھنے کا حکم ہے۔ پھر یہ کہ اگر آرٹیکل 203B(C) کے تحت فیڈرل شریعت کورٹ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے کہ وہ عدالتی پروسیجر میں مداخلت نہیں کرسکتی۔ وہ عائلی قوانین جنہیں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر نے

متفقہ طور پر غیر اسلامی قرار دیا تھا، انہیں بھی منسوخ نہیں کر سکتی۔ معیشت میں سود کو وہ دس سال ختم نہیں کر سکتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دس سال آج اکتالیس سال بعد بھی ختم نہیں ہو سکے۔

عائلی قوانین کے حوالہ سے پاکستان کا مقابلہ اس بھارت سے اگر کیا جائے جس سے اسلام کے نام پر ہم نے علیحدگی اختیار کی تھی تو ہمارے ہاتھ شرمندگی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ جن عائلی قوانین کو 1973 کا نام نہاد اسلامی آئین تحفظ دیتا ہے وہ 1962ء میں ایک فوجی طالع آزما نے ایک گمراہ اور منحرف دانشور نما مذہبی لیڈر سے بنوائے تھے۔ یہ عائلی قوانین اسلامی شریعت پر بدنما داغ لگانے کی ایک کوشش تھی۔ یہ مکمل طور پر غیر اسلامی عائلی قوانین باون سال سے پاکستان پر مسلط ہیں۔ اس کے مقابلے میں بھارت میں سپریم کورٹ نے مسلمانوں کے عائلی قوانین کی ایک شق سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تھی جب شاہ بانو کیس میں ایک طلاق یافتہ خاتون کو تمام زندگی نان نفقہ دینے کا حکم دیا گیا تھا، جس پر بھارت کے مسلمانوں نے ایسی زوردار منظم تحریک چلائی کہ وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور پارلیمنٹ میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ کسی مجاز عدالت کو یہ حق نہیں کہ وہ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں مداخلت کرے۔

جہاں تک آئین کی اس شق کا تعلق ہے جس کے مطابق قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکے گی، تو حکومتوں اور اُن کی اپوزیشن نے کئی بار کھلم کھلا اس شق کی خلاف ورزی کی لیکن ان کا کچھ بگاڑا نہ جا سکا۔ مثلاً تحفظ حقوقِ نسواں کا بل پارلیمنٹ میں منظور کر کے قانون کی شکل دے دی گئی۔ تمام اسلامی مکاتب فکر نے اسے خلافِ اسلام قرار دیا۔ اسلامی جماعتوں نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر یہ بل منظور ہوا تو وہ اسمبلی کی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں گے، لیکن یہ دھمکی بھی کارگر ثابت نہ ہو سکی اور قرآن وسنت کی واضح خلاف ورزی کرتے ہوئے قانون سازی کے تمام مراحل طے کر لیے گئے۔ پاکستان کے آئین کے مطابق کوئی پاکستانی مسلمان مرد یا عورت سربراہِ مملکت بن سکتا ہے حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے عورت کی سربراہی کی شدید الفاظ میں ممانعت فرمائی ہے۔ اسلام میں عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کو منع فرمایا گیا ہے۔ عورت کا دائرہ کار امور خانہ داری، بچوں کی نگہداشت اور ان کی تعلیم وتربیت تک محدود ہے اور مرد کو خارجی امور کی انجام دہی کرنا ہوتی ہے، لیکن پاکستان کے آئین میں آگے بڑھ کر قومی اسمبلی میں عورتوں کی خصوصی نشستیں قائم کی گئی ہیں۔ روشن خیالی کے علمبردار پرویز مشرف نے اسمبلی میں عورتوں کی

خصوصی نشستوں میں اضافہ کر دیا۔ عورتوں کے لیے خصوصی نشستیں جمہوری اصولوں کے بھی خلاف ہیں اور شاید دنیا میں کسی بھی جگہ عوامی نمائندہ اداروں میں عورتوں کے لیے خصوصی نشستوں کا اہتمام نہیں ہے۔

دوسری طرف اگر آئین کے آرٹیکل 1(1) آرٹیکل 2' آرٹیکل 2(A) ' آرٹیکل 31 ' آرٹیکل 227 وہ آرٹیکلز ہیں، مختصراً جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خالصتاً اسلام کے حوالے سے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ ریاست کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ قراردادِ مقاصد اس آئین کا حصہ ہے جس میں اقتدارِ اعلیٰ کا حقدار صرف اور صرف اللہ رب العزت کو قرار دے کر ریاست نے کلمہ پڑھ رکھا ہے۔ اہل پاکستان کی زندگیوں کو اسلام کے مطابق ڈھالنا اور اس کے لیے عملی جدوجہد کرنا ریاست کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ گویا ہمارا آئین اسلامی اور اسلام دشمن آرٹیکلز سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹیکل 228 کے تحت اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی ہے۔ اس کی سفارشات پر بحث کرنا اور ان کو اسمبلی میں قانون کی شکل دینا پارلیمنٹ کی ذمہ داری ہے، لیکن اس کی سفارشات سے الماریاں بلکہ کمرے بھر چکے ہیں، لیکن کوئی عملی پیش رفت نہیں ہوئی۔ لہٰذا یہ جو کسی مردِ مجاہد نے کہا تھا کہ پاکستان کا آئین منافقت کا پلندہ ہے، یہ اگرچہ ہے تو بڑی کڑوی بات لیکن صد فی صد درست ہے۔ اس آئین کو اس حالت میں اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا!



عُروۃُ الوثقیٰ

ندائے خلافت کی تاریخ گواہ ہے کہ حکمرانوں پر تنقید یا ان کی تائید کرتے ہوئے کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ کون ہے اور کیوں ہے بلکہ ہمیشہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کیا کر رہا ہے۔ حکمران کی کارکردگی کو اولاً اور ترجیحاً اسلام کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے اور ثانیاً قومی مفاد کے حوالے سے اس کا جائزہ لے کر اپنا نقطہ نظر پیش کیا جاتا ہے۔ ہمیں ملکی اور قومی حوالے سے بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے میں اس لیے بھی سہولت رہتی ہے کہ ندائے خلافت تنظیم اسلامی کا ترجمان ہے جو پاور پالیٹکس میں بذریعہ انتخابات نہ کبھی شریک رہی ہے اور نہ مستقبل میں شرکت کا ارادہ رکھتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کبھی یہ رکاوٹ پیش نہیں آتی کہ حق بات کہنے سے چونکہ فلاں طبقہ ناراض ہو جائے گا اور تنظیم اسلامی اس طبقہ کے ووٹوں سے محروم ہو جائے گی' لہٰذا حق بات کہنے سے گریز کیا جائے اسے گول مول انداز میں یا suger coated کہا جائے وغیرہ وغیرہ۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ انتخابات کو حرام سمجھتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ تنظیم اسلامی کی بنیاد وطن عزیز میں اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کے قیام کو ایک دینی فریضہ سمجھتے ہوئے رکھی گئی تھی اور بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ اور ان سے اتفاق کرنے والے تاسیسی اراکین کی سوچی سمجھی رائے تھی کہ پاکستان میں کبھی انتخابات اور جمہوری ذرائع سے اسلام کا قیام ممکن نہیں اور چونکہ ہمارا اوّلین فرض اور دینی تقاضا نظریہ پاکستان کی عملی تعبیر کے لیے جدوجہد کرنا ہے' لہٰذا ہم انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ ہم پر یہ بات واضح رہی کہ انتخابی سیاست پاکستان میں اسلام کے نفاذ کے حوالے سے ہماری منزل کھوٹی کر دے گی۔ اس لیے کہ جب اللہ اور رسول ﷺ کے فرمودات اور ووٹرز کی خواہشات میں بُعد ما تضاد پیدا ہو جاتا ہے تو انتخابی سیاست کو اوڑھنا بچھونا

بنانے والے تاویلات کے چکر میں پڑ کر اپنی آخرت کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔ پاکستان کی چھیاسٹھ سالہ تاریخ نے تنظیم اسلامی کے اکابرین کے خدشات پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور آج ہم پاکستان میں نفاذِ اسلام کے حوالے سے مسلسل پسپا ہو رہے ہیں اور نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ پاکستان کی منتخب اسمبلیوں نے جہاں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو ردی کی ٹوکریوں میں پھینکا وہاں حقوقِ نسواں جیسے صریحاً خلاف اسلام بل بطور قانون کے منظور کیے اور اسمبلیوں میں موجود اسلامی جماعتوں کے نمائندے جن میں بعض علمائے کرام بھی شامل تھے آہ و فغاں اور رو کھے سوکھے احتجاج کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ اسمبلیوں سے استعفے دینے کی دھمکی بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور ہماری اسلامی جماعتیں اسی تنخواہ پر کام کرنے پر مجبور ہوئیں۔ بہر حال تنظیم اسلامی کا موقف ضمناً تحریر میں آ گیا اصل موضوع تھا حکمرانوں کی کارکردگی پر تنقیدی اور تائیدی جائزے کا تھا۔

آج پاکستان کا پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا' مذہبی اور سیکولر سیاسی جماعتیں دائیں اور بائیں بازو کے نظریات کے حامل دانشور صرف ایم کیو ایم اور مسلم لیگ (ق) کو نکال کر سب پرویز مشرف پر آگے بڑھ بڑھ کر لعن طعن کر رہے ہیں جبکہ تنظیم اسلامی اور اس کے ترجمان ندائے خلافت پرویز مشرف کو اُس وقت سے زبردست تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں جب اس نے نائن الیون کے بعد یوٹرن لیا تھا اور امریکا کا اتحادی بن کر امارت اسلامیہ افغانستان کی تباہ و بربادی میں حصہ دار بنا تھا۔ اس حق گوئی کا مظاہرہ بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد نے پرویز مشرف سے بالمشافہ ملاقات میں بھی کیا اور بعد ازاں تنظیم اسلامی سے وابستہ ہر مقرر اور محرر نے یہ فریضہ اپنی اپنی استعداد کے مطابق ادا کیا' کیونکہ تنظیم کے نزدیک یہ قومی ہی نہیں ملی جرم تھا جو امت مسلمہ کے خلاف سرزد کیا گیا تھا۔ پھر آصف زرداری کی حکومت نے قوم اور امت کے اس مجرم کو جس عزت کے ساتھ گارڈ آف آنر پیش کرتے ہوئے رخصت کیا تھا اس پر بھی زبردست تنقید کی تھی اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسے عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے اور عبرتناک سزا دی جائے۔ فوج نے نائن الیون کے بعد امریکا سے جس طرح تعاون کیا ہم نے یہ سمجھتے اور جانتے ہوئے بھی کہ ایک فوجی کو کس طرح نظم و ضبط کا خوگر بنایا جاتا ہے اس کے ذہن میں ٹھوک ٹھوک کر یہ بات اتاری جاتی ہے بلکہ راسخ کر دی جاتی ہے کہ تمہیں صرف سننا اور عمل کرنا ہے ان کی باقاعدہ بریفنگ ہوتی ہے' اس کے باوجود امریکی اتحادی ہونے کے حوالے سے فوج کے کردار پر بحیثیت مجموعی تنقید بھی کی۔ ہم نے صاف

صاف کہا کہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کو پس پشت ڈال کر کافروں اور طاغوتی قوتوں کا آلہ کار بن کر اپنے مسلمان بھائیوں کا قتل و غارت اور ایک اسلامی برادر ملک کی تباہی و بربادی میں حصہ دار بننا جرم عظیم ہے۔ ہم نے یہاں تک کہا کہ ڈرو کہیں ہم پر اللہ کا غضب نازل نہ ہو جائے۔ اس وقت پرویز مشرف کی کرسی بڑی مضبوط نظر آ رہی تھی اور اسے امریکہ کی مکمل پشت پناہی اور علی الاعلان اشیر باد حاصل تھی۔ لہٰذا جمہوریت کے علمبردار بھی ایک فوجی طالع آزما اور وقت کے آمر کی حمایت کر رہے تھے اور کم از کم امریکہ سے تعاون کے حوالے سے تو لازماً یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے پاس کوئی دوسرا آپشن ہی نہیں ہے۔ ہر کوئی سپریم پاور کی قوت سے مرعوب بلکہ خوفزدہ تھا۔ آج کے حکمران بھی آن ریکارڈ ہیں کہ امریکا سے تعاون کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے پرویز مشرف کے خلاف آرٹیکل 6 کے تحت صرف آئین شکنی کا مقدمہ چل رہا ہے، طاغوتی قوتوں سے تعاون افغان مسلمان بھائیوں کی نسل کشی کا کوئی ذکر ہی نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ حکمران بھی اسے جرم تصور ہی نہیں کر رہے۔

بہرحال پرویز مشرف کل بھی مجرم تھا اور آج بھی ہے' لیکن ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ موجودہ وزیراعظم میاں نواز شریف پرویز مشرف کی آڑ میں فوج کے حوالے سے اپنے کچھ دیرینہ عزائم کی تکمیل چاہتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ میاں نواز شریف نے اپنے سابقہ دور حکومت میں آئین میں پندرھویں ترمیم کرنا چاہی تھی اور اس ترمیمی بل کو شریعت بل کا نام دیا تھا' جسے بعض علماء نے غیر شرعی بل قرار دیا تھا۔ اس ترمیم کا اصل مقصد یہ تھا کہ قوت اور اقتدار کے حوالہ سے وزیر اعظم کو فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی مانند بنا دیا جائے اور تمام اقتدار اور قوت کا مرکز وزیراعظم ہو۔ ہماری رائے میں وزیراعظم کی سوچ یہ ہے کہ ان کی مطلق العنانی میں حقیقی طور پر صرف فوج حائل ہے۔ اگر فوج کی قوت کو بے اثر یا ممکنہ حد تک زائل کر دیا جائے تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حکمران بن سکتے ہیں۔ لہٰذا پرویز مشرف کی آڑ میں باقاعدہ فوج کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے اور یہ خواجگان حضرات وزیراعظم کے اشارے پر پرویز مشرف کا نام لے لے کر فوج کو ذلیل و خوار کرنا چاہتے ہیں' تاکہ فوج کا مورال اس قدر گر جائے اور وہ اس قابل نہ رہے کہ کبھی ان کی حکومت کو میلی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بھارت سے ضرورت سے زیادہ دوستی کا اظہار اور پاکستان کے مالی نقصانات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھارت سے تجارت کی خواہش بھی درحقیقت اپنی فوج کو غیر اہم

کرنے کی طرف قدم اٹھانے کے مترادف ہے۔ بالفاظِ دیگر ہمیں یہ کوشش دکھائی دیتی ہے کہ فوج کو نکیل ڈال کر صرف اپنے سیاسی مقصد کی تکمیل اور اپنی سیاسی قوت میں اضافے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اگر واقعتاً سوچ کا یہی رخ ہے تو یہ پاکستان کے لیے تباہ کن ہوگا۔ فوجی قوت کے صحیح استعمال کو کس طرح ممکن بنایا جا سکتا ہے اور کرنے کا اصل کام کیا ہے؟ ہماری رائے میں یقیناً فوج کو سول حکومت کے تابع رہنا چاہیے۔ لیکن اس سے پہلے فوج کا قبلہ درست کرنا ہوگا اور فوج کا قبلہ آپ کیسے درست کر سکیں گے جب تک آپ اپنا قبلہ درست نہیں کریں گے۔ واشنگٹن کو اگر آپ بھی طاقت کا سرچشمہ تسلیم کریں گے اور سیاسی قوتوں کا محاذ بنا کر اگر آپ سمجھیں گے کہ آپ نے فوج کی قوت کو کم کر دیا ہے تو یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ واشنگٹن کو جب ضرورت محسوس ہوگی' آپ کی پشت سے ہاتھ اٹھا لے گا اور دوسری سیاسی قوتیں موقع ملنے پر آپ کی حکومت مضبوط کرنے کی بجائے اپنی حکومت قائم کرنا چاہیں گی۔ تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش میں آپ کسی وقت بھی ڈوب سکتے ہیں لہٰذا خود کو اور اس قوم کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے عروۃ الوثقیٰ کو تھامنے کی ضرورت ہے جس کے ٹوٹنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہ ہو۔ عروۃ الوثقیٰ اللہ اور رسول کے دامن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے جسے تھامنے کی ضرورت ہے۔ اسی میں آپ کا اور اس قوم کا بھلا ہے۔ یاد رکھئے' خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو فارغ کرنے کے لیے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے کردار کی ضرورت ہے۔ ان کے مثل تو ممکن نہیں لیکن کوئی شائبہ تو ہو' کوئی ادنیٰ سی جھلک تو نظر آئے۔

میاں صاحب! آپ کی یاد دہانی کے لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ آپ کئی مرتبہ اسلام کے نفاذ کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اللہ نے آپ کو تیسرا موقع دیا ہے اور یاد رکھئے جسے اللہ جتنے مواقع اور وسائل فراہم کرتا ہے ناقدری کی صورت میں گرفت بھی اتنی ہی شدت سے کرتا ہے۔ اگر آپ کی فوج سے محاذ آرائی اسلام کے حوالہ سے ہوئی تو ہم دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں گے بلکہ آپ کی قیادت میں جہاد کریں گے' لیکن اگر فوج کو صرف اس خاطر نیچا دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ آپ کے حضور کورنش بجا لائے اور آپ کے اقتدار کو ابدیت بخشی جا سکے تو آپ ہمیں اپنے دشمنوں کی صف میں پائیں گے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت بھی مقدس فریضہ ہے۔ لہٰذا ہمارا سیاسی اور عسکری دونوں قوتوں کے لیے پیغام ہے کہ "سب سے پہلے اسلام" کا نعرہ لگا کر اس عروۃ الوثقیٰ کو تھام لیں' جو واحد قابل

اعتماد اور نا قابل شکست سہارا اور ذریعہ ہے جس سے ذاتی قومی اور ملی مفادات کا تحفظ ہو گا اور جب پاکستان سے سب سے پہلے اسلام کا نعرہ بلند ہو گا اور اسے ایک حقیقت کا روپ دیا جائے گا۔ جب پاکستان کا فوجی کرائے کا نہیں اللہ کا سپاہی ہو گا' جب پاکستان کا حکمران اللہ کا بندہ ہو گا تب فوج خلیفہ کی اور خلیفہ فوج کی تقویت کا باعث بنے۔ جب سب اللہ سے ڈریں گے تو کسی کو کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔



ایں ہمہ آوردۂ تُست

صدر ضیاء الحق نے اپنے دور حکومت میں ایک موقع پر کہا تھا کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے (معاشرے کے تمام طبقات بگڑ چکے ہیں)۔ اس بات کو تیس سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ گزشتہ تیس سالوں میں آوا مزید تیزی سے بگڑا اور بگڑتا چلا گیا اور اب اس آوے کا بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ جب کوئی معاشرہ بگاڑ کی اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو ایسے معاشرے میں جوشے مکمل طور پر ناپید ہو جاتی ہے اور اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہوتا وہ عدل و انصاف ہوتا ہے۔ معاشرہ دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے۔ ایک مقتدر حلقے اور مالی لحاظ سے مضبوط اور مستحکم لوگ، یہ لوگ بھی بلاواسطہ نہ سہی بالواسطہ طور پر اقتدار کے حصہ دار ہوتے ہیں اور مقتدر لوگوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نظامِ حکومت یا طرزِ حکومت ملوکیتی ہو یا جمہوری اس سے ان کے اثر انداز ہونے میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ بادشاہت اور شہنشاہیت میں دس ہزاری' بیس ہزاری اور دوسرے وڈیرے جاگیرداران کے تخت کے پائے ہوتے ہیں اور جدید جمہوریت میں بڑے تاجر اور صنعت کار حکمرانوں کو اپنا محتاج بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جمہوری حکمران مالی وسائل کے لحاظ سے مضبوط اور مستحکم افراد یا خاندان کے کندھوں پر سوار ہو کر ہی اقتدار تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کا سارا دن بلکہ شب و روز اس جدوجہد میں گزرتے ہیں کہ وہ جسم اور جان کا رشتہ قائم رکھ سکیں یا وہ اپنی سفید پوشی قائم رکھ سکیں۔

اس پس منظر میں پہلا طبقہ ظالم و جابر نظر آتا ہے اور دوسرا طبقہ مظلوم اور مجبور نظر آتا ہے۔ ہم نے سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر یہ نہیں عرض کیا کہ پہلا طبقہ ظالم اور دوسرا طبقہ مظلوم ہوتا ہے بلکہ ''ایسا نظر آتا ہے'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ درحقیقت ہم یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ واقعتاً

آوے کا آوا بگاڑ کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ دیکھئے، ظالم کے پاس ظلم کا ارتکاب کرنے کی طاقت اور وسائل موجود ہیں اور وہ قوتوں کا بے دریغ استعمال کر کے ظلم ڈھا رہا ہے۔ ضمیر نامی کوئی شئے اخلاقیات، شرافت اور مروت اس کے ظلم میں حائل نہیں ہو رہی، معاشرے کا باریک بینی سے مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر مظلوم و مجبور عوام میں سے کوئی کسی اچانک چھپڑ پھاڑے جانے کی وجہ سے یا کسی انہونی سے مالی وسائل حاصل کر لیتا ہے یا اقتدار کی ڈیوڑھی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو وہ زیادہ بڑا ظالم ثابت ہوتا ہے۔ الا ماشاء اللہ تو ہر طبقہ کے حوالے سے کہا جائے گا۔ ویسے بھی انگریزی کا محاورہ ہے exceptions prove the rule گویا اپنا status بدل لینے والا اس لیے مظلوموں کی فہرست میں تھا کہ وہ پہلے ظلم کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ تانگے والا لفٹ کانسٹیبل کی نسبت اس لیے نرم خو اور صابر نظر آتا ہے کہ اس کے پاس دوسرا آپشن نہیں ہے۔ وجہ تسمیہ شرافت اور اخلاق کی بلندی نہیں بلکہ حالات کا جبر ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ اس پاکستانی معاشرے کی بات ہو رہی ہے جو اپنے کرتوتوں کے اعتبار سے بگاڑ کی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اگر معاشرے کے کسی قابل ذکر حصے، کسی طبقے کے دل و دماغ میں یہ بات سمائی ہوتی اور وہ دین کے حوالے سے اور آخرت میں سرخرو ہونے کے حوالہ سے نہ سہی محض اخلاقی بنیادوں پر ہی جدوجہد کر رہا ہوتا کہ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال نہ ہو سکے۔ پھر یہ کہ حصول عدل انسان کا بنیادی حق ہے اور دیانت داری اچھی پالیسی ہے، تب بھی معاشرہ کم از کم اس حال کو نہ پہنچتا جس جگہ آج کھڑا ہے۔

بدقسمتی اور کج روی کی انتہا کا اندازہ کریں کہ عوام کی عظیم اکثریت جسے ہم نے نظر آنے والا مظلوم طبقہ کہا ہے وہ مظلوموں کی فہرست سے نکل کر ظالموں کے طبقہ میں شامل ہونے کے لیے دن رات تگ و دو کر رہا ہے۔ دوسری طرف پہلا طبقہ اگرچہ عوام کا استحصال کرنے کے حوالے سے متحد ہے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ مالی وسائل حاصل کرنے اور اقتدار کو اپنے اندر مرتکز کرنے کی خواہش میں باہم دست و گریبان بھی ہیں۔ میڈیا کے ایک گروپ اور فوج کے مابین یہی کشمکش ہے بلکہ زبردست جنگ جاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زرداری حکومت کا رویہ یہ تھا کہ فوج اور میڈیا جو چاہے کریں، جتنی طاقت چاہیں حاصل کر لیں۔ فوجی وزارت چاہیں، خارجہ چلائیں، داخلی سطح پر قتل و غارت کا بازار گرم کریں، میڈیا طالبان کو ڈریکولا کی نسل ثابت کر دے۔ لیکن یہ سب کچھ صرف

اس شرط پر کہ ہمیں لوٹ مار کے لیے پورے پانچ سال چاہئیں۔ اس سے کم پر ہمارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ نواز شریف حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اگرچہ یہ تو نہیں چاہتی کہ میڈیا آؤٹ آف کنٹرول ہو جائے، لیکن وہ یہ سمجھتی ہے کہ میڈیا چاہے حکومت کے خلاف کتنا ہی شور وغوغا کر لے وہ خود تو کسی حکومت کو گرا نہیں سکتا۔ وہ اپنے شور وغوغا سے فوج کو شب خون مارنے کا موقع مہیا کر دیتا ہے۔ گویا اصل اور آخری فیصلہ کن کارروائی تو فوج ہی کو کرنا ہوتی ہے۔ لہٰذا کیوں نہ میڈیا کے ناز نخرے اٹھائے جائیں اسے اپنے ساتھ ملایا جائے اور اس قوت کے خلاف محاذ بنایا جائے جو میڈیا یا عوامی ردعمل (جس کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا میڈیا کے بائیں ہاتھ کا کام ہے) کو بنیاد بنا کر حکومت کو گھر بھیجتے ہیں۔

لہٰذا پہلا طبقہ جو فوج' حکومت اور میڈیا پر مشتمل ہے اسے اس بات کی رتی بھر پروا نہیں کہ پاکستان اور اسلام دشمن قوتیں پاکستان کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر چکی ہیں۔ امریکہ پاکستان کے ازلی اور ابدی دشمن بھارت کو اس خطے کا تھانیدار بنانا چاہتا ہے۔ وہ زبان سے پاکستان کو اپنا دوست کہتا ہے اور عملاً اپنا سارا وزن بھارت کے پلڑے میں ڈال چکا ہے۔ امریکہ وسطی ایشیا میں دخل اندازی کر کے اور افغانستان میں بیٹھ کر پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کو بروئے کار لا کر اور ایران سے اپنے تعلقات درست کر کے چین کا محاصرہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ چین کی قوت کو اس قدر محدود کر دینا چاہتا ہے کہ اس کی عالمی بادشاہت میں اور نیو ورلڈ آرڈر کی تکمیل میں وہ کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ پھر یہ کہ پاکستانی فوج کو انتہائی کمزور کر کے اور پاکستان میں بدترین حالات پیدا کر کے جب وہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگائے تو چین پاکستان کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس سنگین خطرے کا صرف ہمیں ادراک ہے، حقیقت یہ ہے کہ حکمران طبقہ (فوج' حکومت اور میڈیا) ہم سے بہتر جانتا ہے۔ امریکہ، بھارت اور اسرائیل کی خفیہ ایجنسیاں جو کچھ پاکستان میں کر رہی ہیں اور جس طرح کا نیٹ ورک وہ پاکستان میں پھیلا چکی ہیں، اس سے ہمارے یہ مقتدر حلقے اچھی طرح واقف ہیں۔ بلوچستان میں ان کی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ہم پر رعب جمانے والے یہ مقتدر حلقے امریکہ اور بھارت سے اس قدر خوفزدہ رہتے ہیں کہ شکایت زبان پر لانے کی جرأت نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ ماننے اور جاننے کے باوجود ہمارے مقتدر طبقے باہم دست وگریبان ہیں، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ دولت اور اقتدار کی ہوس نے انہیں اندھا کر دیا ہے۔ انہیں جب بیرونی خطرات سے نمٹنے کے لیے اندرونی اتحاد اور باہمی

چپقلش کو ختم کرنے کا کہا جاتا ہے تو وہ اپنی بدن بولی سے کہہ رہے ہوتے ہیں ''ہنوز دلی دوراست!''۔ اس باہمی جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے سے بھی فرصت نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام حکومتی اور نجی ادارے ملکی تحفظ اور سلامتی کے لیے ہم آہنگ ہو جائیں۔

نائن الیون سے پہلے ہم نے شاید ہی فوج سے کسی گلہ یا شکوہ کا اظہار کیا ہو، لیکن نائن الیون کے بعد کمانڈو پرویز مشرف نے امریکیوں سے مل کر جس طرح افغانستان کے عوام کا خون بہایا ہے اور جس طرح امارت اسلامیہ افغانستان کو تباہ و برباد کیا، پھر روشن خیالی کے نام سے پاکستانی معاشرت پر سمارٹ بم کے حملے کیے اور جس طرح فحاشی اور بے حیائی کو ایک ایجنڈے کے تحت ملک میں پھیلایا ہم نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور کسی ردعمل کی پروا کیے بغیر فوج کو بحیثیت مجموعی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ہم نے لال مسجد' وزیرستان اور سوات میں فوجی آپریشن کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی اور آئندہ بھی ایسی کارروائیوں کی کھل کر مخالفت کرتے رہیں گے۔ لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم میڈیا یا کسی بھی ادارے کو یہ حق دیں کہ وہ پاکستان کے جغرافیہ کی حفاظت کرنے والی فوج کو کمزور کر کے دشمنوں کے لیے تر نوالہ بنا دیں۔ ہمیں اپنے سکیورٹی اداروں کا قبلہ درست کرنے کے لیے شب و روز جدوجہد کرنا ہوگی، اس لیے کہ اگرچہ ہماری پہلی اور آخری ترجیح اسلام ہے، لیکن کسی عمارت کی تعمیر کے لیے پلاٹ کا حصول لازم ہوتا ہے، تعمیر ہوا میں نہیں کی جا سکتی۔ عالم اسلام میں افغانستان اور پاکستان یہی دو ایسے ممالک ہیں جہاں زمینی حقائق اور معروضی حالات میں نفاذِ اسلام کے قوی امکانات ہیں۔ ہم عالمی نظام خلافت کے قیام کے قائل ہیں، لیکن اس کا آغاز تو بہر حال کسی ایک مقام، ایک ملک سے ہوگا اور ہمیں ظاہر ہے اس جدوجہد کا آغاز وہیں سے کرنا ہوگا جہاں اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ جن دو طبقات کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان میں سے پہلا مفاد یافتہ طبقہ تو اس ظالمانہ نظام کا کسٹوڈین ہے۔ وہ کسی صورت اس نظام کا خاتمہ نہیں چاہے گا۔ وہ اسی نظام کو استعمال کر کے عوام کا خون نچوڑ رہا ہے۔ وہ اس جنگ میں اپنا سب کچھ جھونک دے گا۔ اگرچہ ایک داعی کی حیثیت سے ہمیں اپنی بات اُن تک بھی پہنچانا ہوگی، لیکن اصلاً اس نظام کے خلاف محروم اور مظلوم طبقہ ہی کو اٹھنا ہوگا اور اسے اپنی کمزوریوں اور محرومیوں سمیت اٹھنا ہوگا۔ یہ انقلاب ایسی جدوجہد کا متقاضی ہے جس میں خون پسینہ ایک کرنا پڑے گا۔ ہر انقلاب کو خون کی پیاس ہوتی ہے۔ خون لیے دیے بغیر نہ کوئی

انقلاب آیا ہے نہ آئے گا۔ لہٰذا مظلوم طبقہ اپنی ذات سے اٹھے اس ظالمانہ نظام کے خلاف متحد ہو کر جدوجہد کرے، لیکن سب سے پہلے اسے خود میں انقلاب لانا ہوگا، اللہ اور رسول کے آگے سرنڈر کرنا ہوگا۔ یہ ترتیب اختیار کرنا لازم ہوگا، وگرنہ ہم بھٹک جائیں گے اور بھٹکے راہیوں کو منزل نہیں ملا کرتی۔

پاکستان کی فوج نے میڈیا سے بہت کام لیا۔ قبائلی علاقوں میں فوجی کارروائیوں پر میڈیا ہی پردہ ڈالتا رہا۔ میڈیا ہی کے ذریعے ایک دنیا کے ذہن میں یہ راسخ کر دیا گیا کہ طالبان کسی ''خوفناک بلا'' کا نام ہے۔ آج فوج کی بلی فوج کو میاؤں کر رہی ہے۔ یقیناً جیو گروپ نے آئی ایس آئی پر بلاثبوت الزام تراشی کر کے انتہائی گھٹیا حرکت کی، لیکن ہم اس پر ''ایں ہمہ آوردہ تست'' کے سوا کیا تبصرہ کر سکتے ہیں۔ جب میڈیا کو بادشاہ گر بنا دیا جائے گا تو میڈیا کے حضور کورنش بجالانے سے کیسے گریز کیا جا سکے گا۔ ایک سابق کمانڈو نے ''روشن خیالی'' کا ٹارگٹ دے کر میڈیا کو آزاد کیا تھا۔ اس کی مادر پدر آزادی کے خلاف جہاد نہ کیا گیا تو یہ آزادی بالآخر ہر پاکستانی کے گلے پڑے گی۔



کارلوٹا گال کی دہائی

کارلوٹا گال کی کتاب Wrong Enemy ''غلط دشمن'' امریکا کے تھنک ٹینکس میں بڑی پذیرائی حاصل کر رہی ہے جس میں مصنفہ نے صاف صاف لکھا ہے کہ امریکا اور دوسری مہذب دنیا نے جنگ کے لیے غلط دشمن کا انتخاب کیا ہے۔ افغانستان سے جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، حقیقت میں پاکستان کے خلاف جنگ کرنا ہم پر لازم تھا۔ مصنفہ نے اپنے موقف کے حق میں کیا دلائل دیے، ابھی اس کی تفصیل میڈیا میں نہیں آ سکی، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جاننا مشکل نہیں ہے کہ مصنفہ پاکستان پر جنگ مسلط کرنا مغرب کے نقطہ نظر سے کیونکر ناگزیر سمجھتی ہے۔ حقیقت میں ایک اسلامی ریاست کا ایٹمی قوت ہونا مغرب کے پیٹ میں مسلسل مروڑ اٹھنے کا باعث بن رہا ہے۔ ہماری رائے میں جس طرح ہندو اور انگریز کی شدید مخالفت کے باوجود پاکستان کا قیام ایک معجزہ سے کم نہیں، اسی طرح ایک ایسا اسلامی ملک جو پہلے دن سے سیاسی عدم استحکام کا شکار ہو، جس کی معیشت اپنے ہی محافظوں کے ہاتھوں لٹ چکی ہو، جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ایک پسماندہ ملک کے طور پر جانا جاتا ہو اُس کا ایٹمی قوت بن جانا اور ایٹم بردار میزائل تیار کر لینا یقیناً قیامِ پاکستان سے بھی بڑا معجزہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکا' اُس کے یورپی اور دوسرے اتحادی اس معاملے میں غافل رہے اور انہوں نے اس حوالہ سے پاکستان کے راستے میں روڑے نہ اٹکائے ہوں۔ دشمنانِ پاکستان اور اسلام نے ہر ممکن کوشش کی کہ پاکستان ایٹمی قوت نہ بن سکے، لیکن اللہ رب العزت پاکستان کو ایٹمی پاکستان بنانے کے لیے کس طرح راستے بناتا رہا، اس کے لیے آیئے اس خطے کی ماضی قریب کی سیاسی تاریخ پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالیں۔

جب پاکستان کا ایٹم پروسس میں تھا تو سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کرنے کی حماقت

کا ارتکاب کیا۔ امریکا نے حالت مجبوری میں پاکستان کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ اسی دوران پاکستان ایٹم سازی میں ریڈ لائن کراس کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ امریکا کے سب علم میں تھا لیکن وہ افغانستان کے حالات کی وجہ سے مجبور تھا اور پاکستان کے ہاتھ نہ روک سکا۔ یہ ضیاء الحق کا دور تھا جب پاکستان نے لیبارٹری کولڈ ٹیسٹ کیا اور پھر نواز شریف نے 1998ء میں بھارتی ایٹمی دھماکے کے جواب میں ایٹمی دھماکہ کیا۔ ہم اپنے ماضی اور حال کے حکمرانوں کو شدید ترین نکتہ چینی اور تنقید کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ یہ تنقید ٹھوس بنیادوں پر ہوتی تھی لیکن ہم بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اگر کوئی حکمران ننانوے غلط اور برے کام انجام دیتا ہے اور ایک بھی اچھا کام کرتا ہے تو جہاں ان ننانوے کاموں پر شدید تنقید کریں وہاں کوشش کریں کہ اس ایک اچھے کام کی تعریف بھی کر دیں جو انہوں نے کیا ہو۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہی دیانت دارانہ صحافت کا تقاضا ہے۔ آج ہمارا بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم مکمل دشمنی یا مکمل دوستی میں ڈوب کر جس عدل کا دوسروں سے تقاضا کر رہے ہوتے ہیں' خود اس کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کو ایٹمی اسلحہ سے مسلح کرنے کے حوالہ سے ذوالفقار علی بھٹو' جنرل ضیاء الحق' غلام اسحاق خان' نواز شریف اور بے نظیر سب نے مثبت اور جرأت مندانہ رول ادا کیا۔ اس پر انہیں خراج تحسین پیش نہ کرنا خیانت اور بخیلی ہو گی۔

بہرحال پاکستان ایٹمی قوت بن گیا لیکن دشمنانِ اسلام نے جب ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت نائن الیون کا ڈرامہ رچایا اور افغانستان پر حملہ آور ہوا تو اس ایٹمی پاکستان کے فوجی حکمران نے ان اسلام دشمن قوتوں کے سامنے مکمل طور پر سرنڈر کر دیا۔ جب اس طاغوتی قوت نے للکار کر کہا کہ فیصلہ کرو تم ہمارے ساتھ ہو یا نہیں، اگر تم ہمارے ساتھ نہیں تو ہم سمجھیں گے کہ تم ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہو، تب ہم تمہیں پتھر کے دور میں دھکیل دیں گے۔ اس پر ہمارا جرنیل جو دن رات کہتا تھا کہ میں ڈرتا ورتا کسی سے نہیں، طاغوت کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ وہ فراموش کر بیٹھا کہ پاکستان ایٹمی قوت کا حامل ہے۔ امریکا کے سابق صدر بش نے پاکستان کو دھمکی دیتے ہوئے الفاظ جو بھی الفاظ استعمال کیے ہوں، بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ نیت اور ارادہ یہ تھا کہ اس نے پاکستان سے پوچھا تھا، فوری مرنا پسند کرو گے یا سسک سسک کر اور ذلیل و خوار کر کے تمہیں موت کے منہ میں دھکیلا جائے۔ ایک بزدل انسان نے فوری اور باعزت موت پر سسک سسک کر مرنے اور ذلیل و خوار ہونے کو ترجیح دی۔ یعنی گیدڑ کی سو سالہ زندگی اس کی چوائس تھی۔ یہاں یہ

وضاحت از حد ضروری ہے کہ ایٹمی پاکستان پر جنگ مسلط کر کے اسے مکمل طور پر تباہ و برباد کر دینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

ہم نے بات کا آغاز کیا تھا کارلوٹا گال کی کتاب سے، جس میں اس نے اپنی حکومت سے کہا ہے کہ اس نے افغانستان سے جنگ چھیڑ کر غلطی کی ہے، اسے پاکستان پر حملہ آور ہونا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دشمن چالاک اور عیار بھی ہے اور اس کے تمام طبقات اور ادارے ہمیں تباہ و برباد کرنے پر متفق اور ہم خیال بھی ہیں۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اسی کارلوٹا گال سے اگر 2001ء میں نائن الیون کے فوری بعد یہ پوچھا جاتا کہ امریکا کو کیا کرنا چاہیے تو وہ وہی کچھ تجویز کرتی جو جارج بش نے اس وقت کیا تھا یعنی افغانستان پر حملہ اور پاکستان کو دھمکیوں سے زیر کرنا۔ اب چونکہ امریکا کو افغانستان میں شکست کا سامنا ہے، لہٰذا عسکری سطح پر شکست تسلیم کرنے کی بجائے اپنی سیاسی غلطی کی نشاندہی کی جا رہی ہے، تاکہ امریکا جیسی سپریم پاور کی عسکری قوت کی شکست کا تاثر ختم کیا جا سکے اور انہیں چونکہ یقین ہے کہ جس شجاعت اور دلیری کے شاندار کارنامے جنگجو افغانیوں نے سرانجام دیے ہیں آرام پرست اور مغربی تہذیب کے دلدادہ پاکستانی ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے اور پاکستان پر حملہ نائن الیون کا حوالہ ہی دے کر کیا اور یہ عذر تراشا جائے کہ اس وقت ہم سے دشمن کے انتخاب میں غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ اصل میں تو نشانہ پاکستان کو بنانا چاہیے تھا اور نائن الیون کے حوالے سے اس بار پاکستان کے خلاف جذبات ابھارے جائیں۔ اس سے امریکی عوام کی حمایت بھی حاصل ہو جائے گی اور حکومتِ امریکا ایک ایسے اسلامی ملک کو ختم کر سکے گی، جس کی ایٹمی صلاحیت اسرائیل کی سلامتی کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہے۔

ہم نے یہ ساری تفصیل اس لیے عرض کی ہے تاکہ قارئین جان سکیں کہ دشمن کی تیاریاں اور منصوبہ بندی کیا ہے۔ ہم خود پر نظر ڈالیں تو انتشار اور افتراق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ فوج بڑی دلیری اور شجاعت سے کام لیتے ہوئے اپنے ہی قبائلی بھائیوں کو بمباری کا نشانہ بنا رہی ہے۔ تحریک طالبان فوجیوں اور سکیورٹی اداروں کے اہلکاروں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ ساری دنیا کا میڈیا اپنی اپنی فوج کا مورال بلند اور امیج بہتر بنانے میں لگا ہوا ہے۔ ہمارا میڈیا دنیا کو بتا رہا ہے کہ ہماری فوج بڑی ظالم ہے۔ حکومت اور فوج میں چپقلش ہے۔ گرانی نے عام آدمی کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے، لیکن حکومت صرف اپنے پسندیدہ لوگوں کے معاشی استحکام پر توجہ مرکوز کیے ہوئے

ہے۔ بہرحال کس کس بات کا رونا روئیں اور کتنا روئیں' معاشرہ ایک بلوے اور مار دھاڑ کرنے والے ہجوم کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ کارلوٹا گال زینی عصبیت کی دہائی دے کر امریکیوں کو پاکستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ ہمارے پاس کوئی شے ہے جس کی دہائی دے کر ہم قومی یکجہتی پیدا کر سکیں۔ زبان کا جھگڑا تو ہم نے قائداعظم کی زندگی میں شروع کر دیا تھا۔ بنگالیوں نے اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سندھی راجہ داہر کو اپنا راہنما اور لیڈر قرار دیتے ہیں اور محمد بن قاسم کو غاصب کہتے ہیں۔ بلوچوں سے مرکز کئی بار دھوکا کر چکا ہے۔ اکبر بگٹی جو کچھ بھی تھا اینٹی پاکستان نہ تھا۔ ہمارے ایک کمانڈو حکمران نے اسے ہلاک کر کے بلوچستان کو علیحدگی پسندگی کا ایک جواز مہیا کر دیا۔ پنجابیوں کی ریت ہے کہ وہ قابض اور غاصب کو جی آیاں نوں کہتے ہیں، کوئی ہو جیسا کیسا بھی ہو۔

قومیت کی نفی کر کے ہم نے ہندوستان کو تقسیم کروایا اور پاکستان بنایا۔ وہ زہر اب تریاق کا کام کیسے دے گا۔ کوئی ہے جو ہمیں سمجھا دے کہ اسلام کے علاوہ کوئی عصبیت ہمیں متحد کر سکے گی۔ کوئی کسی شے کا نام تو لے کہ یہ ہمیں قومی سطح پر متفق اور متحد کر دے گی۔ کوئی بتا دے کہ فلاں شے سب صوبوں کو یکساں عزیز ہے۔ کالا باغ ڈیم پنجاب کے لیے زندگی اور سندھ کے پی کے کے لیے موت کا مسئلہ ہے۔ کس کے دامن کو تھامیں۔ ہر شے اس قدر شکستہ اور خستہ ہے کہ چھونے سے ریزہ ریزہ ہوا چاہتی ہے۔ ہے کوئی سہارا جسے تھام کر ہم سنبھل سکیں' اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکیں۔ چلو چلو رائے ونڈ چلو' اسلام آباد چلو' ملتان چلو وغیرہ وغیرہ کی بے شمار آوازیں لگائی جا رہی ہیں۔ کہیں سے چلو چلو اسلام کی طرف چلو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف چلو کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ صدا لگانے کے لیے رہبروں کی زبان گنگ ہے اور عوام نے بھی کانوں میں روئی دے رکھی ہے۔ عوام کے کان بھی اس وقت کھلتے ہیں جب بھارتی گلوکارائیں رس گھولتی ہیں۔ وہ اس پر جھوم اٹھتے ہیں۔ کشمیر ہماری شہ رگ ہے اور بھارتی فوجیوں کے دل لبھانے والے اداکار اور اداکارائیں ہمارے آئیڈیل ہیں۔ اے کاش! ہم جان لیں سب راستے بند ہو چکے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی ہمارا حامی و ناصر نہیں' کوئی مددگار نہیں' کوئی چارہ کار نہیں لیکن اللہ کی مدد حاصل کرنے کی ایک شرط ہے صرف ایک شرط، اس کے دامن کو مضبوطی سے تھام لو۔ اسی کے ہو کر رہ جاؤ ماسوا سے بے نیاز ہو جاؤ۔ اس کے دین کو غالب کرنے کی جدوجہد کرو۔ وہ تمہارا مددگار اور پشتیبان بن

جائے گا اور اگر وہ مدد کرنے کا فیصلہ کرے تو کوئی سپریم پاور تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ تم خود سپریم پاور بن جاؤ گے۔ ایک مرتبہ آزماؤ تو سہی۔ ایک بار اس کے سامنے جھکو تو سہی۔ سب سجدوں سے آزاد ہو جاؤ گے۔ دنیاوی سہارے بہت کمزور ہیں، تنکوں سے زیادہ کمزور۔ یہ کسی کو ڈوبنے سے نہیں بچا سکتے۔ آیئے بش، اوباما اور کارلوٹا گال جیسے ان کے چیلے چانٹوں سے نمٹنے کے لیے اللہ کا سہارا حاصل کریں، اس کی کبریائی کا اعلان کریں اور یہ عہد کریں کہ رب کی دھرتی پر رب کا نظام نافذ کریں گے۔ ان شاء اللہ



نسخۂ کیمیا (قرآن سے رہنمائی)

عالمی ہوائی اڈوں پر گرین پاسپورٹ کو الگ کر دینا، پاکستانیوں کی الگ قطار بندی کرانا تو ایک عرصہ سے بہت سی وجوہات کی بنا پر تھا۔ نائن الیون کے بعد ہم پر دہشت گردی کا لیبل لگا۔ مغربی یورپ اور بعض امریکی ریاستوں میں اس طرح کے واقعات ہوئے کہ جب کسی نے اپنا تعارف بطور پاکستانی کروایا تو پاس کھڑے کچھ لوگ دور ہٹ گئے، اگرچہ نائن الیون میں کسی پاکستانی کے ملوث ہونے کا الزام بھی نہ لگا تھا۔ علاوہ ازیں کتوں کے پلے گود کھلانے والے پاکستانی صدر نے نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کو از دل و جان تعاون کا یقین دلایا تھا۔ امریکی مطالبات کو من وعن تسلیم کر کے خود امریکی انتظامیہ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ پاکستانی قوم پولیو زدہ قوم ہے۔ ہر پاکستانی کو بیرونِ ملک سفر کے لیے ایسا سرٹیفکیٹ پیش کرنا ہوگا کہ اسے پولیو کی مہلک بیماری لاحق نہیں ہے اور اینٹی پولیو قطرے پینے کی وجہ سے اسے پولیو کی بیماری لاحق ہونے کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ جب اقوام متحدہ کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ جو ملک پولیو فری نہیں ہوگا، اس پر عالمی سطح پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں اس سے پہلے پاکستان میں پولیو ٹیموں پر حملوں کے بہت کم واقعات رونما ہو رہے تھے۔ صرف آزاد قبائلی علاقوں میں ایسی باتیں گردش کر رہی تھیں کہ پولیو قطروں کے ذریعے مغرب مسلمانوں کے جسموں کو مفلوج کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ بقیہ پاکستان میں اسے ایک افواہ ہی کا درجہ دیا گیا تھا، لیکن عالمی پابندیاں لگنے کے اعلان کے فوری بعد پولیو ٹیموں کی ٹارگٹ کلنگ قطار اندر قطار شروع ہو گئی۔ پھر جب ان پولیو ٹیموں کو حکومت کی جانب سے سیکورٹی فراہم کی گئی تو ان سیکورٹی فورسز پر تابڑ توڑ حملے شروع ہو گئے۔ ایک عام پاکستانی کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ کسی بھی معاملے میں پاکستان کو

سنگل آؤٹ کرنے میں کون سا ملک ہمیشہ سے بڑا فعال اور متحرک کردار ادا کرتا چلا آ رہا ہے۔ پھر نائن الیون کے بعد اسے کن دوسری قوتوں کی حمایت بلکہ سرپرستی حاصل ہو چکی ہے۔ لہٰذا عقلی سطح پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ''ریمنڈ ڈیوس'' ٹائپ وارداتیں تھیں جو اس سٹرٹجی کا حصہ ہیں کہ پاکستان کو عدم استحکام سے دوچار کیا جائے، اسے الگ تھلگ کر دیا جائے بلکہ صحیح تر الفاظ میں اسے عالمی سطح پر اچھوت بنا دیا جائے۔

یہ درست ہے کہ یہ سب کچھ پاکستان اور اسلام کے دشمن کر رہے ہیں لیکن ہمارے لیے اہم سوال یہ ہے کہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب کیوں ہو رہے ہیں؟ ہم پاکستانی مسلسل پسپا کیوں ہو رہے ہیں؟ حالات و واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری کمر دیوار سے لگا چاہتی ہے اور طاغوتی قوتیں ہمارے خلاف گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہیں۔ دشمن قوتیں کامیابی سے آگے کیوں بڑھ رہی ہیں۔ ہماری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح چور اصل مجرم ہوتا ہے لیکن اپنے مال کی بجا طور پر حفاظت نہ کرنے والا بھی خطا کار ہوتا ہے، اسی طرح ظالم بھی اگرچہ بدترین مجرم ہے، لیکن مظلوم اگر ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرتا۔ ظلم کے سامنے ڈٹ جانے کے لیے درکار قوت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور ظالم کے سامنے سجدہ ریز ہونے میں ہی عافیت سمجھتا ہے تو وہ خود بھی اس جرم کے ارتکاب کا باعث بن رہا ہے۔ اس حوالہ سے پاکستان کا تجزیہ کریں یعنی پاکستان کا اسلحی لحاظ سے بڑی قوت بننے کا' تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے عسکری حوالہ سے قوت تو بہت فراہم کی ہے۔ ہمارے پاس دنیا کی بہترین فوج موجود ہے جو انتہائی جدید اور تباہ کن ہتھیاروں سے لیس ہے' ہم ایٹمی قوت ہیں۔ پھر ہم تھر تھر کانپ کیوں رہے ہیں؟ زمین میں گڑھے کیوں جا رہے ہیں؟ ان ہی کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہیں؟ جو دنیا بھر میں ہمیں ذلیل و خوار کر رہے ہیں' ہمیں اچھوت بنا رہے ہیں' دہشت گرد قرار دے کر پولیو زدہ قرار دے کر، یہاں تک کہ انہیں ہمارا وجود کھیل کے میدانوں میں بھی قبول نہیں۔ ہم دنیا کے لیے فٹ بال بنے ہوئے ہیں۔ جس کا جی چاہتا ہے ہمیں ٹھوکر مار کر جس طرف چاہے پھینک دیتا ہے۔ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوت کی پشت پر مذہبی اخلاقیات نہ ہوں آخرت کا تصور نہ ہو صرف دنیا پر نظر ہو تو اس کے دو متضاد نتائج برآمد ہوتے ہیں یا تو فرعون' نمرود' ہٹلر اور بش پیدا

ہوتے ہیں جو اس ریاستی قوت کو دنیا کی تباہی و بربادی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایک امریکی دانشور ہی کا قول ہے: Courage without conscience is a wild beast یعنی ''ہمت بغیر ضمیر کے ایک جنگلی درندہ ہے۔'' آج کا امریکہ اس ضرب المثل کو صد فی صد درست ثابت کر رہا ہے۔ یا پاکستانی حکمرانوں جیسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو ذاتی بدعنوانیوں اور بدکرداری کی وجہ سے اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ ان کے قلوب و اذہان پر دشمن کا خوف مسلط ہو جاتا ہے۔ جونہی وہ دنیوی قوت و وسائل کے تقابل میں خود کو کمتر محسوس کرتے ہیں تو فوراً ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔ یحییٰ خان اور پرویز مشرف نے اس کی عملی مثال پیش کی، لیکن یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے سیاسی لیڈر بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں کیونکہ ہماری عسکری اور سیاسی قیادت امریکہ ہی کو ان داتا سمجھتی ہے (معاذ اللہ) اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا سبق جو اللہ نے ہمیں روزانہ کئی بار دہرانے کا حکم دیا ہے، ہماری عظیم اکثریت اس طرف راغب ہی نہیں ہوتی اور جو یہ دعا روزانہ درجنوں مرتبہ دہراتے ہیں ان کی بھی زبان کی نوک سے معاملہ آگے نہیں بڑھتا۔ صرف اللہ ہی کے آگے جھکنا اور اللہ ہی سے مدد مانگنا دل و دماغ میں راسخ ہی نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ رب العزت دنیوی وسائل اور قوت حاصل کرنے سے منع فرماتا ہے بلکہ وہ تو اپنے کلام میں مسلمانوں کو حکم دیتا ہے: ''اور جہاں تک ہو سکے (قوت کے) زور سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے (مقابلے کے) لیے مستعد رہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں، اور ان کے سوا اور لوگوں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے، ہیبت بیٹھی رہے گی۔ اور تم جو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا ثواب تم کو پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا۔'' (الانفال:60) ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قوت کو استعمال کیا جائے لیکن بھروسا اس قوت پر نہیں بلکہ اللہ رب العزت پر کیا جائے تو اس کا استعمال نہ صرف طاغوتی قوتوں کے لیے دندان شکن ہوگا بلکہ یہ قوت غیر اسلامی دنیا کے لیے بھی امن و سکون اور خوشحالی کا باعث بنے گی۔ اسلامی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ برصغیر میں محمد بن قاسم اس کی تابناک مثال ہیں۔ قصہ کوتاہ فرد ہو یا ریاست اگر قوت ہدایت کے ساتھ ہے تو نعمت ہے اور امن و سکون کا باعث ہے اور اگر قوت بغیر ہدایت کے ہے تو لعنت ہے اور تباہی و بربادی کا باعث ہے۔

ہمارے لیے سوال یہ ہے کہ اپنی ایٹمی اور میزائلی قوت کو ہدایت کے ساتھ کیسے جوڑا جائے، اسے شیطنیت سے الگ کیسے کیا جائے، تاکہ نہ صرف یہ کہ ہم دنیا کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہونے سے بچیں بلکہ باقی دنیا کے لیے بھی رحمت وسلامتی کا باعث بنیں۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ کسی قوم کے علماء کرام اور دانشور حضرات پر منحصر ہے کہ وہ قوم کو سلامتی اور عظمت کے راستے پر ڈالتے ہیں یا تباہی و بربادی کے گڑھے میں دھکیلتے ہیں۔ بہرحال عالم ہو یا دانشور ہمارے ملک میں یہ فریضہ مثبت انداز میں ادا نہیں ہو رہا۔ ہمیں عظمت وسلامتی کے راستے پر ڈالنے کے لیے جہاد کرنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔ علماء مختلف مسالک میں منقسم ہیں۔ ان کی ترجیح اسلام نہیں، اپنا مسلک ہے۔ پھر ایک ہم مسلک مختلف جماعتوں میں منقسم ہیں۔ غیر سیاسی علماء دنیا سے لاتعلق ہو کر اپنے اپنے حجروں میں اللہ اللہ کر رہے ہیں اور انہیں کوئی غرض نہیں کہ قوم ضلالت و گمراہی کی کس حد تک پہنچ چکی ہے اور یا وہ مایوسی کا شکار ہیں۔ لہٰذا گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ رہ گئے سیاسی علماء تو وہ ووٹر کا موڈ دیکھتے ہیں اور اس کے مطابق اپنا لائحہ عمل طے کرتے ہیں۔ ان کی سیاست کا مرکز اور مدار چونکہ دینی مدارس ہیں، لہٰذا وہ مدارس کو خطرے میں محسوس کریں تو تمام اختلافات کو فراموش کر کے یکجا ہو جاتے ہیں اور اپنی ان ریاستوں کو بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، لیکن پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے نفاذ کے لیے وہ کسی تحریک کا آغاز کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس اہم ترین اور عظیم ترین فریضے کی ادائی کے لیے مل بیٹھنے سے انکاری ہیں۔ ان کی اکثریت کا ذاتی کردار بھی عوام کے لیے مثالی نہیں۔ لہٰذا عسکری قوت کو دینی اور روحانی بنیاد کیسے فراہم ہو اور یہ قوت باعث رحمت کیسے بنے اور ہمارے دانشور حضرات (الا ماشاء اللہ) مغرب سے اس قدر مرعوب ہیں کہ وہ اپنے لیے عزت وعظمت کا راستہ اُسی کی پیروی میں ڈھونڈتے ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر اور اندازِ گفتگو یہ ہوتا ہے ''آپ کے پاکستان میں یہ ہوتا ہے'' آپ کے پاکستان کی دنیا میں یہ حیثیت ہے۔'' وہ خود کو الگ تھلگ رکھ کر قوم کی برائیوں کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں اور اکثر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ حکمرانوں کی لوٹ مار میں سے حصہ وصول کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے جزیرے سے پاکستان کے حالات پر تبصرہ کر رہے ہیں اور کسی طرح بھی اس کا حصہ نہیں۔ علماء کرام اور دانشوروں کا یہ رویہ کیسے کوئی تبدیلی لائے گا، کیسے دنیا یہ سمجھے اور جانے گی کہ پاکستان کو الگ تھلگ کر دینے میں خود دنیا کا نقصان ہے۔ ہم بہت بڑی غلط

فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم میں ایمان ہے، عمل کی کمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاً کمی ہی ایمان کی ہے اور اس حقیقت کو قلم کی نوک پر لانے سے کیوں روکیں کہ ایمان ناپید نہ سہی، اس کا فقدان ہے۔ اس کا شدید بحران ہے اور اصل ضرورت دلوں میں ایمان کی بیجائی کی ہے۔ حقیقی ایمان عمل پر اثر انداز نہ ہو، یہ ممکن نہیں ہے۔ ہر وہ پاکستانی مسلمان جو دنیا میں پاکستان کا عزت و احترام چاہتا ہے اپنے دل میں ایمان کی بیجائی سے کام کا آغاز کرے۔ اگلے مراحل کے لیے یاددہانی کراتے رہیں گے۔ یاد رہے کہ ایمان قرآن سے اور صالحین کی صحبت سے ملتا ہے۔ قرآن آپ کے گھر میں موجود ہے۔ اسے پڑھنے اور سمجھنے کی بھی بھرپور کوشش کریں اگر نیت نیک اور آرزو پختہ ہوگی تو صالحین کی صحبت بھی دستیاب ہو جائے گی۔ اس نسخہ کیمیا کے استعمال سے اگلے مراحل آسان ہو جائیں گے ان شاء اللہ!



ہم سب گلوبٹ ہیں؟

کئی دہائیاں پہلے جب منیر نیازی نے کہا تھا

منیر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ!

تو اُس مایوسی میں بھی اُس نے بہر حال سفر کے طے ہونے کا اعتراف کیا تھا، اگر چہ رفتار سست تھی، لیکن کسی جمود یا ریورس گیئر کی بات نہیں کی تھی۔ آج قومی سطح پر وہ سست رفتاری بھی خواب وخیال بن چکی ہے، البتہ حرکت پہلے سے بھی کہیں تیز ہے، لیکن قوم کی نبض ڈوب رہی ہے۔ حرکت کی تیزی کا یہ عالم ہے کہ بیرونِ ملک اور دشمن تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آ رہی، ہم خود ہی اپنے ائیر پورٹس پر حملہ آور ہو کر کھڑے جہازوں کو جلا کر راکھ کرنے کے لئے جہاد کر رہے ہیں اور ہماری فضائیہ اپنے نہتے عوام اور سویلین آبادیوں پر خود ہی ٹھیک ٹھیک نشانے لگا رہی ہے۔ البتہ اس حوالہ سے US AID ڈرون کی شکل میں ہماری مدد کو پہنچ رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس جنگ میں خود کفیل ہیں۔ نوحے کہتے کہتے اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہمیں خود پر پیشہ ور نوحہ گر ہونے کا شبہ ہونے لگا ہے۔ ہمیں یا تو نوحہ کہنے میں عافیت محسوس ہونے لگی ہے یا صبر کا دامن ہمارے ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔ ہم جب چاروں طرف نگاہ دوڑا کر لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو یہ قلم خون میں نہا جاتا ہے۔ گرمی سے جھلسے ہوئے اور لوڈ شیڈنگ زدہ پاکستانی جب برسات کی آمد اور بارانِ رحمت کی توقع میں آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو آسمان اُنہیں ابر آلود تو نہیں نظر آتا جو اُن کی زمینوں پر ہریالی لے آئے، البتہ فضا میں وہ طیارے نظر آتے ہیں جو اپنوں ہی گھروں کو تہس نہس کر کے خون کی ندیاں بہا رہے ہیں۔ کس کی نظر کھا گئی ہے اُس قوم کو جس نے "لا الٰہ الا اللہ" پر اپنی

بنیاد رکھی تھی، جس کی اسمبلی نے قرار دادِ مقاصد منظور کر کے قوم کی قبلہ رخ صف بندی کی تھی، جس کے 31 جید علماء نے 22 نکات پر اتفاق کر کے اس پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیا تھا کہ کس کا اسلام نافذ ہوگا۔ اب یہ سب کچھ خواب وخیال ہو چکا ہے۔

ابھی تحریک طالبان پاکستان کی دہشت گردی اور ریاستی دہشت گردی کا سلسلہ چل رہا تھا کہ پنجاب کی شریف کشمیری حکومت نے سوچا ہم کیوں پیچھے رہیں، یہ خون کا کھیل کیا صرف قبائلیوں کے خلاف کھیلا جانا چاہیے، کیا صرف خیبر پختونخوا کی زمین سرخی مائل ہوگی! ہم لاہور میں ایسا خونی کھیل کھیلیں گے کہ کم از کم کسی سویلین دَور میں ایسی کوئی مثال پہلے قائم نہ ہوئی ہوگی۔ ہم نہتی عورتوں کے چہرے گولیوں سے مسخ کر سکتے ہیں، ہم گولیوں کی بوچھاڑ سے ہونے والے زخمیوں کو ایمبولنس میں ڈالتے وقت اُن پر لاٹھی چارج کریں گے، ہم ستر سالہ سفید داڑھی والوں کو تپتی ہوئی سڑکوں پر گھسیٹیں گے اور لاٹھی زنی بھی جاری رکھیں گے۔ اُف خدایا، ہم نے اسلام سے ہی نہیں شرفِ انسانیت سے بھی ہاتھ اٹھا دیا ہے۔ ہم پر بحیثیت قوم کس قدر درندگی اور خونخواری چھا چکی ہے۔ ہمیں مولانا طاہر القادری سے سو اختلاف ہیں، ہم اُن کے مذہبی تصور سے اختلاف رکھتے ہیں، ہم اُن کے نظریۂ انقلاب یا کم از کم منہج انقلاب سے شدید اختلاف رکھتے ہیں، ہمیں اُن کے اندازِ سیاست سے بھی اختلاف ہے۔ ہم بیرونِ ملک بیٹھ کر ریموٹ کنٹرول قیادت کو بھی صحیح نہیں سمجھتے، لیکن اس کے باوجود 16 اور 17 جون کی نصف شب کو توپ وتفنگ سے اُنہیں فتح کرنے اور اُن کے کارکنوں کو مولی گاجر کی طرح کاٹنے کا جو عمل پنجاب حکومت نے اپنے چہیتے پولیس افسروں کے ذریعے کیا ہے ہم اُس کو غیر اسلامی، غیر اخلاقی اور غیر انسانی سمجھتے ہیں، اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

خدا جانے اقتدار اور فرعونیت میں تعلق ہمارے ہاں اِس قدر گہرا اور قریبی کیوں ہے۔ بش اور اوباما ہمارے حکمرانوں کی نسبت کہیں بڑے ظالم اور درندہ صفت ہوں گے، لیکن غیروں کے لئے، مسلمانوں کے لئے۔ اپنوں کی حفاظت وہ ہر قیمت پر کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے حکمرانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ شریف ہوں یا زردار غیروں کے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں لیکن اپنوں کو گولی اور لاٹھی سے بچھا دیتے ہیں اور پھر اُن سے ووٹ بھی مانگتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو ہماری عوام کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ سادہ دلی یا رحم دلی کی بنا پر نہیں ضمیر فروش ہونے کی بنا پر پھر اُن ہی کو ووٹ دیتے ہیں۔ اور یہ یاد رہنا چاہیے کہ گلو بٹ صرف مسلم لیگ (ن) میں نہیں ہے، جب

قبائلیوں پر فضا سے موت طاری کی جارہی ہوتی ہے تو ہم سب گلوبٹ بنے ہوتے ہیں۔ کیا یہ کردار ہماری تمام سیاسی جماعتیں اور بعض مذہبی جماعتیں ادا نہیں کر رہی ہیں؟ اور بعض عاقبت نا اندیش طالبانی واردات پر تالیاں نہیں پیٹ رہے ہوتے ہیں؟ حالانکہ بلا جواز خون کی ہولی کھیلنا غلط ہے، نا جائز ہے، غیر اسلامی اور غیر انسانی ہے، کوئی بھی کھیلے، کوئی بھی انسانوں کا خون بہائے۔ البتہ یہ جائز ہی نہیں، لازم اور فرض ہے جب رزم حق و باطل ہو، جب کفر و اسلام کی جنگ ہو۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہمیں ہر اُس شخص کو مسلمان ماننا ہوگا جو کلمہ گو ہو، جو حضور ﷺ کو آخری رسول اور نبی تسلیم کرتا ہو اور جو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو ارکانِ اسلام تسلیم کرتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم پر ''خود کردہ را علاجے نیست'' جیسی ضرب المثل کا اطلاق ہوتا ہے۔ ہم نے خود تباہی کا راستہ اختیار کیا، اب جو بیج کر گندم کیونکر کاٹیں؟ ہم نے اپنی خوش بختی کو بدبختی میں تبدیل کر لیا۔ پاکستان اسلامی ممالک میں واحد ریاست تھی جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی۔ جو عمارت اپنی بنیاد سے ہٹ کر زمینی سطح پر تعمیر کی گئی وہ مضبوط اور توانا کیسے ہوتی؟ اسلامی پاکستان کا سیکولر بھارت سے الگ ہونے کا تو جواز تھا، سیکولر پاکستان کا سیکولر بھارت سے الگ ہونے کا کیا جواز تھا؟ اور اگر کسی حادثہ کے نتیجہ میں جزا اپنے کل سے جدا ہوا ہے تو حادثے کے اثرات ختم ہونے پر دوبارہ جُزا اپنے کل کی طرف لپکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بانی پاکستان قائداعظم نے تو کہا تھا کہ ہمارا صرف مذہب ہی ہندوؤں سے الگ نہیں، ہمارا طرزِ زندگی، ہماری بود و باش، ہماری ثقافت، ہمارے رسم و رواج سب کچھ الگ اور متضاد ہیں، لہٰذا ہم ہر لحاظ سے اور ہر سطح پر ایک الگ قوم ہیں۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب پاکستان اسلامی فلاحی ریاست کی بجائے محض مسلمانوں کے ملک کی ایک شکل اختیار کر گیا تو قائداعظم ثانی ہونے کے دعویدار میاں نواز شریف نے (سیفما کے پلیٹ فارم سے میاں نواز شریف کی یہ تقریر ریکارڈ میں موجود ہے) نہ صرف طرزِ زندگی، بود و باش، ثقافت اور رسم و رواج کو ایک جیسا قرار دے دیا، بلکہ مذہب کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ مسلمان اور ہندو ایک ہی خدا کو پوجتے ہیں۔ اِس پس منظر میں ہمیں پاکستان کو بھارت کے قدموں میں ڈھیر کر دینا سمجھ آتا ہے، اس لئے کہ ہر شے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے۔ قصہ مختصر ہمیں کسی کی نظر نہیں لگی، بلکہ ہم سب گلوبٹ بن کر نظریۂ پاکستان پر لاٹھیاں برسا رہے ہیں، لہٰذا اُسی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر منتشر اور بکھرے ہوئے راہوں میں پڑے ہیں جس طرح گلوبٹ کی لاٹھی نے ''منہاج القرآن'' میں کھڑی گاڑیوں کے شیشوں کو ریزہ ریزہ کر کے زمین پر بکھیر دیا۔ ✿✿✿

میاں صاحب! ابھی وقت ہے

غیر مصدقہ اور غیر مستند ذرائع سے یہ خبر آئی ہے کہ ملک کے وزیر اعظم نواز شریف نے اپنے قریبی حلقہ مشاورت میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ وہ جب بھی اقتدار میں آئے ہیں انھیں نصف مدت اقتدار بھی پوری نہیں کرنے دی گئی۔ مشاورت کے انعقاد اور اس میں ان کے سوال اٹھانے کے حوالے سے بات غلط ہے یا درست، لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ تیسری مرتبہ عوام سے ووٹ لے کر برسر اقتدار آئے ہیں۔ دو مرتبہ وہ بمشکل نصف مدت پوری کر سکے۔ پہلی مرتبہ 58-2B کی لاٹھی سے اور دوسری مرتبہ خاکی وردی اور بھاری بوٹوں والوں کے ذریعے اقتدار سے فارغ کر دیے گئے اور اب تیسری مرتبہ صرف 14 ماہ میں ان کا اقتدار کا سنگھاسن اتنی بری طرح ڈول رہا ہے کہ سنبھلتا نظر نہیں آتا۔ کل کیا ہوگا اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن فی الوقت حالات سنگین ہیں۔ آیئے، یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسا بار بار کیوں ہوتا ہے؟

ظاہری اور نظر آنے والی وجوہات میں سے ایک یہ ہے کہ وہ زمینی حالات کو سمجھ نہیں پاتے اور معروضی حالات کا جائزہ لینے میں ناکام رہتے ہیں۔ وہ حکومت کرتے ہوئے اپنے ملک کی 67 سالہ تاریخ کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ جمہوری طور پر منتخب ہوتے ہیں لیکن انداز حکومت شاہانہ بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں قوت کا مکمل ارتکاز چاہتے ہیں، جو آج کی آزاد دنیا میں ممکن نہیں۔ مثلاً اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج کو سول حکومت کے ماتحت ہونا چاہیے، لیکن دنیا بھر میں نظر دوڑائیں امریکہ اور بھارت جیسے ممالک میں بھی جہاں جمہوریت اپنے پاؤں بڑی مضبوطی سے جما چکی ہے فوج بعض معاملات میں من مانیاں کرتی نظر آتی ہے۔ ماضی قریب میں امریکہ میں پنٹاگون نے کئی مرتبہ وائٹ ہاؤس کو اپنے پیچھے چلنے پر مجبور

کیا۔لیکن وہاں یہ سب کچھ سلیقہ سے طے پا جاتا ہے۔دونوں ادارے اپنی اپنی ترجیحات کو اولیت دینے اور روبہ عمل لانے میں کوشاں رہتے ہیں لیکن ملکی مفاد کو کبھی پس پشت نہیں ڈالتے۔تنازعات اور معاملات کو کبھی ذاتیات کا مسئلہ نہیں بناتے اور ایک دوسرے کو adjust کرتے ہیں۔بھارت جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتی ہے اس کے وزیراعظم راجیو گاندھی نے پاکستان کے ساتھ سیاچین پر معاہدہ کرلیا،لیکن فوج نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔راجیو نے اپنی فوج کو سنا اور اسے اہمیت دی۔ان ممالک میں فوج بھی اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتی ہے،دباؤ کے تمام ذرائع استعمال کرتی ہے لیکن منتخب حکومت کا تختہ الٹ دینے کا وہاں کوئی تصور بھی نہیں۔نواز شریف اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ پاکستان کی 67 سالہ تاریخ میں آدھا وقت فوج نے حکومت کی ہے۔ان کی عادات میں اتنا بگاڑ آچکا ہے کہ دنوں اور مہینوں میں اصلاح ممکن نہیں۔مصلحت کا تقاضا ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے تدریج اختیار کی جائے تو ڈنڈا نہیں چلایا جاسکے گا۔

پھر یہ کہ کوئی بڑا قدم اٹھانے سے پہلے عوام میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنا ہوگا۔صورتحال یہ ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد ہر اگلا دن انھیں مزید غیر مقبول کردیتا ہے۔وزیراعظم بننے کے بعد عوام کے حالات کو قریب سے دیکھنا تو دور کی بات ہے،ان کے اپنے اسمبلی ممبران اُن تک رسائی اور ملاقات نہ ہونے کا رونا روتے رہتے ہیں۔طیب اردگان نے ناپسندیدہ جرنیلوں کو ٹھکانے لگانے سے پہلے دس سال میں ترکی کے عوام کی حالت بدل دی۔مغرب میں بھی صرف ووٹ لے لینا جمہوریت نہیں سمجھا جاتا بلکہ عوام کی خدمت جمہوری حکمران کا پہلا فرض سمجھا جاتا ہے۔محترم نواز شریف اس بات پر غور فرمائیں کہ عوام انھیں تھوک کے حساب سے ووٹ دے کر اقتدار میں لاتے ہیں،لیکن جب انھیں اقتدار سے نکالا جاتا ہے تو عوام کیا ان کا کوئی کارکن بھی ان کی حمایت میں میدان میں نہیں نکلتا بلکہ 1999ء میں تو عوام کی اکثریت نے پرویز مشرف کو جی آیاں نوں کہا اور آخری بات یہ کہ اس مرتبہ تو اکثریت حاصل کرنے کی خواہش اور لاہور کو مسلم لیگ (ن) کا لاڑکانہ ثابت کرنے کی کوشش میں انھوں نے اپنے سیاسی حریفوں کو تحریک چلانے کا موقع فراہم کردیا ہے۔

قارئین کرام!ہمارے نزدیک یہ ظاہری وجوہات ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی ریاست کو سیاسی اور معاشی استحکام کیسے حاصل ہو جس کی تعمیر اس کی اصل بنیاد سے ہٹ کر کی گئی ہے۔جس ریاست کا آئین واضح طور پر کہتا ہو کہ یہ اسلامی ریاست ہے اور اس میں کوئی قانون سازی قرآن

اور سنت کے خلاف نہیں کی جا سکتی جب کہ اس ریاست کی رگ رگ میں سود رچا بسا ہو، فحاشی اور بے حیائی سرکاری سرپرستی میں زوروں پر ہو، بددیانتی اور اقربا پروری کو جرم ہی نہ سمجھا جاتا ہو، عدالتیں انصاف مہیا نہ کر رہی ہوں، جاگیردار اور صنعت کار کسان اور مزدور پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہوں۔ یہ وہ جرائم ہیں جن کا ارتکاب یوں تو پاکستان کے ہر حکمران نے کیا ہے لیکن اس معاملہ میں بھی نواز شریف دوسرے حکمرانوں سے آگے نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ پہلی مرتبہ وزیراعظم بنے تو وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے سربراہ بھی تھے جس نے پاکستان کو اسلامی نظام دینے کا واشگاف وعدہ کیا تھا۔ میاں نواز شریف اپنے والد مرحوم میاں شریف اور اپنے بھائیوں کی معیت میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے پاس تشریف لائے تو واضح اور پکا وعدہ کیا کہ وہ ایک سال میں سود ختم کر دیں گے، لیکن اس کے برعکس عمل کرتے ہوئے ان کے دور میں سود کے خاتمے کے خلاف عدالت میں اپیل دائر کر دی گئی۔ دو دہائیاں گزر چکیں لیکن سود کا معاملہ ابھی تک لٹکا ہوا ہے۔

شنید یہ ہے (دروغ بر گردن راوی) کہ اپنی جبری جلاوطنی کے دوران انھوں نے خانہ کعبہ میں یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اب انھیں موقع ملا تو وہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کریں گے لیکن اب کی بار انھوں نے بدترین قسم کے سیکولر افراد اور اداروں سے اپنے گہرے اور قریبی تعلقات بنائے اور اسلامی جماعتوں سے کوسوں دور رہے۔ انھوں نے وزیراعظم بن کر یہ ''انکشاف'' بھی کیا کہ انھیں تو اس بار مینڈیٹ ہی بھارت سے بہتر تعلقات بنانے کے لیے ملا ہے۔ انھوں نے قائداعظم کے بیانات کی نفی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ہندو اور مسلمان کا خدا ایک ہے، رسم و رواج ایک ہیں، بود و باش ایک جیسی ہے، کلچر اور ثقافت ایک ہے۔ گویا ان لوگوں کی تائید کی جو کہتے ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان لکیر مصنوعی طور پر کھینچ دی گئی ہے اور جو ''امن کی آشا'' کی آڑ لے کر اکھنڈ بھارت کی طرف پیش قدمی کی خواہش رکھتے ہیں۔

میاں صاحب! انتہائی محترم میاں صاحب! اب بھی وقت ہے۔ یقیناً آپ کا تعلق ایک شریف مذہبی گھرانے سے ہے۔ لہٰذا لوٹ آئیں اور رجوع کر لیں، اس ہستی کا دامن تھام لیں جسے صرف ''کن'' کہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے حکم پر عملدرآمد ہو جاتا ہے، جو کائنات کا خالق اور مالک ہے، جس کے حکم کے بغیر پتا بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کا حق ہے کہ اس کی زمین پر اسی کا نظام ہو۔ یوں تو زمین کے چپہ چپہ پر اسی کا نظام نافذ اور قائم ہونا چاہیے اور جسے اس کا نظام گوارا

نہیں وہ اس کی زمین سے نکل جائے، لیکن وہ خطۂ زمین جسے حاصل ہی اس نعرہ پر کیا گیا تھا کہ یہاں اللہ اور رسول ﷺ کا دیا ہوا نظام نافذ ہوگا، وہاں اگر عملی طور پر اسلام کا انکار کیا جاتا ہے تو وہ اہل زمین سزا سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ لہٰذا میاں صاحب جرأت کریں، آگے بڑھیں اور پاکستان کے عملی طور پر مسلمان ہونے کا اعلان کر دیں۔ آپ تاجر ہیں اور یہ بہر صورت نفع کا سودا ہے۔ اولاً تو اس یوٹرن میں دنیا اور آخرت دونوں کا بھلا ہے لیکن اگر دنیا ہاتھ سے چلی بھی گئی تو دنیا بہر حال فانی ہے، اسے ایک دن داغ مفارقت دینا ہے۔ جب کہ آخرت کی جزا و سزا دائمی ہے۔ بات ایمان کی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آخرت کے انعام کے مقابلے میں پاکستان کیا ساری دنیا کا اقتدار بھی ہیچ ہے، حقیر ہے۔ پھر یہ کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا چاہنے والوں کو دنیا نے ہی رد کر دیا، جب کہ آخرت کے متوالے آسمان دنیا پر بھی ستاروں کی مانند چمکتے دمکتے رہے۔ میاں صاحب! ابھی وقت ہے اور فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے دل یا شکم؟ اگر پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست بن جائے تو یہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا۔ اِس سے عالمی سطح پر نظام خلافت کے قیام کی راہ ہموار ہو جائے گی ان شاء اللہ۔ لہٰذا میاں صاحب یہ آپ کا قومی ہی نہیں ملی اور دینی فریضہ بھی ہے۔



حلوائی کی دکان پر.....

اللہ ربّ العزت قرآن پاک کی سورۃ الانعام کی آیت 65 میں فرماتا ہے:

''کہہ دو کہ وہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک کو دوسرے (سے لڑا کر آپس) کی طاقت کا مزا چکھا دے۔ دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تا کہ یہ لوگ سمجھیں۔''

جب بھی پاکستان پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے، اور اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ ہم پر آفات قطار اندر قطار نازل ہو رہی ہیں، تو ہمارا ذہن مذکورہ بالا آیت کی طرف منتقل ہوتا ہے اور ہم اپنی تحریر میں اس کا حوالہ دیتے ہیں، جس پر دانشوروں کا ایک مخصوص طبقہ چلا اٹھتا ہے کہ کیا اللہ کا عذاب غریب دیہاتیوں ہی پر نازل ہوتا ہے اور کیا شہروں میں فرشتے بستے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں علمی سطح پر اس کا جواب تو اہل علم ہی دے سکتے ہیں لیکن عقلی سطح پر چند باتیں ہم ان حضرات کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں کہ یقیناً بر و بحر میں فساد پیدا ہو چکا ہے، یقیناً اللہ کی نافرمانی دیہاتوں میں بھی ہو رہی ہے اور شہروں میں بھی۔ لیکن اللہ ربّ العزت کی سنت ہے کہ وہ عذابِ استیصال (یعنی ایسا عذاب جو کسی قوم کی سرے سے جڑ ہی کاٹ دے) صرف اس قوم پر نازل کرتا ہے جو رسول کی موجودگی میں یعنی براہِ راست رسول کو حتمی انکار کر دے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث مبارک کا مفہوم بھی کچھ یوں ہے کہ میری امت پر کوئی ایسا عذاب نازل نہیں ہوگا جس سے اس کا مکمل خاتمہ ہو جائے۔ گویا جب قوم بحیثیت مجموعی گناہوں میں غرق ہو جائے گی تو اس کے ایک حصہ کو عذاب دے کر دوسرے کو انتباہ کیا جائے گا کہ باز آ جاؤ اللہ کی نافرمانی سے اور دین

سے انحراف نہ کرو، وگرنہ اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے۔ اس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہمیں شہروں اور دیہاتوں میں ہونے والے گناہوں کے ارتکاب کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ ہم پاکستانی مسلمان دیہاتی ہوں یا شہری، اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ ہم نے اللہ کی نافرمانی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ دیہاتیوں کو سیلاب کے عذاب کا سامنا ہے، یہ یقیناً شہریوں کے لیے انتباہ ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ عذاب سے بالکل بچے ہوئے ہیں۔ عذاب کا انداز مختلف ہے۔ شہر کے غریب اور متوسط طبقہ کا حال یہ ہے کہ وہ زندگی نہیں گزار رہے، بلکہ زندگی ان کو گزار رہی ہے، بلکہ گھسیٹ رہی ہے' بھوک اور خوف مسلط ہے۔ گھروں میں اختلاف نہیں، انتشار کی کیفیت ہے۔ بعض گھرانے تو صبح و شام میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ان ہی طبقات میں خودکشی کی شرح بہت زیادہ ہے۔ امراء سب کچھ ہوتے ہوئے ذہنی سکون سے بری طرح محروم ہیں۔ sleeping pills کے استعمال کے باوجود نیند سے محروم ہیں۔ بیٹا باپ کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے، بیٹی اپنے معاملات میں والدین کو کوئی وقعت دینے کو تیار نہیں۔ وہ دولت جو مار دھاڑ سے والدین نے اکٹھی کی تھی، اولاد اس دولت کے لیے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہے اور عدالت میں ایک دوسرے کو کٹہرے میں کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ طلاق اور خودکشی میں بے حد اضافہ معاشرے کے انتشار کی نشان دہی کرتا ہے۔ بقول شخصے خون سفید ہو چکے ہیں۔ کوئی بتائے اور عذاب کسے کہتے ہیں؟ پھر یہ کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ کسے دنیا ہی میں سزا دے کر آخرت میں نرمی اختیار کرے گا اور کسے دنیا میں چھوٹ دے کر آخرت میں شدت سے پکڑ کرے گا۔ آخرت کی المناک سزا کا آج تصور کرنا بھی انتہائی مشکل نہیں ہے۔ اللہ سب کو محفوظ رکھے۔

سیلاب کی تباہ کاریوں کے حوالہ سے یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ یہ بات بالکل درست ہے اور ہم پورے وثوق کے ساتھ شریف برادران پر لگے ہوئے اس الزام کو درست سمجھتے ہیں کہ 2003ء سے 2008ء تک کا وقفہ نکال دیں جب پرویز الٰہی پنجاب میں وزیراعلیٰ تھے، شریف برادران 1983ء سے آج تک 26 سال سے پنجاب میں حاکم ہیں، لیکن نااہلی کی انتہا یہ ہے کہ تین روز بارش ہو تو لاہور ڈوب جاتا ہے۔ اور نہ ہی پنجاب کو فلڈ سے بچانے کے لیے کوئی اقدامات اٹھائے گئے اور حد تو یہ ہے کہ جسٹس منصور کی صوبائی فلڈ کمیشن 2010ء کی سفارشات

جن کے بارے میں ماہرین کی رائے سامنے آئی تھی کہ ان سفارشات کو عملی شکل دے دی گئی تو پنجاب کو بڑے سے بڑے سیلاب سے اگر مکمل طور پر محفوظ نہ رکھا جا سکا تو اس کے نقصانات کو انتہائی کم کیا جا سکتا ہے، لیکن شریف برادران نے ان سفارشات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور جب اس کے نتیجہ میں سیلاب کی روک تھام نہ ہو سکی اور اس نے تباہی مچا دی تو ان کی بڑے بوٹ پہن کر بھاگ دوڑ کو شعبدہ بازی اور ڈرامہ بازی کے سوا کیا کہا جائے؟ اس سے فوٹو سیشن تو ہو جاتا ہے لیکن عوام جان و مال سمیت غرق ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا پنجاب کا بہت وسیع رقبہ پانی میں ڈوب چکا ہے' کئی دیہات صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں، مال مویشی بھی سیلاب کی نذر ہو گئے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں' گویا آنے والے دنوں میں مہنگائی سے لوگ مارے جائیں گے۔ جان و مال کی تباہی کا باعث بارشوں سے کہیں زیادہ وہ پانی بنا ہے جو بھارت نے بلا اطلاع چھوڑ دیا ہے۔ نریندر مودی نے ''بغل میں چھری منہ میں رام رام'' کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے ایک طرف ہمیں ڈبو دیا اور دوسری طرف سیلاب میں مدد کی پیشکش بھی کر دی، جس پر ہمارے وزیر اعظم کی بھارت سے محبت نے ایک بار پھر جوش مارا اور شکریہ کا خط لکھ مارا، حالانکہ مودی نے اپنی مدد کی پیشکش کو آزاد کشمیر تک محدود رکھا تھا، کیونکہ وہ اسے بھارت کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ بہر حال وزیر اعظم نے شکریہ کا خط لکھنا ہی تھا تو بلا اطلاع پانی چھوڑنے پر تشویش کا اظہار بھی کر دیتے، کچھ تو ہم پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی بھی ہو جاتی، لیکن شاید اس پر مودی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے جس کا رسک ہم نہیں لے سکتے۔

سیلاب کے باوجود دھرنے بھی جاری ہیں اور پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بھی جاری ہے، کوئی اپنی سیاست سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ حکومت بمقابلہ عمران خان اور قادری صاحب کے موضوع پر ہم کافی کچھ عرض کر چکے ہیں، اس مرتبہ صرف پنجاب کے دو چودھریوں کے جھگڑے کا ذکر کریں گے جو جمہوریت' آئین اور پارلیمنٹ کو بچانے کے لیے لپیٹ دیا گیا۔ چودھری اعتزاز احسن اور چودھری نثار دونوں نے ایک دوسرے کو کرپٹ کہا، دونوں نے ایک دوسرے پر لوٹ مار کا الزام لگایا۔ ایک طرف سے پوپٹواری کا ذکر آیا تو دوسری طرف سے LPG کے کوٹہ پر طعنہ زنی کی گئی۔ پھر دونوں نے مک مکا کر لیا کہ جمہوریت کو خطرہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا دونوں نے ایسی کرپشن کی تھی جس سے انہوں نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچایا تھا؟ اگر ایسا نہیں تھا تو ظاہر ہے دونوں نے

سرکار یعنی عوام کا مال لوٹا تھا، لہٰذا جس کے ہاں ڈاکہ پڑا تھا' جسے لوٹا گیا تھا اس کو لاتعلق قرار دے کر درگزر اور صلح صفائی کیسے ہوگئی؟ سرکاری مال خانے کو لوٹنے پر اعتزاز نثار کو اور نثار اعتزاز کو معاف کیسے کر سکتے ہیں؟ اس صلح سے دونوں پر عوام کا مال حلال کیسے ہوگیا؟ ایسی غیر اخلاقی حرکات پر اہل پنجاب کیا فقرہ چست کرتے ہیں، اسے تحریر کرنے کی ہم اپنے قلم کو اجازت نہیں دے سکتے ، بہر حال شائستہ زبان میں اسے کہتے ہیں ''حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ۔''

قصہ کوتاہ جمہوریت LBW ہوتے ہوتے بال بال بچ گئی' ایمپائر کی انگلی نہ اٹھی۔ ہم کس قدر خوفزدہ ہیں اس ایمپائر کی انگلی اٹھنے سے جو صرف جمہوریت، آئین اور پارلیمنٹ کو لپیٹ سکتی ہے اور کس قدر بے خوف اور نڈر ہو چکے ہیں اُس ایمپائر کی انگلی اٹھنے سے جو ساری کائنات کو لپیٹ دے، جس سے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑنے لگیں۔ جس پر تمام اگلے پچھلے کھلاڑیوں کو جمع کر لیا جائے گا آخری اور حتمی فیصلہ کے لیے۔ اس میدان میں کس کی جیت اور کس کی ہار ہوتی ہے، یہ جیت اور ہار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگی۔ آیئے اس جیت کے لیے زندگی وقف کریں، پارلیمنٹ اور دھرنے والوں کو نظر انداز کر کے۔



قصۂ آدم وابلیس

قرآن حکیم میں قصۂ آدم وابلیس سات مرتبہ آیا ہے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اللہ رب العزت جو حکیم مطلق ہے اور انسان کا جیسا وہ خیر خواہ ہے کائنات میں اور کوئی نہ ہوگا۔ پھر یہ کہ انسان کی عظمت اور اللہ کی اُس سے محبت کا اندازہ کریں کہ وہ ابلیس کو غضبناک ہو کر خطاب فرماتا ہے کہ تجھے اُس کو سجدہ کرنے میں کیا عذر مانع ہوا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ اس قصہ کو بار بار دھرانے کا مقصد یہ ہے کہ اس میں انسان کے لئے زبردست رہنمائی ہے۔ انسان کا ہیولہ تیار کرنے اور اُس میں اپنی روح میں سے پھونکنے کے بعد اللہ نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان کو سجدہ کریں۔ قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ فرشتوں پر اپنے اس ارادے کا اظہار کر چکا تھا کہ وہ کھنکھناتی مٹی سے بنائے ہوئے انسان کو زمین میں اپنے خلیفہ کی حیثیت سے بھیج رہا ہے۔ اِس پر فرشتوں نے اس تحفظ کا اظہار کیا کہ وہ زمین میں خون خرابہ کرے گا جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ لہٰذا جب اُنہیں سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ بلا چوں و چراں آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے سوائے ابلیس کے۔ گویا اُنہوں نے اپنے تحفظ کا اظہار تو کر دیا لیکن حکم پر حرف بہ حرف عمل کیا اور اپنے تحفظ کو بالائے طاق رکھ دیا۔

اسی نوعیت کا معاملہ آدم علیہ السلام کا بھی ہوا۔ اُنہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ وہ جنت میں جو چاہیں کھائیں پییں لیکن متنبہ فرما دیا کہ فلاں درخت کا پھل نہ کھائیں، اور قبل از وقت شیطان کی دشمنی سے بھی آگاہ کر دیا۔ لیکن شیطان اُنہیں ورغلانے میں کامیاب ہو گیا۔ پہلے انسانی جوڑے کو جونہی اپنی غلطی کا احساس ہوا وہ تائب ہوئے اور ایسے الفاظ میں معافی مانگی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اُسے درج کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا "اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم

کیا۔ اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کھایا تو یقیناً ہم ہوں گے خسارہ پانے والوں میں۔''
یعنی عاجزی اور انکساری سے اپنی بھول پر رجوع کر لیا۔ لہٰذا اُنہیں معاف کر دیا گیا۔ جبکہ ابلیس لعین کا رویہ مکمل طور پر اس کی ضد تھا۔ اُس نے آدم کو سجدہ نہ کر کے نافرمانی کی اور معصیت کا ارتکاب کیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حکم عدولی پر پُرسش کی تو اعتراف جرم اور اظہار ندامت کی بجائے وہ بحث و دلیل میں پڑ گیا۔ کہا، خدایا مجھے تجھ نے آگ سے پیدا کیا اور انسان کو مٹی سے اور آگ، مٹی سے افضل ہے۔ یہ عذرِ گناہ تھا۔ یہ گناہ اور جرم پر اصرار تھا، یہ تکبر تھا۔ جس پر غضب الٰہی کا ظہور ہوا اور وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔ ابلیس کی شیطنت اور تکبر جاری رہا اور اُس نے اللہ سے قیامت تک کی مہلت مانگ لی، تاکہ وہ اپنے دشمن انسان کو گمراہ کرتا رہے۔ اللہ نے اُسے یہ مہلت عطا فرما دی، تاکہ اس سے بندوں کی آزمائش بھی ہو سکے۔

یہاں ایک نکتہ کی وضاحت از حد ضروری ہے۔ ابلیس کا لغوی مطلب ہے مایوس شدہ۔ ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابلیس تو اپنے کام یعنی بندوں کو گمراہ کرنے کے حوالے سے مایوس ہوتا ہی نہیں۔ کوئی شخص زہد و تقویٰ کی کتنی ہی منازل کیوں نہ طے کر لے۔ شیطان مایوس نہیں ہوتا، بلکہ ایسے متقی اور پرہیز گار انسان پر زیادہ حملے کرتا ہے۔ دائیں بائیں آگے اور پیچھے سے آتا ہے اور ایسے ایسے وسوسے پیدا کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر انسان ان حملوں سے بچ ہی نہیں سکتا۔ تو پھر اُسے ایسا نام کیوں دیا گیا، جس کا مطلب ہو مایوس شدہ۔ وہ تو اپنی ناکامیوں پر مایوس ہوتا ہی نہیں بلکہ نئے نئے انداز سے حملہ آور ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی مایوسی اپنے حوالے سے ہے یعنی اُس کا راندۂ درگاہ ہونا حتمی اور قطعی ہے، کیونکہ اُسے یہ سزا انسان کی وجہ سے ملی۔ لہٰذا وہ انسان کا بدترین دشمن ہے ع ہم تو ڈوبے ہیں، صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

اللہ رب العزت اپنی مقدس کتاب میں قصۂ آدم و ابلیس کو بار بار دہرا کر انسان کو یاد دلاتا ہے کہ تمہیں آدم کا راستہ اختیار کرنا ہے، غلطی اور خطا کے تم پتلے ہو، لہٰذا میرا غضب محض تمہاری خطا پر نہ بھڑکے گا، ہاں تم سنبھلو، رجوع کرو اور معافی کے طلب گار بنو، میں غفور و رحیم بھی ہوں، کریم اور توّاب بھی ہوں۔ لیکن اگر تم نے ابلیس کی پیروی کی، اُس جیسا رویہ اختیار کیا، اپنے گناہ پر اصرار کیا اور ڈٹے رہے تو پھر تمہارا انجام بھی ابلیس کے ساتھ ہوگا۔ کیوں کہ ایسی روش اختیار کرنے والوں کے لیے میں جبار بھی ہوں، قہار بھی ہوں۔ اجتہادی خطا تو حضرت یونس علیہ السلام جیسے پیغمبر سے بھی

ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں پکڑ کی لیکن جب انہوں نے مچھلی کے پیٹ سے پکارا (ترجمہ) ''تیرے سوا کوئی معبود نہیں' پاک ہے تیری ذات اور میں خطاواروں میں سے ہوں'' تو اللہ نے آپؑ کی توبہ قبول فرمائی اور مچھلی نے اُنہیں ساحل پر اُگل دیا۔ اللہ نے صحت عطا فرمائی اور آپؑ توانا ہو گئے۔

معاشرہ' قوم اور ملت افراد کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ مسلمانانِ برصغیر نے اللہ سے وعدہ کر کے ایک خطۂ زمین حاصل کیا تھا کہ ہم پاکستان کے نام سے ایک اسلامی فلاحی ریاست بنائیں گے اور اسلام کے چہرے پر دورِ ملوکیت میں جو پردے پڑ گئے تھے، اُنہیں ہٹا کر اسلام کا حقیقی، بے داغ اور روشن چہرہ دنیا کو دکھائیں گے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اہل پاکستان محض گفتار کے غازی ثابت ہوئے۔ اُن کے کردار اور افعال میں اسلام دور دور تک نظر نہ آیا۔ اُنہوں نے محض نعرہ بازی سے اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کی لیکن اس کا فیصلہ تو وہ پندرہ سو سال پہلے اپنی آخری مقدس کتاب میں سنا چکا تھا جو لوگ اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں حقیقت میں وہ صرف خود کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ ہم اس دھوکا بازی میں ستر سٹھ سال گزار چکے ہیں۔ ہم اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی رجوع کرنے کی سنت کو اپنا نہیں رہے بلکہ اپنے بدترین دشمن ابلیس لعین کی طرح بحث وتمحیص' دلیل اور تاویل میں پڑ گئے ہیں۔ ہم نے کج روی اختیار کر لی۔

جب پاکستان چوبیس سال کا تھا تو اللہ نے اہل پاکستان کو جھنجھوڑا۔ ایک کوڑا اُن کی پیٹھ پر مارا۔ شاید کہ یہ سنبھل جائیں۔ لیکن اس کاری ضرب کے باوجود ہم نے لوٹنے سے اور صراطِ مستقیم پر آنے سے انکار کر دیا۔ اپنی پرانی روش اور طور طریقے جاری رکھے۔ لہٰذا ہم پر ذلت ومسکنت مسلط ہونا شروع ہو گئی۔ ہم ایٹمی قوت ہیں لیکن خوف سے لرزتے رہتے ہیں۔ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے۔ ہمارا پڑوسی دشمن ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری زمینوں کی بنجر کر رہا ہے لیکن ہم میں اس کا ہاتھ روکنے کی ہمت نہیں' لہٰذا ہم پر بھوک کا خوف بھی مسلط ہے۔ دین اسلام کو اپنی قومیت کی جڑ اور بنیاد تسلیم کرنے سے انکار کیا تو خلا پیدا ہو گیا، جسے صوبائی' علاقائی اور لسانی تعصب نے پُر کیا۔ قرآن وسنت سے دور ہوئے تو فتنوں نے سر اٹھایا۔ فرقہ واریت نے سوچ اور فکر میں زہر بھر دیا۔ عقل وفہم پر جوش اور دیوانگی غالب آ گئی۔ ہم صبر وتحمل کا دامن چھوڑ بیٹھے اور ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگے۔ ہمارے سر کی آنکھیں موجود اور ظاہراً روشن ہیں لیکن ہمیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ اس لیے کہ دل کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔ ہم باطنی بصیرت سے محروم ہو چکے ہیں۔

اس پس منظر میں کوئی جزوی اصلاحی کوشش ہماری ناؤ کو ڈوبنے سے بچا نہیں سکتی۔ کوئی احتجاج کوئی، مارچ یا محدود مطالبات پر دھرنا چھوٹی موٹی تبدیلیاں تو لا سکتا ہے، وقتی طور پر VIP کلچر پر اثر انداز تو ہو سکتا ہے لیکن ہمارے مسائل کلیتاً حل نہیں کر سکتا۔ اپنی نظریاتی بنیاد سے ہٹ کر پاکستان اپنے وجود کا جواز کھو چکا ہے اور یقین کیجیے، ہماری مٹھی سے ریت کی طرح کھسک رہا ہے۔ ابھی وقت ہے اس کو سنبھال لیں' اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی سنت کو اپناتے ہوئے رجوع کر لیں' ابلیس کو اپنا دشمن جانتے ہوئے اللہ کی پناہ حاصل کر لیں' اُس کی شر انگیزی سے صرف اللہ ہی بچا سکتا ہے۔ یاد رکھیں، گیا وقت ہاتھ آتا نہیں۔ آگے بڑھیں خود پر اسلام نافذ کریں اور معاشرے اور ریاست میں اسلام کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلام کا قلعہ بنا کر طاغوتی قوتوں کے خلاف ڈٹ جائیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی سلامتی کا یہی ایک راستہ ہے۔



گو نظام گو!

ڈی چوک اسلام آباد میں دو ماہ سے ایک سیاسی جماعت اور ایک مذہبی سیاسی جماعت نے دھرنا دیا ہوا ہے۔ دونوں جماعتیں الگ الگ لاہور سے لانگ مارچ کرتی ہوئی اسلام آباد پہنچیں۔ اسلام آباد میں الگ الگ ڈیرے جمائے۔ ایک جماعت کے قائد عمران خان ہیں اور دوسری کے قائد ڈاکٹر طاہر القادری۔ دونوں روزانہ کی بنیاد پر اپنے اپنے پلیٹ فارم سے اہل دھرنا سے خطاب کرتے ہیں جو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پاکستان اور پاکستان سے باہر وسیع حلقوں میں سنا جاتا ہے۔ عمران خان تبدیلی کی بات کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں جو بنیادی تبدیلی کے لیے ایک اصطلاح ہے۔ البتہ ایک واضح فرق تھا۔ عمران خان موجودہ جمہوری نظام میں رہتے ہوئے صاف اور شفاف انتخابات کے ذریعے برسر اقتدار آ کر تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب اگرچہ خالصتاً کسی اسلامی نظام کی بات تو نہیں کر رہے تھے۔ البتہ اس نظام کو فرسودہ اور بے ہودہ کہتے ہوئے اسے زمین بوس کر کے خامیوں اور برائیوں سے مبرا ایک نیا نظام چاہتے ہیں جو انقلابی جدوجہد سے لایا جائے گا۔ فی الحال تو وہ خارجی سطح پر یعنی معاشرے میں یا ریاست کی سطح پر تو کوئی انقلاب نہیں لا سکے البتہ ایک داخلی انقلاب رونما ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنی جماعت کو انتخابی جماعت بناتے ہوئے آئندہ انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا ہے۔ گویا دوران دھرنا کنٹینر میں ہی انقلابی سے انتخابی ہو گئے ہیں۔ لیکن ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔ انقلاب اور انتخاب کے درمیان اُن کی آمد و رفت پہلے بھی کئی بار ہو چکی ہے۔ البتہ عمران خان اپنے پہلے دن والے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ نواز شریف استعفا دیں، 2013ء کے انتخابات کا آڈٹ ہو اور دھاندلی ثابت ہونے پر دوبارہ انتخابات کروائے جائیں۔ لیکن ہدف کے حصول کے لیے انہوں

نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی کی ہے۔اب وہ پاکستان کے بڑے شہروں میں جلسے کر کے موجودہ حکومت کے خلاف عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے مہم چلائیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ انتہائی مختصر نوٹس پر انہوں نے مختلف شہروں میں انتہائی کامیاب جلسے کیے ہیں، جس سے اُن کی تحریک کو تقویت پہنچی ہے اور دھرنے کی طوالت میں جو ایک کمزوری یا محتاط الفاظ میں بوریت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی وہ کسی حد تک دور ہوئی ہے اور پاکستان تحریک انصاف کے کے کارکن جو تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے اُن کا حوصلہ بڑھا ہے۔

دو ماہ سے ملکی سطح پر یہ جو ہلچل مچی ہوئی ہے اس پر تنظیم اسلامی کے احباب اور کرم فرما دو انتہائی نوعیت کے نظریات و خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے تنظیم کو مکمل طور پر لاتعلق رہنا چاہیے۔ نہ تنظیم کے قائدین کی تقاریر میں ان سیاسی اور مذہبی شعبدہ بازوں کا ذکر ہونا چاہیے اور نہ تنظیم اسلامی کے ہفت روزہ و ماہانہ ترجمان ندائے خلافت اور میثاق میں بھی اس کے بارے میں کوئی تحریر ہونی چاہیے اور اگر تنظیم اسلامی ان حالات پر کوئی تبصرہ کر رہی ہے جس سے کسی کی تحسین یا تنقیص کا پہلو اجاگر ہوتا ہے یا فریقین کو کوئی مشورہ دیا جاتا ہے تو یہ گویا تنظیم اسلامی کا اپنے بنیادی فکر اور اسلامی انقلاب کے لیے اختیار کیے جانے والے لائحہ عمل سے دستبردار ہونے کے مترادف ہے۔ دوسری انتہائی رائے یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کے فکر کے مطابق پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ میں چاہے کسی مرحلے میں سہی بالآخر دھرنے دینے اور نظام کو مفلوج کرنے کا ذکر ہے تو آج ڈاکٹر طاہر القادری اور کسی حد تک عمران خان بھی اگر یہ کام کر رہے ہیں تو تنظیم اسلامی آگے بڑھ کر اُن کا ساتھ کیوں نہیں دیتی، تاکہ جلد از جلد اس فرسودہ نظام سے چھٹکارا پایا جا سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں قسم کے متضاد اور انتہائی نظریات رکھنے والے ان حضرات نے تنظیم اسلامی کے قریب ہونے اور اس کے خیر خواہ ہونے کے باوجود بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی تقاریر و تحاریر کو سرسری پڑھا اور سنا ہے۔ سنجیدگی اور گہرائی سے اس پر توجہ نہیں دی۔ خصوصاً اُن کی معرکہ آرا کتب ''منہج انقلاب نبوی ﷺ'' اور ''رسول انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب'' کا مطالعہ کرنے کے لیے وقت نہیں نکال سکے۔ نہ انہوں نے تنظیم اسلامی کے بنیادی لٹریچر ہی کو غور سے پڑھنا گوارا کیا ہے اور شاید امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید کے خطباتِ جمعہ اور مختلف مواقع پر کی گئی تقاریر پر بھی غور نہیں فرمایا۔ بہر حال یہ ہمارا قومی، ملی اور دینی فریضہ ہے کہ ہم انہیں

تنظیم اسلامی کے حقیقی موقف سے آگاہ کریں۔ ہم اِس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان حضرات کے سامنے اصل صورتِ حال اور تنظیم کا موقف صحیح طور پر سامنے نہ آنے میں ہماری کوتاہی اور غفلت کا بہت بڑا دخل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرات جو یہ سمجھتے ہیں کہ تنظیم اسلامی کو اس ساری کشمکش اور سیاسی ہلچل سے الگ رہتے ہوئے آنکھیں بند کر کے اپنے فکر کے مطابق اپنے طریق کار پر کاربند رہنا چاہیے اور ان معاملات پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ یا ان کا تذکرہ یا کوئی مشورہ دینا گویا اپنے لائحہ عمل کو ترک کرنے کے مترادف ہے۔ اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ آپ کی بات کا وہ حصہ بالکل درست ہے کہ تنظیم کو پورے عزم کے ساتھ اپنے فکر کے مطابق اپنے طے شدہ راستہ پر گامزن رہنا چاہیے۔ یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن آنکھیں بند کر کے یا ملکی حالات سے بالکل لاتعلق ہو کر نہیں اور نہ یہ درست ہی ہے کہ کسی ہنگامے یا ہنگاموں کی وجہ سے ملکی سلامتی شدید خطرات سے دوچار بھی ہو جائے تو ہمارا رویہ یہ ہو کہ پاکستان جائے بھاڑ میں ہمیں کیا، ہمیں تو اقامت دین کی جدوجہد کرنا ہے۔ یقیناً ہمیں اقامت دین کی جدوجہد کرنا ہے، لیکن جس خطۂ زمین میں ہم پیدا ہوئے ہیں ہمارا اولین فرض تو یہی ہے کہ اقامت دین کے لیے اسے ٹارگٹ کریں۔ سوال یہ ہے کہ جس جگہ کو ہمیں اسلام کے قلعہ میں تبدیل کرنا ہے کیا اس کی بقا اور سلامتی سے ہمارا کوئی تعلق ہونا چاہیے یا نہیں اور اگر معاملات اتنے بگڑ رہے ہوں کہ جس ریاست کو ہم اسلامی فلاحی ریاست بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں وہ خطہ زمین ہی کسی اسلام دشمن کافر ریاست کے قبضہ میں جاتا نظر آئے تو کیا ہمیں مکمل خاموشی اختیار کیے رکھنی چاہیے۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کینسر کے مریض کو یکلخت 105 ڈگری بخار ہو جائے تو ڈاکٹر وقتی طور پر اُس کے کینسر کو فراموش کر کے اس کے ٹمپریچر کو فوری طور پر ڈاؤن کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس لیے کہ مریض بخار سے ہی مر گیا تو کس کے کینسر کا علاج کریں گے۔ پاکستان کا کینسر یقیناً غیر اسلامی نظام ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کا دشمن نظام یقیناً پاکستان کا کینسر ہے اور اس کا صرف اور صرف علاج ملک کو حقیقی اسلامی فلاحی ریاست بنانا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صد فی صد درست ہے کہ سیکولر نظام اور طرزِ حکومت میں پاکستان میں آپ اچھی سے اچھی دیانتدار اور انتہائی کوالیفائیڈ قیادت لے آئیں، شفا کبھی پاکستان کا مقدر نہیں بن سکے گی۔ لیکن اسلامی نظام کے قیام تک اِس پاکستان کو زندہ رکھنے کی بھی تو جدوجہد کرنا ہو گی۔ آپ نے ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے سنا ہو گا کہ بنی اسرائیل کے پیغمبر

سیاست میں حصہ لیتے تھے۔ سیاست کی دو قسمیں ہیں: (1) نظریاتی سیاست (2) عملی سیاست۔ پھر عملی سیاست کے دو حصہ ہیں: احتجاجی سیاست اور انتخابی سیاست۔ ہم نے انتخابی سیاست کو اپنے لیے شجر ممنوعہ قرار دیا ہوا ہے لیکن نظری اور احتجاجی سیاست میں حصہ لینا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ تبصرے، مشورے اور اظہار خیال یہ نظری سیاست ہے۔ احتجاجی سیاست ہمارے فکر کے مطابق آخری انقلابی مراحل میں شروع ہوگی۔ اِس وقت ہم صرف نظری سیاست کر سکتے ہیں۔ ان تبصروں اور مشوروں کے ساتھ ہم اپنے فکر کے عین مطابق یہ رول ادا کر رہے ہیں۔

جہاں تک اُن حضرات کا تعلق ہے جن کی رائے میں چونکہ تنظیم اسلامی نے بھی آخری مراحل میں نظام کو مفلوج کرنے کے لیے دھرنا یا دھرنے دینے ہیں، لہٰذا وہ ان دو حضرات کے ساتھ دھرنوں میں کیوں نہیں مل جاتے۔ ان حضرات کی خدمت میں خاص طور پر ہماری گزارش ہے کہ خدارا وہ ''منہج انقلاب نبویؐ'' یا ''رسولؐ انقلاب کا طریق انقلاب'' کا سرسری ہی مطالعہ کر لیں۔ تنظیم کے بنیادی لٹریچر کو ایک نظر ہی دیکھ لیں۔ بہرحال ان حضرات کی خدمت میں ہم مختصر ترین الفاظ میں دین کی دعوت رکھ دیتے ہیں۔ ہمارا پہلا فرض ہے کہ ہم خود پر اور اپنے زیر کفالت اہل خانہ پر اسلام کو نافذ کریں۔ اپنی ذات کو شریعت کے دائرے میں لائیں۔ اسی کی دعوت ہم دوستوں، عزیز و اقارب اور اہلِ محلّہ کو دیں۔ یہ کوئی جماعتی فریضہ نہیں، دینی فریضہ ہے۔ اِسی فریضہ کو ادا کرنے کے لیے رفقاء تنظیم نے خود کو ایک لڑی میں پرویا، اِس لیے کہ جماعت پشت پر ہو تو اس فریضہ کی ادائی میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اس جماعت نے اولاً پاکستان میں دین اسلام کے نفاذ کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ تجربہ نے بتایا کہ یہ نہ بُلٹ سے ممکن ہے اور نہ بیلٹ سے، بلکہ اس کے لیے انقلابی لائحۂ عمل اختیار کرنا ہوگا۔ اب مسلمان اگر انقلاب کے لیے نبی اکرم ﷺ کے طریق کے علاوہ کسی اور طریق پر غور کرتا ہے تو اُس سے بڑا احمق اور جاہل کون ہوگا۔ قرآن و حدیث سے ہمیں نبویؐ انقلاب کے مراحل نظر آتے ہیں، وہاں ہمیں نظریہ کی تشہیر، جماعت کا قیام، پھر ساتھیوں کی تربیت اور اہم ترین بات اِس دوران، ہر صورت اور ہر ظلم کے جواب میں ہاتھ باندھ کر رکھنا نظر آتا ہے (یہ انسانی حوالہ سے مشکل ترین مرحلہ ہے) اسے صبر محض کا نام دیا گیا ہے۔ انقلاب کے حوالہ سے اگلے مراحل میں ہمیں اُس دور میں کھلم کھلا جنگ نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ وہاں کافر اور مسلمان کا مقابلہ تھا۔ علاوہ ازیں اُس دور میں طاقت کا توازن کچھ نہ کچھ اور کسی نہ کسی درجہ میں تھا جواب بالکل درہم برہم ہو چکا ہے۔ لہٰذا آج کے دور کی جنگ چونکہ مسلمان

بمقابلہ مسلمان ہے اور طاقت میں عدم توازن ہے، لہٰذا انقلابی مسلمان حکومتی مسلمان کی گردن نہیں مارے گا بلکہ حکومت کو دھرنوں کے ذریعے مفلوج کرے گا۔ خدارا ذرا نگاہ اٹھا کر اسلام آباد کے دھرنوں کو تو دیکھیں کیا اوپر بیان کی گئی کوئی شرط کسی درجہ میں بھی پوری کی گئی ہے۔ کسی جسم پر آپ کو اسلام نافذ ہوا نظر آتا ہے الا ماشاء اللہ۔ مذہبی رہنما کی تقریر مغرب کی نماز سے پہلے شروع ہوتی ہے اور عشاء کے بعد تک جاری رہتی ہے۔ وہاں ہاتھ باندھنا دور کی بات ہے دست درازی کی تلقین ہوتی ہے اور پولیس والوں کی وہ درگت بنتی ہے کہ اللہ پناہ میں رکھے اور کنٹینر سے باقاعدہ اس کی تلقین ہوتی ہے۔ فریق مخالف پر طعن کی جاتی ہے' ان کا استہزا کیا جاتا ہے' ان پر جھوٹے سچے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ خدارا ذرا سوچئے تو سہی، ایسے انقلاب کا تنظیم اسلامی ساتھ دے جہاں پہلے اِس نظام پر لعنت بھیجی جاتی ہے اور انقلاب کے ذریعے موجودہ نظام کو تہہ و بالا کرنے اور زمین بوس کرنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں پھر یکدم یہ انقلاب برپا ہو جاتا ہے کہ عوامی تحریک انتخابات میں حصہ لے گی۔ ظاہر ہے اسی نظام کے تحت جس پر لعنت بھیجی جا رہی تھی۔ ہمارے اپنے احباب اور کرم فرماؤں سے یہ درخواست ہے کہ سیاہ و سفید اور شب و روزِ روشن میں فرق کریں۔ کسی سستی سی دھات پر سنہرا رنگ کر دینے سے وہ سونا نہیں بن جاتی۔

آخر میں ہمیں اپنے احباب کے سامنے یہ درخواست کرنی تھی کہ جب ہم ان سیاسی انتخابی پہلوانوں میں سے کسی کی کسی پہلو سے تحسین کر دیں تو وہ دوسرے ایسے ہی کسی پہلوان کا تقابل کرتے ہوئے ہوتی ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہم اُس فرد یا جماعت کے طریق کار اور لائحہ عمل کو درست سمجھ رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سو میں سے ننانوے غلط کرنے والا بھی اگر ایک کام صحیح کرے تو جہاں اس کے ننانوے کاموں کی شدت سے مذمت کرنی چاہیے، اس کے ایک اچھے کام کی تعریف کرنا بھی حق ہے اور یہ حق ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اس تحسین یا تنقیص کے باوجود ہم اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے صرف اور صرف منہج انقلابِ نبوی کو صراط مستقیم سمجھتے ہیں۔ اور اِسے اپنائے رکھیں گے، باقی سب کج راہی اور گمراہی ہے۔ یہ ہماری رائے نہیں، ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ آخر میں ہم پھر اس خواہش کا اعادہ کریں گے کہ تنظیم کے لٹریچر خصوصاً منہج انقلابِ نبویؐ اور رسولِ انقلاب کا طریقِ انقلاب اور امیر تنظیم اسلامی کے خطباتِ جمعہ اور بیانات کو غور سے پڑھیں اور سماعت فرمائیں۔ ہمارا دینی فریضہ ہے کہ اِس پیغام کو گھر گھر پہنچائیں اور پھر ہر گھر سے صدا آئے ''گو نظام گو!''



محرم الحرام میں دو عظیم شہادتیں

محرم الحرام کا مہینہ حرمت والے اُن چار ماہ میں شامل ہے جن کے تقدس کے عرب قبل از اسلام یعنی دورِ جاہلیت میں بھی قائل تھے اگر چہ گروہی مفادات کی تکمیل کے لئے اُن میں الٹ پھیر کرتے رہتے تھے۔ اللہ کے آخری رسول ﷺ نے ان میں تغیر و تبدل کو سختی سے روک دیا۔ ہجری سال کا باقاعدہ کیلنڈر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ترتیب پایا اور اس کا آغاز مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت سے کیا گیا۔ محرم ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے جس کے 1435 سال مکمل ہو چکے اور 1436 ہجری سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ انتہائی افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ آج کا نوجوان ہی نہیں بلکہ بڑے بوڑھے بھی عیسوی سال سے اس طرح منسلک ہوئے ہیں کہ ہجری سال سے قطعی طور پر لاتعلق ہو چکے ہیں۔ اسلامی سال کی تاریخ اور ماہ تو دور کی بات ہے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا ہجری سال ہے۔ عیسوی سال کے بارہ (12) ماہ کے نام چھوٹے چھوٹے بچوں کو ازبر ہیں لیکن اسلامی مہینوں کے نام سے اکثریت ناآشنا ہے۔ ہم عیسوی سال، تاریخ اور ماہ وغیرہ کے استعمال کو غلط یا ناجائز ہرگز نہیں سمجھتے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسلامی تاریخوں اور ماہ و سال سے لاتعلقی ہی اختیار کر لیں۔ ایک وجہ یقیناً یہ ہے کہ عیسوی کیلنڈر چونکہ شمسی اور ہجری کیلنڈر قمری ہوتا ہے اور مستقبل کے پروگراموں میں عیسوی تاریخ کا تعین آسان ہے۔ بہر حال ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بھی مغربی تہذیب کے تسلط اور مسلمانوں کی ذہنی اور سماجی و ثقافتی مرعوبیت کا نتیجہ ہے کہ اُنہوں نے خود کو اسلامی کیلنڈر سے بالکل منقطع کر لیا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تمام مسلمان خصوصاً ندائے خلافت کے قارئین خود کو اسلامی کیلنڈر سے بھی جوڑیں۔

اسلامی تاریخ میں محرم الحرام میں دو عظیم شہادتیں ہوئیں۔ مرادِ رسول حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یکم محرم الحرام کو جامِ شہادت نوش فرمایا اور دس محرم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کے جگر گوشہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے شہادت کا رتبہ پایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں عظیم المرتبت ہستیاں تھیں اور دونوں نے فی سبیل اللہ شہادت پائی۔ اگرچہ خارجی پروپیگنڈا اور اقلیتی مسلک کے اصرار پر عوامی سطح پر محرم الحرام کو صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت سے جوڑ دیا گیا، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے یہ دونوں چمکتے دمکتے ستارے ہیں جن کی روشنی کو مدھم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ بدری صحابی تھے، خلیفۂ دوئم تھے، عشرہ مبشرہ میں سے تھے، پھر یہ کہ آپؓ یکم محرم کو شہید ہوئے تھے، اس لئے ہم اُن کا پہلے ذکر کریں گے، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب جوان ہوئے تو اسلام جزیرہ نمائے عرب میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکا تھا اور آپؓ نے شہادت کا اعزاز چونکہ دس محرم الحرام کو پایا، لہٰذا اُن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عظمت کے اسلام کے دشمن بھی قائل ہیں، یعنی جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ مغرب کا مؤرخ تسلیم کرتا ہے کہ اگر اسلامی تاریخ میں ایک عمر رضی اللہ عنہ اور ہوتا تو آج ساری دنیا مسلمان ہوتی۔ حضرت عمر ہی کے بارے میں سردار الانبیاء والرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا۔'' اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے بارے میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شیطان وہ راستہ چھوڑ دیتا ہے جس پر عمر ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مرادِ رسول بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے دعا کی تھی کہ ''اے اللہ! عمرو بن ہشام یا عمر بن خطاب میں سے ایک کو میری جھولی میں ڈال دے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دس سالہ دورِ حکومت میں اسلامی سلطنت 22 لاکھ مربع میل تک پھیل گئی۔ ایک تازہ تحقیق کے مطابق آپؓ نے 36 عدد ایسی achievements کیں جو آپ سے پہلے نہ کی گئی تھیں یا اُنہیں ادارہ جاتی شکل نہیں دی گئی تھیں، جن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔ بیت المال کو آپؓ نے ایک منظم ادارہ کی شکل دی، مسلمانوں ہی کی نہیں غیر مسلموں کی حاجات بھی اُس سے پوری کی جاتی تھیں۔ لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کے لئے قاضی عدالتیں پہلے بھی تھیں، لیکن یہ عارضی اور ہنگامی نوعیت کی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ عدالتی نظام قائم کیا اور قاضیوں کی تقرری حکومت کی ذمہ داری ٹھہری۔ پوسٹل سروس کا باقاعدہ اجرا کیا۔ محکمہ لینڈ ریونیو قائم

کیا گیا۔ مردم شماری کا آپؓ نے آغاز کیا۔ باقاعدہ جیلوں کا قیام ہوا۔ نہریں اور پل بنائے گئے۔ آپؓ نے پہلی مرتبہ کوڑے کو سزا کے لئے استعمال کیا۔ الہجرہ کیلنڈر کا آغاز ہوا۔ ریاست کو صوبوں میں تقسیم کیا گیا اور مفتوحہ علاقہ کو صوبہ کا درجہ دیا گیا۔ آپؓ نے کوفہ، بصرہ جیسے نئے شہر بسائے۔ آپؓ نے سمندری خوراک پر زکوٰۃ نافذ کی اور زکوٰۃ کی سرکاری وصولی کے لئے باقاعدہ ایک نظام قائم کیا۔ آپؓ نے خفیہ رپورٹیں حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ دوسرے صوبوں میں کیا ہو رہا ہے۔ شعر و شاعری میں عورتوں کے نام کا استعمال بند کر دیا گیا۔ تراویح کا باقاعدہ نظام قائم کیا۔ مختلف صوبوں میں ملٹری سٹریٹجک پوائنٹس بنائے۔ محکمہ پولیس کا آغاز کیا۔ عوام سے براہ راست رابطہ کے لئے راتوں کو گشت کرتے۔ قیمتوں کو کنٹرول کرنے کا ریاستی نظام بنایا۔ آپؓ نے مسجد الحرام میں پہلی توسیع کی۔ آج اگر پاکستان کے حکمران حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول پر غور کریں کہ ''فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو مجھ سے جوابدہی ہوگی'' ذرا تصور کریں آج بھوک کے ہاتھوں مجبور خودکشیاں کرنے والے جب اپنا مقدمہ اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کریں گے تو ہمارے یہ حکمران کیا جواب دیں گے!

یہ آپؓ کے وہ کارہائے نمایاں ہیں جن میں سے ہر ایک پر طویل بات کی جا سکتی ہے۔ آخری اور اعلیٰ ترین اعزاز کی بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے آپ کی رائے اور آپ کی منشا کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اپنی مقدس کتاب میں ذکر فرمایا، یعنی اسیرانِ بدر سے سلوک کے حوالہ سے اور خواتین کے پردہ کے بارے میں احکامات جاری ہوئے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں گوشہ نشین ہو چکے تھے، اُس وقت متحرک ہوئے جب امیر المومنین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنایا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اسے خلافت سے ملوکیت کی طرف پیش قدمی قرار دیا اور بعض دوسرے جید اور سینئر صحابہؓ کے ساتھ مل کر یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ جو صحابی رسول تھے، کاتب وحی تھے، اُن کا یہ فیصلہ یقیناً نیک نیتی پر مبنی ہوگا اور ماضی قریب میں تقرر خلیفہ کے حوالہ سے پیدا ہونے والے انتشار کو مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل میں مسلمانوں کو بچانے کے لئے ہوگا، لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر درست ہے کہ اس فیصلہ نے ملوکیتی طرز کی خلافت کا آغاز کر دیا اور اسلامی نظام کی شاندار عمارت میں ایک دراڑ آ گئی۔ حضرت حسینؓ نے نظامِ خلافت میں اس دراڑ کا راستہ

روکنے یا اُسے پُر کرنے اور پھر سیاسی سطح پر حقیقی خلافت کو پٹری پر چڑھانے کے لئے جہاد کیا اور ایک بے مثل جہاد کیا، جس میں اپنی ہی نہیں اپنے خاندان کے کئی درجن افراد کی جان بھی قربان کر دی، لیکن اسلامی نظام میں دراڑ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ آج کا مسلمان سوچے کہ ایک وہ تھے جنہوں نے اسلام کے حوالہ سے اتنی بات پر اپنی اور اہل وعیال کی جان قربان کر دی اور ایک ہم ہیں کہ اسلامی نظام کی شاندار عمارت پوری ڈھ چکی ہے بلکہ زمین بوس ہوگئی ہے اور ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ ہم دنیا بنانے اور اس حوالہ سے دوسروں پر سبقت لے جانے پر تلے ہوئے ہیں اور ہر چہ باداباد کا نعرہ لگا کر میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ ہمارے اسلام کا کُل انحصار اب خالی خولی نعروں پر ہے۔ ہم پُر جوش انداز میں نعرۂ تکبیر اور نعرۂ رسالت لگاتے ہیں، ہم بآوازِ بلند ''حسینؓ سب کا ہے'' کہتے ہیں، لیکن عملاً نہ اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی پابندی ہے نہ حسینؓ جیسا جہاد کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے ایمان کے بعد عمل صالح کی توقع کرتا ہے۔ جس طرح کربلا میں عمل صالح حق کی خاطر ڈٹ جانا تھا، وگرنہ کیا صفِ مخالف کے لوگ اللہ اور رسولؐ پر ایمان نہیں رکھتے تھے اور ارکانِ اسلام نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پر عامل نہیں تھے؟ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ سیاسی نظام کو بھی بالکل اُسی طرح دیکھنا چاہتے تھے جیسے خلفائے راشدینؓ کے دور میں تھا۔ آج عالم اسلام خصوصاً مسلمانانِ پاکستان کا حقیقی عمل صالح یہ ہے کہ وہ اپنے ملک میں ایسا سیاسی، سماجی اور معاشی نظام قائم کریں جس کا دین اسلام تقاضا کرتا ہے۔ اگر ہم باطل نظام کے تحت زندگی گزارنے پر راضی رہتے ہیں تو باطل کے زیر اہتمام حق نکھر کر سامنے آئے یا حق کا بول بالا ہو، یہ نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ اور اس باطل کے زیر تسلط نماز، روزہ حج، زکوٰۃ کس قدر اجر وثواب کے حامل ہیں؟ یہ ایک مشکل سوال ہے جو جواب طلب ہے۔ البتہ یہ بات واضح ہے اور واضح رہنی چاہیے کہ ہم پر اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کے قیام کی کوشش اور جدوجہد فرض ہے، ایسا کر گزرنا یعنی اسے بالفعل قائم کر دینا ہم پر فرض نہیں۔ لہٰذا صد ہزار مبارک باد کے مستحق ہیں وہ لوگ جو ارکانِ اسلام کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس عملِ صالح کے لئے کوشاں ہیں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان اسلامی فلاحی ریاست بن جائے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

تعلیمی نصاب میں pluralism کا پیوند

وزیراعظم میاں نواز شریف نے وزارتِ تعلیم کو ایک خصوصی حکمنامہ جاری کیا ہے جس کے مطابق وزارتِ تعلیم دو ماہ کے عرصہ میں پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک کے تعلیمی نصاب میں تبدیلی کرے گی اور جمہوریت' انتخابات' آزادیٔ رائے اور عدلیہ کے حوالہ سے خصوصی اسباق شامل کیے جائیں گے۔ اس خصوصی حکم نامہ میں pluralism کا ذکر پُرزور انداز میں کیا گیا ہے اور وزارت تعلیم سے کہا گیا ہے کہ تعلیمی نصاب میں ایسے اسباق شامل کیے جائیں جس سے pluralistic سوسائٹی کے قیام میں مدد مل سکے۔ ہم نہ جمہوریت کو اور نہ انتخابات کو حرام سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف عملی اور قلمی جہاد کا اعلان کریں، ہمیں صرف یہ اختلاف ہے کہ اگر کوئی اسلامی جماعت اس وطن عزیز یعنی پاکستان میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے قیام میں مخلص ہے تو وہ جان لے کہ انتخابات اور جمہوریت اس شاہراہ پر آپ کو کبھی گامزن نہیں کر سکتے جس پر چل کر آپ اسلام کی منزل پا سکیں۔ منزل کھوٹی ہو جائے گی اور راہ گم ہو جائے گی۔ البتہ نظامِ خلافت کی منزل پا لینے سے پہلے عبوری دور میں ہم بادشاہت اور مارشل لاء سے جمہوری طرزِ حکومت کو نسبتاً بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم آزادیٔ رائے کے بھی قائل ہیں لیکن اس آزادی کی حدود کا تعین ہونا چاہیے۔ ہمارا دین' ہماری روایات' ہمیں مادر پدر آزادی کی اجازت نہیں دیتے۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ آزادیٔ رائے کی آڑ میں شعائرِ اسلام اور مقدس ہستیوں کا استہزاء کیا گیا ہے اور ان پر کیچڑ اچھالا گیا ہے۔ یہ آزادی نہیں باقاعدہ سازش ہے' تخریب کاری اور دہشت گردی ہے۔ پہلے ہی میڈیا اس آزادی کے غلط استعمال سے ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ جہاں تک عدلیہ کی آزادی اور اس کے احترام کا تعلق ہے دنیا میں کون سا ایسا نظامِ حیات یا طرزِ حکومت ہے جو اسلام سے بڑھ کر عدلیہ کی آزادی اور

اس کے احترام کا قائل ہو۔ اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں، کس مذہب، کس معاشرہ اور کس نظام میں حکمرانوں نے یا اشرافیہ نے خود کو عدلیہ کے سامنے یوں پیش کیا ہو جیسے بہت سے مسلمان حکمرانوں نے خود کو عدالتوں کے سامنے پیش کیا اور پھر ان کے فیصلوں کا بھرپور احترام کیا۔

مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تعلیمی نصاب میں اصلاً کس نوعیت کی تبدیلی ہونا چاہیے تھی اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، لیکن پہلے ہم وزیراعظم کے حکمنامے میں اس خاص حصہ کا ذکر کریں گے جس نے نشتر کا کام کرتے ہوئے ہمارے سینہ کو چھلنی کر دیا ہے۔ یہ پاکستان کی جڑ اور بنیاد پر خودکش حملہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس ایٹم بم کی حفاظت کرتے کرتے اب ہم تھکتے جا رہے ہیں موجودہ حکومت نے اب اسے نظریۂ پاکستان پر دے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے تاکہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ وزیراعظم کے حکمنامے میں وزارتِ تعلیم کو ہدایت جاری کی گئی ہے کہ طلبہ کو آغاز ہی سے pluralism کی تعلیم دی جائے تاکہ pluralistic سوسائٹی وجود میں آ سکے۔ ہم نے ''پلورل ازم'' کو جو سمجھا ہے یا مختلف ڈکشنریوں میں اس کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ مختلف مذاہب اور مختلف افکار کے حامل لوگوں یا مختلف زاویۂ نگاہ رکھنے والوں کی ایک سوسائٹی وجود میں لائی جائے۔ لغت کے مطابق ان مختلف مذاہب اور مختلف افکار کے لوگوں کے اتحاد کا ہی نہیں بلکہ اس میں باہم ضم ہونے کا معنی بھی یہ لفظ دیتا ہے۔ یعنی ذہنی اور عقیدہ کی سطح پر بُعد کے باوجود انسانی سطح پر باہمی بقائے دوام اور امن کے قیام کے لیے سب یکجا اور یک رنگ ہو جائیں۔ ایک اردو روزنامہ کے مشہور سیکولر کالم نویس جو آج کل سیاسی لحاظ سے نواز شریف کے بدترین دشمن بنے ہوئے ہیں اور موجودہ حکومت کی گڈ گورننس اور وزراء کی کارکردگی پر اپنے ترکش کے تمام تیر چلا رہے تھے، انہوں نے نواز شریف کی pluralism کی طرف پیش قدمی کو اس قدر سراہا ہے، لکھتے ہیں کہ اگر نواز شریف یہ کارنامہ سرانجام دے گئے تو گویا وہ تاریخ میں امر ہو جائیں گے۔ اکبر اعظم نے ہندوؤں سے شادیوں کے ذریعے اور دین الٰہی کے اجراء سے یہ کارنامہ سرانجام دینے کی کوشش کی تھی۔ فرماتے ہیں کہ اس حوالہ سے مولویوں کی مزاحمت کی پروا نہ کی جائے۔ اور تو اور انہوں نے pluralism کو قرآن کے مطابق ثابت کرنے کی احمقانہ کوشش کی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اس کالم کی آخری سطور کچھ یوں ہیں ''نواز شریف نے یہ قدم اٹھا لیا ہے تو حقیقی منزل تک پہنچ کر وہ تباہی کے راستے پر سرپٹ دوڑتی ہوئی اپنی قوم کو امن اور ترقی کے

راستے پر گامزن کر دیں گے، گاش! وہ ایسا کر سکیں۔'' حقیقت یہ ہے کہ نواز شریف SAFMA کے پلیٹ فارم سے آن ریکارڈ یہ کہہ چکے ہیں کہ ہمارا اور ہندوؤں کا خدا ایک ہے' کلچر ایک ہے' زبان ایک ہے' رہن سہن ایک جیسا ہے۔ گویا قائداعظم نے حصولِ پاکستان کے لیے جو بنیاد اور جواز فراہم کیا تھا کہ ہم الگ ریاست اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ ہم ہر سطح پر اور ہر لحاظ سے ہندوؤں سے الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ' ہمارا کلچر الگ، ہماری بود و باش الگ، یہ سب سراسر غلط تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس انتہا پر مذکورہ کالم نویس گئے ہیں شاید نواز شریف کی سوچ اس حد تک نہ ہو۔ وہ محض ہندو مسلم دوستی چاہتے ہیں۔ وہ پاک بھارت کشیدگی کو اس حد تک ختم کر دینا چاہتے ہیں کہ فوج کی اہمیت نہ رہے، بلکہ صحیح تر الفاظ میں ضرورت ہی نہ رہے۔ فوج پولیس کی مانند ہو۔ ان کی حکومت ہو تو جلسے جلوس روک دے' آسمانی آفات نازل ہوں تو ریسکیو کا کام کرے' گھوسٹ سکولوں کا کھوج لگائے' وغیرہ وغیرہ۔ ہم بھی ہندوستان سے دشمنی ترک کرنے کے خواہش مند ہیں۔ تعلقات کو normalise کیا جانا چاہیے، لیکن ہندو مسلم دوستی ممکن نہیں، کیونکہ آگ اور پانی ایک ہو سکتے ہیں، لیکن بت پرست اور بت شکن ایک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا دوستی ممکن نہیں، اجتناب اور اعراض ممکن ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ دفاعی معاملات کو پس پشت ڈالنا ایک عام دشمن کو جارحیت کی دعوت دینے کے مترادف ہے۔ ہندو جیسا کینہ پرور دشمن کب معاف کرے گا۔ فوج کے ہاتھ میں کند ہتھیار پکڑا دینے سے یا ہر موقع پر اور ہر پلیٹ فارم سے ذلیل و رسوا کر دینے سے آپ کی کرسی مضبوط نہیں ہو گی۔ آپ کی کرسی deliever کرنے سے' عوام کو ریلیف دینے سے، امن و امان قائم کرنے سے' کرپشن کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے سے' عدل و انصاف کو سستا اور آسان بنا دینے سے' تعلیم اور صحت کے حوالہ سے عوام کو سہولیات فراہم کرنے سے اور ایک آزاد، باوقار اور جرأت مندانہ خارجہ پالیسی وضع کرنے سے ہو گی۔ کون نہیں جانتا کہ 5 جولائی 1999ء کو جب پرویز مشرف نے بغاوت کی تو اس وقت حکومت مذکورہ بالا صفات سے محروم تھی۔ لہٰذا مشرف کی ناجائز حکومت کے خلاف عوام کیا مسلم لیگ کا کارکن بھی میدان میں نہ نکلا، بلکہ مشرف کو ''جی آیاں نوں'' کہا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا صفات کو کیسے اپنایا جائے' حکومت کیسے مضبوط و مقبول ہو گی۔ حضور! اس کے لیے pluralistic سوسائٹی کی ضرورت نہیں ہے، اس کے لیے ہندوستان کا منت

ترلا مارنے کی ضرورت نہیں ہے، فوج کا ڈنک نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سول حکومت کی غیر مقبولیت فوج کو حکومت پر ناجائز قبضہ کی راہ دکھاتی ہے۔ ان کے سینوں میں موجود اقتدار کی ہوس کو بڑھاتی ہے۔ ایک خوشحال، توانا اور مضبوط پاکستان صرف اس صورت میں وجود میں آ سکتا ہے اگر اس عمارت کو اس کی نظریاتی بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تعلیمی نصاب میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ ہر طالب علم ایک پختہ عقیدہ کا حامل ایک باعمل اور صالح مسلمان بن جائے۔ وہ اسلام کے نجی و انفرادی گوشوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی گوشوں سے باخبر ہو جائے۔ وہ اسلام کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی نظام کو جان جائے اور سمجھ سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دین کی زبان یعنی عربی میں مہارت حاصل کرے، اللہ کے کلام اور رسول اللہ ﷺ کے فرمودات کو اپنی آنکھوں سے پڑھے۔ اس کے لیے وہ کسی دوسرے کی عینک کا محتاج نہ ہو۔ وہ دین کے تقاضوں کو سمجھ سکے۔ اسلامی فلاحی ریاست پاکستان کا مقدر ہو۔ اور اگر کبھی پاکستان کے حکمران اسلام کے محکمات سے یا شریعتِ محمدیؐ کے کسی واضح حکم سے سرِ مو انحراف کریں یعنی اس حوالہ سے کج راہی اختیار کریں تو پاکستان کے شہری جن کے اذہان و قلوب میں بچپن سے دینی تعلیمات راسخ ہو چکی ہوں گی، وہ چٹان کی طرح اس حکمران کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ امریکہ اور بھارت کا تعاون نہ پہلے کسی کا اقتدار بچا سکا، نہ اب بچا سکے گا۔ دنیا کی سپر قوتوں کی کائنات کی سپریم قوت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ امریکہ افغانستان میں اپنی عزت نہ بچا سکا اور بھارت کی سلامتی کو اندرونی تحریکوں سے شدید خطرہ ہے، وہ کسی کو کیا بچائیں گے۔ اللہ کا دامن تھام لینے والے ہی دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔



ظلم اسلام کی ضد ہے

کوٹ رادھا کشن میں ایک عیسائی جوڑے کو تشدد کے بعد بھٹہ میں ڈال کر جلا دیا گیا ہے۔ اس عیسائی جوڑے پر الزام لگایا گیا کہ اس نے مقدس اوراق کی بے حرمتی کی اور انہیں جلایا۔ اب تک کی اطلاعات کے مطابق مرد کا باپ جو عورت کا سسر تھا جادو ٹونہ اور تعویذ گنڈا کا دھندا کرتا تھا۔ اس شخص کے فوت ہونے کے بعد اس جوڑے نے اپنے اس بڑے کے کاغذات وغیرہ جلائے جن میں شاید کوئی مقدس کاغذات بھی تھے۔ ایک پڑوسی یا راہگیر نے انہیں دیکھا اور دوسرے لوگوں کو اس سے آگاہ کیا۔ بعض غیر مصدقہ اطلاعات کے مطابق قریبی مساجد سے بھی یہ اعلان ہوا کہ عیسائی خاندان یہ حرکت کر رہا ہے۔ اس پر ایک مشتعل ہجوم ان کے گھر پر حملہ آور ہوا ان پر تشدد کیا اور میاں بیوی کو بھٹہ میں پھینک دیا اور وہ جل کر خاکستر ہو گئے۔ دروغ بر گردنِ راوی یہ خبر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نے اسی طرح دی۔ یہ بات بھی ابھی تک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے کہ وہ مقدس اوراق قرآن مجید ہی کے تھے یا عربی میں کچھ اور لکھا تھا۔

فرض کر لیجیے کہ خدانخواستہ قرآن پاک کو ہی جلایا گیا ہے تب بھی ہم سمجھتے ہیں کہ یہ جہالت عظمیٰ کا اظہار تھا، یہ سنگدلی تھی، یہ حماقتِ عظمیٰ تھی، یہ انسانیت کے خلاف جرم کا ارتکاب تھا اور اہم ترین بات یہ کہ یہ اسلام سے بدترین دشمنی تھی۔ دنیا کا کوئی قانون کوئی معاشرہ ہجوم کو قانون ہاتھ میں لینے کا حق نہیں دیتا۔ ظاہر ہے یہ مشتعل ہجوم مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ ان کا تعلق اسلام سے تھا جس کا کیچ ورڈ ہی عدل ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ قرآن پاک کے اوراقِ مقدسہ جلائے گئے تو یقیناً اسلامی معاشرے میں یہ بدترین اور سنگین ترین جرم کا ارتکاب تھا۔ اس کی اطلاع انتظامیہ کو دی جاتی، ملزموں کو گرفتار کیا جاتا۔ غیر جانبدارانہ تحقیقات ہوتیں۔ ملزموں کو صفائی کا پورا پورا موقع دیا

جاتا۔ انصاف کے تمام تقاضے پورے کیے جاتے۔ یہاں تک کہ یہ بھی دیکھا جاتا کہ ایسا بدنیتی سے اور جان بوجھ کر کیا گیا ہے یا کوئی دوسرے عام کاغذات جلائے گئے تھے جن میں سے کسی کاغذ پر قرآن پاک کی کوئی آیت یا کچھ آیات درج تھیں جو نظر انداز ہو گئیں اور غیر ارادی طور پر جل گئیں وغیرہ وغیرہ یا ارادے کے ساتھ اسلام سے بغض اور دشمنی کی بنا پر اور مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مجاز عدالت کا کام تھا۔ پہلی صورت میں ملزموں سے کچھ رعایت برتی جاسکتی تھی۔ دوسری صورت میں انہیں عبرتناک سزا دی جاتی۔ قصہ کوتاہ عوام الناس کا کام انتظامیہ کو اطلاع کرنا اور جو کچھ انھوں نے دیکھا اس کی سچی گواہی دینے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس مشتعل ہجوم کی دہشت گردی سے عیسائی جوڑے کے ساتھ ظلم ہوا۔ خود انہوں نے اپنی عاقبت خراب کی اور جس مذہب سے ان کا تعلق تھا اسے بدنام کیا۔ یہ اس واقعہ کا ایک پہلو ہے جس کی بہرحال جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک جرم دوسرے جرم کا جواز نہیں ہوتا۔

جرم کے ردِعمل میں یقیناً جرم کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب بھی نہیں کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ دوسروں کے مذہبی جذبات کو مسلسل کچلا جاتا رہے۔ آزادی رائے کی آڑ میں اشتعال انگیزی جاری رہے۔ امریکہ کا بدبخت اور لعین ٹیری جونز قرآنِ پاک کو جلاتا رہے۔ یورپ میں نوع انسانی کی عظیم ترین اور مقدس ترین ہستی جس کی ناموس پر ہر غیرت مند مسلمان مال، جان اور اولاد قربان کرنے کے لیے ہر آن تیار ہو، اس کے کارٹون بنائے جائیں (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) لیکن پھر بھی اس کے خلاف کوئی علاقائی یا عالمی قانون حرکت میں نہ آئے تو یہ دوسری طرف کا جرم ہے۔ غضب خدا کا اسے جرم سمجھا ہی نہیں جاتا۔ غیر تو غیر مسلمان حکمران بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے، جس سے مذہب سے محض جذباتی لگاؤ رکھنے والے ناپختہ ذہن کے لوگ مشتعل ہو جاتے ہیں۔ آگ لگانا یقیناً جرم ہے لیکن دیا سلائی اور تیل کا فراہم کرنا بھی قابل مذمت ہے، جرم ہے۔

پاکستان میں حالیہ دنوں میں اقلیتوں سے ہونے والی زیادتیوں کو ایک اور زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا جانا چاہیے۔ نائن الیون سے پہلے پاکستان غیر مسلم اقلیتوں کے لیے جنت تھا۔ یہاں شیعہ سنی فسادات تو ہوتے تھے۔ کبھی کبھی کسی مسجد کے قبضہ کے جھگڑے پر بریلوی دیوبندی بھی باہم دست و گریبان ہو جاتے تھے۔ گویا مذہبی مسالک کے درمیان بگاڑ پیدا تو ہو جاتی تھی۔ لیکن ہندو مسلم یا

عیسائی مسلم فسادات تو دور کی بات ہے، ان کے درمیان عام نوعیت کے لڑائی جھگڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کو آڑ بنا کر امریکہ اور یورپ نے مسلمانوں پر جو ظلم وستم ڈھائے اور اس حوالہ سے مسلمان حکمرانوں نے جو عمومی رویہ اختیار کیا ہے یہ کھلی ریاستی دہشت گردی تھی، جس نے ہر مسلمان کو ذہنی اور قلبی طور پر بے چین کیا۔ لیکن ان میں سے جو اسلام کا صحیح اور عادلانہ تصور نہیں رکھتے تھے اُنہوں نے صبر کا دامن چھوڑ دیا۔ پھر یہ کہ قرآن پاک کی بے حرمتی اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخی سے مسلمانوں کو ذہنی اذیت دینے کے علاوہ دنیا کے بعض حصوں میں غیر مسلم حکومتوں نے مسلمان شہریوں کے ساتھ جس بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بھی ناقابلِ بیان ہے اور یقیناً ناقابلِ برداشت بھی ہے جس سے ناپسندیدہ ردعمل سامنے آئے۔ مثلاً اسرائیل فلسطینیوں پر ظلم ڈھانے میں تمام حدود کو عبور کر گیا۔ بھارت نے ایک عرصہ سے مقبوضہ کشمیر میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔ برما میں مسلمانوں پر جو بیت گئی ہے فلکِ پیر نے ایسی انسان دشمنی کا مظاہرہ کبھی نہ دیکھا ہوگا اور بات کو اگر بیسویں صدی تک لے جائیں گے تو ایشیا اور افریقہ میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم وستم کی داستان اتنی طویل، اتنی خونچکاں اور اتنی لرزہ دینے والی ہے کہ اسے قرطاس پر منتقل کر دینا عملاً ممکن نہیں ہے۔ جھوٹے نگوں سے مرصع چمکتی دمکتی آنکھوں کو خیرہ کرتی مغربی تہذیب کی طرح مسلمانوں کے خون کے دریا بہا رہی ہے، لیکن اپنے دامن پر چھینٹ نہیں پڑنے دیتی۔ حیرت ہے یہ سب کچھ کر کے اِن خونی درندوں کا معاشرہ پھر مہذب اور تہذیب یافتہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ اس سب کچھ کے باوجود جو کچھ کوٹ رادھا کشن میں ہوا صریحاً غلط اور ناجائز تھا، ناروا تھا۔

ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر عرض کرتے ہیں کہ یہ دشمن سے انتقام نہیں تھا، خود مسلم معاشرے پر ظلم تھا۔ اس لئے کہ جس عیاری اور چالاکی کے ساتھ مسلمانوں کو تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے، اور اُن پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اور پھر ان ظلم وتشدد اور ریاستی دہشت گردی کو جس طرح قانون کا لبادہ اوڑھا دیا جاتا ہے اس کا جامع حکمت عملی سے اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ امریکہ اور اہل مغرب کا اوّلین ہتھیار میڈیا کے ذریعہ جھوٹا پروپیگنڈا کر کے دنیا کو مس گائیڈ کرنا ہے۔ پھر سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی برتری سے اعدائے اسلام عالم اسلام پر جنگ اس طرح مسلط کرتے ہیں کہ قصوروار بھی مسلمان ہی دکھائی

دیتے ہیں۔ عالم اسلام کا المیہ یہ ہے کہ مسلمان حکمران اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے اُن کی ڈکٹیشن کو قبول کر کے اُن کے مفادات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ میڈیا کے ذریعے ایسی فضا قائم کر دی گئی ہے کہ مغرب مسلمانوں کو مار رہا ہے اور پھر بھی مظلوم ہے اور مسلمان مار کھا رہے ہیں اور خون میں نہا رہے ہیں، پھر بھی ظالم ہیں۔ یہ دشمنوں کی حکمت عملی کا کمال ہے اور میڈیا کی جادوگری ہے کہ وہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کر رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس ظالم کا ہاتھ کیسے توڑا جائے؟ جہاں تک میڈیا کا تعلق ہے ہمیں جوابی طور پر کسی جادوگری کا مظاہرہ نہیں کرنا، البتہ یہ امر لازم ہے کہ جھوٹ کی برملا تردید کی جائے، حق کی صدا بلند کی جائے اور کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ قوت کا جواب قوت سے دیا جائے۔ اُس کی اس برتری کو چیلنج کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمان جس قدر پیچھے رہ گیا ہے یہ فاصلہ ختم کرنا بلکہ کم کرنا بھی انتہائی مشکل ہے۔ لیکن ایک تو یہ کہ ہمیں جدوجہد کرنا چاہیے اور ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ غور کریں ہمیں کس چیز نے کمزور کیا ہے۔ ہم جو انسانی تاریخ میں طویل ترین عرصہ تک اس دنیا میں سپریم پاور کی حیثیت رکھتے تھے کیوں ناتواں ہوئے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ، رسول اللہ ﷺ اور کتاب الٰہی سے دور ہو کر ہم دنیا بھر میں خوار ہوئے اور ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بن گئی۔ ایک بار پھر سپریم پاور آن دی ارتھ بننے کے لئے ہمیں اللہ اور رسول ﷺ سے اپنے تعلق کو دوبارہ استوار کرنا ہوگا۔ ذرا سوچئے، نبی اکرم ﷺ تو اللہ کے نبی اور رسول تھے، اگرچہ آپؐ نے دین متین کو نافذ اور غالب کرنے کے لئے تمام تر جدوجہد انسانی سطح پر کی لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ کو استثنا حاصل تھا۔ آپ کی حیثیت خصوصی تھی۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس طرح حالات کا مقابلہ کیا اور آپؐ کے وصال کے بعد بھی دین پر آنچ نہ آنے دی۔ دور فاروقیؓ میں اُس وقت کی دو سپر قوتوں کو جس طرح تہس نہس کیا گیا۔ دور عثمانیؓ میں بھی یہ سلسلہ دس سال تک جاری رہا۔ آج حالات اُس سے زیادہ مشکل نہیں۔ ستاون مسلمان ممالک دنیا میں ہیں۔ ان کو قدرت نے بے شمار وسائل دے رکھے ہیں۔ دنیا بھر میں ایک سو ساٹھ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ تو کیا آج ہم پانسہ نہیں پلٹ سکتے۔ یقیناً ایسا ممکن ہے۔ لیکن اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، کسی طرح ممکن نہیں۔ اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ وہ مدد کرتا ہے بشرطیکہ مسلمان اُس کی مدد کریں یعنی اللہ کا دین نافذ کرنے کی جدوجہد کریں۔ فرشتے میدان بدر میں مدد کو اترے

تھے، آج بھی قطار اندر قطار اتریں گے۔ شرط یہ ہے کہ ہم مسلمان فضائے بدر پیدا کریں۔ گویا بال ہمارے کورٹ میں ہے۔ دل یا شکم کا فیصلہ ہم کو کرنا ہے۔ یاد رہے اسلام بدلہ کی اجازت دیتا ہے، لیکن A کا بدلہ B سے لینا ظلم ہے۔ ہمیں اپنے گھوڑے تیار رکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ظالم جان لے کہ اُسے منہ توڑ جواب ملے گا۔ لیکن مسلمان کسی صورت اپنی ریاست کے ذمی پر ظلم نہیں کرے گا، کیونکہ عدل اسلام کا خاصہ ہے، اسلام کا کیچ ورڈ ہے اور اسلامی نظام کی روح ہے اور ظلم اسلام کی ضد ہے۔



تقدیر کا فیصلہ

اللہ ربّ العزت نے انبیاء اور رُسل کو واضح بیّن اور روشن نشانیاں دے کر دنیا میں بھیجا۔ یہ نشانیاں ہر خاص و عام کو سر کی آنکھوں سے بآسانی نظر آتی تھیں۔ ان نشانیوں کو پیغمبروں کے معجزات کہا جاتا ہے۔ معجزہ کا حقیقی مفہوم ہے ایسا ماورائے عقل کام جو نہ صرف فرد بلکہ معاشرے کی اجتماعی دانش کو بھی عاجز کر دے۔ معجزہ کی پشت پر نہ مادی سائنس ہوتی ہے اور نہ اُسے مادی وسائل کی مدد درکار ہوتی ہے۔ عصائے موسیٰ کی ایک ضرب سے بارہ چشمے پھوٹ پڑتے ہیں تاکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں میں سے ہر ایک کو اپنا چشمہ میسر آ جائے۔ اسی عصا کی ضرب جب دریا پر پڑتی ہے تو دریا میں پانی کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لئے بیچ دریا راستہ بن جاتا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کی قوم نے اپنی آنکھوں سے ایک اونٹنی کو پہاڑ کی کوکھ سے جنم لیتے دیکھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کیا اور مادر زاد اندھے کو بینائی کی نعمت سے نوازا۔ لیکن ان تمام معجزات پر مکان و زمان کی قید لگی تھی۔ حضور ﷺ کے دور میں شق القمر کا واقعہ ہوا۔ چاند کا دو حصوں میں بٹ جانا چونکہ آسمان پر ہونے والا ایک واقعہ تھا لہٰذا یہ مقام کی قید سے آزاد تھا اور دنیا کے کسی بھی ایسے حصہ میں دیکھا جا سکتا تھا جہاں آسمانِ دنیا پر چاند نظر آ رہا تھا۔ تاریخ میں ایسے مستند اور قابل یقین شواہد موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں بھی یہ نظارہ دیکھا گیا۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیجنے کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رکھا جب تک اللہ کی ربوبیت، کائنات کی حقانیت اور آخرت کی حتمیت پر یقینِ محکم کے لئے انسان کو معجزے دکھانے کی ضرورت تھی اور انسان عام اشیاء کو اُتنا ہی جانتا اور سمجھتا تھا جتنی اور جیسی اُسے اپنی آنکھ سے نظر آتی تھیں یا اپنے ماحول سے وہ اخذ کر سکتا تھا۔ مثلاً اُس دور کے آدمی کو زمین

کے گول ہونے کا ثبوت نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اُس دور کا حکیم انسان کے اندر قائم نظام کو اُس طرح نہیں سمجھ سکتا تھا جیسے آج کا سرجن اُس نظام کو دیکھتا ہے اور حیرت و تحسین سے سر دھنتا ہے۔ (کسی کے ہاتھ میں شفا کا ہونا اور نہ ہونا بالکل الگ بات ہے)۔ اگر اُس دور میں کسی سے کہا جاتا کہ تم نے اپنے والدین کی شادی کا منظر دیکھا ہے تو وہ اُسے گالی سمجھ کر مرنے مارنے پر اُتر آتا۔ آج کا بچہ بلکہ نوجوان اپنے والد کو نکاح نامہ پر دستخط کرتے اپنی آنکھوں سے ٹیلی ویژن سکرین پر دیکھ سکتا ہے۔ اُس دور کا انسان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زمینی لحاظ سے ہزاروں میل کے فاصلے کے مکین نہ صرف محو گفتگو ہو سکتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو ایسے ہی دیکھ سکتے ہیں جیسے کوئی چند گز دور بیٹھا ہو۔ آج آپ آڈیو ویڈیو ریکارڈنگ سے دس سال پرانی اپنی یا کسی کی گفتگو اس طرح دوبارہ سن سکتے ہیں کہ اُس میں زیر زبر کا فرق نہ آئے۔

خلائی دور میں داخل ہونے کے بعد انسان کے سامنے ایسے ایسے حقائق آئے ہیں کہ وہ اس کائنات کی عظمت اور اس میں قائم کردہ ایک زبردست نظام کا ذہنی طور پر قائل ہو گیا ہے۔ کوئی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرے تو بات الگ ہے وگرنہ اکثر سائنس دان اور ماہرین اس خلاقی پر اش اش کرتے ہیں۔ آج کے انسان کو صرف دیانت دار اور حقیقت کو تسلیم کرنے والا ہونا چاہئے تو وہ جان لے گا کہ ایسا بے مثل نظام نہ خود بخود قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی خود بخود چل سکتا ہے جب تک اُس کا کوئی خالق اور نگران نہ ہو۔ انسان عقل اور سوچ سے اس نتیجہ پر بھی پہنچ سکتا ہے کہ ایسا باکمال، بے مثل نظام اور وسیع و عریض سلسلہ صرف Unity of Command سے چل سکتا ہے۔ یعنی ہماری عقل بھی ہمیں توحید کا راستہ دکھاتی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ انسان یہ راستہ دیکھنا چاہتا ہے یا جان بوجھ کر اندھا بنا رہتا ہے۔ سائنس اب اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکی ہے کہ اس کائنات کا ایک خاتمہ بھی ہے، یعنی قیامت کی قائل بھی ہو چکی ہے۔ اگر آج کا انسان چالیس پچاس سال پرانی یادیں پردۂ سکرین پر تازہ کر سکتا ہے تو انسان کا خالق اُسے اُس کی ساری زندگی کی فلم کیوں نہیں دکھا سکتا؟ اور پھر یقیناً ارشادِ ربانی ہوگا کہ آج تو اپنا فیصلہ خود کر! اگر ہمارا کمپیوٹر بٹن دبانے سے تمام یادداشتیں، تمام حساب کتاب اور ہر قسم کے کوائف نکال باہر کر سکتا ہے تو خالق کا سپر کمپیوٹر کائنات کی ساری کہانی کیوں نہیں دہرا سکے گا؟ اگر ذہن تعصب اور اختیاری جہالت سے مجبور نہیں تو وہ تسلیم کرے گا کہ آخرت میں احتساب اور جزا و سزا جہاں ایمان بالغیب کا حصہ ہے وہاں بعید از عقل

بھی نہیں۔ انسان کی ایک مجبوری اور بھی ہے، وہ یہ کہ اس دنیا میں لاکھوں انسانوں کے قاتل کو زیادہ سے زیادہ سزا موت ہی دی جا سکتی ہے اور اسی طرح جزا بھی محدود ہی دی جا سکتی ہے۔ مکمل جزا و سزا ممکن نہیں، لہٰذا عدل کا منطقی تقاضا ہے کہ کوئی ایسی عدالت ہونی چاہئے جو بمطابق جرم سزا دینے اور کارگزاری کے مطابق ایوارڈ دینے کا اختیار رکھتی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان دنیوی علوم سے بے بہرہ تھا اُسے آسمانی ذریعہ یعنی وحی سے بتایا گیا کہ تمہارا ایک خالق ہے، تمہارا اور کائنات کا مقدر موت ہے اور آخرت میں جزا و سزا کا نظام ہے۔ لیکن جب انسان عقلی طور پر جوان ہو گیا بلکہ چھلانگیں لگانے لگا تب بھی اُسے صرف عقل اور دنیوی علوم کے سہارے چھوڑ نہیں دیا گیا بلکہ اُس کی رہنمائی کے لئے آخری نبی اور رسول ﷺ کو ایسا معجزہ عطا کیا گیا جو زمان و مکان کی قید سے آزاد تھا، یعنی قرآن پاک۔ پھر اُس کے متن کے محفوظ رہنے کا بھی ڈنکے کی چوٹ اعلان کر دیا گیا۔ صرف وحی کا سلسلہ منقطع ہوا۔ یہ اُس مالک کے غفور و رحیم ہونے کا تقاضا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ عیار انسان کسی عذر کا سہارا لے۔

اب سوال یہ ہے کہ اللہ کی یہ کتاب ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہے؟ یہ کہ: (i) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ واحد ہے اور اُس کی ذات و صفات میں کوئی کسی بھی درجہ میں شریک نہیں (ii) آخرت لازماً قائم ہو گی اور جزا و سزا میں صرف اللہ واحد فیصلہ کن اور فیصلہ ساز ہستی ہو گی۔ (iii) اللہ کے آخری رسول ﷺ کی اطاعت لازم ہو گی اور اُس کی نبوت و رسالت تا قیامت قائم و دائم رہے گی۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آج ہمارے پاس عقلی و نقلی سطح پر کوئی جواز نہیں ہے کہ ہم اللہ کے احکامات سے انحراف کریں یا ہم رسول ﷺ کی اطاعت سے گریز کے راستے نکال لیں۔ ہمیں خاص طور پر آج کے دور میں اُس شیطانی حملے سے محفوظ رہنا ہو گا جو بعض عملیت پسند دانشوروں کے ذریعے ہم پر ہو رہا ہے کہ نبی آخر الزمان ﷺ کے فلاں فلاں احکامات وقتی اور عارضی تھے یا فلاں سنتِ رسولؐ درحقیقت اُس دور کے کلچر کا حصہ ہے اور آج ہم پر لازم نہیں کہ اُس کلچر کو بھی اپنائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ شیاطینِ انس اگر ہمارا تعلق اور رشتہ سنتِ رسول سے کاٹنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم رسولؐ سے ہی کٹ جائیں گے اور رسولؐ سے کٹ جانے والا بدقسمت انسان دربارِ خداوندی میں بھی بدترین عذاب کا مستحق ٹھہرے گا۔ یہ قرآنی تعلیمات کا مغز اور حاصل ہے۔

اللہ نے دین کے لئے جدوجہد کرنے کو اپنی مدد قرار دیا ہے اور اللہ کے رسول کی اہم ترین سنت اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کائنات اور مقصودِ کائنات یعنی انسان کے لئے بننے والا دنیوی نظام ہم آہنگ نہیں ہو جاتے، امن قائم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا نیکی کا نچوڑ، تقویٰ کا حاصل اور اللہ کی رضا کا اصل ذریعہ یہ ہے کہ وہ نظام قائم کیا جائے یا اُسے قائم کرنے کی کوشش کی جائے جو اللہ اور رسولؐ نے انسانوں کو اپنی آخری کتاب میں فراہم کیا ہے۔ انفرادی نیکی عادلانہ نظامِ اجتماعی کے قیام کے لئے یقیناً اُس سے بھی زیادہ ضروری ہے جتنی اکھاڑے میں اُترنے والے پہلوان کے لئے جسمانی ورزش اور اچھی خوراک، لیکن اکھاڑے میں اُترے بغیر دشمن کو زیر نہیں کیا جا سکتا۔ غارِ حرا، دارِ ارقم اور شب بھر کی سجدہ ریزی نے حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ قوت بخشی کہ اُنہوں نے بدر و حنین میں جزیرہ نمائے عرب کی کایا پلٹ دی، یہ لازم و ملزوم ہیں۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اُمت مسلمہ خصوصاً مسلمانانِ پاکستان کے اچھے اور نیک لوگ باہم جڑ جائیں اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں اور اپنے سر پر مسلط باطل نظام کے خلاف جہاد کے لئے میدان میں نکلیں، وگرنہ ہمارے حکمران اور مقتدر قوتیں کافر قوتوں کی ڈکٹیشن پر جس طرح اسلامی نظام زندگی سے انحراف کر رہی ہیں اُس میں گندم کے ساتھ گھن کے پس جانے کا بھرپور احتمال ہے۔ وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔ سوچتے رہ جانے سے یا دوسروں کے انتظار میں پانی سر سے نہ گزر جائے۔ یا پھر یہ کہ کوئی ہمیں بتائے کہ فوز و فلاح کا کوئی اور راستہ بھی ہے۔ وگرنہ اسی ناگزیر راستے کو اپنانا ہوگا۔ یہی تقدیر کا فیصلہ ہے، یہی سنتِ رسول ہے..... لہٰذا یہی صراطِ مستقیم ہے۔ یاد رکھیں انفرادی نیکی اچھی مثال قائم کر سکتی ہے، لیکن بزورِ بازو معاشرے کا قبلہ درست نہیں کر سکتی، جبکہ اجتماعی سطح پر قائم عادلانہ نظام فرد کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی ترغیب بھی دے سکتا ہے اور اُسے مجبور بھی کر سکتا ہے۔ وما علینا الا البلاغ!



بڑے اجتماعات ہدف یا حصولِ ہدف کا ذریعہ؟

پاکستان میں ماہ نومبر دینی و مذہبی جماعتوں کے سالانہ اجتماعات کے انعقاد کا مہینہ ہوتا ہے۔ یہ اجتماعات لاہور میں منعقد ہوتے ہیں شاید اس لئے کہ اس مہینے میں لاہور میں صبح کو زیادہ گرمی نہیں ہوتی اور شام کو زیادہ سردی نہیں ہوتی موسم معتدل ہوتا ہے کارکنان اور دیگر شرکت کنندگان کو موسم کی شدت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لہٰذا سال رواں میں اسی روایت کے مطابق تبلیغی جماعت اپنے دو اجتماعات اور جماعت اسلامی اپنا اجتماع عام منعقد کر چکی ہیں اور جماعۃ الدعوۃ کا لاہور میں آل پاکستان اجتماع اگلے چند روز میں منعقد ہونے کو ہے یہ اجتماعات عوامی شرکت کے حوالے سے بہت کامیاب رہے۔ تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع کو چند سال ہوئے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا کیونکہ رائے ونڈ کے وسیع و عریض میدان کا دامن بھی اب تنگ پڑ رہا تھا شنید یہ ہے کہ آئندہ اسے چار حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ جماعت اسلامی کا اجتماع عام بھی عوامی شرکت کے حوالے سے بہت کامیاب تھا۔ جماعۃ الدعوۃ جو شہروں میں بڑی بڑی ریلیاں اور جلوس نکالتی ہے ظاہر ہے وہ بھی آل پاکستان بنیاد پر ایک بہت بڑا اجتماع منعقد کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

یقیناً یہ ایک خوش کن بات ہے کہ مسلمانان پاکستان ایک بہت بڑی تعداد میں اللہ تبارک تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے فرمودات سننے آتے ہیں۔ اور یقینی طور پر بہت سوں کی قلبی اور ذہنی ماہیت تبدیل ہوتی ہوگی۔ بہت سے بے قاعدہ نمازی باقاعدہ نمازی بن جاتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ گھروں کی بجائے مساجد میں نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ اپنے معمولات زندگی میں اوراد اور ذکر الٰہی میں اضافہ کر دیتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ تبلیغ کے لئے اپنا وقت وقف کرنے کا اعلان یا عہد کرتے ہوں گے۔ جماعت اسلامی کے امیر محترم سراج الحق

نے اپنے اختتامی خطاب میں شرکاء سے عہد لیا کہ وہ جھوٹ نہیں بولیں گے، غیبت نہیں کریں گے، خود حرام کھائیں گے نہ بچوں کو حرام کھلائیں گے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے عہد لینا یقیناً قابل ستائش ہے۔ پاکستان کی سڑسٹھ (67) سالہ تاریخ کا جائزہ لیں تو مسلمانانِ پاکستان کے بارے میں بہت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ہر اگلے روز مساجد میں نمازیوں کا اضافہ ہوا مساجد کو خوبصورت بنانے میں لوگوں نے دل کھول کر چندے دیئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ روزہ داروں میں اضافہ ہوا پھر یہ کہ احترام رمضان کی صورت حال پہلے سے بہتر ہوئی۔ حج وعمرہ کے لئے ذوق وشوق میں بے حساب اضافہ ہوا ہے۔ لوگ حکومت کو انکم ٹیکس دینے سے گریز کرتے ہیں لیکن خیراتی اداروں کو بے دریغ پیسہ دیا جا رہا ہے۔ ہزاروں مذہبی مدارس اور بہت سے ہسپتال کسی قسم کی حکومتی مدد کے بغیر اپنے اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ آبادی اور وسائل بڑھنے سے یہ سب کچھ زیادہ تعداد میں نظر آتا ہے۔ ہم پورے یقین اور وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ آبادی میں جس شرح سے اضافہ ہوا ہے نسبت وتناسب کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی اس سے کہیں بڑھ کر لوگوں کے مذہبی رجحان میں اضافہ ہوا ہے، لیکن اور یہ بہت بڑا لیکن ہے کہ یہ عظیم المیہ بھی رونما ہو رہا ہے کہ بد دیانتی، حرام خوری، عہد شکنی، دروغ گوئی، بے غیرتی اور بے حیائی میں بھی اضافہ ہوا۔ ظلم وستم بھی بڑھا ہے معاشرے میں درندگی اور بہیمت کے ایسے ایسے مظاہر دیکھنے میں آئے ہیں کہ اپنے مسلمان ہونے ہی نہیں انسان ہونے پر بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے مثلاً پانچ سالہ بچی کے ساتھ جنسی زیادتی یا کسی چودھری کا ملازم پر کتے چھوڑ دینا۔ اہل نظر واہل دل کے لئے یہ دورخی باعث تشویش ہے۔ جب ہم اسے محض باعث تشویش کہتے ہیں تو شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ صورت حال کی سنگینی کی صحیح نقشہ کشی نہیں کر رہے حقیقت یہ ہے کہ لغت ایسا مناسب اور صحیح لفظ فراہم کرنے سے ہی قاصر ہے جس سے اس درندگی کی مذمت کی جا سکے اور معاشرے کے بگاڑ کا تصور کیا جا سکے۔ یہ دو مختلف اور متضاد سمتوں کی طرف سفر نا قابل فہم ہے۔ نماز تو برائی سے بچاتی ہے پھر معاشرہ بدتر کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ روزہ تو روح کی تقویت کا باعث بنتا ہے، لیکن معاشرہ روحانی طور پر مفلس کیوں ہو رہا ہے۔ اللہ کا ذکر تو دلوں کو نرم کرتا ہے۔ یہ معاشرہ اتنا شقی القلب کیوں ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام تو عدل وانصاف کا علمبردار ہے، پاکستانی معاشرے میں یہ ظلم ودرندگی کہاں سے در آئی ہے۔ فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ مسلمان ایک جسد کی مانند ہیں

جب جسم کے ایک حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو دوسرا حصہ بھی متاثر ہوتا ہے، لیکن یہاں بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔ حسد اور غیبت جیسی بیماریاں وبائی امراض کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہماری دوئی پسندی کا نتیجہ ہے ہم دل اور شکم کو گڈمڈ کر رہے ہیں۔ ہم دو کشتیوں کے سوار ہیں ہم چاہتے ہیں کہ رند کے رند رہیں اور جنت بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ تمام لوگ قانون کے تابع ہوں اور اُس کی پابندی کریں۔ البتہ میری بات دوسری ہے، میری مجبوری ہے، مجھے استثنا حاصل ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ

قارئین کرام سوچئے، غور و فکر کیجئے اور جاننے کی کوشش کریں کہ ایسا کیوں ہے؟ بات کو سمجھنے کے لئے عالم کفر پر نگاہ ڈالیں، وہ یکسو ہو چکے ہیں۔ اُن کی ایک آنکھ مکمل طور پر بند ہے۔ یہی دنیا سب کچھ ہے۔ اوّل تو آخرت کے تصور ہی کو رد کیا جا چکا ہے اور اگر کوئی مذہبی سوچ گنتی کے چند افراد رکھتے بھی ہیں تو وہ اس سے زیادہ نہیں کہ اللہ کا بیٹا یسوع مسیح (معاذ اللہ) ہماری خاطر سولی پر چڑھ کر ہمارے سب گناہوں کا کفارہ ادا کر چکا ہے۔ لہٰذا اس دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا یہی مطلوب و مقصود ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ انسان جس طرف جانا چاہتا ہے وہ اُسی طرح کے راستے کھول دیتا ہے۔ پھر یہ کہ اللہ تبارک تعالیٰ قرآن عظیم میں اپنا یہ فیصلہ صادر کر چکا ہے کہ جو صرف دنیا چاہے گا، ہم وہ اُسے دیں گے جتنی چاہیں گے، لیکن آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔ اور خسارہ ہی اُن کا مقدر ہو گا۔ اسی اصول کے تحت مغربی معاشرہ اس دنیا میں اپنی ذات اور اپنی قوم کی سربلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہے۔ اور ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ عالم اسلام خصوصاً مسلمانانِ پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ دورخی اختیار کر کے نہ گھر کے رہے ہیں نہ گھاٹ کے۔ اجتماعی اور حکومتی نظام مغرب کا اپنایا ہوا ہے۔ انفرادی سطح پر معاملہ کچھ یوں ہے کہ نومولود تھے تو کان میں اللہ اکبر اللہ اکبر کی گونج سنائی دی۔ اکثریت کا معاملہ یہ رہا کہ گھر پر بسم اللہ بھی پڑھائی گئی اور ABC کا جاننا بھی لازم تھا۔ پھر یہ کہ فطری دین سے تعلق اور مولوی کا وعظ مسجد کی طرف کھینچتا ہے اور رائج نظام دنیوی حرص و ہوا پیدا کرتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ اکثریت نے عملی طور پر رحمان اور شیطان دونوں کو خوش کرنا شروع کر دیا اگرچہ زبان سے جو چاہے کہتے رہے۔ یہ ہے ہمارا اصل مرض، یہ ہے ہمارا اصل روگ، جو وبا کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اس کا صرف اور صرف ایک حل ہے جو قرآن پاک تجویز کر چکا: ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے اسلام میں

پورے کے پورے داخل ہو جاؤ'' (البقرہ:208) یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام حصول دنیا سے روکتا نہیں ہے۔ جائز طریقے سے اور شریعت محمدی کے دائرے کے اندر دنیا ملے تو کوئی حرج نہیں۔ اس اصول کے تحت جس کا حکم دیا جائے وہ کرو اور جس سے روک دیا جائے اُس سے رک جاؤ۔ اللہ اور رسول ﷺ جس چیز کا فیصلہ کر دیں مسلمان کا عمل ہی نہیں خواہش بھی اس کے مطابق ہونی چاہیے نماز اور روزہ بھی اللہ کا حکم ہے اور تمام نظام زندگی کو اسلام اور شریعت کے تابع کرنا بھی اُسی اللہ کا حکم ہے دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کو اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کا حق حاصل ہوگا۔ دنیوی جبر قابل قبول نہیں، لیکن اگر آپ مسلمان ہیں تو پھر انفرادی ہی نہیں اجتماعی اور ریاستی سطح پر بھی مسلمان ہونا پڑے گا۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر کسی صورت نہیں چلے گا۔

لہٰذا دینی جماعتوں کا مقصد محض بڑے اجتماعات کا انعقاد ہی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ قائدین کا فرض ہے کہ لوگوں کو بتائیں کہ اُنہیں نہی عن المنکر کا فریضہ بھی ادا کرنا ہوگا، کیونکہ نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ اس باطل نظام کو بھی زمین بوس کرنا ہوگا، جس کی بنیاد ظلم پر ہے۔ مسلمان کا فرض ظلم مٹانا ہے۔ مسلمان اگر باطل نظام کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کرتا ہے تو پھر وہ اسی صورت حال سے دوچار ہوگا جس کا آج عالم اسلام اور پاکستان کو سامنا ہے۔ دینی جماعتوں کے اجتماع کا مقصد اقامت دین یعنی نفاذ اسلام کی تحریک کو مہمیز لگانا ہونا چاہیے نہ کہ سیاسی قوت کا اظہار، جس سے نہ پہلے کوئی مثبت نتیجہ نکلا، نہ اب نکلے گا۔ و ما علینا الا البلاغ!



فوج: بائنڈنگ فورس؟

ہمارا سیاسی، سماجی اور معاشی زوال رکنے نہیں پا رہا۔ ہمارے لیڈران حکومت میں ہیں یا اپوزیشن میں قومی سطح پر جگ ہنسائی کا باعث بن رہے ہیں۔ فریقین جمہوریت کو اپنا نصب العین اور ایمان قرار دیتے ہیں، لیکن جمہوری تماشا بھی ہم دنیا کو دکھا رہے ہیں۔ اسلام آباد کے ڈی چوک میں کنٹینر میں مقیم صاحب روزانہ یہ لیکچر دیتے تھے کہ اظہار رائے اور احتجاج اُن کا جمہوری حق ہے، کوئی یہ حق اُن سے چھین نہیں سکتا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اگرچہ اُن کے روزمرہ کے حکومت مخالف بیانات سے حکومت بہت تلملائی مگر اُن کا یہ حق چھینا نہیں۔ لیکن اب صاحب کنٹینر آگے بڑھ کر ایسا قدم اٹھانے جا رہے ہیں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوگی۔ اگر آپ شہر بند کر دیں گے تو کیا طالب علموں، مسافروں، تاجروں اور بیماروں کی حق تلفی نہ ہوگی؟ یورپ میں آزادی اظہار رائے کی مثال دینے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہاں کبھی شہر نہیں بند کئے جاتے۔ اُن کا بھی یہ اصول ہے کہ ایک فرد کی آزادی دوسرے شخص کے لئے آزاری کا باعث نہ بنے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ عمران خان اور تحریک انصاف کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا ہے اور وہ تصادم کی راہ پر چل نکلے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ تصادم اُن کے لئے زیادہ خطرناک ہے یا حکومت کے لئے، لیکن ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ ملک کے لئے انتہائی خطرناک اور ضرر رساں ثابت ہوگا۔

دوسری طرف حکومت بھی انتہائی بچکانہ رویہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ وہ صرف آج کا سوچتی ہے، کل کی اُسے کوئی فکر نہیں۔ جس دن دھرنے میں زیادہ لوگ ہوتے ہیں اُس دن وزراء کے بیانات مفاہمت آمیز ہوتے ہیں اور جس دن زیادہ لوگ نظر نہ آئیں تو حکومت اکڑفوں بن جاتی ہے۔ عمران خان کے مسلسل مطالبہ پر نہ چار حلقے کھولے نہ جوڈیشل کمیشن کی بات کی، لیکن

جب 14 اگست کو اسلام آباد میں بہت بڑے ہجوم کی آمد نظر آئی تو دو دن پہلے جوڈیشل کمیشن قائم کرنے کی سپریم کورٹ کو درخواست دے دی۔ عمران خان کے ساتھ طاہر القادری کا دھرنا طویل ہوا تو مذاکرات شروع کر دیئے اور چھ میں سے ساڑھے پانچ مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جونہی قادری صاحب نے ڈی چوک سے بوریا بستر لپیٹا، حکومت منحرف ہو گئی۔ عمران خان نے 30 نومبر کی تاریخ دی تو اُس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن جب 30 نومبر کو اسلام آباد میں بہت بڑا جلسہ ہوا اور عمران خان نے مختلف شہر بند کرنے کی دھمکی دے دی تو خود ہی مذاکرات مذاکرات کی رٹ لگا دی۔ حکومت عمران کی سیاسی قوت دیکھ کر آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی ہے۔ یہ سیاسی لحاظ سے انتہائی غلط طرزِ عمل ہے۔ حکومت حکومت ہوتی ہے۔ اُس کے پاس طاقت ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنا ہو یا بیگانہ اُسے بڑے اور سرپرست کا رول ادا کرنا چاہیے۔ سیاسی رویہ اور طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ اپوزیشن اگر کمزور بھی پڑ جائے تو فخر سے گردن اکڑانے کی بجائے اُس کے جائز مطالبات کو غور سے سنے اور جتنا ممکن ہو اس کمزوری کی حالت میں اُسے ریلیف دے۔ یہ رویہ آپ کی پوزیشن کو مزید کمزور کر دے گا۔ اپوزیشن کے اندر حکومت کے ہمدرد پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن کمزور کو اگر آپ دیوار سے لگائیں گے تو وہ آخری کوشش کے طور پر آپ کا منہ نوچنے کی کوشش کرے گا۔ تو پھر سب سے زیادہ نقصان حکومت کو پہنچنے کا خطرہ ہے بلکہ ریاست کی سلامتی پر بھی سوالیہ نشان لگ جائے گا۔

اُدھر سیاست دانوں کی کھینچ تان اور لڑائی سے ایک مرتبہ پھر امریکہ نے اپنا رخ سویلین حکومت سے موڑ کر فوج کی طرف کر دیا ہے۔ جس انداز کا راحیل شریف کو امریکہ میں پروٹوکول ملا ہے اور جس طرح اُن کے سات روزہ دورے نے طوالت پکڑی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ایک مرتبہ پھر خطرہ کی گھنٹی بج گئی ہے۔ راحیل شریف کے سرکاری دورہ کے دوران امریکی وزیر خارجہ جان کیری امریکہ میں موجود نہیں تھے، لہٰذا راحیل شریف کے سرکاری دورے کے اختتام پر اُن کا نجی دورہ شروع ہو گیا۔ درحقیقت یہ جان کیری کا انتظار تھا۔ جان کیری نے واپس آ کر غیر معمولی کام کیا کہ راحیل شریف کو اتوار کے روز سرکاری ڈنر دیا جو صرف امریکہ کا سرکاری دورہ کرنے والے سربراہان مملکت کو دیا جاتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ مہمان اور میزبان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی، لیکن جان کیری کا یہ بیان بڑا الارمنگ تھا کہ پاکستان کی فوج پاکستان کی بائنڈنگ فورس ہے۔ ہمیں اس بیان میں ایک بھرپور پیغام نظر آتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ راحیل شریف اس حوالہ سے

کس حد تک قائل ہوئے ہیں، لیکن ہم جان کیری کے اس بیان سے شدید اختلاف کرتے ہیں کہ پاکستان کی فوج پاکستان کی بائنڈنگ فورس ہے اور اس کی پُر زور طریقہ سے نفی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کی وفات کے بعد سے لے کر آج تک گویا ساڑھے سات سال سے فوج پاکستان میں بلاواسطہ یا بالواسطہ مقتدر قوت رہی ہے۔ کبھی پس پردہ اور کبھی بے پردہ۔ فوج کنٹرولنگ اور نیم کنٹرولنگ اتھارٹی کی حیثیت سے اس گاڑی کے سٹیرنگ پر موجود رہی۔ پھر بھی اگر پاکستان تباہی و بربادی کا شکار ہے، اور ہم اندرونی سطح پر باہم دست و گریبان ہیں اور خارجی سطح پر تنہا ہیں، تو ظاہر ہے اس صورت میں یہ سب کچھ فوج کا کیا دھرا ہے۔ لہٰذا فوج بائنڈنگ فورس کیسے ہوئی؟ پاکستان دولخت ہوا تو پاکستان کا صدر ایک فوجی تھا۔ سیاچین ہمارے ہاتھ سے نکلا تو حکمران فوجی تھا۔ کراچی میں لسانی قوت فوجی دور میں اُبھری بلکہ اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے فوج نے خود پیدا کی اور اُسے توانا کیا۔ وہ دن گیا آج تک کراچی میں امن قائم نہیں ہو سکا۔

ہمیں اس حقیقت کو بلا چون و چرا تسلیم کرنا ہوگا کہ پاکستان کی بائنڈنگ فورس صرف اور صرف اسلام ہے۔ اس بات کو وقتی طور پر چھوڑ دیجئے کہ ہم نے پاکستان حاصل کرتے وقت اللہ سے کیا وعدہ کیا تھا؟ اس بات کو بھی چھوڑ دیں کہ پاکستان میں 97 فی صد مسلمان بستے ہیں۔ ہمیں کوئی صرف یہ بتا دے کہ بنگال میں رہنے والے مسلمان کا پندرہ سو میل دور بسنے والے پٹھان سے کیا تعلق تھا کہ اس جغرافیائی فصل کے باوجود ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھنے کے باوجود مختلف بود و باش رکھنے کے باوجود انگریز حکمران اور ازلی دشمن ہندو اُنہیں ایک قوم تسلیم کرنے اور ایک ملک میں جمع کر دینے پر آخر کیوں مجبور ہوا؟ صرف اسی لئے کہ رنگ و نسل کے اختلاف کے باوجود اُن کا مذہب ایک تھا۔ اسلام نے ہمیں جوڑا لیکن جب ہم نے اس سیمنٹ کو درمیان سے نکال دیا تو پھر ہم ٹوٹ گئے، ہم بکھر گئے۔ آج بھی پاکستان اگر انتشار کی طرف بڑھ رہا ہے تو صرف اور صرف اس لئے کہ ہم اُس نظریہ کو عملی شکل نہیں دے رہے جو اس کی بنیاد ہے۔ فوجی اور عسکری لحاظ سے تو ہم اتنے مضبوط ہو چکے ہیں کہ اب ہمارے پاس چھوٹے سائز کے ایٹم بم ہیں۔ ہم revolving gun بنا چکے ہیں جو پہلے صرف اسرائیل کے پاس تھی۔ پھر ہم کانپ کیوں رہے ہیں؟ ہم پر لرزہ کیوں طاری ہے؟ ہر ایرا غیرا ہماری سلامتی پر سوال کیوں اٹھا رہا ہے؟ اور داخلی سطح پر

یہ خون خرابہ کیسا ہے؟ یقیناً جدید ترین ہتھیار اور ایک مضبوط فوج کسی ریاست کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن کسی نظریاتی ملک کے لئے فوج اور ہتھیار صرف اُس صورت میں نفع بخش اور استحکام کا باعث بن سکتے ہیں اگر اُس نظریہ کو جو ریاست کی بنیاد ہو اوڑھنا بچھونا بنایا جائے۔ جان کیری تو دشمن ہے، دشمنی کا حق ادا کرے گا۔ راحیل شریف، فوج، حکومت اور عوام تو پاکستان دوست ہیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ پاکستان کے لئے بائنڈنگ فورس صرف اور صرف اسلام ہے۔ لیکن ایسا اسلام نہیں جو صرف آئین کی کتاب میں موجود ہو بلکہ جو پاکستان کو حقیقی اسلامی فلاحی ریاست بنا دے اور جس کی پارلیمنٹ واقعتاً قرآن اور سنت کے خلاف کسی قسم کی قانون سازی نہ کر سکے اور صحیح معنوں میں شریعت محمدی ﷺ کا نفاذ ہو۔



کیوں قتل کرتے ہو بچوں کو!

اللہ رب العزت اپنے پاک کلام میں اپنی بہترین تخلیق انسان کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ○﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر یہ ہو جاتا ہے نچلوں میں سب سے نچلا''۔ یہ رب کائنات کی آخری اور مقدس ترین کتاب کے الفاظ ہیں۔ اس سے بڑھ کر حق اور سچ کیا ہو سکتا ہے۔ انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالیں، ایک ایک لفظ اور حرف اس کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن پاک کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے آج سے قریب قریب پندرہ سو سال پہلے اپنے محبوب بندے رحمۃ للعالمین ﷺ کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا، لیکن اس کلام برحق کے نزول سے ہزاروں سال پہلے بھی اور آج بھی انسان نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ وہ حقیقت میں اس کائنات کی بہترین مخلوق ہے۔ اس کا وجود نہ صرف دوسرے انسانوں بلکہ کل مخلوق کے لیے باعث رحمت ہے۔ اسی طرح انسان نے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ بھیڑیئے کو درندگی میں، اونٹ کو کینہ پروی میں اور لومڑی کو عیاری میں آسانی سے شکست دے دیتا ہے۔ جنگلی درندوں اور جانوروں میں بہت کم ہیں جو ہم جنس پر حملے کرتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیں، انسان نے انسان کا کس قدر خون بہایا ہے۔ انسان نے جنگیں صرف مذہب کے نام پر نہیں لڑیں بلکہ ہم مذہب لوگوں نے بھی ایک دوسرے کا جی بھر کر خون بہایا۔ ماضی بعید کے ذکر سے بات بہت طویل ہو جائے گی۔ ماضی قریب یعنی بیسویں صدی میں جنگ عظیم اول اور ثانی میں کروڑوں انسان جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دونوں بڑی متحارب قوتیں عیسائی تھیں، اگرچہ غیر عیسائی بھی جنگ میں شامل تھے۔ جنگ عظیم دوم میں وقت کی ابھرتی ہوئی سپر پاور امریکہ نے اس وقت کا جدید ترین ہتھیار یعنی ایٹم بم استعمال کیا اور اس انتہائی ہولناک ہتھیار سے

کسی میدانی فوج یا کسی فوجی چھاؤنی یا فوجی تنصیبات پر حملہ نہیں کیا گیا بلکہ دو ہنستے بستے شہروں پر یہ بم گرائے گئے اور وہ شہر آگ کے دریا بن گئے۔ انسانوں کا وہ حشر ہوا کہ ان کی لاشیں کیا ملتیں، اکثریت کی خاک اور راکھ بھی نہ مل سکی۔ آس پاس کی آبادیاں متاثر ہوئیں۔ خطرناک نوعیت کی بیماریاں پیدا ہوگئیں۔ عورتوں کے حمل گر گئے۔ گویا قیامت کا سماں پیدا ہوگیا۔

اگرچہ اس انسان کی سوچ میں تبدیلی آئی یا لومڑی صفت آلِ یہود نے ایک بات عیسائی دنیا کو سمجھائی اور جس سیکولرازم کا شور وغوغا انیسویں صدی سے سنائی دے رہا تھا اسے دنیا بھر میں بزور بازو مسلط کر دیا گیا۔ عیاری اور چالاکی کی انتہا یہ ہے کہ سیکولرازم جس کا مطلب ہمہ مذہبیت بتایا جاتا ہے اور مذہب کو انسان کا انفرادی معاملہ قرار دے کر ریاستی امور سے بے دخل کر دیا جاتا ہے، اسی سیکولرازم کا لبادہ اوڑھ کر عملی طور پر بدترین مذہبی تعصب روبہ عمل ہوگیا۔ انتظامی سطح پر اندرونی اور داخلی معاملات میں تو آپ کو کافی حد تک سیکولرازم یعنی مذہب سے بالاتر معاملہ نظر آئے گا، عسکری اور خارجی سطح پر نیام سیکولرازم کی ہی استعمال ہوتی ہے، لیکن اندر رکھی گئی تلوار مذہبی بنیاد پر اپنی کاٹ پوری قوت سے دکھا رہی ہے۔ یورپی یونین اس کی بہترین مثال ہے۔ ترکی نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے، تحریری تقریری ہر نوعیت کی گارنٹی مہیا کرنے کی درخواست دی گئی لیکن اس یونین کا وہ حصہ نہ بن سکا جو عیسائی ریاستوں کا اتحاد ہے۔ مذہب کے سوا کون سی چیز آڑے آئی تھی؟ سیکولرازم کے پرچارک غیر مسلم خصوصاً عیسائی اور یہودی متحد ہو کر اُمت مسلمہ کے خلاف میدانِ جنگ میں اُتر چکے ہیں۔

لطیفہ یا المیہ تو یہ ہے اس پر چاہے ہنسیے یا روئیے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عملی طور پر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم مسلمان اقوام ہیں، ہم امت مسلمہ نہیں ہیں۔ کوئی کہتا ہے ''سب سے پہلے پاکستان'' اور کوئی عرب نیشنلزم کی صدا لگا رہا ہے۔ لیکن دشمن قہقہے لگا کر کہتا ہے کہ نہیں نہیں تم اُمت مسلمہ ہو یا اُمت مسلمہ بننے کی خواہش رکھتے اور ہمیں تمہاری یہ خواہش بھی پسند نہیں۔ اور اگر یہ الفاظ کسی کے لبوں تک آ جائیں تو انہیں ناگوار گزرتے ہیں۔ یہ وہ المیہ ہے، یہ وہ داستانِ غم ہے جو ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو بارہا سنا چکے ہیں اور وہ آنکھوں سے بھی دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان حکمران اپنے تخت وتاج کی حفاظت میں امت مسلمہ کے دشمنوں کے بے دام غلام بن چکے ہیں۔ لیکن صرف حکمران ہی نہیں، عوام بھی ذاتی فائدے کے لیے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں اور ضمیر کو تھپکیاں دے کر میٹھی نیند سلا دیتے ہیں۔ پورے عالم اسلام کے حالات بیان کرنے کے لیے ضخیم

کتاب درکار ہے۔ چند گزارشات صرف پاکستان کے حوالے سے عرض کیے دیتے ہیں۔

یہاں حکومت اپنی رٹ قائم کرنے کے لیے مسلمانوں پر آتش فشانی کر رہی ہے۔ اور کچھ پاکستان اور اسلام دشمن عناصر اسلام کو ڈھال بنا کر اپنے مسلمان بھائیوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے ہیں۔ سکول میں داخل ہو کر بچوں کے خون سے ہولی کھیلنا یہ جنگلی درندوں سے آگے بڑھنے والا قدم ہے۔ درندہ پیٹ بھرنے کے بعد اپنے شکار سے بھی منہ پھیر لیتا ہے۔ یہ درندہ صفت انسان بچوں کو کرسیوں سے نکال نکال کر اور بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کرنے والے بچوں کے سروں کا نشانہ لیتے رہے اور ایک سو اکتیس بچوں کو شہید کر دیا۔ بعض کو ایسا زخمی کیا کہ وہ مفلوج اور محتاج زندگی گزاریں گے۔ ہم امریکا کی اُس وحشیانہ کارروائی کی بھی شدید مذمت کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں ڈمہ ڈولہ میں 84 قرآن پڑھتے معصوم بچے شہید ہو گئے تھے۔ اس کی مذمت ہم نے اس وقت بھی کی تھی، آج بھی کرتے ہیں اور جب تک سانس میں سانس ہے، منہ میں زبان اور ہاتھ میں قلم ہے، ہر سطح پر اس کی مذمت بلا خوف و خطر کرتے رہیں گے۔ لیکن اس کو جواز بنا کر بچوں کا قتل عام اور درندگی کا یوں مظاہرہ ہرگز ہرگز قابل قبول نہیں۔ یہ اسلامی فعل نہیں ہے۔ یہ انسانی فعل نہیں ہے۔ اس کا نہ شرعی جواز ہے نہ اخلاقی۔ نبی اکرم ﷺ نے مجاہدین اسلام کو جنگی ہدایات دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کرنا۔ ہمیں تو بلا جواز درخت کاٹنے کی اجازت بھی نہیں۔ آنکھیں بند کر کے بچوں کا قتل عام چاہے وہ فوجی سکول کے ہوں یا مدرسے میں پڑھتے ہوں ان کو معمولی سی زک پہنچانا بھی کچھ اور تو ہو سکتا ہے اسلام بہر حال نہیں ہے۔ ہم تو اس نبی ﷺ کی اُمت ہیں اور اس کے لائے ہوئے دین کو نافذ کرنا چاہتے ہیں، جو کوڑا پھینکنے والی عورت کی خیریت دریافت کرتے ہیں، جو یہودی بوڑھے کو گلی میں اس لیے کراس نہیں کرتے کہ اس کی داڑھی سفید ہے، جو سجدے سے سر اس لیے نہیں اٹھاتے کہ ایک معصوم کمر پر سوار ہے۔ بچوں کے حوالہ سے تو مسلم اور غیر مسلم کی تمیز بھی ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ جو رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے قتل کی اجازت اس لیے نہیں دیتے کہ یہ الزام آئے گا کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو قتل کروا رہے ہیں، جو اس صحابیؓ کو ڈانٹ دیتے ہیں جس نے کافر کو قتل کرنے سے ہاتھ نہیں روکا تھا جبکہ اُس نے مرنے کے خوف سے کلمہ پڑھ لیا تھا۔ ایسا دین بچوں کے قاتلوں کو ڈھال کیوں فراہم کرے گا؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ یہ جنگ اور امن کے حوالے سے الگ الگ ضابطے اور احکامات صادر کرتا ہے۔ میدانِ جنگ ہے تو حربی کافر کا قتل عظیم جہاد ہے اور مجاہد اسلام کو اجر وثواب سے لاد دیتا ہے۔ یہاں بڑھ چڑھ کر دشمن کے کشتوں کے پشتے لگانا ہوں گے۔ اور اگر امن ہے تو مسلمان کیا، ذمی کی حفاظت فرد اور ریاست دونوں کی ذمہ داری ہے۔ چہ جائیکہ کوئی مسلمان اپنے تئیں مسلمان کو قتل کر دے۔ پاکستان اس وقت جس خانہ جنگی کا شکار ہے ہم فریقین کو ایک ہی بات کہیں گے کہ خونریزی مت کرو، زبان سے بات کرو، وعظ کہو، اصلاح کرو اور اپنی تلوار اسلام دشمن کافر قوم کے لیے سنبھال کر رکھو۔ کسی کو اچھا لگے یا بُرا، ہم واشگاف الفاظ میں حق کہتے رہیں گے کہ اس خانہ جنگی سے کوئی فریق نقصان اور تباہی سے بچ نہیں سکے گا۔ فائدہ صرف اسلام دشمن قوتوں کو پہنچے گا۔ لہٰذا سب ہوش کے ناخن لیں، گریبان میں منہ ڈالیں اور دوسروں سے پہلے اپنی اصلاح کریں۔ جس پاک ہستی نے ہمیں ہر چھوٹی بڑی بات پڑھائی اور سکھائی ہے، کیا اسلام کے عادلانہ نظام کے قیام (جو آپ ﷺ کا اصل مقصد بعثت ہے) نے حوالہ سے آپ نے قوم کی رہنمائی نہیں فرمائی۔ کیا اس حوالے سے آپ کا اسوۂ حسنہ موجود نہیں؟ کیا سیرت نبویؐ سے یہ اخذ نہیں ہوسکتا کہ یہ نظام کیسے نافذ ہوگا۔ تو پھر دائیں بائیں کیوں دیکھ رہے ہو۔ فریقین کو سوچنا ہوگا اور فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ اب کسی کے پاس غلطی کی گنجائش نہیں۔ سابقہ غلطیاں ہمیں تباہی کے کنارے پہنچا چکی ہیں۔ مزید ایک غلطی بھی بحیثیت قوم ہمارا نام ونشان مٹا سکتی ہے، ہمیں دوسری اقوام کے لیے عبرت کا نشان بنا سکتی ہے۔ اللہ ہمیں تائب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اپنے فضل وکرم سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین ثم آمین



فوجی عدالتیں آخر کیوں؟

سانحہ پشاور نے کہرام مچا دیا۔ یقیناً یہ ایک ایسا سانحہ اور ایک ایسا حادثہ فاجعہ تھا جس نے پاکستان کے چہرے کو بری طرح مسخ کر دیا۔ قوم پر پڑنے والی اس مصیبت نے سقوطِ ڈھاکہ کا زخم ہرا کر دیا ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ دشمنانِ اسلام اور پاکستان نے پشاور میں بچوں کے قتل عام کے لیے 16 دسمبر یعنی سقوطِ ڈھاکہ ہی کا دن کیوں منتخب کیا۔ یہ محض اتفاق تھا یا اہل پاکستان کو کچھ یاد دلایا گیا ہے جس کا ذکر بھی ایک محبِ وطن پاکستانی کے لیے تکلیف دہ ہے۔ بہر حال اس المناک حادثہ پر حکومت، اپوزیشن، مذہبی جماعتیں، وکلاء اور سول سوسائٹی سب نے بہت چیخ و پکار کی۔ عمران خان جو دھرنا تاحیات، یا کم از کم شریفان کے اقتدار کے خاتمے تک، جاری رکھنے کی قسمیں اٹھا رہے تھے وہ بھی کنٹینر سے نیچے اتر آئے اور دہشت گردی کے خلاف ایک قومی پالیسی کی تشکیل کے لیے وزیراعظم ہاؤس جا پہنچے اور نواز شریف کی بغل میں تشریف فرما ہوئے۔ حکومت اور فوجی قیادت میں بھی اختلاف کی بڑی خبریں تھیں لیکن سانحہ پشاور کے ردعمل میں سیاسی اور عسکری قیادت سر جوڑ کر بیٹھ گئی۔ میڈیا پہلے ہی اس مہم کی قیادت کر رہا تھا کہ دہشت گردی کے خلاف قومی سطح پر اجماع ہونا چاہیے۔ عوامی سطح پر جذباتی اظہار کیا گیا اور دہشت گردوں کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ سامنے آیا۔ میڈیا نے دنیا کو مطلع کیا کہ 1965ء کے بعد قوم پہلی مرتبہ کسی ایشو پر اتنی متحد و متفق ہوئی ہے۔ سیاسی و عسکری قیادت کا اجلاس گیارہ گھنٹے جاری رہا۔ پھر قوم کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ پوری قیادت ایک ایکشن پلان پر متفق ہو گئی ہے اور وزیراعظم نے اس حوالہ سے قوم کو اعتماد میں لینے کے لیے خطاب فرمایا۔ انہوں نے عوام کے سامنے ایک بیس نکاتی ایکشن پلان رکھا اور قوم کو یہ خوشخبری دی کہ اس ایکشن پلان پر عمل درآمد ہونے کے بعد دہشت گردی کا

خاتمہ ہو جائے گا اور پاکستان امن و امان اور سکون و عافیت کا گہوارہ بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سانحہ کے بعد قوم پر کومہ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب حواس کچھ بحال ہوئے تو سیاسی شعور رکھنے والے اور غور و فکر کرنے والے لوگوں نے محسوس کیا، بلکہ برملا کہا بھی کہ اس ساری بھاگ دوڑ کا حاصل کیا ہوا ہے؟ یعنی یہ جو پہاڑ کھودا گیا تھا اس میں سے فوجی عدالتوں کے قیام کے سوا نکلا کیا؟ بہر حال صورت حال کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر جماعتوں نے فوجی عدالتوں کے قیام کو قبول کر لیا، یہاں تک کہ امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید نے ایک اخباری بیان جاری کیا جس میں فوجی عدالتوں کے قیام کو مشروط طور پر قبول کرنے کی بات کی۔ شرط یہ تھی کہ یہ عدالتیں عدل و انصاف کے اسلامی تقاضوں کو ملحوظ رکھیں گی گویا امیر تنظیم اسلامی نے ایک ایسی شرط عائد کر دی جس کا پورا کیا جانا پہلے بھی کبھی آسان نہ تھا، لیکن آج کی صورت حال میں تو ناممکن نظر آتا ہے، اور یہ تو اٹل حقیقت ہے کہ فوری اور سرسری سماعت والی مادر پدر آزاد عدالتیں انسانوں کو کبھی انصاف مہیا نہیں کرتیں۔ لہٰذا بالفاظِ دیگر امیر تنظیم اسلامی نے فوجی عدالتوں کے قیام کے حوالہ سے اپنی ناپسندیدگی کا واضح اعلان بھی کر دیا۔

ہماری رائے میں ہماری سیاسی اور فوجی قیادت پاکستان کا اصل مسئلہ اور پاکستان کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی تباہی و بربادی کی اصل وجہ اور سبب جان ہی نہیں سکی اور یہ اس قوم کی بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ یہ اس قوم کی بدبختی اور بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم اصل حل کی طرف آنے کی بجائے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ قارئین کے لیے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگرچہ عدل کرنا عدالت یعنی جج کا فرض ہے لیکن ہر جج اس قانون اور آئین کے دائرے میں فیصلہ کرنے کا پابند ہوتا ہے جو ریاست میں رائج ہو اور اسی آئین اور قانون کی رو سے اسے جج مقرر کیا جاتا ہے، لہٰذا وہ کسی صورت میں قانون اور آئین کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ تو پھر قابل اصلاح کیا ہے؟ تبدیلی کہاں آنی چاہیے؟ کس چیز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جانا چاہیے اور کس چیز کو مضبوطی سے پکڑنا ہو گا۔ سیدھی سی بات ہے کہ برائی کی اصل جڑ یہ فرسودہ اور گلا سڑا بدبودار نظام ہے جسے بدلا جانا چاہیے۔ اور یاد رکھیے جس طرح ایک انتہائی بوسیدہ اور کمزور عمارت کی مرمت نہیں کی جا سکتی، اسے ڈھا کر نئے سرے سے نئی بنیادوں پر تعمیر کرنا لازم ہے، اسی طرح ایک فرسودہ اور مفلوج نظام کو چھوٹی موٹی ترامیم اور cosmatic measures سے سودمند اور مثبت نتائج دینے والا نہیں بنایا جا سکتا۔ پاکستان کو اس عادلانہ اجتماعی نظام کی اشد ضرورت ہے جس میں غریب اور امیر میں امتیاز

نہ برتا جائے، جس کے تحت صاحب امر خادم ہوں مخدوم نہ ہوں، جس میں ریاست کے ہر شہری کا ہاتھ حکمرانوں کے گریبان تک پہنچ سکتا ہو، جہاں حکمران محافظ اور پہرہ دار ہو اور ریاست کا شہری چین کی نیند سوئے۔ ایسا نظام جس میں حکمران باپ کی طرح شفیق اور ماں کی طرح مہربان ہو اور جس میں صاحب نصاب کے لیے زکوٰۃ کا مستحق ڈھونڈنا ایک بڑا مسئلہ ہو۔ جہاں حق وصول کرنے کے لیے شہری کا صرف حق پر ہونا لازم ہو۔

انسانی تاریخ کا باریک بینی سے مطالعہ کیجیے۔ خلافت راشدہ یا کسی بھی دور میں جب اللہ اور اُس کے رسول کے احکامات نافذ العمل رہے، حکمرانوں کا طرزِ عمل ایسا ہی تھا اور دنیا حقیقت میں جنت کا نقشہ پیش کرتی رہی۔ یہ تو آئیڈیل صورت حال تھی، لیکن کمتر سطح پر وہ مسلمان حکمران بھی جو ایسے مثالی حکمران تو نہ تھے لیکن انہوں نے اپنے ہاں شریعت محمدی کو نافذ کیا وہاں امن و امان کی صورت حال کہیں بہتر تھی۔ شہری یوں ذلیل و خوار نہ تھا اور نہ عدل و انصاف یوں نایاب تھا جیسا آج پاکستان میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر کی سلامتی کا انحصار اس فطری اور الہامی عادلانہ نظام کے نفاذ پر ہے، لیکن پاکستان کو چونکہ ایک ریاست کی شکل دینے کے لیے اسلام ہی کو بنیاد بنایا گیا تھا لہٰذا پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست نہ بنانا اپنے بنیادی نظریہ سے انحراف ہے۔ یہ ایک اجتماعی جرم ہے جس کا ارتکاب پوری قوم خصوصاً قیادت نے کیا ہے۔ بہرحال اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے نہ کرنا یہ جسم اور روح کو الگ الگ کر دینے کے مترادف ہے۔ اور تاریخ کا سبق یہ ہے کہ نظریاتی موت جغرافیائی شکست و ریخت کا سبب بنتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اچھے اور دیانت دار منصف بھی ایک نیک اور صالح معاشرہ ہی فراہم کر سکتا ہے۔ آج موجودہ پاکستان میں معاشرہ جس ڈگر پر چل رہا ہے، عدالتیں سول ہوں یا فوجی انصاف کی فراہمی ممکن نہیں ہے، اِس لیے کہ دیانت و امانت کے حوالہ سے بانجھ معاشرے کے بطن سے جرأت مند اور انصاف پسند انسان کیسے جنم لے سکتے ہیں؟ یاد رہے زیادہ مقتدر اور بااختیار عدالتیں جب انصاف پر مبنی فیصلے نہیں کریں گی تو زمین پر فساد زیادہ پھیلے گا اور زیادہ ہولناک نتائج برآمد ہوں گے۔ لہٰذا اصل ضرورت اس نظام کو بلڈوز کرنے کی ہے جو انصاف کا خون کر رہا ہے، جو فیصلہ سناتے وقت بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب، حاکم اور محکوم میں فرق کرتا ہے۔ ایک سرمایہ دارانہ اور عملی طور پر اونچ نیچ کے قائل نظام میں جب جلد بازی میں سخت فیصلے ہوں گے تو ظلم میں اضافے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ❁❁❁

ناک کٹی جمہوریت سیکولرازم کی راہ پر گامزن

چند ہفتے پہلے جب عمران خان اور طاہر القادری اسلام آباد کے ڈی چوک میں اپنے اپنے کنٹینر پر کھڑے تھے، اسلام آباد میں روزمرہ زندگی معطل ہو چکی تھی۔ اِس وقت سپریم کورٹ کے جج بھی اپنی عدالت میں لمبا چکر کاٹ کر پہنچتے تھے۔ سفارتی سطح پر پاکستان بیرونی دنیا سے کٹ چکا تھا۔ یہاں تک کہ چین جیسے دوست ملک کے صدر کا دورہ بھی ملتوی کرنا پڑا۔ حکومت ہراساں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی بھی وقت ایمپائر کی انگلی اٹھ سکتی ہے۔ کسی وقت بھی ''میرے ہموطنو!'' جیسی آواز میڈیا پر گونجے گی اور بھاری بوٹ ایک بار پھر جمہوریت کو بُری طرح مسل کر رکھ دیں گے۔ اندرون خانہ کیا معاملات چل رہے تھے اِس سے قطع نظر، ظاہری طور پر جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ ''باغی'' نے ایک بار پھر بغاوت کی اور پانسا پلٹ دیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ باغی نے جمہوریت کے عشق میں اسمبلی کی رکنیت اور اپنی پارٹی کی صدارات قربان کی یا بمطابق ہمدردانِ تحریک انصاف وہ آغاز سے ہی planted تھا یا وہ کسی سودا بازی کا شکار ہوا۔ واللہ اعلم۔ بہر حال حکومت نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بلا لیا۔ اس اجلاس میں حکومت اور اپوزیشن کے ممبران نے جمہوریت کے عشق میں جو کچھ کہا وہ سننے کے قابل تھا۔ اور جس طرح جمہوریت کے چرنوں میں تن من دھن قربان کرنے کے دعوے کیے گئے، اُس پر بھارت کی سب سے بڑی، برطانیہ کی سب سے پرانی اور امریکہ کی سب سے طاقتور جمہوریت سب ہیچ اور کمتر محسوس ہو رہی تھیں۔ اور پاکستان جمہوریت کا باوا آدم نظر آ رہا تھا۔ پاکستان کی تاریخ کے اس طویل ترین مشترکہ اجلاس میں حکومت اور اپوزیشن کی پُر جوش اور ولولہ انگیز تقاریر سن کر ہمیں لگ رہا تھا کہ جمہوریت کی اصل تعریف تو یہ ہے کہ ''عوامی راج وہ ہے جو پاکستان میں ہے، پاکستان کے

لئے ہے اور پاکستان سے ہے۔'' قصہ کوتاہ دس بارہ روز کی تقاریر سے عوامی تاثر یہ تھا کہ یوں تو کسی کو چڑیل نہیں چمٹی، جیسے حکومت اور اپوزیشن کو جمہوریت چمٹی ہوئی ہے۔ اور شاید اُنہیں اب کبھی الگ نہیں کیا جا سکے گا۔

لیکن پھر کیا ہوا؟ جیسے 16 دسمبر 1971ء کو بھارت اور اُس کی تیار کردہ مکتی باہنی نے مشرقی پاکستان میں درندگی کا مظاہرہ کیا تھا، تینتالیس سال بعد اسی تاریخ کو ایسی ہی درندگی کا مظاہرہ پشاور میں ہوا اور ایک سو چونتیس معصوم بچوں کو وحشیانہ طریقے سے شہید کر دیا گیا۔ بچے بچے ہوتے ہیں اور اُن کی معصومیت کو دین و دنیا کے قانون میں تسلیم کیا جاتا ہے چاہے ڈومہ ڈولہ کے ہوں یا فوجی افسروں کے۔ اُن کے قاتل مسلمان تو کجا انسان کہلانے کے بھی قابل نہیں ہیں۔ ایسی حرکات کے ارتکاب سے یقیناً انسانیت شرمندہ ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کا ماضی اور حال ایسے واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ بہرحال پاکستان میں ہر چھوٹے بڑے نے سانحۂ پشاور پر جذباتی ردعمل کا اظہار کیا اور یہ توقع کے عین مطابق تھا۔ فوج تو اس حادثہ کا شکار ہوئی تھی، سیاسی سطح پر بھی طوفان برپا ہو گیا۔ سیاسی اور عسکری قیادت سر جوڑ کر بیٹھ گئی۔ یہاں تک کہ عمران خان جو چوبیس گھنٹے پہلے یہ کہہ رہے تھے کہ مطالبات تسلیم نہ ہوئے تو بقیہ ساری زندگی کنٹینر پر گزار دوں گا، فوری طور پر دھرنا چھوڑ کر حکومت کی بلائی ہوئی APC میں جا بیٹھے۔ طویل مشاورت ہوئی لیکن اس مشاورت اور مفاہمت سے برآمد کیا ہوا؟ صرف فوجی عدالتیں۔ حیرت ہے کہ وہ سیاست دان جو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں جمہوریت کے صدقے واری جا رہے تھے اور پارلیمنٹ کی خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے وہ بڑے بڑے کلہاڑے لے کر بیچاری جمہوریت پر چڑھ دوڑے اور پارلیمنٹ کا وہ حشر کیا کہ نائن الیون کو ٹوئن ٹاورز کا نہیں ہوا ہو گا۔ فوجی عدالتوں کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور عام عدالتیں کیا سپریم کورٹ جس کا ترجمہ ہم عدالت عظمیٰ کرتے ہیں اُسے بھی آئینی اور قانونی طور پر کہہ دیا گیا کہ تمہاری کیا اوقات ہے، تم فوجی افسروں کے فیصلوں کی سماعت بھی نہیں کر سکو گے۔ جمہوریت کے تین ستون ہوتے ہیں: عدلیہ انتظامیہ اور مقننہ۔ انتظامیہ اور مقننہ نے مل کر عدلیہ پر خودکش حملہ کیا اور اب تینوں شدید زخمی حالت میں پڑے ہیں اور فوج کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اس صورت حال پر ایک نوجوان نے جنہیں اُس کے گھر والے بھی سیاسی طور پر نابالغ قرار دے کر سیاسی وراثت سے شاید عاق کر چکے ہیں (ہماری مراد بلاول

بھٹو ہے) بہت اچھا تبصرہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ پارلیمنٹ نے ناک کٹوالی ہے۔ ہم صرف اس میں یہ اضافہ کریں گے کہ ناک صرف پارلیمنٹ کی نہیں، جمہوریت کی بھی کٹی ہے کہ وہ دہشت گردی کو روکنے میں بُری طرح ناکام ہوئی ہے، فوجی عدالتیں قائم کر کے جس کا اعتراف بھی کر لیا گیا۔ بہرحال ہمارے سیاستدان بڑے باذوق اور اعلیٰ ظرف کے مالک ہیں۔ لہٰذا وہ اسے بھی جمہوریت کا حسن قرار دے سکتے ہیں۔

اب آیئے، اس عجیب وغریب ترمیم کی طرف جو صرف بیالیس سال کے عرصہ میں کی جانے والی آئینی ترامیم میں اکیسویں نمبر پر سامنے آئی ہے۔ اس کے چیدہ چیدہ نکات ہم قارئین کے سامنے رکھ دیتے ہیں:

(1) صرف مذہب کا نام لے کر ہتھیار اٹھانے والوں کا مقدمہ فوجی عدالت میں پیش کیا جائے گا

(2) آرمی ایکٹ میں ترمیم سے فوجی عدالت اور اس کے فیصلوں کو سپریم قرار دے دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان فیصلوں کے خلاف کسی بھی عدالت حتیٰ کہ سپریم کورٹ میں بھی اپیل نہیں ہو سکتی اور اب سویلین بھی ملٹری کورٹس میں پیش ہوں گے۔

(3) صرف دہشت گرد ہی نہیں بلکہ ان کی مالی، اخلاقی یا کسی نوعیت کی امداد بھی قابل گرفت ہوگی۔ ایسے تمام افراد کا مقدمہ فوجی عدالت میں چلے گا۔

(4) دنیا بھر میں استغاثہ ملزم کو مجرم ثابت کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ فوجی عدالت میں پیش ہونے والا ہر شخص مجرم تصور ہوگا جب تک وہ خود کو معصوم ثابت نہ کر دے۔

(5) مقدمہ کی کارروائی بند کمرہ میں ہوگی۔ مدعا علیہ کو بھی قانونی اعانت فوج مہیا کرے گی۔ یعنی وہ اپنی مرضی کا وکیل بھی نہیں کر سکے گا اور تمام جج بھی فوجی ہوں گے۔

(6) POP یعنی Protection of Pakistan بل جو اب قانون کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اُسے بھی اس ترمیم کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ یعنی تمام شہری حقوق سلب کر لئے گئے ہیں۔

(7) یہ ترمیم دو سال کے لئے ہے۔ اُس کے بعد خود بخود ختم ہو جائے گی۔ لیکن قومی اسمبلی میں سادہ اکثریت سے اس کی مدت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ (بالفاظ دیگر یہ اب جان چھوڑنے والی نہیں۔)

اس آئینی ترمیم کا پہلا نکتہ ہی ترمیم کرنے والوں کی نیت جاننے کے لئے کافی ہے کہ یہ درحقیقت مذہب کی بات کرنے والوں کے خلاف کریک ڈاون کا آغاز ہے اور اس ترمیم سے لسانی اور علاقائی بنیادوں پر دہشت گردی کرنے والوں کے حوصلے بڑھیں گے۔ کیونکہ بین السطور اُنہیں لائسینس ٹو کل (licence to kill) دے دیا گیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے تمام جمہوریت پسندوں اور انسانی حقوق کے علمبرداروں نے حکومت پاکستان کو اس ترمیم پر مبارک باد دی ہے اور خوشی کا اظہار کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں عالمی اسلام دشمن قوتوں کا ایجنڈا کھل کر سامنے آ گیا ہے اور وہ پاکستان کے حکمرانوں کو سیکولر ازم کی راہ پر ڈالنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملحد سرمایہ دارانہ نظام نے جو انسان کے استحصال کے حوالہ سے تاریخ کا بدترین نظام ہے دنیا کو جمہوری طرز حکومت کو بڑا خوشنما اور دیدہ زیب بنا کر پیش کیا ہے اور اُسے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہوئے الحاد اور خدا دشمن تہذیب کو دنیا بھر میں مسلط کر رہا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلط کر چکا ہے۔ یہ نظام ایسا معاشی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے، جس سے اقلیت اکثریت کا خون نچوڑتی ہے۔ یہ اکثریت کو ہلو کے بیل کے طرح جُتی رہتی ہے اور اس کی محنت کا پھل اقلیت کھاتی ہے اور دوسری طرف ایسا معاشرتی نظام قائم کر دیا ہے جس سے خاندان اور خاندانی زندگی کا تصور تہس نہس ہو گیا ہے۔ عریانی اور بے حیائی کو فیشن اور جدیدیت کا سمبل بنا دیا گیا ہے اور چونکہ مذہب خصوصاً اسلام اس کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے، لہٰذا یہ سب کچھ مذہب کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے کیا جا رہا ہے اور اس حوالہ سے مسلمان ممالک کو فوکس کیا گیا ہے۔ عراق، افغانستان اور لیبیا پر حملہ کر کے مغرب مذموم عزائم کی تکمیل کر رہا ہے اور مصر میں فوج کو اس ملحدانہ ایجنڈے کی تکمیل پر لگا دیا گیا ہے اور اب پاکستان کی باری آ چکی ہے۔ دینی جماعتیں اِس کے خلاف کھل کر میدان میں نہ نکلیں تو خاکم بدھن پاکستان دوسرا مصر یا لیبیا بن سکتا ہے۔



تہذیبوں کا تصادم

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ چارلی ہیڈو کی قلمی درندگی کسی خاکہ ساز کے ذہنی اور اخلاقی افلاس کا نتیجہ تھی یا امریکی پادری ٹیری جونز کی قرآن عظیم کے بارے میں دریدہ دہنی محض اس کا ذاتی فعل تھا تو اسے اپنی اس غلط فہمی کو دور کر لینا چاہیے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی دنیا خصوصاً یورپ اور امریکا ایک طے شدہ ایجنڈے پر کام کر کے مسلمانوں پر کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتے ہیں۔ ان بے ہودہ اور مذموم حرکات کا مقصد عالم اسلام کو کھینچ کر میدانِ جنگ میں لانا ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اور ایک لحاظ سے درست سمجھتے ہیں کہ اس وقت مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں پسماندگی کی وجہ سے عسکری سطح پر ان سے بہت کمزور ہیں۔ اکثر مسلمان ممالک سیاسی عدم استحکام سے بھی دوچار ہیں۔ لہٰذا یہ وقت ہے کہ انہیں ملیامیٹ کر دیا جائے، یا کم از کم تقسیم در تقسیم کے عمل سے انہیں پورے طور سے غلامی میں جکڑ لیا جائے۔ یہ تقسیم جغرافیائی بھی ہو اور مذہبی بنیادوں پر بھی کی جائے اور مغربی تہذیب دنیا پر مکمل طور پر مسلط اور غالب ہو جائے۔ پھر یہ کہ سیاسی اور عسکری تسلط کے ذریعے مسلمان ممالک کی معدنی دولت بھی اپنے مفاد میں استعمال کی جائے۔ گویا وہ عیسائی اور مسلمان کا دنیا میں آقا اور غلام کا رشتہ ہمیشہ کے لیے قائم کرنا چاہتے ہیں۔

یہاں ایک بات قابل وضاحت ہے کہ آخر وہ اتنی کمزور منقسم اور منتشر اُمت سے خوفزدہ کیوں ہیں؟ اس لیے کہ وہ جانتے ہیں اور یقیناً درست اور صحیح جانتے ہیں کہ اس امت کے پاس ایسا نظریہ ہے، ایسا نظام ہے اور وہ ایسا جذبہ پیدا کرتا ہے کہ کل کلاں اگر مسلمان اس نظریہ کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہو گئے اور اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی قائم ہو گیا تو غیر مسلم دنیا کی حیثیت تو اس طوفان کے سامنے صحرا کے ایک ذرّے اور شجر سے جدا ہونے والے پتہ کی سی ہو گی۔ یہی خوف بش

کے ذہن وقلب پر چھایا ہوا تھا کہ اس کی زبان سے سچ پھسل گیا اور اس نے ''کروسیڈ'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ لہٰذا یورپ اور امریکا اس حوالہ سے جلدی میں ہیں کہ اس سے پہلے کہ مسلمان وہ راہ اختیار کرلیں اور ایک سیسہ پلائی دیوار بن جائیں' ان سے نمٹ لیا جائے۔ چنانچہ اس جنگ کے لیے پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کو ہراول دستہ کی شکل دی گئی ہے اور وہ بڑھ چڑھ کر اشتعال انگیزی کر رہے ہیں۔ اس شعبہ میں یہودی ان کے دست راست کا کردار ادا کر رہے ہیں اور صورت حال یہ بن گئی ہے کہ عالم اسلام کے خلاف عیسائی عسکری قوت کو یہودی سرمایہ اور یہودی ذہن کی مکمل معاونت حاصل ہے۔

ہم نے آغاز میں رقم کیا ہے کہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی دنیا عالم اسلام پر کاری اور فیصلہ کن ضرب لگانا چاہتی ہے۔ ہمارا یہ یقین اور وثوق بے بنیاد نہیں ہے۔ ہم ماضی بعید کو بالکل فراموش بھی کر دیں اور اس حوالہ سے اپنی آنکھیں بند بھی کرلیں اور صرف ماضی قریب پر ہی نگاہ ڈالیں تب بھی ہماری یہ بات ثابت ہو جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ربع صدی پہلے سرد جنگ کے خاتمے پر امریکا اور دوسری عیسائی قوتوں نے تہذیبوں کے تصادم (Clash of Civlizations) کی اصطلاح ایجاد کی اور ایک جاپانی نژاد امریکی فرانسس فوکویاما نامی شخص نے جو ہارورڈ یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا 1992ء میں End of the History and the last man کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھا جس کا خلاصہ اور نچوڑ یہ تھا کہ مغربی تہذیب اور جمہوریت انسانی اجتماعی زندگی کی معراج اور اختتام ہے۔ اب نہ کوئی تہذیب اس کے مقابل آسکتی ہے اور نہ مستقبل میں اس سے برتر کسی تہذیب کا اپنایا جانا ممکن ہوگا۔ لیکن اگلے ہی سال 1993ء میں ہارورڈ یونیورسٹی ہی کے پروفیسر سموئیل پی ہنٹنگٹن نے جو فوکویاما کے استاد بھی تھے، فارن افیئر میگزین میں (جو امریکا میں پالیسی سازی کے حوالہ سے ایک اہم معاون تصور کیا جاتا ہے۔) clash of civilizations کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھا جس میں پہلی مرتبہ ''تہذیبوں کے تصادم'' کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ہنٹنگٹن نے بہت سی تہذیبوں کا ذکر کیا لیکن مغربی تہذیب کے علاوہ صرف اسلامی تہذیب اور sino یا کنفیوشین تہذیب کو زندہ اور جاندار تہذیبیں قرار دیا۔

1996ء میں ہنٹنگٹن نے Clash of Civilizations and remarking of new world order کے نام سے ایک شہرۂ آفاق کتاب لکھی اور تہذیبوں کے تصادم کی کھل کر

بات کی۔اس پر تبصرہ کرتے ہوئے Edward wadie Said نامی ایک امریکی نے جو مسلمان ہو چکا ہے' کہا کہ یہ دنیا پر اپنا سیاسی عسکری اور تہذیبی تسلط جمانے کا عذر ہے۔اس موجودہ سیناریو میں یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ اِس لیے کہ عالم اسلام کمزور اور پسماندہ نظر آنے کے باوجود نظریاتی طور پر انتہائی مستحکم بنیاد رکھتا ہے اور دنیا کو ایک غیر استحصالی قابل عمل نظام دے سکتا ہے۔ لہٰذا کسی وقت بھی مغربی تہذیب اور مغربی جمہوریت کے لیے خطرہ بن سکتا ہے اور چینی تہذیب غیر نظریاتی ہونے کے باوجود اقتصادی اور معاشی طور پر ایک انتہائی مضبوط اور مستحکم تہذیب ہے جو مغرب کے معاشی استحکام کے لیے خطرہ بن کر ابھر رہی ہے۔مغرب متحد ہو کر انسانی حقوق اور آزادی رائے کی آڑ میں ان دونوں تہذیبوں کے خلاف صف آراء ہے،لیکن اس کا پہلا اور فوری ہدف عالم اسلام ہے۔

بدقسمتی سے مسلمان حکمرانوں اور میڈیا کو مغرب طاقت اور سرمایہ کے زور پر اپنا ہمنوا بلکہ اتحادی بنا چکا ہے۔ان حکمرانوں کو صرف اپنی کرسی سے غرض ہے اور صحافیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ڈالر کی چمک سے اندھی ہو چکی ہے لیکن عوامی سطح پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت مغرب کے عزائم سمجھ چکی ہے۔یہ عظیم اکثریت امریکا اور اس کے یورپی اتحادیوں کو اپنا دشمن جانتی ہے،لیکن بے بس ہے اور اس پر کسی قدر مایوسی چھائی ہوئی ہے،لہٰذا خاموش رہنے پر مجبور ہے۔البتہ عالم اسلام میں مختلف گروہوں نے غیر ریاستی سطح پر سفید سامراج کے خلاف ہتھیار اٹھایا ہے۔کوئی اسے حکمت عملی اور لائحہ عمل کی غلطی قرار دے سکتا ہے،کوئی اسے قبل از وقت اور غیر منظم کہہ سکتا ہے لیکن ہر باضمیر اور ذہنی طور پر آزاد مسلمان یہ گواہی دے گا کہ انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمن کو صحیح طور پر شناخت کیا ہے۔ہم بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ دشمن کی صحیح پہچان کی گئی ہے،لیکن اس سے نمٹنے کے لیے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا جا رہا۔گویا بیماری کی تشخیص تو درست ہے،علاج صحیح نہیں ہو رہا۔دنیا میں اس وقت ستاون اسلامی ممالک ہیں۔اگر کسی ایک ملک میں اسلام بحیثیت نظام قائم ہو جائے یعنی ایک ایسی اسلامی فلاحی ریاست وجود میں آ جائے جس میں قرآن وسنت کو حقیقت میں اور عملی طور پر بالادستی حاصل ہو،پھر اس کا دائرہ وسیع کر کے ملت اسلامیہ میں نظامِ خلافت قائم کیا جا سکتا ہے۔لیکن بلین ڈالر کا سوال یہ ہے کہ اسلامی نظام کو قائم کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نہ بلٹ سے قائم ہو سکتا ہے اور نہ بیلٹ سے۔اسے صرف اور صرف منہج نبوی کو اپنا کر

ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔ ایسی اسلامی ریاست کو اللہ کی مدد اور نصرت حاصل ہوگی۔ لہٰذا کوئی تہذیبوں کے تصادم کے نام سے ہم پر اپنی تہذیب مسلط کرنے کی کوشش کرے یا میدانِ جنگ میں صلیبی جنگ کے نام سے ہم سے پنجہ آزمائی کرے، عبرت ناک شکست سے دوچار ہوگا اور فتح و نصرت اسلام کے پروانوں کا مقدر رہوگی ان شاء اللہ!

قصہ کوتاہ کسی طاقت سے ڈرنے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ کسی سے ڈکٹیشن ہی لینے کی ضرورت ہے۔ اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنی تمام تر توانائیاں یعنی تن من دھن منہج نبوی کی پیروی کرتے ہوئے اسلام کے اِس عادلانہ نظام کے قیام کے لیے لگا دی جائیں، جو یقیناً ناقابل شکست ہے۔ یقین جانئے، سورج مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے یا سرد پڑ سکتا ہے لیکن اللہ کی رسی تھامنے والے اور نبی اکرم ﷺ کی سنت کو اپنانے والے کسی میدان میں ناکام نہیں ہو سکتے۔ یہ مقابلہ تہذیبوں کے تصادم جیسے کسی بھی عنوان سے تحریر و تقریر کے ذریعے علمی سطح پر ہو یا کھلے میدان میں خونریز معرکہ ہو، فتح اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کا ہی مقدر رہوگی! ان شاء اللہ



امریکا بھارت گٹھ جوڑ نیا نہیں، پرانا ہے!

امریکا کے صدر بارک اوباما نے بھارت کا دوروزہ دورہ کیا اور 26 جنوری کو بھارت کے یوم جمہوریہ کی تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ اس دوران پاکستان کے تمام نیوز چینلز پر ٹاک شوز میں زور وشور سے یہ کہا گیا ہے کہ امریکا نے اب پاکستان سے منہ موڑ لیا ہے اور بھارت سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ یہی کچھ پاکستان کے پرنٹ میڈیا میں بھی شائع ہوتا رہا۔ یہ گلہ بھی شدت سے کیا گیا کہ دہشت گردی کی جنگ میں پاکستان نے جس طرح صف اوّل کے اتحادی کا رول ادا کیا اور کر رہا ہے، اُسے بھی امریکا نے نظر انداز کر دیا اور صدر اوباما پاکستان کو چند گھنٹے دینے کے روادار بھی نہ ہوئے۔ حالانکہ پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں پچاس ہزار سے زاید سویلین اور فوجی جوانوں کی قربانی دی اور زبردست مالی نقصان برداشت کیا، یہاں تک کہ آج پاکستان دیوالیہ ہونے کے قریب ہے۔ ہم یہ سب کچھ حیرت سے پڑھ، سن اور دیکھ رہے ہیں اور یہ سوچ رہے ہیں کہ یا تو اس قوم خاص طور پر اس کے ذہین طبقات کی یادداشت بڑی کمزور ہے یا اس کی سوچ بڑی سطحی ہے اور یہ بھولے بادشاہوں کا ملک ہے۔ غور وفکر کرنے اور معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت کا بُری طرح فقدان ہے۔

ہمارا اصل اعتراض اور ہماری حیرت تجزیات میں استعمال ہونے والے لفظ ''اب'' پر ہے۔ گویا پہلے امریکا پاکستان کا مخلص دوست اور بھارت کا حریف تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم سے لے کر آج تک کی پاک بھارت تعلقات کی تاریخ کا جائزہ لیں اور اس میں امریکی کردار کو جانچیں تو ہر صاحبِ نظر اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ امریکا ظاہری طور پر پاکستان کا دوست ہونے اور اُس کے ساتھ مختلف معاہدات میں بندھے ہونے کے باوجود در پردہ بھارت سے دوستی نبھاتا رہا اور پاکستان کو کسی نہ کسی انداز میں نقصان پہنچاتا رہا۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں دوست کے روپ میں دشمنی

کرتا رہا۔ فرق صرف اتنا واقع ہوا کہ سوویت یونین کی شکست وریخت اور کمیونزم کے خاتمے سے پہلے یہ سب کچھ ڈھکا چھپا اور خاموش انداز میں ہوتا تھا اور اب کھلم کھلا اور چڑانے کے انداز میں ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ پہلے چونکہ راز داری مقصود تھی اور یہ بھارت و امریکا دونوں کے مفاد میں تھی، لہٰذا دوستی اور دشمنی کے اس تعلق کو ایک حد سے بڑھنے نہیں دیا جاتا تھا۔ بھارت نے اُس دور میں غیر جانبداری کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور وہ اس روپ میں روس کو بھی بٹورتا رہتا تھا۔ ہم اللہ کے فضل و کرم سے اپنی اس رائے کو کہ امریکا کس طرح پاکستان کا ظاہری دوست اور بھارت کا ظاہری حریف تھا، قارئین کو تاریخ کے آئینہ میں مختصراً دکھا سکتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ فاتح کی حیثیت سے سامنے آیا تھا، لیکن تکنیکی لحاظ سے وہ پسپا ہوا، امریکا سپر طاقت کی حیثیت سے ابھرا اور گریٹ برطانیہ کی عظیم سلطنت سکڑنے لگی۔ امریکا نے اپنے عالمی مفادات کے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے نام سے ایک عالمی تنظیم قائم کی جس کا ہیڈ کوارٹر امریکا کی ریاست نیویارک میں بنایا گیا۔ روزِ اوّل سے اقوام متحدہ نے امریکا کی ایک کنیز کا رول ادا کیا۔ اس نام نہاد اقوام متحدہ میں امریکا کی مرضی کے بغیر پتہ بھی جنبش نہیں کرتا۔ 1948ء میں جب بھارت کشمیر میں قبائلیوں کے ہاتھوں شکست کھا رہا تھا، بھارت نے اسی اقوام متحدہ میں پناہ لی۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے کشمیر کے بارے میں پاکستان کو جھوٹی تسلی دلائی اور کشمیر میں قبائلیوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا گیا۔ 1962ء میں بھارت نے امریکا سے اسلحہ حاصل کرنے کے لیے چین سے سرحدی جھڑپوں کا ڈراما رچایا۔ بھارت کی توقع کے خلاف چین نے انتہائی سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ بھارت نے یہ سوچ کر کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں کشمیر سے فوجیں نکال کر چین کے بارڈر پر بھیج دیں۔ چین نے پاکستان کو مشورہ دیا کہ سنہری موقع ہے کشمیر میں آپ کو واک اوور مل جائے گا، لیکن پاکستان نے ایک بار پھر امریکا سے دھوکہ کھایا۔ امریکی یقین دہانی پر کہ بھارت جنگ کے بعد کشمیر پر مذاکرات کرے گا' یہ سنہری موقع کھو دیا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ مذاکرات کا یہ جھوٹ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بولا گیا تھا۔ بھارت اور امریکا نے مل کر اس موقع پر پاکستان کو بے وقوف بنایا تھا۔ پاکستان امریکا کا سیٹو اور سینٹو میں اتحادی تھا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران امریکا نے دونوں کی دفاعی امداد بند کر دی۔ اس کا اصل نقصان تو پاکستان کو ہوا، اس لیے کہ پاکستان امریکا سے اسلحہ حاصل کر رہا تھا، جبکہ بھارت روس سے اسلحہ حاصل کرتا تھا،

لہٰذا اس پر پابندی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ 1971ء کی جنگ میں چھٹے بحری بیڑے کا شوشہ چھوڑ دیا گیا، جو نہ آنا تھا نہ آیا۔ بعد ازاں ہنری کسنجر جو اُس وقت امریکا کے وزیر خارجہ تھے، انہوں نے انکشاف کیا کہ پاکستان کو دولخت کرنے میں امریکا کی سی آئی اے نے بھارت سے مکمل تعاون کیا تھا۔ 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کو امریکا کی مالی اور اخلاقی حمایت حاصل تھی، کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو امریکا کے انتباہ کے باوجود پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ سوویت یونین نے جب افغانستان پر حملہ کرنے کی حماقت کی تو امریکا نے پاکستان سے افرادی اور جغرافیائی مدد حاصل کر کے سوویت یونین کو شکست و ریخت سے دوچار کر دیا اور دنیا کی واحد سپر پاور بن گیا۔ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد اس علاقہ سے مکمل طور پر لاتعلقی اختیار کر لی، لیکن اس جنگ کے مضر اثرات نے پاکستان کو بری طرح متاثر کیا۔ خاص طور پر افغانستان میں مرکزی حکومت قائم نہ ہونے سے قوت کا خلا پیدا ہوا جس سے اسلحہ مافیا اور ہیروئن مافیا نے جنم لیا جو افغانستان کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بربادی کا باعث بھی بنا۔ نائن الیون کے بعد افغانستان میں اپنی جنگ کو زبردستی پاکستان میں داخل کر دیا۔ بھارت کو افغانستان میں ضرورت سے کہیں زیادہ قونصل خانے کھولنے کی اجازت دی اور دونوں ممالک پاکستان کے اندر دہشت گردی کا ایسا کھیل کھیل رہے ہیں جس نے پاکستان کو جہنم بنا دیا ہے۔ یہاں بھائی کو بھائی سے لڑا دیا ہے۔ پاکستان قبائلیوں پر بمباری کر کے انہیں خون میں نہلا رہا ہے اور جوابی کارروائی میں دہشت گردی ہو رہی ہے جس سے معصوم لوگ اور چھوٹے چھوٹے بچے خون میں لت پت ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ امریکا نے اب ہم سے منہ موڑ لیا ہے۔ فرق صرف یہ واقع ہوا ہے کہ پہلے امریکا دوست کے روپ میں پاکستان کو نقصان پہنچا رہا تھا، اب وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے، کیونکہ وہ سمجھ چکا ہے کہ موجودہ کمزور اور لاغر پاکستان اور اس کی بے ضمیر، بددیانت اور بزدل قیادت اب اتنی سکت بھی نہیں رکھتی کہ وہ احتجاج یا اظہار ناراضگی کے لیے زبان کھول سکے۔

اب آیئے، صدر بارک اوباما کے حالیہ دورہ بھارت کی طرف۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس دورہ کے دو مقاصد تھے: ایک ظاہری اور ایک خفیہ۔ ظاہری طور پر جو معاہدے عمل میں آئے ہیں، ان کے مطابق سول جوہری توانائی میں معاہدہ فائنل ہو گیا ہے اور یہ بھارت کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اسی طرح تجارتی اور صنعتی معاہدوں میں دونوں ممالک کا فائدہ ہوگا، البتہ سیاسی سطح پر دو معاملات

میں امریکا نے بھارت کو محض لالی پوپ دیا ہے۔ ایک یہ کہ اسے سلامتی کونسل کا مستقل ممبر بنانے میں امریکا تعاون کرے گا اور دوسرا یہ کہ اسے جوہری سپلائرز گروپ میں شامل کر لیا جائے گا۔ یہ دونوں امور ممکن نہیں، اس لیے کہ ان دونوں جگہ پر چین براجمان ہے۔ وہ سلامتی کونسل میں اس کی نشست کو لازماً ویٹو کر دے گا اور سپلائرز گروپ میں شمولیت کے لیے سب کو راضی کرنا پڑے گا۔ چین وہاں بھی بھارت کے راستے کی رکاوٹ بنے گا۔

آخر میں ہم اپنے ملک میں موجود عاشقانِ امریکا کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ امریکا اور بھارت فطری حلیف ہیں، دونوں میں اسلام دشمنی ایک مشترک فیکٹر ہے۔ بھارت کی پاکستان دشمنی کی کئی اور وجوہات بھی ہیں، وہ تو اس کے وجود ہی کے خلاف ہے، کیونکہ پاکستان ہند کی مقدس سرزمین، جسے ہندو ماتا کی حیثیت دیتا ہے، کا سینہ چیر کر بنایا گیا تھا اور امریکا پاکستان کا اُس وقت تک دوست نہیں بن سکتا یا اس کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا جب تک پاکستان کا اسلام سے کوئی بھی تعلق اور واسطہ ہے۔ لہٰذا پاکستانیوں کو اسلام اور امریکا میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ کم از کم پاکستان کو یہ اعلان تو ضرور کرنا پڑے گا کہ ہمارا نظریہ پاکستان سے عملی طور پر کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ امریکا سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں اتنا حساس اور محتاط ہے کہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ دنیا کو کنٹرول کرنے میں یہ نظام اس کا واحد اور مفید ترین ہتھیار ہے، لہٰذا اس نظام کو کہیں دور سے اور انتہائی معمولی نوعیت کا بھی خطرہ لاحق ہونے کا ذرہ برابر خدشہ ہوگا تو وہ آگے بڑھ کر اسے کچلنے کی کوشش کرے گا۔ اسے وہ اپنی سلامتی کا مسئلہ قرار دیتے ہوئے اعلانیہ کہتا ہے کہ ہم اس صورت میں pre-amptive قدم اٹھائیں گے۔ افغانستان کی اسلامی حکومت کو تباہ و برباد کرنا اور پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے لیے آخری حد تک جانا اسی سٹرٹیجی کا حصہ ہے۔ امریکا دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم کر کے اسے نیپال بھوٹان کی طرح بھارت کی محتاج ریاست بنانا چاہتا ہے۔ امریکی صدر کے دورے کا خفیہ مقصد یہی ہے کہ اس حوالہ سے امریکا اور بھارت مشترکہ لائحہ عمل اختیار کریں۔ آنے والے وقت میں پاکستان میں دہشت گردی بڑھے گی۔ کراچی میں حالات مزید خراب ہوں گے اور یہ سب کچھ امریکا بھارت گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہوگا۔ تاریخی حقائق یہ ہیں کہ امریکا شروع سے ہی پاکستان دشمنی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ جوں جوں

پاکستان سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب امریکا اظہار دشمنی کو چھپانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن حکیم پندرہ سو(1500) سال پہلے ہی مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے برملا یہ اعلان کر چکا ہے کہ یہود و نصاریٰ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا یہ ایک اٹل حقیقت ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں! پاکستان کی مقتدر قوتوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اسی حقیقت کی روشنی میں اندرونی و بیرونی سطح پر پالیسی سازی پر متفق اور یکسو ہو جائیں اور اس بات کا ادراک کریں کہ امریکا بھارت گٹھ جوڑ درحقیقت ایک ایسی اسلامی ریاست کے خلاف ہے جو ایٹمی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔



.....ہاں باقی وہ رہ جائے گا

جماعت کی تعریف شاید اس سے بہتر ممکن نہ ہو کہ یکساں ہدف رکھنے والے ہم مقصد افراد کا ایسا گروہ جو کسی ایک نظم سے منسلک ہو۔ یہ نظم جماعت کے دستور کے تحت قائم ہوتا ہے، اور تمام وابستگان جماعت اپنی ذمہ داری اس دستور کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ وہ دستور ہی کے حوالے سے نظم بالا کو جوابدہ ہوتے ہیں اور اُن سب کی اصل وفاداری جماعت کے دستور کے ساتھ ہوتی ہے۔ جماعت کا سربراہ بھی دستور کا پابند ہوتا ہے۔ آج کے دور میں دنیا بھر میں جماعت سازی کا یہی چلن ہے۔ آج دنیا میں حصول قوت واقتدار کے لئے سیاسی داؤ پیچ جو حیثیت اختیار کر گئے ہیں اُن کی بنا پر بھی ایک کامیاب سیاست دان بننے کے لئے کسی باقاعدہ سیاسی جماعت سے منسلک ہونا ناگزیر ہے۔ دنیا کے اکثریتی حصہ میں چونکہ سیکولرازم ایک نظام کی حیثیت سے تسلط حاصل کر چکا ہے، اس ماحول اور پس منظر میں مذہب اور ریاست بہتے دریا کے دو کناروں کی طرح ہیں، جو کبھی مل نہ سکیں گے۔ لہٰذا آج کسی سیاسی کارکن کے دو ہی بڑے مقاصد ہو سکتے ہیں: اولاً ملک و قوم کی خدمت کی جائے اور اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ ڈالا جائے۔ دوسرا اقتدار یا سیاسی قوت کے بل بوتے پر ذاتی مفادات کی تکمیل کی جائے۔

سیاسی جماعتوں کے وجود کے حوالہ سے برصغیر یورپ سے بہت پیچھے ہے۔ یہاں مغل حکمرانوں کا خاتمہ ہوا تو سات سمندر پار سے گورے آ گئے۔ 1857ء تک اہل ہندوستان آزادی حاصل کرنے کے لئے عسکری جدوجہد کرتے رہے، لیکن باہمی چپقلش کی وجہ سے ناکام ہو گئے۔ بعد ازاں مسلمانوں میں سے روایتی مذہبی طبقہ یا تو اسی راستہ پر گامزن رہا یا اصحاب کہف کی سنت کو اپناتے ہوئے خانقاہوں اور مدارس میں گوشہ نشین ہو گئے لیکن ہندو اور عام مسلمان نے آزادی

کے لئے سیاسی راستہ اختیار کیا۔ 1885ء میں ہندوؤں نے کانگرس کے نام سے سیاسی جماعت بنائی اور 1906ء میں مسلمانوں نے مسلم لیگ کے نام سے سیاسی جدوجہد کے لئے جماعت تشکیل دی۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ دونوں کا مطمح نظر انگریز سے آزادی کا حصول تھا، لیکن مسلم لیگ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے ساتھ ہندوستان کو تقسیم کر کے مسلمانوں کیلئے علیحدہ وطن حاصل کرنے کی جدوجہد بھی کرتی رہی، جس سے کانگرس اور مسلم لیگ میں ایک فرق واقع ہو گیا۔ کانگرس صرف یہ چاہتی تھی کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہو جائے اور انگریز نے ہندوستان سے اپنی رخصتی کو اصولی طور پر قبول بھی کر لیا تھا۔ لہٰذا اختلاف صرف وقت اور رخصتی کے انداز کا تھا۔ یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ ہندوؤں کو کانگرس کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے مضبوط بنیادیں فراہم کرنے اور تنظیم سازی کے لئے مناسب وقت مل گیا۔ جب کہ مسلم لیگ کو پاکستان بنانے کے لئے ایک زوردار تحریک چلانا پڑی، لہٰذا تنظیم سازی کا نہ وقت تھا نہ موقع۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے چونکہ مذہب کی بنیاد پر الگ وطن کا مطالبہ کیا تھا، لوگوں کو پاکستان کا مطلب لا الہ الا اللہ بتایا گیا تھا، لہٰذا اس تحریک کو مذہبی جذبات کی بنیاد پر ہی آگے بڑھایا گیا۔

ہم قارئین خصوصاً تنظیم اسلامی کے رفقا کی خدمت میں اصلاً یہ عرض کرنا چاہ رہے ہیں کہ پاکستان کی گھٹی میں جذباتیت ہے۔ اس کی تعمیراتی فزیالوجی میں جذباتیت ہے۔ لہٰذا قیام پاکستان کے بعد جتنی بھی نئی سیاسی اور مذہبی جماعتیں قائم ہوئیں، اُن میں لیڈر حضرات نے جذبات کو فوکس کیا مثلاً مذہبی جماعتوں نے اپنے اپنے مسلک کی دھائی دی، مسلکی جذبات کو بھڑکایا اور مسلک کی بنیاد پر الگ جماعت بنالی۔ جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت اہل حدیث، اہل تشیع کی جماعت تحریک جعفریہ وغیرہ۔ سیاسی جماعتوں نے جو حقیقت میں سب سیکولر جماعتیں ہیں انسانی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا لالچ دیا۔ مثلاً کسی نے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کر کے اور کسی نے لسانی اور علاقائی تعصب کو ہوا دیکر جذبات کو بھڑکایا اور ہم زبانوں یا علاقہ پرستوں (جنہیں قوم پرست کہا جاتا ہے) کو اپنے گرد اکٹھا کر کے جماعت بنالی۔ گویا صورت حال یہ بنی کہ سندھ کے کراچی اور حیدرآباد جیسے بڑے شہروں میں آسانی سے لسانی بنیادوں پر جماعت بن گئی۔ اسی طرح مذہبی جماعتوں میں شیعہ حضرات کو تحریک نفاذ جعفریہ کی اور اہل حدیث حضرات

کو جمعیت اہل حدیث کی دعوت دینا اور دعوت قبول کرنا کتنا آسان ہے۔ ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان میں کسی بھی نوع کی عصبیت کی پکار لگا کر جماعت بنانا بھی آسان، چلانا اور قائم رکھنا بھی آسان ہے۔

تنظیم اسلامی کے رفقاء سے ہمارا ٹریلین ڈالر کا سوال یہ ہے کہ وہ کس عصبیت کی صدا لگائیں گے؟ وہ کس طرح کے جذبات کو مہمیز لگائیں گے؟ ہم نے جو آغاز میں جماعت کی تعریف بیان کرنے کی کوشش کی ہے اس میں صرف پہلے جملے کا ابتدائی جُز تنظیم اسلامی پر صادق آتا ہے۔ یعنی یکساں ہدف رکھنے والے ہم مقصد افراد جو ایک نظم سے منسلک ہیں۔ اس کے بعد پاکستان کی تمام دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں سے تعمیری اور عملی اختلاف شروع ہو جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی دستوری نہیں بلکہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہے، جس کا بنیادی فلسفہ یا اصول یہ ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پر بیعت کی جا رہی ہے اُس کے ہر حکم کی بلا چوں و چراں پابندی کرنا ہوگی، بشرطیکہ حکم شریعت کے دائرے کے اندر ہو۔ تنظیم اسلامی نے اپنا اصل اور حقیقی ہدف رضائے الٰہی کو ٹھہرایا ہے اور اُس کا موقف یہ ہے کہ اپنے ہدف کے حصول کے لئے نظریہ پاکستان کو عملی تعبیر دینا لازم ہے، بلکہ تقسیم سے قبل کے نعرے میں قیام پاکستان کے بعد ''محمد رسول اللہ'' کا اضافہ لازم ہے، ناگزیر ہے۔ شریعت محمدیہ کا نفاذ نہیں ہوگا تو بات محض جذباتیت تک محدود ہو کر رہ جائے گی اور نعرے لگاتے لگاتے جذبات بھی بالآخر سرد پڑ جائیں گے۔ اگرچہ پاکستان کی تمام مذہبی جماعتیں نعرہ تو نفاذ اسلام کا ہی لگاتی ہیں لیکن جب وہ اپنے مخصوص خول سے مخصوص لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے لگاتی ہیں تو ہم مسلک لوگ اصل دعوت کو سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا وہی لپکتے ہیں جنہیں حقیقت میں پکارا جاتا ہے۔ تنظیم اسلامی نے خود کو کسی خاص مسلک سے نتھی ہی نہیں کیا ہوا، لہٰذا اُسے مسلک محمدیؐ کی صدا لگانی ہے (جس کے لئے صحیح تر اصطلاح شریعت محمدیؐ ہے) اور تمام مسلمانوں کو دعوت دینی ہے۔ شریعت محمدیؐ کے مطابق تمام زمین اللہ کی ہے اور مسلمان کے لئے مسجد کی حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا کسی زمینی عصبیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لئے فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر برتری حاصل نہیں۔ کسی گورے کو کالے پر، کالے کو گورے پر اور کسی کالے پر فوقیت نہیں۔ گویا رنگ نسل اور زبان یا کسی بھی نوع کی عصبیت کی پکار نہیں لگائی جا سکتی۔

پھر یہ کہ سیکولر سیاسی جماعتوں کی طرح دنیوی ساز و سامان اور عہدوں وغیرہ کا لالچ کا کوئی

سوال ہی نہیں۔اس لئے کہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ انتخابات میں حصہ لینے پر بھی تنظیم نے خود پر پابندی لگا رکھی ہے۔لہٰذا خالصتاً نفاذ دین کے لئے کسی جماعت سے منسلک ہونے کی دعوت دینا اور لوگوں کو اپنے ساتھ جمع کر کے بڑی جماعت بنالینا دنیا کا مشکل ترین کام ہے، اگر چہ ناممکن نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ 20 کروڑ میں سے چند ہزار افراد کو اللہ نے یہ توفیق بخشی ہے کہ وہ تنظیم اسلامی کے رفقاء اور رفیقات کہلاتے اور کہلاتی ہیں۔لیکن اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ مشکلات کی وجہ سے knocking ہو رہی ہے۔ایک ہچکچاہٹ اور تذبذب کی بہر حال کیفیت موجود ہے۔ہماری رائے میں اس حوالہ سے مختلف لوگوں کی مختلف وجوہات ہیں۔اگر رفقاء بُرا نہ مانیں تو ہم اس knocking کو مرض کا نام دیں گے اور ساتھ ساتھ علاج تجویز کرنے کی کوشش کریں گے۔مثلاً بعض ساتھی جو بڑے پرعزم طریقے سے تنظیم میں شامل ہوئے انہوں نے اقامت دین (یعنی دین کو عملاً قائم کر دینے) کو دینی اور شرعی فریضہ سمجھ لیا۔حالانکہ ایک رفیق پر اقامت دین کی جدوجہد فرض ہے، اسلام کا بالفعل نفاذ کرنا اس کی ذمہ داری نہیں۔ایسا رفیق جب زمینی حقائق پر نگاہ ڈالتا ہے اور حالات کی ناموافقت اس کے سامنے آتی ہے تو تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔نتیجتاً یا تو سست روی کا شکار ہو جاتا ہے یا جلد بازی کا مظاہرہ کر کے انقلاب کے دنیوی ہدف کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی فکر کرنے لگتا ہے، اور نتائج سے مایوسی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔یہ بہت بڑی غلطی ہے۔اُسے اس بات کو ذہنی اور قلبی طور پر سمجھنا چاہیے کہ میرا فرض دین قائم کرنے کے لیے سر توڑ جدوجہد کرنا ہے، مجھے تن من دھن لگانا ہے لیکن میرا اصلی ہدف رضائے الٰہی ہے اور کیا اللہ اپنی راہ میں مخلصانہ جدوجہد کو رد کرے گا۔سورۂ محمدؐ کے آیت نمبر 7 کا مطالعہ کریں، وہ تو اسے یعنی اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کو اپنی مدد قرار دیتا ہے۔کیا وہ اپنی مدد کرنے والوں کو بھلا دے گا؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔گویا کامیابی کا امکان صد فی صد ہے تو تذبذب کیسا؟ معاشرے میں انقلاب آتا ہے یا نہیں آتا، یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں اور فی الوقت دنیا میں کیا ہونا چاہیے، (باقی صفحہ 15 پر) کیا اچھا ہے کیا برا ہے، یہ کوئی انسان، مسلمان یا تنظیم کا رفیق نہیں جانتا۔ یہ صرف اور صرف اللہ جانتا ہے۔یہ اُس کا کام ہے، اُس پر چھوڑ دیں۔آپ اپنا کام کریں، لوگوں کو اقامت دین کی جدوجہد کے لیے جمع ہونے اور تنظیم کے نظم سے جُڑنے کی دعوت دیں اور دیتے چلے جائیں، دیتے چلے جائیں کہ یہی آپ کا فرض منصبی ہے۔ایسے ہی لوگوں کے لئے تو علامہ

اقبال نے کہا تھا

اس دور میں سب مٹ جائیں گے ہاں باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور پکا اپنی ہٹ کا ہے

ضرورت اپنی راہ پر قائم رہنے کی اور ہٹ کا پکا ہونے کی ہے۔ لیکن یاد رکھئے، یہ اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں اور اللہ کی مدد کے حصول کے لئے دن کا شہسوار رہنے کے ساتھ ساتھ رات کا راہب بننا ہوگا۔ شیطان لعین سے اللہ کی پناہ حاصل کرنا ہوگی۔ دوسری بہت بڑی رکاوٹ حصول رزق کی مشکلات ہیں۔ اپنے اور اہل خانہ کی ضروریات دنیوی کی تکمیل ہے۔ یہ رکاوٹ اور مشکل یوں تو ہر دور میں رہی ہے لیکن آج بہت گھمبیر اور پیچیدہ ہوگئی ہے۔ اسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر انسان یہ طے کر لے کہ وہ کسی تیسرے کام میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا اور اپنے اوقات کا سختی سے احتساب کرے گا تو ہمارا ایمان ہے اور شاید تجربہ بھی کہ دینی اور تنظیمی امور کی انجام دہی کے لئے وقت نکل ہی آتا ہے اور جسے نہیں نکالنا اُسے پنج وقت نماز کے لئے بھی وقت نہیں ملتا۔ ضرورت عزم کی ہے۔ Commitment قلبی ذہنی اور روحانی ہو تو اللہ آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا، مشکل ضرور ہوتا ہے۔ صرف آپ کا امتحان درکار ہے۔ افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد ہمارا یقین ہونا چاہیے۔ رفقا گرامی! یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ اللہ کا کام کریں اور اللہ آپ کا کام نہ کرے۔ لہٰذا آیئے اس مرتبہ سالانہ اجتماع میں طے کریں کہ جس دعوت کو ہم نے حق جانا اُسے دوسرے تک لازماً پہنچائیں گے۔ اسلامی انقلاب کے لئے quality اور quanuty دونوں کی ضرورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک بات پہنچائیں، کچھ نہ کچھ آپ کو ضرور مل جائیں گے۔ انسان فراہم ہوتے رہیں گے تو قافلہ بنتا اور بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی پر ہماری آپ کی اور اس امت کی زندگی کا دارومدار ہے۔ زندگی تو بہرحال گزر ہی جائے گی، اصل بات یہ ہے کہ اس پر ہم سب کی آخرت کا انحصار ہے، جس کی ابتدا ہے انتہا نہیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین)



ہوسِ زر

حضرت آدم علیہ السلام اس زمین پر قدم رکھنے والے پہلے انسان تھے، آپ پہلے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے نبی بھی تھے اور نبی کا معاملہ بہت سے حوالوں سے استثنائی ہوتا ہے۔ البتہ بعد ازاں عام انسان نے جب اس زمین پر زندگی کا سفر شروع کیا تو آغاز میں زندگی بسر کرنے کے انداز میں انسان اور جانور کی اپروچ میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ خوراک کی تلاش، جنسی خواہش کی تکمیل اور موسم کی شدت یا اپنے سے طاقتور سے جان کا تحفظ بس یہی زندگی کا مقصد تھا۔ اللہ رب العزت نے جانوروں کی عظیم اکثریت کو انسان کی نسبت بہت زیادہ جسمانی قوت عطا کی لیکن ذہنی طور پر اُن کی صلاحیت ان ہی تین چیزوں تک محدود رہی یعنی خوراک، جنسی خواہش اور دشمن سے جان کے تحفظ کی کوشش۔ جبکہ انسان جو جسمانی لحاظ سے اگرچہ کمزور ہے اُسے وسیع ذہنی صلاحیت سے نوازا۔ لہٰذا انسان نے اس صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے بہتر زندگی کے لئے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اجتماعیت کو وجود میں لایا اور قبائل وجود میں آ گئے جس سے تحفظ کے حوالہ سے انسان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ پھر یہ کہ مسابقت کا جذبہ پیدا ہوا۔

یہ جذبہ اس لحاظ سے تو بڑا قابل قدر اور قابل تحسین تھا کہ آگے بڑھنے کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت اور جدوجہد کی جائے اور خداوند کریم کی طرف سے عطا کردہ تمام صلاحیتوں کو پرزور انداز میں بروئے کار لایا جائے، لیکن آگے بڑھنے کی بے قابو خواہش نے انسان کو اُس عقل اور ذہانت کو جو اللہ تعالیٰ نے نعمت عظمیٰ کے طور پر اُسے عطا کی تھی، اُس کے منفی استعمال کی طرف راغب کیا اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے خود کو ذاتی طور پر آگے بڑھانے اور اپنی اجتماعیت کو سبقت دلانے تک محدود نہیں رکھا بلکہ دوسرے کو کہنی مارنے، اُسے زبردستی پیچھے دھکیلنے، اُس کا حق تلف کرنے کے لئے دبوچ لینے، اُس کا بدترین استحصال کرنے یہاں تک کہ اُس کو جان سے مار

دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہ سب کچھ انسان نے ذاتی سطح، پر گروہی سطح پر اور ریاستی سطح پر کیا۔ یہ انسان کا حال یا ماضی قریب ہی نہیں بلکہ ماضی بعید میں بھی انسان کا چلن کچھ اسی طرح کا تھا۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ دولت و اقتدار کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ دولت اقتدار کے لئے اور اقتدار و قوت دولت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ذاتی سطح پر دوسرے سے آگے نکلنے اور اُس کا حق تلف کرنے کے لئے میزان میں ڈنڈی مارتی تھی۔ قارون نے اپنی فنی مہارت کو دولت کے ارتکاز اور دوسروں کے استحصال کے لئے استعمال کیا۔ نمرود اور فرعون نے سیاسی اقتدار کو وسائل پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کیا، یہاں تک کہ خدائی کے دعویدار بن بیٹھے۔

اللہ رب العزت نے انسانوں کی اصلاح اور اُنہیں صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے لئے وقفہ وقفہ سے انبیاء اور رسول بھیجے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ضابطے اور قوانین یعنی شریعت بھی لاتے رہے، جن سے اُس دور کے لوگ اسی دولت و اقتدار کی خاطر اور اپنی برتری کو قائم رکھنے کی خواہش میں الجھتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور رسول حضرت محمد ﷺ کو اپنی آخری کتاب قرآن مجید دے کر اپنی ہدایت کو آخری اور حتمی انداز میں انسان تک پہنچا دیا۔ اس کتاب کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ اے انسان اللہ واحد ہی تمہارا خالق، مالک اور رازق ہے اور اُس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضور ﷺ کو حکم دیا کہ ان کے درمیان عدل قائم کرو اور انہیں بتا دو کہ ان سب کو ایک روز اُسی کی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور یہ وہ دن ہوگا جب کہ چھوٹا بڑا سب حساب چکا دیا جائے گا۔ پھر یہ کہ انسانی کمزوریوں کی خاص طور پر نشان دہی کر دی۔ سورۃ الانفال کی آیت 28 میں اللہ تبارک تعالیٰ فرماتا ہے "اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے اور یہ کہ اللہ کے پاس (نیکیوں کا) بڑا اجر ہے۔" اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی بنیادی کمزوری کی نشان دہی کر دی۔

ہم آگے اپنی بات کو مسلمانوں تک محدود کر کے امت مسلمہ کا عمومی اور مسلمانان پاکستان کا خصوصی جائزہ لیتے ہیں۔ لیکن یہ جائزہ لیتے ہوئے ہمیں حضور ﷺ کی اس حدیث مبارک کو ذہن میں رکھنا ہوگا جو سیدنا کعبؓ بن عیاض سے مروی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "بے شک ہر امت کے لئے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال

ہے۔'' ندائے خلافت کے قارئین یہ تو جانتے ہی ہیں کہ عربی میں ''فتنہ'' آزمائش کو کہتے ہیں۔ گویا فرمان مبارک یہ ہے کہ میری امت کے لئے مال و دولت بہت بڑی آزمائش ہے۔ آزمائش میں انسان پورا بھی اتر سکتا ہے اور ہلاک بھی ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج امت اس آزمائش میں بُری طرح ناکام ہوتی نظر آتی ہے۔ عرب جو اسلام کی جائے پیدائش ہے، وہاں کی سرزمین نے جب سیال سونا اگلا اور دولت کی ریل پیل ہوئی تو وہ نظری طور پر اور عقیدہ کی سطح پر نہ سہی عملی طور پر اسلام سے دور بلکہ بہت دور ہو گئے۔ زندگی میں رنگینی آ گئی۔ وہ عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قدرتی وسائل رکھنے کے باوجود وہ ظاہری طور پر آزاد اور حقیقت میں غلام ہیں۔ وہ اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتے۔ امریکہ اور عالمی طاقتوں کے محتاج ہیں اور چھوٹا سا اسرائیل جس کی آبادی ایک کروڑ سے بھی کم یہودیوں پر مشتمل ہے، عربوں پر بُری طرح حاوی ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے اسرائیل کو نیست و نابود کرنے کے دعویدار عرب آج اپنی بقا اور سلامتی کے لئے اسرائیل اور یہودیوں کی منت سماجت کرتے نظر آتے ہیں بلکہ اُن کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے فلسطینی بھائیوں کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ رہے ہیں اور اُنہیں معاشی طور پر تباہ کرنے کے لئے اُن کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔

وطن عزیز پاکستان کا حال عربوں سے بدتر ہے۔ عرب اپنے وسائل کو عیش و عشرت میں جھونک رہے ہیں اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مے بھی قرض کی پیتے ہیں۔ ہم دنیا بھر میں کشکول لئے پھرتے ہیں اور بھکاری کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ دنیا ہمیں یہ قرض سود پر دیتی ہے۔ ہمارے حکمران ان قرضوں کو اپنے ٹھاٹھ باٹھ میں اُڑا رہے ہیں یا بڑی بڑی عمارتیں اور پل تعمیر کر کے غیر ترقیاتی کاموں میں صرف کر رہے ہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ مقروض ہوتا ہے اور یہ قرض اُسے بالآخر ادا کرنا ہے۔ وگرنہ ہمارے قرض خواہ اتنے بھولے، سیدھے اور مجبور نہیں ہیں۔ وہ قرض نہ لوٹانے والوں کا جینا حرام کر دیں گے۔ اُن کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات قرض خور نہ کرنا چاہیں گے اور نہ کر سکیں گے۔ اُنہیں جرات رندانہ سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ سود کے لین دین کی ہماری شریعت اجازت نہیں دیتی، یہ کسی صورت ادا نہیں کیا جائے گا۔ رہ گئی بات اصل زر کی تو وہ جب اور جیسے ممکن ہوا ادا کر دیا جائے گا۔

اب آیئے، اس طرف کہ جس شے کو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور رسول ﷺ نے فتنہ (یعنی آزمائش) قرار دیا ہے پاکستانی معاشرہ نے اس حوالہ سے کس سطح کی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم آخری درجہ تک اس میں ناکام ہوئے ہیں۔ اِس حوالہ سے ہماری ناکامی تو ناقابل بیان اور ناقابل تحریر ہے۔ گزشتہ اڑسٹھ سال کی تاریخ میں اپنی ناکامیوں کا سرسری جائزہ لینے کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ دیگ سے چاول کا دانہ چیک کرنے کے لئے صرف حالات حاضرہ پر نگاہ ڈالیں، قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں جن لوگوں کو ہم نے اپنی نمائندگی کے لئے بھیجا ہے یا وہ زور آوری سے پہنچ گئے ہیں۔ اُنہیں اگلے ماہ کی پانچ تاریخ کو سینٹرز منتخب کر کے پاکستان کا ایک آئینی ادارہ یعنی ایوان بالا تشکیل دینا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے ہمیں اس عیاشی کی ضرورت کیا ہے؟ حکومتی معاملات میں سینٹرز کا کوئی رول نہیں ہوتا۔ فنانس بل میں وہ ووٹ نہیں دے سکتے اور نہ فیڈرل بجٹ پر سینٹ میں رائے شماری ہوسکتی ہے۔ گویا غریب ملک کے خزانے پر یہ ایک بلا ضرورت بوجھ ہے۔ بہرحال یہ آئینی تقاضا ہے۔ ہمارے سیاست دان یوں تو آئین سے دن رات کھیلتے ہیں اور جیسے چاہے کھیلتے ہیں، لیکن اپنے مفادات کے لئے انہیں آئین یاد آجاتا ہے۔ سینیٹ کے انتخابات میں ہمارے قومی وصوبائی اسمبلیوں کے نمائندے اپنی جس طرح بولی لگوا رہے ہیں الامان الحفیظ۔ اس پر کسی نے بہترین تبصرہ کیا ہے کہ پاکستان کی اسمبلیوں کو مویشی منڈی کہنا بیچارے مویشوں کے ساتھ زیادتی ہے، یہ مویشوں کی توہین ہے۔ قصہ کوتاہ قوم کے نمائندے نیلام ہورہے ہیں اور ہمارا ایوانِ اقتدار خوبصورت اور لکش نیلام گھر کی صورت اختیار کر گیا ہے اور قوم کے نمائندے خود کو عبدالروبیہ ثابت کررہے ہیں۔ اُدھر آسٹریلیا میں کرکٹ کا ورلڈ کپ ہورہا ہے۔ پاکستان جُوا کے حوالہ سے بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ کرکٹ ٹیم پے در پے شکست کھا رہی ہے اور اُس کے آفیشلز وہاں کے کسینو کو رونق بخش رہے ہیں۔ اس غریب قوم کی جیب سے لاکھوں روپے ماہوار تنخواہ لینے والے ہائے پیسہ ہائے پیسہ کی چیخ وپکار کررہے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض انتہائی بلند پایہ دانشور فرماتے ہیں کسینو جانا اور جوا کھیلنا ذاتی فعل ہے۔ اگر ہم مذہب اور ریاست کو ایک دوسرے کے لئے اجنبی کردیں گے تو جوا کھیلنا ہی نہیں، شراب پینا اور رضامندی سے زنا کرنا سب ذاتی افعال ہیں۔ بہرحال ہم مسلمانانِ پاکستان ہوسِ زر میں دیوانے ہو چکے ہیں اور مجنوں کی طرح اپنی اس لیلیٰ کی تلاش میں ملک وقوم ہی نہیں دین ومذہب کو بھی داؤ پر لگا چکے

ہیں۔ ہے کوئی جو ہمیں سمجھائے کہ کفن کی جیب نہیں ہوتی۔ لوٹ مار سے جمع شدہ دولت کے ہم کبھی مالک نہیں بن سکتے، زیادہ سے زیادہ وارث بن سکتے ہیں اور وراثت کو بالآخر منتقل ہونا ہوتا ہے۔ سکندر اعظم جیسا آدمی دنیا کا فاتح بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اُس کے ہاتھ کفن سے باہر رکھیں جائیں تا کہ دنیا کو معلوم ہو کہ اتنی فتوحات کے بعد بھی میں دنیا سے خالی ہاتھ جا رہا ہوں۔ بھائی بند بھی قبر پر مٹی ڈال کر واپس آ جاتے ہیں۔ ساتھ صرف اعمال جائیں گے اور اُنہی پر دارومدار ہے ہمیشہ ہمیشہ کی جنت یا ہمیشہ ہمیشہ کی آگ کا۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے اور دعا ہے کہ اس آزمائش میں وہ ہمیں سرخرو کرے۔ آمین یاربّ العالمین!



کراچی کرچی کرچی کیوں؟

بیسویں صدی کے چھٹے عشرہ کے آغاز میں، جب خود ساختہ فیلڈ مارشل ایوب خان کا مارشل لاء جو پاکستان کا پہلا مارشل لاء تھا ابھی جوان بھی تھا اور زور آور بھی، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ایک شاہی حکمنامہ کے تحت دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی کے قریب ایک نیا شہر آباد کر کے منتقل کرنے کا اعلان کر دیا۔ فوجی حکومت نے انتہائی فیاضی اور دریا دلی سے کام لیتے ہوئے عوام کو نئے شہر یعنی پاکستان کے نئے دارالحکومت کا نام تجویز کرنے کی دعوت دی۔ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ جس شہری کا تجویز کردہ نام حکومت پسند کرے گی، اسے پانچ ہزار روپیہ نقد انعام دیا جائے گا جو اُس زمانہ میں ایک معقول رقم تھی۔ اسلام آباد کا نام فائنل ہوا۔ نئے شہر کی تعمیر اور دارالحکومت کی منتقلی کا کام بڑی تیزی سے شروع ہو گیا۔

برصغیر کی تاریخ میں یہ کام یعنی دارالحکومت کو ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل کرنا تغلق بادشاہ فیروز شاہ تغلق کر چکا تھا۔ وہ منتقلی نہ صرف عوام بلکہ خود بادشاہ کو بھی بہت مہنگی پڑی تھی اور اس نے خرابی بسیار کے بعد اپنا یہ فیصلہ واپس لے لیا تھا۔ جب کراچی کی بجائے اسلام آباد کو نئے دارالحکومت کے طور پر منتخب کیا گیا تو ہمارا ذہن اُس وقت بھی اس تاریخی واقعہ کی طرف منتقل ہوا تھا اور ہم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ پاکستان اور خصوصاً اہل کراچی کے لیے یہ فیصلہ خیر و برکت کا باعث بنے، اچھے اور خوشگوار نتائج کا حامل ہو۔ آغاز کے بیس بائیس برس میں تو دو طرفہ اچھی خبریں ملیں، یعنی اسلام آباد نے بھی بحیثیت شہر تیزی سے ترقی کی اور کراچی کی رونقیں بھی ماند نہ پڑیں۔ کراچی کے وہ لوگ جنہیں مرکز کی ملازمت کی وجہ سے اسلام آباد رہائش منتقل کرنا پڑی تھی، انہوں نے آغاز میں اسلام آباد کی سردی کا ذکر کیا، لیکن جلد ہی وہ موسم اور حالات سے مانوس ہو گئے۔

ملک کے دوسرے حصوں سے بھی لوگ اسلام آباد کی طرف متوجہ ہوئے اور اسلام آباد دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا۔ کراچی چونکہ ایک اہم بندرگاہ بھی تھی لہٰذا تاجر پیشہ لوگوں کی کثیر تعداد اپنا کاروبار جمانے اور بڑھانے کراچی کا رخ کرنے لگی۔ تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ کی وجہ سے ملک کا غریب طبقہ بھی روزگار کمانے کے لیے کراچی کو ترجیح دینے لگا۔ لہٰذا بالعموم دارالحکومت کی منتقلی کے فیصلہ کو سراہا گیا۔ علاوہ ازیں تقسیم کے بعد چونکہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت کراچی آباد ہوئی تھی لہٰذا بعد میں ہندوستان سے آنے والے لوگ بھی کراچی میں اپنے عزیز و اقارب کے پاس ٹھکانہ ڈھونڈتے۔ یوں کراچی کی آبادی بے تحاشا بڑھتی چلی گئی۔ ظاہر ہے مسائل بھی بڑھتے چلے گئے۔ دوسری طرف کراچی اب مرکزی حکومت کا دارالحکومت نہیں رہا تھا بلکہ وہ سندھ کا دارالحکومت بن گیا۔ اب کراچی کے مسائل اور اس کی سیکیورٹی پر پہلی سی توجہ نہ دی گئی۔ ہمارے حکمران بھول گئے کہ کراچی مغربی پاکستان کی واحد بندرگاہ ہے۔ کراچی پاکستان کا تجارتی حب ہے اور سارے مغربی پاکستان کی درآمدات و برآمدات کراچی کے راستے سے ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے کراچی کا پاکستان کا سب سے بڑا شہر بن جانا ایک منطقی بات تھی۔ لہٰذا وہ کراچی جو پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا، انتظامی بے توجہی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ ملک میں چونکہ مارشل لاء تھا، پریس اور آزادئ صحافت کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا، سیاسی کارکن سخت آزمائش سے گزر رہے تھے، لہٰذا عوام اور حکومت میں تعلق قریباً منقطع ہو چکا تھا۔ سرکاری پریس، ریڈیو اور بعد ازاں ٹیلی ویژن سب اچھا کی زوردار صدائیں لگا رہے تھے۔ خوشامدی وزیر اور افسران بھی ایسے مواقع پر حاکم کو اس کی مقبولیت کے افسانے گھڑ گھڑ کر سناتے ہیں۔

کراچی میں اُن دنوں میں اسلامی جماعتوں کو کافی مقبولیت حاصل تھی، لیکن ظاہر ہے وہ عوامی سطح پر مسائل حل کرنے کی پوزیشن میں نہ تھیں۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے وہ کام بھی نہ کیا جو وہ کر سکتے تھے، یعنی سیاست سے بالاتر ہو کر دین کی دعوت کا کام عوام میں کرتے، اسلامی شعائر کا ڈٹ کر دفاع کرتے تو عوام سے ان کا غیر سیاسی تعلق تو قائم رہتا۔ پھر وہ عوام کو بتاتے کہ اسلامی نظام کیا ہے؟ اس کی برکات و ثمرات سے لوگوں کو آگاہی فراہم کرتے اور اپنا کردار بطور نمونہ عوام کے سامنے پیش کرتے تو حالات بہت مختلف ہوتے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔ ایسی صورت میں خلا کا پیدا ہو جانا بڑی منطقی بات تھی اور ایسے خلا کو کوئی لسانی

یا علاقائی تعصب ہی پُر سکتا ہے۔ لہٰذا کراچی میں لسانی اور اندرونِ سندھ میں علاقائی تعصب نے اپنے اثرات مرتب کرنے شروع کر دیے۔ لیکن ایوب اور یحییٰ خان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر انسان کے بنیادی اور جبلی تقاضوں پر دستک دی، جس سے لسانی اور علاقائی تعصب وقتی طور پر دب گیا یا زیرِ زمین چلا گیا، لیکن جلد ہی ''روٹی، کپڑا اور مکان'' کے نعرے کا سحر ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ بھٹو کا تعلق دیہی سندھ سے تھا، ظاہر ہے کچھ نہ کچھ علاقائی تعصب کا بھٹو بھی حامل تھا۔ پھر یہ کہ اُس کی سیاسی مجبوری تھی، اندرون سندھ اُن کا حلقہ انتخاب بھی تھا، لہٰذا اُس نے بعض ایسے اقدامات کیے جسے اہل کراچی کی اکثریت نے قبول نہ کیا۔ مثلاً ملازمتوں میں دس سال کے لیے دیہی سندھ کو خصوصی کوٹہ الاٹ کر دیا گیا۔ یہ دس سال آج بیالیس سال ہوئے، ختم نہ ہوئے اور کوٹہ سسٹم ابھی تک جاری ہے۔ اس کوٹہ سسٹم کو خصوصاً مہاجر اپنے اوپر بہت بڑی زیادتی گردانتے ہیں۔ بھٹو کے بعد پاکستان ایک بار پھر مارشل لاء کی نذر ہو گیا۔

جنرل ضیاء الحق نے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی سے اقتدار چھینا، پھر ایک مشکوک عدالتی کارروائی کے ذریعے ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی چڑھا دیا جو اہل سندھ کے لیے ایک بہت بڑا چرکہ تھا۔ یہ ایک ایسا زخم تھا جو آج تک صحیح طور پر مندمل نہیں ہو سکا۔ جنرل ضیاء الحق کو سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو کاؤنٹر کرنے کے لیے کسی جماعت یا گروہ کی حمایت کی ضرورت تھی، لہٰذا جرنیل صاحب نے کراچی میں لسانی تعصب کی سلگتی ہوئی چنگاری کو ہوا دی اور ایم کیو ایم شعلہ کی صورت اختیار کر گیا۔ الطاف حسین جو سٹوڈنٹ لیڈر تھے اور ایک روایت کے مطابق کسی موقع پر کچھ لوگوں نے انہیں مارا پیٹا، لہٰذا معاملہ گروہی کے ساتھ ساتھ ذاتی بھی بن گیا۔ الطاف حسین کا ایک خاص نرالا اور انوکھا انداز بیان ہے۔ انہوں نے اس انداز بیان سے اس لسانی تعصب کو خوب ہوا دی۔ ایم کیو ایم ایک سیاسی جماعت بن گئی لیکن اصل اور کلیدی حیثیت اس کے عسکری ونگ کو حاصل ہو گئی۔ اس لیے بھی کہ ایم کیو ایم کے ارکان کی عظیم اکثریت مالی لحاظ سے کمزور لوگوں پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر ملازم پیشہ لوگ تھے جو بمشکل اپنے گھریلو اخراجات پورے کرتے تھے۔ یہ غریب اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے کارکن اپنے چندے سے جماعت کے اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے۔ جماعت پھیل رہی تھی اور اس کے اخراجات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لہٰذا انہیں بھتہ خوری کا راستہ دکھایا گیا۔ تاجروں کے انکار پر تشدد کا سہارا لیا گیا' باقاعدہ ٹارچر سیل قائم

کیے گئے۔ جرم چھپانے کے لیے میڈیا کو قابو کیا گیا۔ تعاون نہ کرنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں کی بوری بند لاشیں کراچی کی سڑکوں پر ملنا شروع ہو گئیں۔ ہڑتال کا اعلان کیا جاتا، جس کے لیے تاجر یونین کو دھمکیاں دی جاتیں۔ ہڑتال کی اعلان کردہ تاریخ سے ایک دن پہلے بازاروں میں فائرنگ کی جاتی اور بزورِ بازو ہڑتال کامیاب کروائی جاتی۔ بالفاظ دیگر سارے کراچی پر اس جماعت کا خوف مسلط ہو گیا۔ 1992ء میں میاں نواز شریف کی حکومت میں جب جنرل آصف باجوہ آرمی چیف تھے، ایم کیو ایم کے خلاف کراچی اور حیدر آباد میں آپریشن کیا گیا، لیکن ایک تو یہ آپریشن ضروری ہوم ورک کے بغیر شروع کر دیا گیا اور دوسرا یہ کہ وزیر اعظم نواز شریف اور آرمی چیف بہت سے معاملات میں متفق نہ تھے اور ان کے درمیان اختلافات کی خبریں عام تھیں۔ وزیر اعظم اور آرمی چیف دونوں سندھ کے شہروں میں ایم کیو ایم کے رول سے ناخوش تھے، لیکن ان میں باہم رابطہ درست انداز میں استوار نہ تھا۔ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے الطاف حسین نے کراچی سے نکل جانے میں عافیت سمجھی اور وہ لندن جا بیٹھے اور آج تک وہاں سے اپنی جماعت کو کنٹرول کر رہے ہیں۔

1992ء کے نامکمل اور غیر ذمہ دارانہ آپریشن نے ایم کیو ایم کو مظلوم جماعت بنا دیا۔ اور وہ 1992ء کے آپریشن کا آج تک اسی طرح ذکر کرتے ہیں جیسے یہودی ہولوکاسٹ کا ذکر کرتے ہیں۔ 1999ء میں پرویز مشرف نے نواز شریف کا تختہ الٹ کر ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ وہ پرویز مشرف جو کور کمانڈر کی حیثیت سے ایم کیو ایم کے خلاف زبردست ریمارکس دے چکے تھے اور اِس جماعت کے بارے میں ایسے سخت اور مخالفانہ الفاظ استعمال کیے جو پہلے کبھی نہ کیے گئے تھے، اُسی پرویز مشرف نے نواز شریف کی سیاسی قوت کو زیر کرنے کے لیے ایم کیو ایم کو اتحادی بنا لیا۔ 12 مئی 2007ء کو جب ایم کیو ایم نے وقت کے چیف جسٹس کو کراچی ایئر پورٹ سے باہر نہ آنے دیا اور ایک ہی دن میں کراچی میں پچاس کے قریب لوگوں کو ہلاک کر دیا تو پرویز مشرف نے اسے اپنی قوت قرار دیا۔ بہر حال پرویز مشرف اپنے سیاسی مقاصد کے لیے ہر طرح ایم کیو ایم کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ زرداری اقتدار میں آئے تو ان کی اور ان کے وزیر داخلہ رحمٰن ملک کی مجرمانہ ذہنیت اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سیاسی دیوالیہ پن نے ایم کیو ایم کو ناقابل شکست بنا دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکز میں حکومت ختم ہو چکی ہے، لیکن ان کے سیاسی دیوالیہ پن کا یہ عالم ہے کہ

سینٹ کی صرف دو نشستوں کی خاطر انہوں نے سانحہ بلدیہ ٹاؤن میں دو سو اٹھاون مزدوروں کو جلا کر ہلاک کر دینے والی انتہائی خوفناک واردات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا یوں کراچی کرچی کرچی کر دیا گیا ہے۔ اب شنید یہ ہے کہ ہماری عسکری قیادت نے ایم کیو ایم کی ان مجرمانہ حرکات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کراچی میں کئی اور گروہ ایسے پیدا ہو چکے ہیں جو بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ اور دہشت گردی کی اور دوسری بہت سی وارداتوں کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

ہم اپنی عسکری قیادت سے گزارش کرتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی بڑا آپریشن کرنا ہی ہے تو پہلے اچھی طرح ہوم ورک کریں، پھر یہ کہ کسی ایک جماعت کو ٹارگٹ نہ کریں بلکہ صرف جرائم پیشہ لوگوں کا تعاقب کر کے انہیں عبرتناک انجام تک پہنچائیں، چاہے اُن کا تعلق کسی جماعت سے ہو۔ کسی سیاسی بلیک میلنگ کو خاطر میں نہ لائیں اور اپنے اس آپریشن کو حتمی اور منطقی انجام تک پہنچائیں۔ ہم سیاسی قیادت سے بھی اپیل کرتے ہیں کہ وہ غور کریں کہ کراچی ہی نہیں پورے ملک کو تباہی و بربادی کا سامنا کیوں ہے؟ کراچی آپریشن عارضی حل ہوگا، لیکن حقیقی اور دائمی حل یہ ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب ہم نظریۂ پاکستان کو عملی تعبیر دینے میں ناکام ہوئے تو لسانی اور علاقائی تعصب نے قوم کو گردن سے دبوچ لیا۔ انسانوں کو بھی باہم جڑنے کے لیے ایک طرح کے سیمنٹ کی ضرورت ہوتی ہے اگر ہم اسلام کو باہم جڑنے کی بنیاد نہیں بنائیں گے تو لسانیت اور علاقائیت پرستی کے فتنے یقیناً سر اٹھائیں گے۔ ہم نے پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اگر ہم اسلام کے رشتہ کو ختم کر دیں گے تو سندھی کو بلوچی سے اور بلوچی کو پنجابی سے محبت کیوں ہو اور کس بنیاد پر ہو؟ اگر ستر سٹھ سال کے بعد بھی ہندوستان سے ہجرت کرنے والے مسلمان اور پاکستانی کہلوانے کی بجائے مہاجر کہلوانا چاہیں گے تو اتحاد اور یکجہتی کو کیسے قائم رکھا جا سکے گا۔ ٹوٹ پھوٹ اور شکست و ریخت اِس کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ ریاست پاکستان اور مسلمان عوام دونوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی اس ریاست میں اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی قائم کرے کیونکہ اسلام ہی پاکستان کے وجود کا واحد جواز ہے اور ہر شہری بھی اس حوالہ سے دنیا و آخرت میں جوابدہ ہے اور یہی ملک میں امن و امان قائم کرنے کا نسخہ کیمیا بھی ہے۔



ہوئے تم دوست جس کے.....

اسلامی تاریخ میں کئی ایسے ناخوشگوار مواقع آئے جب مسلمان ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوئے اور ان کے درمیان کشت وخون ہوا۔ یہاں تک کہ دورِ خلافت راشدہ بھی پوری طرح اس سے خالی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایک دوسرے کے خلاف مورچہ زن ہوئے۔ اگرچہ باقاعدہ جنگ رات کے اندھیرے میں ایک سازش کا نتیجہ تھی، لیکن ان کا ایک دوسرے کے خلاف میدانِ جنگ میں اتر آنا تو ایک تلخ تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان بھی خونریز جنگ ہوئی تھی، پھر سانحہ کربلا جیسا حادثہ فاجعہ بھی اسلامی تاریخ کے ایک سیاہ باب کی حیثیت سے ہماری کتب میں موجود ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی جنگ بھی عقیدہ میں فرق کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی یزید کے خلاف جہاد اس لیے کیا کہ آپؓ کو خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوتی نظر آئی تھی، آپ کو یہ انحراف قبول نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے نظامِ خلافت کی خوبصورت عمارت میں ایک دراڑ کو بھی برداشت نہ کیا اور اسلام کے ایک سنہری اصول کی خاطر اپنی اور اہل خانہ کی جان کی قربانی پیش کر دی۔ بعد ازاں مسلمانوں میں جو باہم جنگ وجدل ہوا وہ خالصتاً ذاتی اقتدار اور حصولِ قوت کی جنگیں تھیں جو مسلمان سلاطین اور بادشاہوں نے ایک دوسرے کے خلاف لڑی تھیں، یعنی کشور کشائی کا معاملہ تھا۔ عقیدہ کی بنیاد پر باہم آویزش اور چپقلش بھی اگرچہ رہی اور مقامی سطح پر محدود بلوے اور مذہبی فرقہ وارانہ لڑائی جھگڑے بھی ہوئے لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ لڑائی جھگڑے صرف اہل تشیع اور اہل سنت کے درمیان ہوئے بلکہ ایک ہی امام ابوحنیفہؒ کے مقلدین یعنی دیوبندی اور بریلویوں کے درمیان بھی ہوئے۔ جبکہ مسلکی اختلاف کی بنیاد پر دو

مسلمان ممالک کی باقاعدہ جنگ اسلامی تاریخ میں بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ ماضی قریب کی ایران عراق جنگ بھی خالصتاً جغرافیائی تنازع پر ہوئی تھی۔

امریکہ افغانستان اور عراق پر ظالمانہ اور جابرانہ قبضہ جمانے کے بعد مسلسل اس کوشش میں تھا کہ امت مسلمہ کو اہل تشیع اور اہل سنت میں تقسیم کر کے ان میں کوئی بڑا تصادم کروادیا جائے۔ دونوں کا نقصان اور ہلاکت اس کے فائدہ میں ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے امریکہ نے سعودی عرب سے دوستی اور ایران سے دشمنی کا ڈھونگ رچایا۔ گزشتہ پانچ چھ دہائیوں کا واقعاتی جائزہ لیتے ہوئے ہم حلفیہ کہہ سکتے ہیں کہ نہ وہ سعودی عرب کا حقیقی دوست تھا اور نہ وہ ایران کا حقیقی دشمن تھا۔ کہیں دوستی کا روپ دھار کر اور کہیں دشمنی کا ڈھونگ رچا کر اور اصل میں امت مسلمہ کی نادانیوں اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر آج اس نے سعودی عرب اور ایران کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ امریکہ امت مسلمہ کے ان دو دھڑوں کو لڑانے میں اتنا آگے جا چکا ہے کہ اس نے ایران کے جوہری قوت بننے کے مسئلہ پر اسرائیل سے بھی محبت آمیز اور پیار بھرا جھگڑا مول لے لیا ہے۔ اگرچہ امریکہ کسی صورت ایران کو ایٹمی قوت نہیں بننے دے گا اور اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے ایران بھی اپنے سابقہ سخت موقف سے دستبردار ہو چکا ہے۔ لیکن جو بات امریکہ اپنے محبوب اسرائیل کو سمجھانا چاہتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایران کو اس حوالہ سے اتنا نہ دبایا جائے کہ وہ اہل سنت دنیا کے خلاف کمزور پڑ جائے اور دونوں کو لڑانے کی اُس کی کوشش کامیاب نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ عالم اسلام میں جگہ جگہ فرقہ وارانہ جنگ بھڑکانا چاہتا ہے۔ یہی کچھ عراق میں کیا گیا اور یہی کچھ پاکستان میں کیا جا رہا ہے۔

یمن سعودی عرب کا پڑوسی ہے، دونوں ممالک میں 1800 کلومیٹر کا مشترکہ بارڈر ہے۔ مشرق، جنوب اور جنوب مشرق تین اطراف سے یہ بارڈر باہم ملتا ہے اور سعودی عرب کا صوبہ قطف جس میں اہل تشیع کی زیادہ آبادی ہے وہ اسی بارڈر پر واقع ہے۔ اہل تشیع کُل آبادی کا 36 فیصد ہیں جو حوثی کہلاتے ہیں۔ وہ ایک طویل عرصہ سے یمن میں حکومت کرتے چلے آ رہے تھے اور 1962ء تک یہی فرقہ یمن کا حکمران تھا۔ اُس کے بعد حکومت اہل سنت کے ہاتھ آئی۔ یہ حوثی آج کل اپنے اِن حکمرانوں کے خلاف بغاوت کیے ہوئے ہیں اور ایران کے ایما پر سعودی خاندان کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں۔ سعودی عرب امریکہ کا پرانا حلیف گردانا جاتا ہے، لیکن

امریکہ بذریعہ ایران سعودی عرب کے بغل میں یمن کے حوثیوں کو اہل سنت کے خلاف بغاوت میں مدد دے رہا ہے۔ یمن کے حکمران باغیوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر فرار کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ یمن کا صدر منصور الہادی آج کل سعودی عرب میں پناہ گزین کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے۔ لہٰذا یمن میں ایک ایسی حکومت قائم ہونے جا رہی ہے جو ہمسایہ عرب ریاست خصوصاً سعودی حکمران خاندان کی بدترین دشمن ہے۔ سعودی عرب کے نئے بادشاہ سلمان بن عبدالعزیز نے اپنی ریاست بلکہ صحیح تر الفاظ میں اپنی حکومت کے لیے خطرہ محسوس کیا تو پاکستان کے وزیراعظم میاں محمد نواز شریف جو سعودی خاندان کے ذاتی دوست بھی ہیں، جنہیں سعودی حکمرانوں نے جلاوطنی کے دور میں اپنے ملک میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ پناہ دی تھی، انہیں سعودی عرب کے دورہ کی ہنگامی دعوت دی۔ وہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور معتبر ترین ذرائع کے مطابق اپنی ریاست اور حکومت کی سکیورٹی کے لیے پاکستانی فوج کے تعاون کا مطالبہ کیا۔ ابھی یہ غیر مصدقہ اطلاعات آ رہی تھیں کہ وزیراعظم نواز شریف نے واپسی پر پاکستان کے مقتدر حلقوں سے مشورہ کے بعد سعودی عرب سے اس حوالہ سے معذرت کر لی ہے۔ بعدازاں سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں نے (جن میں مصر، قطر، سوڈان اور کویت وغیرہ شامل ہیں) یمن میں حوثی باغیوں کے اڈوں پر فضائی حملہ کیا۔ سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ مقرن اور وزیر خارجہ سعود الفیصل نے وزیراعظم نواز شریف سے رابطہ کر کے تعاون کی دوبارہ درخواست کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مکہ مکرمہ سے کعبۃ اللہ کی وجہ سے اور پہلی اسلامی ریاست مدینہ منورہ سے نبی اکرم ﷺ کی خصوصی نسبت اور آپ کی آخری آرام گاہ ہونے کے ناتے، جو عظمت اور ان دو شہروں سے محبت کا جو جذبہ ہے، وہ کبھی اس عرب ریاست کی بے حرمتی یا دشمن کی کسی نوع کی یلغار کو کسی صورت قبول نہیں کر سکتے۔ سعودی حکام کی طرف سے مدد کی اس درخواست کا جائزہ لینے کے لیے پاکستان میں اعلیٰ ترین سطح کا ایک اجلاس ہوا جس میں سیاسی اور عسکری قیادت سر جوڑ کر بیٹھی اور اس درخواست پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس میں کیا فیصلے ہوئے، ظاہر ہے انہیں پبلک تو نہیں کیا گیا، البتہ سرکاری ترجمان نے یہ وضاحت کی ہے کہ سعودی عرب کی سلامتی کو خطرات لاحق ہوئے تو پاکستان خاموش نہیں بیٹھے گا۔ ہماری رائے میں ہمیں اس حوالہ سے احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ جہاں عرب کی سرزمین اور اس کی سرحدوں کا معاملہ ہے، ہمیں اس حوالہ سے بڑا حساس اور چوکنا ہونا ہوگا اور اگر کوئی بدنیتی سے مقدس مقامات کی طرف بڑھنے کی

جرأت کرے تو تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ہر چہ بادا باد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ہمیں میدان میں کودنا ہوگا۔ البتہ اگر مسئلہ صرف سعودی خاندان کی حکومت کو بچانے کا ہے تو ہمیں وہاں اقتدار کی کشمکش سے بالکل جدا رہنا ہوگا۔ ہمارے لیے سعودی خاندان یا ان کی حکومت مقدس کیا، اہم بھی نہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کا حق ہے کہ وہ کسے حق حکمرانی دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وزارتِ خارجہ نے جس محتاط انداز میں بیان دیا ہے، وہ مناسب ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہمیں عرب ریاست سے دلچسپی اور قلبی تعلق ہے۔ حکومت سعودی خاندان کی ہوتی ہے یا ان کی طرح کا کوئی اور صحیح العقیدہ مسلمان اس ریاست میں حکمرانی کرتا ہے، ہمیں غرض نہیں ہونی چاہیے۔

پاکستان کے لیے یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ ظاہری طور پر پاکستان کے ایران کے ساتھ تعلقات بھی بہت اچھے ہیں۔ اگر پاکستان سعودی عرب کی out of the way حمایت کرتا ہے تو ایران بھی ناراض ہوگا۔ شام پہلے ہی اس حوالہ سے ہمارے ساتھ اظہار ناراضگی کر چکا ہے۔ چین اور روس بھی کچھ حدود میں رہتے ہوئے ایران اور شام کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں جبکہ ترکی سعودی عرب کا ساتھ دیتا نظر آتا ہے۔ پھر یہ کہ پاکستان میں اہل تشیع کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو ایران اور شام کے لیے اچھے جذبات رکھتے ہیں۔ سو پاکستان کے لیے کشتیاں جلا کر کسی ایک فریق کا ساتھ دینا ممکن نہیں، کیونکہ پاکستان اندرونی طور پر بھی مستحکم نہیں۔ ہمیں داخلی سطح پر کوئی نیا مسئلہ نہیں کھڑا کرنا چاہیے۔ ایک طرف شمال مغرب میں فوجی آپریشن ہو رہا ہے تو دوسری طرف کراچی میں ایم کیو ایم کو رینجرز نے للکارا ہے۔ کراچی کا آپریشن اگر کسی بھی وجہ سے ادھورا چھوڑا گیا تو کراچی کو آئندہ سنبھالنا انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ سعودی عرب کی اس انداز میں مدد کرنا چاہیے جس سے وہ ریاست مستحکم ہو، نہ کہ وہ خاندان جس کی اس وقت حکومت ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں عالم اسلام کی سطح پر یہ کوشش کرنی چاہیے کہ امریکہ جو کھیل امت مسلمہ کے ساتھ کھیل رہا ہے، مسلمان اس کی عیاری اور دشمنی کو سمجھیں۔ وہ مسلمانوں میں سے کسی کا دوست نہیں۔ مسلمان متحد ہو کر اُس کے ناپاک عزائم کو ناکام بنائیں۔ پاکستان کو سعودی عرب کی صورتِ حال سے عبرت حاصل کرنا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ امریکہ اپنے دوستوں سے خصوصاً مسلم ممالک سے دوستی کے پردے میں کیا کچھ کرتا ہے۔ امریکہ کا دوستوں سے یہ رویہ دیکھ کر غالب کا یہ مصرعہ نوک قلم آتا ہے ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟ اللہ ہم مسلمانوں کو ہدایت دے اور کفار پر فتح مبین دے۔ آمین یارب العالمین! ✿✿✿

پاکستان: بھارت کے خفیہ ہتھیار ''را'' کی زد میں

آئی ایس پی آر کی ایک پریس ریلیز کے مطابق کور کمانڈرز کی میٹنگ میں اس بات کا نوٹس لیا گیا کہ ''را'' پاکستان میں تخریب کاری اور دہشت گردی کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ بھارت کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ باز آ جائے ورنہ پاکستان جوابی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ بعد ازاں، ایک امریکی جنرل سے ملاقات کے دوران پاکستان کے آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے پاکستان میں دہشت گردی میں بھارت کے ملوث ہونے کے دستاویزی ثبوت پیش کیے۔ الحمدللہ ہماری عسکری قیادت نے بالآخر اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عرصہ سے ہمارے مقتدر حلقوں کو سب کچھ معلوم تھا لیکن مصلحت' خوف اور مرعوبیت کی جس کیفیت سے ہماری پہلی عسکری قیادت دوچار تھی وہ اسے زبان کھولنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ لہٰذا دہشت گردی کی کسی بھی واردات کے بعد ان کی نظریں اولاً تو دینی مدارس اور باریش افراد پر ٹک جاتی تھیں، یا کبھی کبھار جرأت سے کام لیتے ہوئے صرف اتنا کہہ دیا جاتا تھا کہ غیر ملکی ہاتھ ملوث ہو سکتا ہے۔ بہرحال ''دیر آید درست آید'' کے مصداق عسکری قیادت نے تو سچ اور حق کی بات کہہ دی ہے۔ البتہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہماری سول حکومت کو یہ سچ گوارا نہیں، لہٰذا وزیراعظم میاں نواز شریف کی مبارک زبان سے تو ابھی تک ''را'' کا نام نہیں نکلا۔ ایک مرتبہ وزارت خارجہ کے ترجمان نے ''را'' کا ذکر خیر کر دیا تھا لیکن اگلے روز کسی کی ڈانٹ ڈپٹ پر یا خود ہی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ بات فی الحال حتمی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ حالیہ دہشت گردی میں بھارت ملوث تھا۔ صرف وزیر دفاع جی ایچ کیو سے اپنی علیک سلیک قائم رکھنے کے لیے بھارت کی شرانگیزی کا جواب کسی نہ کسی سطح پر دے دیتے ہیں۔ بھارت پاکستان میں سول اور فوجی حکومت کو

ایک پیج پر نہ دیکھ کر اب کھلم کھلا دھمکیوں پر اتر آیا ہے۔ بھارت کے وزیر دفاع منوہر پریکار نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ہے "We will fight terror with terror" یعنی ہم دہشت گردی کا جواب دہشت گردی سے دیں گے۔ اگلے ہی روز انہوں نے یہ بیان داغ دیا کہ ہم نے 13 لاکھ فوج پاکستان کے ساتھ امن قائم کرنے کے لیے نہیں بنائی۔ یہ جنگ کی کھلی دھمکی ہے۔

بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ہم قارئین سے "RAW" کا تعارف کروانا چاہیں گے۔ یہ مخفف ہے Research & Analysis Wing کا۔ چالاکی اور عیاری کا اندازہ کریں، اس نام سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے کوئی علمی اور تحقیقی کام کرنے کے لیے کوئی ادارہ بنایا گیا ہے۔ 1962ء میں چین کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد اور 1965ء میں پاکستان کے بارے میں اپنے مذموم عزائم کی ناکامی پر ستمبر 1968ء میں یہ خفیہ ایجنسی قائم کی گئی۔ اپنے قیام کے بعد جلد ہی اس ایجنسی کو 1971ء میں پاکستان کو شکست و ریخت سے دوچار کرنے کی ایسی شاندار کامیابی ملی جس کی نظیر جدید تاریخ میں ملنی دشوار ہے، اگرچہ اس ذلت آمیز شکست میں پاکستانیوں کی اپنی حماقتوں اور ان کی بداعمالیوں کا بھی کردار تھا۔ بہرحال دشمن نے ان سے بھرپور اور زبردست فائدہ اٹھایا۔ ''را'' کی کارروائیوں اور بھارت کے پاکستان کے حوالہ سے رویہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خصوصاً سیاسی قیادت کو اپنی آنکھوں سے بھارتی محبت کی پٹی اتار کر ایک سیدھی سادی حقیقت کو جان لینا چاہیے۔ ان کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ دنیا کے کوئی سے دو ممالک کے درمیان کشیدگی اس کی وجہ کو دور کر کے ختم کی جا سکتی ہے۔ بھارت کا اصل مسئلہ پاکستان کا وجود ہے۔ بھارت راضی نہیں ہو سکتا جب تک پاکستان دنیا کے نقشے پر موجود ہے۔ ہندو نقطہ نظر یہ ہے کہ پاکستان بنا کر بھارت ماتا کے ٹکڑے کیے گئے۔ اکھنڈ بھارت ان کے دھرم کا مطالبہ ہے۔ لہٰذا ہندو پیار و محبت سے لے کر جنگ و جدل تک ہر حربہ اختیار کریں گے۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کی محبت کا وار ان کی جنگ سے زیادہ خطرناک ہے۔ اکبر اعظم پر انہوں نے محبت کا ڈول ڈالا تھا۔ اسی محبت میں وہ مذہب اسلام کو بہا لے جاتے اگر مجدد احمد سرہندیؒ الف ثانی ان کے راستے کی دیوار نہ بنتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھرے اور جنت میں ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین یا رب العالمین! دورِ حاضر کی ''امن کی آشا'' بھی ویسی ہی ایک کوشش تھی جس میں ہمارا ایک بڑا میڈیا گروپ بہہ گیا تھا، اور

بعض ٹی وی اینکر بھارتی لائن پر آنکھیں بند کیے چلے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں ہماری سیاسی قیادت تو ناسمجھ ثابت ہوئی البتہ عوام نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اس میڈیا گروپ کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ امید ہے ایسی امن کی آشا جو پاکستانی ریاست کے وجود کو خطرات لاحق کر دے اور ہمارے پیارے مذہب ہی کو مسخ کر دینے کے مذموم عزائم رکھتی ہو، عوامی ردعمل کے خوف سے کوئی پاکستانی ادارہ اب شروع کرنے یا اس کی معاونت کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔

ہم ہرگز اس بات کے حق میں نہیں کہ بھارت کے ساتھ پُرامن اور اچھے ہمسایوں کی طرح نہ رہا جائے یا اس کے ساتھ جنگ و جدل کا سلسلہ جاری رکھا جائے، البتہ ہم اس کے ساتھ محبت کی پینگیں ڈالنے کے خلاف ہیں کیونکہ وہ کسی بھی وقت دوستی کی آڑ میں ڈنک مارے گا۔ ہم ایک ہزار سال تک اس کے ساتھ رہے ہیں لہٰذا ہمیں ہندو ذہنیت کا علم ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندو نے بدھ مت اور سکھ مذہب کو کیسے ڈسا تھا۔ پاکستان کے حوالہ سے بھارت کی سوچ منفی اور حاسدانہ ہے۔ اندازہ کریں کہ چانکیا پاکستان اکنامک کوریڈور جو یقیناً اس صدی کا عظیم ترین منصوبہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن بھارت صرف اس سوچ پر عمل درآمد کے لیے کہ پاکستان کو فائدہ نہیں ہونا چاہیے اور پاکستان کو معاشی استحکام نہیں ملنا چاہیے اس عظیم منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کھل کر میدان میں آ گیا ہے۔ ''را'' نے ایک خصوصی ڈیسک قائم کیا ہے جسے 300 ملین ڈالر کے فنڈ دیے جا رہے ہیں کہ اس منصوبہ کو ناکام بنایا جائے۔ علاوہ ازیں جس طرح بھی ممکن ہو، اگر پاکستان کو دنیا کے کسی بھی کونے سے فائدہ پہنچتا ہے تو بھارت وہاں اپنی ٹانگ ضرور اڑائے گا۔ بھارت نے اپنی اس تنظیم ''را'' کو دنیا کے جغرافیہ کے حوالہ سے چار گروپس میں تقسیم کیا ہوا ہے، گویا دشمنوں کی ایک ترجیحی فہرست بنائی ہوئی ہے: (1) پاکستان (2) چین (3) مشرق وسطیٰ اور افریقہ (4) باقی دنیا۔ اس فہرست سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت کا اولین اور ترجیحی ٹارگٹ پاکستان ہے۔ افسوس کہ ہمارے حکمران خصوصاً موجودہ وزیراعظم اور ملک بھر کے سیکولر عناصر کے سر سے بھارت سے محبت کا جنون کیوں نہیں اترتا۔ کیا وزیراعظم کو اپنی ذاتی تجارت ملکی مفاد سے عزیز تر ہے؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی اس بے پایاں محبت سے بھارتیوں کے دل جیت لیں گے تو یہ ان کی خوش فہمی ہے۔ یہ تاریخ سے نابلد اور ناآشنا ہونے کا ثبوت ہے۔ بھارت آج بھی چانکیہ فلسفہ کا قائل ہے۔ وہ ہمسائے سے نہیں، ہمسائے کے ہمسائے سے تعلقات اچھے رکھے گا۔ یہی

وجہ ہے کہ وہ پاکستان سے نہیں بلکہ افغانستان اور ایران سے دوستی کی کوشش میں رہتا ہے۔

قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ بھارت کا یہ انتہائی خفیہ ہتھیار یعنی ''را'' اگرچہ اولین طور پر اور ترجیحاً پاکستان کے خلاف استعمال ہو رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ بھارت کا کوئی ہمسایہ اس حوالہ سے سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ سری لنکا کو ''را'' نے ایک مدت تک دہشت گردی کی جنگ میں جھونک رکھا۔ نیپال کے پورے شاہی خاندان ہی کو قتل کروا دیا۔ اجمل قصاب کو ''را'' نے نیپال سے اٹھا کر ممبئی حملوں کا مجرم بنا کر پھانسی دے ڈالی۔ مالدیپ بھی ''را'' کو بھگت چکا ہے۔ بھارت درحقیقت پورے خطے میں ہندو راج قائم کرنا چاہتا ہے۔ ہم پاکستان کے مقتدر حلقوں کو بآوازِ بلند اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھارت کا مقابلہ پاکستانی قومیت کی بنیاد پر کرنا چاہیں گے تو کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے کہ ہم نے پاکستان قومیت کی نفی کر کے بنایا تھا۔ پاکستان اگر بھارت کا مقابلہ کر سکتا ہے تو صرف ایک نظریاتی ریاست بن کر ہی کر سکتا ہے۔ ہمیں یقین واثق ہے کہ ایسی صورت میں ہم بھارت کو دندان شکن شکست دے سکتے ہیں!

ایم کیوایم پر بی بی سی کے سنگین الزامات

بی بی سی عالمی سطح پر اچھی اور قابل اعتماد ساکھ رکھنے والا ایک بڑا نشریاتی ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ایک پرانا ادارہ ہے جس کی ایک تاریخ ہے اور خبر کے حوالہ سے ایک کریڈیبلٹی ہے۔ دنیا اسے دیکھتی اور سنتی ہے اور اس کے کہے کو وزن دیتی ہے، لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس کی آواز کو حق اور سچ کی صدا سمجھا جائے یا اس کی رپورٹس کو من وعن تسلیم کرلیا جائے۔ حال ہی میں بی بی سی نے ایک ڈاکومینٹری کے ذریعے پاکستان کی ایک سیاسی جماعت ایم کیوایم پر سنگین نوعیت کے الزامات عائد کیے ہیں۔ ان الزامات کے مطابق بھارت ایم کیوایم کو پاکستان میں تخریب کاری کرنے کے لیے بھاری رقوم دیتا ہے۔ ایم کیوایم کے سینکڑوں کارکن گزشتہ دس سالوں میں بھارت فوجی ٹریننگ حاصل کرنے کے لیے گئے۔ گویا اِس ڈاکومنٹری کے مطابق پاکستان کے ازلی دشمن بھارت سے تعاون کرتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کے خلاف ایم کیوایم سازش کررہی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ بی بی سی کی اس رپورٹ سے چند ہفتے قبل بھارتی وزیراعظم نریندر مودی بنگلہ دیش کے دورہ کے دوران اس جرم کا اعتراف کرچکے ہیں کہ بھارتی افواج نے 1971ء میں مشرقی پاکستان میں مکتی باہنی کے روپ میں بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے پاکستان کی سلامتی کے خلاف عملی کارروائیاں کیں اور پاکستان کو دولخت کیا۔ لہٰذا فی الحال صرف ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ بھارت قولی اور عملی طور پر پاکستان کی سلامتی کا بدترین دشمن ہے۔ اب یہ پاکستان کی طرف سے الزام نہیں رہا بلکہ مجرم کا اعترافی بیان ہے۔

اس رپورٹ کے حوالہ سے اہل پاکستان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا پاکستان کی سیاسی جماعت ایم کیوایم کا پاکستان دشمن ملک سے مال اور جان کا کوئی تعلق ہے؟ اس حوالہ سے ہماری گزارش یہ

ہے کہ اگر چہ پاکستان کی فضاؤں میں بی بی سی کے الزامات سے ملتے جلتے الزامات ایک عرصہ سے گردش کر رہے تھے اور بہت سے تجزیہ کاروں اور کالم نگاروں کو یہ کہتے اور لکھتے پایا گیا کہ بی بی سی نے کون سے نئے انکشافات کیے ہیں، ہم تو عرصہ دراز سے یہ سب کچھ عوام کو بتا رہے تھے، اس سب کچھ کے باوجود محض میڈیا میں ایم کیو ایم پر حملہ آور ہونا درست نہیں ہے۔ یہ ایک طرف اگر پاکستان کی سلامتی کا مسئلہ ہے تو دوسری طرف تیس پینتیس سالہ پرانی سیاسی جماعت کی ساکھ کا بھی مسئلہ ہے۔ لہٰذا بیان بازی اور الزام تراشی کی بجائے حقائق کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے، اور یہ حکومت پاکستان اور ایم کیو ایم دونوں کی ضرورت ہے۔ ایم کیو ایم کو تو سنہری موقع میسر آیا ہے۔ وہ برطانیہ کی عدالت سے رجوع کرے اور بی بی سی کو الزامات ثابت کرنے کا چیلنج کرے۔ یہ بات ہم بہت دکھ سے زیر تحریر لا رہے ہیں کہ برطانیہ کی پولیس کا تفتیشی نظام اور وہاں کا عدالتی نظام پاکستان کی طرح فرسودہ اور سیاست زدہ نہیں ہے۔ وہاں کسی فرد یا جماعت پر اگر کوئی نشریاتی ادارہ جھوٹا اور بے بنیاد الزام لگا دے تو اُس کو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں اور اتنے بھاری ہرجانے ادا کرنا پڑتے ہیں کہ بڑے بڑے ادارے دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا کوئی اخبار یا الیکٹرانک میڈیا کسی بڑی ہستی یا گروہ پر الزامات عائد کرنے سے پہلے اپنے لیگل ایڈوائزر سے الزامات کے ایک ایک لفظ پر قانونی رائے لیتے ہیں اور وہ اُس وقت تک کوئی رپورٹ شائع یا بیان نہیں کرتے جب تک انہیں مکمل طور پر تسلی نہ ہو جائے کہ وہ ہر قسم کی قانونی چارہ جوئی کا مناسب جواب دیں سکیں گے۔ بہر حال غلطی کا امکان ہر جگہ ہے، لہٰذا ہم اپنے ملک کی اس الزام زدہ سیاسی جماعت یعنی ایم کیو ایم سے پوری پوری ہمدردی رکھتے ہوئے اُسے کہیں گے کہ وہ فوری طور پر اور بلا تاخیر برطانیہ میں عدالتی کارروائی کرے تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو سکے۔ بصورت دیگر یعنی اگر ایم کیو ایم، بی بی سی کو عدالت میں چیلنج نہیں کرتی تو یہ اعتراف جرم کے مترادف ہوگا جو نہ صرف ایم کیو ایم بلکہ ہر پاکستانی کے لیے باعث شرمندگی ہوگا۔ یہ بات تو چل جائے گی کہ پاکستان میں سول انتظامیہ یا اسٹیبلشمنٹ یا کوئی خاص قوت ایم کیو ایم کے خلاف سازش کر رہی ہے لیکن یہ بات دنیا بھر میں کوئی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ بی بی سی یا سکاٹ لینڈ یارڈ یا برطانوی حکومت اور برطانیہ کی عدالتیں سب ایم کیو ایم کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ ایم کیو ایم کو یہ بات سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ ان الزامات سے بری ہو جاتی ہے اور اُن پر الزامات عائد کرنے والا نشریاتی ادارہ

اعتراف کر لیتا ہے کہ اس نے کسی بھی مقصد کی خاطر جھوٹے الزامات لگائے تھے تو ایم کیو ایم کو ایک نئی سیاسی زندگی مل جائے گی اور اس وقت پاکستان میں ان پر جو الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے وہ ختم نہ ہوئی تب بھی اس میں بہت کمی واقع ہو جائے گی اور وہ پاکستان میں اپنے سیاسی مخالفین کو جواب دینے کے حوالے سے بہتر پوزیشن میں آ جائیں گے۔

ہم حکومت پاکستان سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ کسی قسم کے سیاسی مفاد کو آڑے نہ آنے دے اور اگر ایم کیو ایم برطانوی عدالت سے رجوع کرنے سے گریز کرتی ہے تو اسے خود برطانیہ میں عدالت سے رجوع کرنا چاہیے، اس لیے کہ اگر کسی گھر کے ایک فرد پر شرمناک الزام لگے تو وہ صرف اس فرد کی توہین اور ذلت کا باعث نہیں ہوتا بلکہ پورے گھرانے کی عزت کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اگر الزامات درست اور سچے ثابت ہوں تو سارا گھرانہ داغدار اور ذلیل و خوار ہو جاتا ہے۔ حکومت پاکستان کے لیے ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ کسی طرح کم اہم نہیں ہے کہ جس بھارت کے ساتھ دوستی کرنے، اس سے تجارت کرنے اور اسے ایم ایف این (Most favourite nation) کا درجہ دینے کے لیے ہماری حکومت بے تاب تھی، وہ پاکستان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کس سطح تک اتر آتا ہے۔ پاکستان کو اپنا کیس تیار کر کے فوری طور پر عالمی اداروں سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگرچہ ہمیں ان عالمی اداروں سے کوئی توقع نہیں جو ہر وقت اسلام اور مسلمان دشمنی پر کمر بستہ رہتے ہیں تب بھی اتمام حجت لازم ہے۔

ہم خاص طور پر پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ تین مرتبہ پاکستان کے وزیر اعظم بن چکے ہیں، کیا اب بھی وہ ہندو ذہنیت کو نہیں سمجھے۔ ہمارے قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اپنی موجودہ حکومت کی تشکیل سے پہلے میاں صاحب سیفما کے پلیٹ فارم سے آن ریکارڈ یہ کہہ چکے ہیں: ہندو اور مسلمان کا خدا ایک ہے، ان کا کلچر اور رسومات ایک ہیں، ان کا طرز بود و باش ایک ہے۔ گویا پاکستان بناتے وقت جو کچھ قائد اعظم محمد علی جناح نے کہا تھا، اس کی حرف بہ حرف نفی کر دی۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر سربراہ حکومت بدترین دشمن کی ذہنیت سے ہی آگاہ نہیں، اگر وہ برصغیر کی تاریخ سے کلیتاً نابلد ہے تو اس قوم کا مستقبل کیا ہو گا! اس حوالہ سے پند و نصائح یا بہتر مستقبل کے لیے کوئی تجویز دینا اگرچہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے لیکن ہمیں اپنی دینی اور قومی ذمہ داری ادا کرنا ہے۔ پھر یہ کہ افراد آتے

جاتے رہیں گے، ہمیں اپنا فرض ادا کرنے سے غرض ہونا چاہیے۔ فی الحال ہم اپنے مقتدر حلقوں کے سامنے صرف ایک سوال رکھتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ایگزٹ ٹام سے ایک نقائی ادارہ سالوں سے کام کر رہا ہو، مالی لحاظ سے دن سوگنی اور رات ہزار گنی ترقی کر رہا ہو، اپنے کارکنوں کو اتنی بڑی بڑی تنخواہیں دے رہا ہو کہ کسی دوسرے ادارے کا ملازم اُس کا خواب بھی نہ دیکھے لیکن ہمارا کوئی حکومتی، نیم حکومتی تحقیقاتی ادارہ اُس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھے البتہ جب نیویارک ٹائمز یہ ادارے کی جعل سازی کی خبر چھپے تو طوفان اٹھ جائے۔ ایسا ہی معاملہ ایم کیو ایم کا ہے کہ نجی محفلوں سے لے کر ٹاک شوز تک بی بی سی سے ملتے جلتے الزامات کا شور مچاتے رہے لیکن حکومتیں اُن سے اتحاد کرتی رہیں اور اچانک بی بی سی کی رپورٹ پر ملزم ہی نہیں مجرم سمجھے جانے لگیں۔ ہمارے تحقیقاتی ادارے کہاں ہیں؟ ہمارا عدالتی نظام کہاں ہیں؟ ہماری انتظامی مشینری کیوں غفلت کی نیند سوئی رہتی ہے؟ پھر باہر والوں کی دستک پر ہڑبڑا کر اٹھ جاتی ہے اور الٹے سیدھے اقدام کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ہم اپنی طرف سے نہ ایگزٹ والوں کو مجرم قرار دیتے ہیں اور نہ ہی ایم کیو ایم کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں لیکن پاکستان کو اپنا اعتماد قائم کرنے کی ضرورت ہے اور یہ اعتماد قائم نہیں ہوگا جب تک سچائی، دیانت، امانت جیسی اقدار کو ہم نہیں اپناتے، اور آخری حتمی اور فیصلہ کن بات یہ کہ جب تک عدل و قسط کا نظام قائم نہیں کرتے۔



عید کبھی روزوں سے پہلے نہیں آ سکتی

سندھ میں رینجر کی بعض کارروائیوں کی وجہ سے اراکین اسمبلی سخت نالاں ہیں لہٰذا صوبائی مقننہ اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان تصادم کی کیفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی جو سندھ کی حکمران جماعت ہے اور ایم کیو ایم جو سندھ کے شہروں کی بڑی جماعت ہے اور کبھی کبھار وہاں اپوزیشن کا روپ بھی دھار لیتی ہے، اس حوالہ سے دونوں متحد ہو گئی ہیں۔ گویا دیہی سندھ اور شہری سندھ کی یہ دونوں نمائندہ جماعتیں مشترکہ طور پر کراچی میں رینجرز کے خلاف محاذ بنا چکی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رواں سال کے آغاز میں یعنی چند ماہ پہلے ایم کیو ایم کے قائد الطاف بھائی زور انداز میں فوج سے اپیل کر رہے تھے کہ وہ کراچی میں مکمل کنٹرول حاصل کر کے کراچی کو قتل و غارت، بھتہ خوری، ٹارگٹ کلنگ اور اغوا برائے تاوان جیسی وارداتوں سے نجات دلائے۔ بعدازاں، اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے الطاف بھائی نے یہ مطالبہ بھی کر ڈالا کہ فوج ملک بھر میں اقتدار پر قبضہ کر لے۔ پیپلز پارٹی تو ایک مدت سے کراچی میں رینجرز کے قیام کی مدت میں بخوشی توسیع کرتی چلی آ رہی تھی۔ لیکن ان ہی رینجرز نے جب ایسے جرائم پیشہ افراد پر ہاتھ ڈالا جن کا تعلق ایم کیو ایم سے تھا اور وہ اُن کا تعاقب کرتے ہوئے نائن زیرو تک جا پہنچے تو ایم کیو ایم اور اُن کے قائد الطاف بھائی نے چیخ و پکار کرنا شروع کر دی۔ اس وقت تک پاکستان پیپلز پارٹی کو رینجرز سے کوئی خاص شکایت نہ تھی اور نہ ہی اُنہوں نے کسی ردعمل کا اظہار کیا۔ فوج جب اس نتیجہ پر پہنچی کہ معاشی دہشت گردی یعنی کرپشن اور بدعنوانی کے سیلاب کے آگے بند باندھے بغیر کراچی سے قتل و غارت گری اور ہر نوعیت کی دہشت گردی پر قابو نہیں پایا جا سکتا اور اُنہوں نے بعض محکمہ جات پر چھاپے مار کر فائلوں پر قبضہ کیا اور بعض افسران کو گرفتار کیا تو یہ انکشاف ہوا کہ اس

معاشی دہشت گردی کے ڈانڈے پاکستان پیپلز پارٹی اور بلاول ہاؤس سے جا ملتے ہیں۔ بعض افسران نے واضح طور پر کہا کہ وہ اس بدعنوانی سے حاصل ہونے والی رقم کا ستر فیصد روزانہ کی بنیاد پر بلاول ہاؤس پہنچاتے ہیں تو آصف زرداری پر واضح ہو گیا کہ وہ گھیرے میں آ چکے ہیں۔ اُنہوں نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا۔ وہ افغانستان کے دورے پر کابل پہنچے اور عبداللہ عبداللہ سے ملاقات کی۔ بعض ذرائع نے یہ خبر بریک کی کہ کابل میں آصف زرداری نے فوج کے خلاف بہت زہر اگلا۔ شاید وہ براستہ کابل امریکہ تک یہ خبر پہنچانا چاہتے تھے کہ وہ پاکستانی فوج کے خلاف سٹینڈ لینے کو تیار ہیں۔ بہر حال بقول راوی، یہ سب کچھ جی ایچ کیو کو من و عن معلوم ہو گیا۔ آصف زرداری نے واپس آ کر آرمی چیف سے ملاقات کے لیے سر توڑ کوشش کی لیکن وہ ناکام ہوئے ۔دروغ بر گردن راوی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ابھی تک اس خبر کی تردید نہیں کی۔ بعد ازاں آصف زرداری ایک تقریب میں پارٹی کے جیالوں سے خطاب کرتے ہوئے پھٹ پڑے اور انہوں نے کہا ''تم تین سال کے لیے ہو، ہم سیاست دان ہمیشہ کے لیے ہیں۔ ہم سے اگر چھیڑ چھاڑ کی تو ہم تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔''

یہ ہے وہ پس منظر جس کی بنیاد پر آج ریاست پاکستان کے دو ادارے یعنی سندھ انتظامیہ بلکہ سندھ اسمبلی اور پاک فوج ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں اور سندھ حکومت نے زبردست مزاحمت کے بعد پاکستان رینجرز کو پہلی مرتبہ صرف ایک ماہ کی توسیع دی ہے اور وہ بھی مشروط کہ اس توسیع کی سندھ اسمبلی منظوری دے گی۔ یہاں ہم ایک اہم اور خطرناک بات قارئین کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھیں گے کہ ملک بھر میں ہر سطح پر یہ تاثر ہے کہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کی مرکز میں حکومت مکمل طور پر فوج کی پشت پر ہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف سٹینڈ لے چکی ہے، لیکن ہمیں اس تاثر سے اتفاق نہیں۔ ہماری رائے میں پاکستان مسلم لیگ کی حکومت خصوصاً وزیر اعظم میاں نواز شریف اگر ایم کیو ایم نہیں تو پاکستان پیپلز پارٹی سے یقیناً پوری پوری ہمدردی رکھتے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ نواز شریف اپنی پوزیشن یعنی پاکستان پیپلز پارٹی کو غیر متوقع طور پر مضبوط حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مرکزی حکومت ظاہری طور پر اور کاغذی سطح پر (on paper) فوج کے ساتھ ہے اور یہ اُس کی مجبوری ہے جب کہ اصلاً اور حقیقتاً اور دلی طور پر وہ فوج کے مخالفین کے ساتھ ہے۔ یہ ہماری رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ہماری یہ رائے

بلا دلیل اور بلا جواز نہیں ہے۔ فوج نے احتساب کا عمل ایم کیو ایم اور دوسری ایسی جماعتوں کے خلاف شروع کیا جن پر بھتہ خوری اور ٹارگٹ کلنگ وغیرہ کا الزام تھا لیکن بعد ازاں پاکستان پیپلز پارٹی کی معاشی دہشت گردی کے خلاف کارروائی کی نوبت آ گئی۔ مسلم لیگ (ن) سمجھتی ہے کہ اس کے بعد اُن کی باری بھی آ سکتی ہے، کیونکہ نواز حکومت کے خلاف بھی کرپشن کے بہت سے الزامات ہیں۔ نیب کے چیئرمین قمر الزمان چودھری جو نواز شریف کے پرانے خدمت گزار ہیں، اُنہیں خاص طور پر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دلوا کر یہ منصب دیا گیا تھا۔ اُنہیں جی ایچ کیو طلب کیا گیا ہے اور اُس کے بعد وہ بدلے بدلے نظر آ رہے ہیں جبکہ حکومتی وزرا خصوصاً وزیر اطلاعات پرویز رشید جنہیں حقیقت میں وزیر اعظم نواز شریف کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت حاصل ہے، وہ نیب کے چیئرمین پر بڑی زبان درازی کر رہے ہیں۔

ہمیں یہ منظر نظر آ رہا ہے کہ ایک طرف فوج ہے اور دوسری طرف پاکستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں جو کم از کم تین چوتھائی پاکستان پر حکومت کر رہی ہیں۔ فوج کے ساتھ صرف پاکستان تحریک انصاف کھڑی نظر آتی ہے جس کی پختون خوا جیسے حساس صوبہ میں حکومت ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین پنجاب میں ذاتی لحاظ سے بہت پاپولر ہیں جبکہ تحریک انصاف پنجاب میں پیپلز پارٹی کا متبادل بن کر سامنے آئی ہے اور مسلم لیگ (ن) کے لیے ایک بڑا چیلنج بن چکی ہے۔ یہ مورچہ بندی ہو چکی ہے۔ ہماری رائے میں داخلی سطح پر ہم خانہ جنگی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ جوڈیشل کمیشن کا فیصلہ جلتی پر تیل کا کام کر سکتا ہے۔ یہاں اس نکتہ کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ جنرل راحیل شریف اپنے بعض اقدامات کی وجہ سے ملک بھر میں بہت مقبول ہیں۔ لیکن ہمیں مارشل لاء کے نفاذ کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اگر صورت حال بہت بگڑتی ہے تو ایک عبوری سیٹ اپ کے قیام کا قوی امکان ہے جو بے رحم اور across the board احتساب کرے گا۔ یہ عبوری سیٹ اپ اور احتساب کامیاب ہوتا ہے یا ناکام، کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ البتہ ہم یقین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ عوام دشمن استحصالی نظام کے دن گنے جا چکے ہیں۔ یہ نظام اگلے بارہ سے اٹھارہ ماہ کے عرصے میں زمین بوس ہوتا نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس سے بڑی اور بہت ہی بڑی مصیبت آنے والے وقت میں ہمارے گلے پڑ سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس منافق نظام کی بجائے خالصتاً سیکولر بلکہ ملحد نظام پاکستان پر مسلط ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی جماعتوں کی قیادتوں اور

کارکنوں کے لیے فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا ہے۔ اگر اب بھی وہ دین کے حوالے سے متحرک نہیں ہوتے اگر اب بھی وہ سیاسی مصلحتیں ترک نہیں کرتے، اگر اب بھی دنیا کی دین پر ترجیح رہتی ہے اور دنیا سے بچے کھچے وقت میں دین کے حوالے سے ڈنگ ٹپاؤ طرز عمل جاری رہتا ہے، اگر اب بھی زیادہ توجہ اس طرف رہتی ہے کہ میڈیا میں ہماری رونمائی ہو جائے، بنیادی کام ہو نہ ہو تشہیر ہو جائے، اگر سارا انحصار اس پر رہا کہ کارروائی ڈال دی جائے۔ اگر اسلام کو اپنے جسم پر نافذ نہ کیا گیا، اگر تعلق مع اللہ کو حرزِ جان نہ بنایا گیا، اگر سنت رسول ﷺ کو دانتوں سے نہ پکڑا گیا اور عملی زندگی میں قرآن وسنت سے راہنمائی حاصل کرنے کا اصولی اور حتمی فیصلہ نہ کیا گیا تو سن لیجیے اور لکھ رکھیے کہ پاکستان میں اعلانیہ اور کھلا سیکولر نظام آیا چاہتا ہے اور اس کی اولین ذمہ دار اسلامی جماعتیں ہوں گی کہ وہ اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں بُری طرح ناکام رہی ہیں۔ اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ تمام اسلامی جماعتیں یک نکاتی ایجنڈے پر متحد ہو کر پاکستان میں نفاذ شریعت کے لیے بھرپور تحریک چلائیں، بلکہ آئیڈیل صورت یہ ہے کہ وہ تمام فروعی اختلافات ختم کر کے ضم ہو جائیں۔ ایک امیر کے ہاتھ پر بیعت کریں جو مشاورت سے تحریک کے عمل کو آگے بڑھائے۔ اُسی کے حکم پر قدم بڑھائیں اور پیچھے ہٹائیں اور زبردست نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تحریک چلائی جائے۔ ہمیں امید واثق ہے کہ پاکستان کی کوئی داخلی قوت اس تحریک کا راستہ نہیں روک سکے گی۔ عالمی سطح پر امریکہ اور یورپ جس طرح افغانستان میں شکست کے زخم چاٹ رہے ہیں اور اب افغان طالبان سے مذاکرات کے لیے اُن کے تلوے چاٹ رہے ہیں، پاکستان میں کسی قسم کی مداخلت کی جرأت نہیں کریں گے۔ لہٰذا اس وقت اگر اسلامی جماعتوں کی قیادتوں اور کارکنوں نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر سر دھڑ کی بازی نہ لگائی اور اقامت دین کے لیے مال وجان کی قربانی نہ دی تو گیا وقت ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ رمضان کی مشقت اٹھائے بغیر عید نہیں آتی۔ اسلامی جماعت کے کارکنوں کو بھی پاکستان میں ذاتی اور جماعتی مفادات کے روزے رکھنا ہوں گے۔ تب پاکستان میں اسلامی عید کا سورج طلوع ہوگا۔ ان شاء اللہ یاد رہے عید کبھی روزوں سے پہلے نہیں آسکتی۔



ملّا عمرؒ کی رحلت اور کالم نگار کا المیہ

مُلّا عمر رحلت فرما گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کے انتقال پُر ملال کی خبر بجلی بن کر دل و دماغ پر کوند گئی۔ دل کا غنچہ مرجھا گیا، لیکن اچانک قرآن کریم کی سورۃ الرحمٰن کی طرف ذہن منتقل ہوا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (٢٦) وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (٢٧)﴾ جس نے ذہن کو سکون دیا۔ یقیناً موت اس کائنات کی سب سے بڑی اور اٹل حقیقت ہے جس سے ہر ذی روح ہی نہیں ہر ذی جان کو بھی پالا پڑے گا۔ بہر حال مسافر نے منزل پالی۔ ہمیں ہی نہیں شاید اُن کے قریبی چند ساتھیوں اور اہل خانہ کے سوا کسی کو بھی اُن کا آخری دیدار نصیب نہیں ہوا لیکن ہم تصور میں ہی اُس ہستی کا دیدار کرتے رہے جس کی ذات سے اکیسویں صدی کے دجالی دور میں ایک معجزہ رونما ہوا اور اِسی تصور میں علامہ اقبال کا یہ شعر بار بار ہمارے لبوں پر آتا رہا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

ملّا عمر ایک بندۂ رب، ایک مردِ درویش، مردِ قلندر اور سرتاپا مجاہد تھے جنہوں نے مصنوعی روشنیوں سے چمکتی دمکتی آج کی دنیا میں فقیر بن کر بادشاہی کی اور بطور حکمران اپنے عہد حکومت کے چار سال میں سادگی اور قیام عدل کی ایسی ایسی روایات قائم کیں جنہیں بلاشبہ اور بلاخوفِ تردید اسلام کے ابتدائی تابناک دور کا صحیح عکس کہا جا سکتا ہے۔ ہم قطعی طور پر اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ طالبان افغانستان نے ملّا عمر کی موت کو کیوں چھپایا، کس کتاب میں لکھا ہے کہ کسی کی بھی موت کا خصوصاً اپنے قائد کی موت کا لازماً ڈھنڈورا پیٹو۔ افغان طالبان ایک جابر اور غاصب قوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ ان پردیسیوں اور خارجیوں کو اپنے دیس سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں جو

افغانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی موت کو صیغہ راز میں رکھنا ایک سٹریٹجی تھی۔ ایک حکمت عملی تھی جو اُنہوں نے اپنائی۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ امریکہ جو سپریم پاور آف دی ورلڈ ہونے کا دعویدار ہے اور اپنے چالیس سے زاید حلیف ممالک کے ساتھ پندرہ سال سے افغانستان کی چٹانوں سے سر پٹخ رہا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ وہ ٹیکنالوجی میں اس قدر ترقی کر چکے ہیں کہ فضاؤں میں تیرتے ہوئے پرندوں اور زمین پر رینگتی چیونٹیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اور زیر زمین دھاتوں کا وزن کر سکتے ہیں، وہ سوا دو سال اس خبر سے بے خبر کیسے رہے کہ اُن کا بدترین دشمن اب دنیا میں نہیں رہا؟ اس سوال کا جواب اُس سیکولر طبقہ کو بھی دینا ہوگا جس کا تعلق تو مسلمانوں سے ہے لیکن وہ مغرب کی ترقی سے اس قدر مرعوب ہے کہ اُن کی طرف سے آئی ہوئی بات اور اُن کے ہر دعویٰ پر فوراً ایمان لے آتا ہے۔ اس طبقے کے افراد اب اس پروپیگنڈا پر بغلیں بجا رہے ہیں کہ ملا عمر کی وفات کے بعد نئے امیر کے تقرر کے حوالہ سے طالبان میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اور وہ باہم جنگ و جدل کی طرف بڑھ رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جس طرح انسانوں کی جسمانی ساخت اور چہرے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح مزاج، ذہن اور زاویہ نگاہ بھی مختلف ہوتا ہے، لہٰذا کسی درجہ میں اختلاف کا پیدا ہو جانا تو فطری بات ہے لیکن ہمیں اللہ کی رحمت سے یقین واثق ہے کہ افغان طالبان جلد اس مسئلہ پر متفق ہو جائیں گے اور کفار و منافقین کی یہ خواہش پوری نہیں ہوگی کہ افغان طالبان باہم دست و گریبان ہوں، ان شاء اللہ۔ ہمارے لیے اس وقت اس سے زاید کچھ کہنا قبل از وقت اور غیر ضروری ہوگا کہ ملا منصور اختر افغان طالبان کے نئے امیر مقرر ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ افغان طالبان کو جو افغانستان میں اللہ کے پسندیدہ دین کو نافذ کرنے کے لیے جان و مال کی قربانیاں دے رہے ہیں، اپنے حفظ و امان میں رکھے اور سب کو ایک امیر پر جمع کر دے تاکہ وہ یکسو ہو کر سفید سامراج کے خلاف اپنے جہاد کو منزل پا لینے تک جاری رکھیں۔ آمین ثم آمین!

ہم خود کو اُن تمام ذہنی قلابازیوں سے الگ رکھتے ہیں جو بعض پاکستانی دانشور افغان طالبان اور افغانستان کے حوالہ سے لگا رہے ہیں۔ صرف یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ امت مسلمہ کے مستقبل کے حوالہ سے ایک انتہائی اہم اور حساس مسئلہ ہے۔ لہٰذا غیر واضح صورت حال میں قیاس آرائیاں کرنا اور غیر تصدیق شدہ خبروں پر تبصرہ کرنا دوستی نہیں، دشمنی ہے۔ البتہ ایک جدت پسند دانشور نے اپنے کالم میں ملا عمر کی جدوجہد پر انتہائی غیر حقیقت پسندانہ تبصرہ ''ملا عمر کا المیہ'' کے

عنوان سے کیا ہے، اُس کا جواب دینا ہمارا فرض ہے۔ ان صاحب نے ملا عمر سے ظاہراً بڑی محبت اور کسی حد تک عقیدت کا اظہار بھی کیا ہے لیکن اپنے ترکش کے تمام تیر ان پر برسائے ہیں۔ خاص طور پر ان کا وہ جملہ ہمارا سینہ چیر گیا جو انہوں نے ملا عمر پر بالواسطہ لکھا ہے: ''دل ان کی عزیمت پر رشک اور ان کی بصیرت پر ماتم کرتا ہے''۔ اگرچہ کالم نگار کے اٹھائے ہوئے ہر ہر نکتہ کا تفصیلی جواب دیا جا سکتا ہے لیکن ہفت روزہ جریدہ کی تنگ دامنی کا مسئلہ ہے، البتہ ان کی تحریر کے جس حصہ میں ملا عمر کی بصیرت پر سوالیہ نشان لگایا گیا ہے اس کا جواب دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ کالم نگار لکھتے ہیں: ''اگر اسامہ امریکہ کے حوالے کر دیا جاتا تو آج کی دنیا وہ نہ ہوتی جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کے وجود سے اس طرح لہو نہ رستا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اسامہ کا انجام یہ ہوتا نہ ملا عمر کا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسامہ اپنی جان دے کر اُمت مسلمہ کو عذاب سے محفوظ کر سکتے تو یہ ان کی ایک خدمت ہوتی۔ افسوس کہ ملا عمر نے روایت کو اور اسامہ نے جذبات کو ترجیح دی۔ کوئی اس پیغمبرانہ بصیرت سے فیض نہ پا سکا جس نے صلح حدیبیہ میں ظہور کیا جب اللہ کے رسولؐ نے ابو جندل کو مشرکین کے حوالے کر دیا''۔

ہمارے جدت پسند دانشوروں کا ایک بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ انہیں اسلامی تاریخ میں صرف اور صرف صلح حدیبیہ نظر آتی ہے جبکہ نبی اکرم ﷺ کا صلح حدیبیہ کی تجدید سے انکار ہو یا درجنوں غزوات ہوں یا صحابہ کرامؓ کے دور میں کیے جانے والا جہاد و قتال وہ ان دانشوروں کو نظر نہیں آتا یہ تاریخی حقائق وہ نظر انداز کر دیتے ہیں اور اُن کے دل اندھے اور ذہن مفلوج ہو جاتے ہیں۔ بہر حال تاریخ سے نابلد یہ مرعوب اور غلامانہ ذہنیت کے حامل نام نہاد دانشور جب موجودہ عالمی حالات کو مغرب کی عطا کردہ عینک لگا کر دیکھتے ہیں تو ہم بھی اظہار افسوس اور ان کی فکر اور بصیرت پر ماتم کرنے کے سوا کیا کر سکتے ہیں، لیکن ہم انہیں کسی صورت تاریخ کو مسخ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اسامہ کی امریکہ کو سپردگی کے حوالہ سے حقیقت یہ ہے کہ جب ملا عمر پر اس حوالہ سے عالمی سطح پر خصوصاً پاکستان کی طرف سے شدید دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے کر دیں تو انہوں نے کمال حکمت اور اعلیٰ بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود فیصلہ کرنے کی بجائے افغانستان اور پاکستان سے ایک ہزار (1000) علماء کو اکٹھا کیا اور ان سے مشورہ مانگا کہ آیا اسامہ کو امریکہ کے حوالے کیا جائے یا نہیں۔ تین دن تک یہ علماء سر جوڑ کر بیٹھے رہے۔ بالآخر

انہوں نے ملا عمر کو مشورہ دیا کہ اسامہ کو امریکہ کے حوالے تو نہ کیا جائے لیکن انہیں افغانستان سے نکال دیا جائے۔ اس پر امریکہ نے اسی روز بغیر وقت ضائع کیے وائٹ ہاؤس میں صحافیوں کو پریس بریفنگ کے لیے بلایا اور واضح طور پر کہا کہ اگر اسامہ افغانستان سے نکل بھی جاتا ہے تب بھی امریکی فوج کا افغانستان میں داخل کرنا لازم ہے اس لیے کہ ہمیں وہاں سے القاعدہ نیٹ ورک کو ختم کرنا ہے۔ گویا یہ بات ثابت ہوگئی کہ اسامہ کی سپردگی کا مطالبہ عذر لنگ تھا۔ امریکہ کو ہر صورت افغانستان آنا تھا اس لیے کہ ایک ایسی اسلامی حکومت کا خاتمہ ضروری تھا جو اپنے سنہری کارناموں کے حوالہ سے خطے میں دوسرے ممالک کے لیے مثال بن کر سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرہ پیدا کر سکتی تھی۔ امریکہ کا افغانستان آنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ عربوں کے سیال سونا پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد اس کی نظریں وسطی ایشیا کی نو آزاد ریاستوں کی معدنی دولت پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر یہ کہ اسے چین کا محاصرہ کرنا تھا۔

ہماری رائے میں امریکہ کے لیے اسامہ کو گرفت میں لینا سرے سے کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ دراصل خطے میں اپنی چودھراہٹ اور قدرتی دولت کی لوٹ مار کے لیے وہ افغانستان میں جم کر بیٹھنا ناگزیر سمجھتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کالم نگار کو غامدیت کا موذی مرض بری طرح لاحق ہے۔ ہم ملا عمر کی مغفرت اور بلند درجات کے لیے دعا کرتے ہیں اور کالم نگار کے لیے بھی کہ وہ غامدیت کے کینسر سے نجات پائیں اور انہیں اللہ جسمانی اور روحانی لحاظ سے شفائے کاملہ اور عاجلہ عطا فرمائے۔

مسلمانانِ پاکستان کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے۔ آیئے غور کریں! پاکستان افغانستان کی نسبت ایک ترقی یافتہ ملک ہے۔ پاکستان دنیا کی چھٹی ایٹمی قوت ہے۔ پاکستان ایک نظریہ کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اگر ہم مسلمانانِ پاکستان اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے وطن عزیز میں اسلام کا عادلانہ نظام رائج کریں گے تو دنیا کی کون سی طاقت ہمیں اس طرف بڑھنے سے روک سکتی ہے۔ افغان طالبان ایک روز افغانستان کو دوبارہ امارت اسلامیہ میں تبدیل کر لیں گے ان شاء اللہ۔ ہم اگر پاکستان کو اسلامی فلاحی ریاست نہ بنا سکے تو اپنے وجود کو جسے پہلے ہی درجنوں امراض لاحق ہو چکے ہیں، کیسے زندہ و تابندہ رکھ سکیں گے؟ پھر یہ کہ روز قیامت اللہ رب العزت کو کیا جواب دیں گے کہ کیوں ہم پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللہ کے نعرہ سے دستبردار ہوئے؟ ہمیں پاکستان میں اس کے لیے منہج نبوی کی طرز پر جدوجہد کرنا ہوگی اس لیے کہ یہ دنیا میں ہمارے وجود کا جواز ہے اور آخرت میں ہماری نجات کا ذریعہ۔

❁❁❁

﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ﴾

اللہ رب العزت اپنی آخری کتاب قرآن حکیم کی سورۃ التین میں ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا اور پھر وہ ہو جاتا ہے نچلوں میں سب سے نچلا۔ اور سورۃ الاعراف میں فرمانِ الٰہی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ انسان اپنے افعال بد کی وجہ سے حیوان کی مانند ہو جاتا ہے بلکہ حیوان سے بھی بدتر۔ اگر ہم انسان کے ماضی اور حال پر سرسری سی بھی نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ کیسی نا قابلِ تردید حقیقت ہے جو قرآنِ پاک نے بیان کی ہے۔ اللہ کے ہر پیغمبر نے لوگوں کو توحید کا پیغام دیا، شرک کو بدترین گناہ قرار دیا لیکن انسانوں کی اکثریت شرک کی مرتکب ہوتی رہی۔ اکثر معاشروں کو یہ علم تھا کہ ماضی میں اللہ نے اس گناہ عظیم کی پاداش میں بستیوں کی بستیاں تباہ و برباد کر دیں لیکن پھر بھی وہ شرک کا ارتکاب کرتے رہے۔ اگرچہ ماضی کا یہ شرک بعض ترامیم اور تبدیلیوں کے ساتھ کسی نہ کسی انداز میں اب بھی جاری ہے لیکن بہر حال محدود ہو گیا ہے لیکن حال کا حال یہ ہے کہ جدید دنیا نے شرک میں بھی جدت پیدا کر لی ہے۔ آج دنیا مادہ کی پرستش کر رہی ہے اگرچہ اُسے سجدہ نہیں کیا جاتا۔ اس حوالہ سے آج کی دنیا انکار کی دنیا ہے۔ مادہ کے حصول کے لیے سب کچھ کر گزرو، نہ حقوق اللہ کی پرواہ کرو اور نہ بندوں کے حقوق کو پاؤں تلے روندنے سے گریز کرو، پھر بھی اس بات سے انکار کرو کہ ہم مادہ پرست ہیں۔ ناپ تول میں ڈنڈی مارنے پر قوم شعیبؑ تباہ ہوئی۔ آج یہ جرم چھوٹے اور متوسط طبقہ کا جرم ہے، بڑے بڑے ایوانوں میں تو میزان ہی اپنی طرف الٹا لی جاتی ہے۔ فحاشی اور بے حیائی بھی انسانی معاشرہ میں نیا مسئلہ نہیں ہے۔ حضرت لوطؑ کے دور میں جنسی بے راہروی تھی، بے حیائی نے نئی شکل اختیار کی اور انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ مرد شہوت رانی کے لیے مردوں کی طرف مائل ہوئے۔ اللہ نے اُن کی

قوم پر آسمان سے پتھر برسائے۔ آج انسانی معاشرے فحاشی، عریانی اور بے حیائی کو آرٹ کا نام دے رہے ہیں۔ اگر ایک مرد اور عورت رضامندی سے زنا کے مرتکب ہوتے ہیں تو قانون اس کو جرم نہیں گردانتا۔ فحاشی اور بے حیائی کے اس کینسر نے پہلے مغرب کو اپنی لپیٹ میں لیا، آج یہ پوری انسانیت کے جسد میں پھیل چکا ہے۔

اچھائی ہو یا بُرائی، جس کا غلبہ ہوگا اُسے پھیلنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ اس بے حیائی نے جب اپنی انتہا کی طرف سفر شروع کیا تو نتیجہ کیا نکلا۔ خود کو مہذب کہنے والی انتہائی جاہل دنیا نے ہم جنس پرستی کو قانونی جواز فراہم کر دیا۔ مغرب کا معاشرہ خاص طور پر اس حوالے سے مادر پدر آزاد معاشرہ ہے۔ وہاں اچھی خاصی اکثریت کا حال یہ ہے کہ باپ اپنی بیٹی کو اطلاع کرتا ہے کہ اُس کا بوائے فرینڈ آیا ہے اور ماں اپنی بیٹی کی حرام اولاد کی خوشی مناتی ہے۔ لہٰذا عریانی کا نظارہ اور بے حیائی کی تشہیر جب نوجوانوں کی جنسی خواہش کو مشتعل کرتی ہے تو انہیں جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے اُس مادر پدر آزاد معاشرہ میں کسی خاص دِقت کا سامنا نہیں ہوتا۔ پھر بھی چھوٹی چھوٹی بچیوں سے ظلم کا ارتکاب ہوتا رہتا ہے۔ مرد کو عورت اور عورت کو مرد دستیاب ہے، پھر بھی ہم جنس پرستی عام ہے۔ پاکستان جیسے مشرقی اور مسلمان ملک کا معاملہ کچھ مختلف ہے۔ یہاں اخبارات اور جرائد میں فحش تصاویر کی بھرمار ہے۔ الیکٹرانک میڈیا فحاشہ کی تشہیر کے حوالہ سے تمام حدود کراس کر چکا ہے۔ فلمیں اور تھیٹر کے ڈرامے نوجوانوں کی جنسی خواہشات میں تہلکہ مچا رہے ہیں۔ تاہم یہاں کا معاشرہ ناجائز جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے مغربی معاشرہ کی طرح کھلی سہولتیں فراہم نہیں کرتا۔ معاشرہ میں ابھی کچھ مشرقی، کچھ اسلامی رکھ رکھاؤ باقی ہے لہٰذا جنسی خواہش کی ناجائز تکمیل اتنی آسان نہیں تو پھر وہی کچھ ہوتا ہے جو قصور کے گاؤں حسین خان والا میں ہوا ہے۔ سانحہ قصور کے مرتکبین انسانیت کے دشمن ہیں۔ انہیں یقیناً عبرت ناک سزا ہونی چاہیے اور سرِ بازار ہونی چاہیے۔ اگر قانون انہیں سنگسار کرنے کی اجازت دے تو انہیں سنگسار کیا جانا چاہیے وگرنہ انہیں لازماً چوکوں میں پھانسی پر لٹکانا چاہیے۔ لیکن اس بات پر بھی ضرور غور کر لینا چاہیے کہ آیا قصور کے صرف یہ عاقبت نااندیش ہی قصوروار ہیں۔ ہماری رائے میں ہرگز نہیں وہ تو اس گلے سڑے معاشرے کا عکس ہیں جس کی سڑاند سے انسانیت کا دم گھٹ رہا ہے۔ اس شرمناک واردات میں جنسی زیادتی کے ساتھ دولت کی ہوس بھی آشکار ہے۔ معاشرہ آئینہ میں اپنا بدنما اصل چہرہ دیکھ کر چیخ و پکار کر رہا

ہے۔لطیفہ یہ ہے اور آیئے اس لطیفہ کو سن کر روئیں اور سر پیٹیں کہ وہ میڈیا اس سانحہ پر چیخ و پکار کر رہا ہے جو انسانوں کی جنسی خواہشات کو آگ کی ایسی آنچ سے تپش دے رہا ہے کہ روح جل کر خاک ہو جائے اور جسم بے قابو، بے مہار سانڈ کا روپ دھار لے۔ وہ حکومت ملزموں کو عبرتناک سزائیں دینے کا اعلان کر رہی اور خود کو بڑا متحرک ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو کسی ایسے فرد، گروہ یا جماعت سے ملاقات کرنے کو تیار نہیں اور اُن کی بات سننے کی روادار نہیں جو فحاشی، عریانی اور بے حیائی کے خلاف تحریک چلاتے ہیں، اپنے تمام وسائل اس میں جھونک دیتے ہیں، بازاروں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر فحاشی اور جنسی بے راہروی کے بُرے نتائج سے عوام کو آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مساجد سے نکلنے والے لوگوں سے اپنی اس مہم کے حق میں تائیدی دستخط حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومت ایسے ''سر پھروں'' کو گھاس ڈالنے کے لیے تیار نہیں البتہ ہر سانحہ پر، ہر واردات پر کچھ افسر ادھر سے اُدھر کر دیئے جاتے ہیں اور پہلے سے تیار شدہ اخباری بیان ''مجرم سزا سے نہیں بچ سکیں گے'' پریس سیکرٹری اخبارات کو بھیج دیتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ عوام، اِلا ماشاءاللہ، بھی معصوم اور دودھ کے دھلے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ سانحہ قصور جیسے واقعات پر مجرموں کو گالیوں اور بُرے القابات سے نوازتے ضرور ہیں لیکن اُن پر بھی زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ ہر کوئی یہ چاہتا ہے دوسرا تبدیل ہو جائے۔ پھر یہ کہ اگر اللہ نے اُسے ایسی برائیوں سے محفوظ رکھا ہے تو دوسروں کو تبدیل کرنے کے لیے وہ کسی صورت میدان میں آنے کو تیار نہیں۔ سننے کو یہی ملے گا، میری تو کچھ مجبوری ہے البتہ یہ کرنے کا کام ہے۔ علماء کرام کا معاملہ یہ ہے کہ سیاسی مذہبی رہنماؤں کو جمہوریت کے استحکام کے کام سے ہی فرصت نہیں کہ وہ کسی دوسری بات کا سوچیں، عمل تو بعد کی بات ہے جبکہ مساجد کے خطیب، دینی مدارس کے اساتذہ اور حجروں میں مقیم دوسرے علماء باہر کی دنیا سے لاتعلق اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ پہاڑوں کو لرزا دینے والے سانحہ قصور جیسے واقعات پر بھی اُن کے ماتھے پر بل نہیں پڑتے۔ اُن کے چہرے کا رنگ نہیں بدلتا۔ قال اللہ اور قال قال رسول اللہ کی گردان یقیناً کرنے کا کام ہے۔ مذہبی علوم کا حصول یقیناً معاشرے پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہزاروں یا چند لاکھ طلبہ کو آپ نیک راہ دکھاتے ہیں، اُن پر صراطِ مستقیم واضح کرتے ہیں تو باقی پونے بیس کروڑ عوام کو گناہوں اور برائیوں کے جوہڑ میں غرق ہونے کے لیے لاوارث چھوڑ دیا ہے

جنہیں دجالی تہذیب میڈیا اور دوسرے ذرائع سے کس طرف کھینچ رہی ہے اور آپ کے یہ چند لاکھ طلبہ جب عملی زندگی کا آغاز کریں گے تو اُن میں کتنے خود کو اس بے حیا تہذیب کے اثرات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ اس بات کو اس مثال سے سمجھنا ہوگا کہ چند لوگ چھوٹے چھوٹے برتن لے کر کسی گندے جوہڑ کا پانی نکال رہے ہیں لیکن بڑے بڑے موگوں سے گندہ اور غلیظ پانی اس جوہڑ میں سیلاب کی مانند داخل ہو رہا ہے تو جوہڑ کی صفائی کیسے ممکن ہوگی اگر یہ لوگ لنگوٹے کس کر اُن موگوں کو بند نہیں کرتے۔ لہٰذا علماء کرام کا خود کو حجروں میں بند کر لینا اپنی دینی ذمہ داری کی ادائی سے واضح گریز ہے جس کی جوابدہی اُنہیں کرنا ہوگی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سانحہ قصور کے ظاہری مجرم تو وہی ہیں جو اس گھناؤنے فعل کا چھ سال سے ارتکاب کر رہے تھے اور علاقے کی ''بھولی بھالی پولیس اور انتظامیہ'' کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہوئی لیکن ہر ہر پاکستانی کسی نہ کسی سطح پر ان مجرموں کا معاون اور مددگار تھا اور ہے، سوائے اُن کے جو اپنی حیثیت اور وسائل کے مطابق فحاشی اور بے حیائی کے خلاف عملی طور پر جہاد کر رہے ہیں۔ منکر کے خلاف جہاد کیے بغیر پاکستان کا معاشرہ صالح معاشرہ نہیں بن سکے گا اور سانحہ قصور جیسے سانحات رونما ہوتے رہیں گے۔ اللہ ہم سب کو منکرات کے خلاف قولی اور عملی جہاد کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!



1965ء کی جنگ: ایک پہلو یہ بھی ہے

پاکستان اور بھارت دونوں نے اس مرتبہ 1965ء کی جنگ کی یاد بڑے زور شور کے ساتھ منائی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس جنگ کو پچاس سال بیت گئے اور یہ جنگ کی گولڈن جوبلی تھی۔ دونوں نے جنگ جیتنے کا دعویٰ کیا ہے اور اپنے جنگی ہیروز کے حوالے سے بلند بانگ واقعات بیان کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں نے یہ جنگ جیتی اور دونوں نے یہ جنگ ہاری، اس لیے کہ کسی مقابلے میں یا کسی بھی نوعیت کی کشمکش میں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ فریقین میں سے کون سا فریق اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہا اور کون ناکام رہا۔ ہماری رائے میں پاکستان نے یہ جنگ کشمیر کو بزور شمشیر آزاد کروانے کے لیے شروع کی تھی لیکن پاکستان کشمیر حاصل نہ کر سکا۔ بھارت نے اس جنگ میں لاہور اور سیالکوٹ کے محاذوں پر پوری قوت سے حملہ کر کے یہ کوشش کی تھی دونوں اطراف سے اس کی فوج آگے بڑھ کر پاکستان کو جغرافیائی لحاظ سے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی ۔لیکن بھارت بری طرح ناکام رہا بلکہ لاہور سیکٹر سے بھارت بری طرح پسپا ہوا اور پاکستانی افواج نے قصور سے آگے بڑھ کر کھیم کرن کے بھارتی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ البتہ بھارت کو انٹرنیشنل سرحد پر حملہ صرف اس لحاظ سے فائدہ مند رہا کہ اپنی انٹرنیشنل سرحدیں بچاتے ہوئے پاکستان کی کشمیر میں پیش رفت رک گئی۔ شاید اسی لیے پاکستان آج تک 6 ستمبر کو یوم فتح نہیں بلکہ یوم دفاع کے طور پر مناتا رہا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس جنگ میں پاکستان اپنے سے پانچ گنا بڑے دشمن سے اپنا دفاع کرنے میں مکمل طور پر کامیاب رہا۔ یہ اعداد و شمار بھی درست ہیں کہ پاکستان نے دشمن کا جانی نقصان زیادہ کیا، اس کے رقبہ پر قبضہ کیا اور دشمن کا جنگی ساز و سامان بھی زیادہ تباہ ہوا لیکن پاکستان بھی کشمیر کے حوالے سے اپنے مقصد کے حصول میں بری طرح ناکام ہوا۔ لہٰذا

فریقین میں سے کوئی بھی مکمل فتح یا اپنے دشمن کی مکمل شکست کا دعویٰ کرتا ہے تو تاریخ اُس کے دعویٰ کو قبول نہیں کرے گی۔

آج ہم اس جنگ کہ اس پہلو پر غور کریں گے کہ آیا حکومت پاکستان خصوصاً ایوب خان جو اس وقت پاکستان میں سیاہ و سفید کے مالک تھے، نے اس جنگ کا آغاز باقاعدہ منصوبہ بندی اور سوچ سمجھ کر کیا تھا یا پاکستان کو اس جنگ میں دھکیل دیا گیا تھا اور اگر واقعتاً پاکستان کو اس جنگ میں دھکیلا گیا تھا تو اندرونی اور بیرونی سطح پر وہ کون سے عناصر تھے جو پاکستان کو جنگ کی طرف لے گئے تھے۔

ہماری رائے میں اس دلیل میں وزن ہے اور پاکستان کی تاریخ کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو ایسے واضح شواہد ملیں گے کہ اندرونی اور بیرونی عناصر نے مل کر یا اپنے اپنے مفاد کے تحت اپنی اپنی سطح پر شعوری کوشش سے پاکستان کو اس جنگ میں دھکیلا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ایوب خان کی حکومت، قطع نظر اس سے کہ وہ کیسے قائم ہوئی تھی، ایک مستحکم حکومت تھی اور پاکستان تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہا تھا۔ پاکستان کی معیشت ہندوستان سمیت اکثر ممالک سے بہتر تھی۔ پاکستانی روپے کی قیمت بھارتی روپے سے پونے دو گنا زیادہ تھی۔ پاکستان کی فوج کا شمار دنیا کی چند بہترین افواج میں تھا۔ پاکستان آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا اسلامی ملک تھا۔ دنیا جانتی تھی کہ پاکستان اسلامی نظریہ کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور اسلام دشمن عالمی قوتوں کو یہ سب کچھ گوارا نہ تھا۔ لہٰذا ایک منصوبہ کے تحت ترقی کی ابتدائی منازل طے کرنے والی ایک اسلامی ریاست کو جنگ میں الجھا دیا گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ نے یہ بھی ثابت کیا تھا کہ جدید دور میں جنگ سے مفتوح ہی نہیں فاتح بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ برطانیہ جنگ عظیم دوم کا فاتح تھا لیکن اس جنگ کے بعد وہ سکڑ گیا۔ اندرون ملک بھٹو کی شخصیت ابھر رہی تھی، خصوصاً مغربی پاکستان میں لوگ ایوب خان کے بعد اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہماری رائے میں ایوب خان جنگ نہیں چاہتا تھا لیکن پاکستانی حکمرانوں چاہے فوجی ہوں یا سویلین، اُن کی سوچ یہ رہی کہ اگر کشمیر اُن کے دور میں پاکستان کو مل جائے تو انہیں نسل در نسل حکومت کرنے کا موقع اور حق حاصل ہو جائے گا۔ بھٹو نے ایوب خان کے ساتھ ڈبل گیم کی۔ اُسے کشمیر میں مداخلت کار بھیجنے کا مشورہ دیا اور یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ بھارت انٹرنیشنل سرحد عبور نہیں کرے گا۔ بھٹو کا منصوبہ یہ تھا کہ اگر کشمیر حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ایوب خان کے نیچرل جانشین ہوں گے،

اور شاید اسی لیے وہ انہیں ڈیڈی کہتے تھے۔ اور اگر پاکستان ناکام ہوتا ہے تو یہ ناکامی ایوب خان کے کھاتے میں ڈال کر اُن کے خلاف مہم جوئی کے امکانات بہت روشن ہوں گے اور اُنہیں صدارت سے ہٹایا جا سکے گا۔ یعنی اندرونی اور بیرونی عناصر نے ایوب خان کو کشمیر کے حوالے سے چکمہ دے کر جنگ کی طرف دھکیلا۔ گویا ایوب خان سے فراڈ ہوا، اگرچہ یہ بات اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ کوئی فراڈ یا یعنی دھوکہ باز اُسی صورت میں کامیاب ہوتا ہے جب وہ دھوکہ کھانے والے کے اندر کے لالچ کو پوری طرح ہوا دیتا ہے، اُس کی کمزوری کو اور اُس کی خواہش کو ایکسپلائیٹ کرتا ہے اور وہ لالچ میں دوسرے کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ مثال سے بات شاید زیادہ بہتر طور پر واضح ہو سکے۔ ڈبل شاہ ہمارے معاشرے کا ایک کردار ہے۔ وہ لوگوں سے پیسے نکلوانے میں اس لیے کامیاب ہوا کہ اُس نے لوگوں کی اس اندھی خواہش کو ایکسپلائیٹ کیا کہ وہ کسی طرح راتوں رات امیر ہو جائیں، ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ چھپڑ پھاڑ کر دولت کا ڈھیر اُس کے سامنے لگ جائے۔ لہٰذا وہ بیوقوف بنے اور اپنی پونجی بھی گنوا بیٹھے۔ ہماری رائے میں ایوب خان جنگ نہیں چاہتے تھے۔ اُنہیں جنگ کے نقصانات کا پورا پورا اندازہ تھا لیکن نسل در نسل حکومت اور بادشاہت کی خواہش میں وہ بہہ گئے۔ 1962ء میں ہند چینی سرحدی جھڑپوں کے دوران جب چین نے پاکستان کو کشمیر میں فوجیں داخل کرنے کا کہا تھا تو ایوب خان نے انکار کر دیا، اس لیے کہ امریکہ نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی اور وہ اُس وقت امریکہ کو اپنا انتہائی مخلص اور ہمدرد سمجھتے تھے۔ وہ امریکہ کو اپنے اقتدار کا پشتیباں سمجھتے تھے لیکن 1965ء میں وہ امریکہ کے حوالے سے شک و شبہات میں مبتلا ہو چکے تھے اور اب انہیں اپنے اقتدار کو دائمی اور پکا کرنے کے لیے کسی اور سہارے کی ضرورت تھی۔ 1965ء میں بیرونی سازشیں کتنی ہی کیوں نہ ہوتیں، اگر ایوب خان اور بھٹو اپنے اقتدار کی بجائے کشمیر کی آزادی کے لیے مخلص ہوتے تو ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کشمیریوں کی آزادی کی کوئی راہ نکال دیتا۔ کارگل کا حادثہ اگرچہ 1965ء کی جنگ کے چونتیس سال بعد ہوا لیکن اس میں بھی ہمیں ناکامی کا منہ اس لیے دیکھنا پڑا کہ پرویز مشرف کو اقتدار کی ہوس تھی وہ بدنیت تھا جبکہ نواز شریف کی نااہلی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ بہرحال، تاریخِ پاکستان کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کے مسئلہ کو سیاسی اور عسکری قوتوں نے اپنے اقتدار کو جمانے اور مضبوط کرنے کے لیے استعمال کیا۔

1965ء کی جنگ سے البتہ ایک بات سامنے آئی کہ قوم اگر متحد ہو تو دشمن کے لیے کامیابی

آسان نہیں ہوتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ 1965ء کی سترہ روزہ جنگ کے دوران سٹریٹ کرائم، رشوت کا لین دین اور باہمی جھگڑے اور فساد تاریخ کی کم ترین سطح پر تھے۔ نہ اس سے کم پہلے کبھی تھے اور نہ اس کے بعد ہوئے۔ لیکن یہ قومی اتحاد جلد ہی انتشار میں تبدیل ہو گیا اور 1971ء میں بدترین شکل میں اُس کا نتیجہ سامنے آ گیا۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ اتحاد کیوں ختم ہوا، اور کیوں انتشار میں تبدیل ہو گیا۔ ہماری رائے میں اس لیے کہ یہ اتحاد کمزور اور عارضی بنیادوں پر تھا۔ ہمارے طرزِ عمل، طرزِ زندگی اور طرزِ حکومت میں زبردست تضاد تھا۔ پاکستان قومیت کی نفی کر کے معرضِ وجود میں لایا گیا تھا اور ہم قومیت ہی کی بنیاد پر پاکستان کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ ہم یہ نہ سمجھ سکے کہ کلکتہ اور ڈھاکہ میں رہنے والے دونوں قومیت کے حوالہ سے ایک یعنی بنگالی ہیں لیکن وہ دو مختلف ممالک میں اس لیے تقسیم ہوئے کہ کلکتہ والا بنگالی ہندو تھا اور ڈھاکہ والا مسلمان تھا۔ ڈھاکہ کے بنگالی نے ہزار میل دور سندھی یا پنجابی یا پٹھان قومیت کے حامل سے مل کر ایک ملک میں رہنا صرف اس لیے طے کیا کہ دونوں مسلمان تھے۔ لہٰذا اتحاد کی بنیاد دین ہونا چاہیے تھا۔ دین اسلام کو پاکستان میں نافذ و جاری کیا جاتا تو جغرافیائی فاصلوں اور قومیتوں کے بُعد کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اللہ اور رسولؐ سے محبت اُنہیں جوڑ کر رکھتی۔ بہرحال ہمارے درمیان مثالی اور مضبوط اتحاد صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔ اسی کا نعرہ لگا کر ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا اسی کو نافذ کر کے ہم نیا، مضبوط و مستحکم پاکستان دنیا کو دکھا سکتے ہیں۔



اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اقوام متحدہ نے زندگی کی اُنہتر بہاریں دیکھ لی ہیں اور ستر ویں برس میں قدم رکھ دیا ہے۔ حسب معمول، ستمبر میں ریاستی اور حکومتی سربراہوں یا اُن کے نمائندوں کا میلہ نیویارک میں دھوم دھام سے سجایا گیا۔ بیسویں صدی نے ابھی اپنا نصف بھی پورا نہیں کیا تھا جب ''لیگ آف نیشنز'' جنگ عظیم دوم میں ماری گئی اور اس جنگ کے فاتحین نے مل بیٹھ کر اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی۔ اقوام متحدہ نے جس طرح بڑی طاقتوں کے مفادات کا تحفظ کیا اور اُن کی من مانیوں کو جائز قرار دینے کے لیے راہ ہموار کی، اس پر بقایا کمزور دنیا کی طرف سے کوئی ردِ عمل بھی سامنے نہ آ سکا۔ لہٰذا جب تک دنیا میں موجودہ نظام اور تہذیب غالب ہے، نیویارک میں قائم اس کا ہیڈ کوارٹر یوں ہی چمکتا دمکتا رہے گا اور وہاں ایسے میلے سجتے رہیں گے۔ طاقت کا ڈنکا بجتا رہے گا۔ بہرحال، اس سال بھی حسب معمول میزبان یعنی امریکہ کے صدر کے خطاب سے اس کا آغاز ہوا۔ ہمارے لیے اس خطاب میں دلچسپی کا پہلو یہ تھا کہ اسے سن کر ہمارا ذہن سینئر بش کی اُس تقریر کی طرف منتقل ہوا جو افغانستان میں سوویت یونین کی درگت بننے اور اُس کی شکست وریخت کے بعد صدام کا ہوا دکھا کر سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ممالک میں امریکی فوجوں کے لیے مستقل ٹھکانہ بنانے میں کامیابی کے بعد کی گئی تھی۔ اُس نے ایک تقریر میں نیو ورلڈ آرڈر کی اصطلاح متعارف کروائی تھی۔ اِس ساری گفتگو کا لُب لباب یہ تھا کہ دنیا میں اب صرف اور صرف امریکہ کا حکم چلے گا، دنیا کو امریکی فیصلے قبول کرنا ہوں گے اور دنیا کو امریکی چاہت کو اپنانا ہوگا۔ اب دنیا میں کسی قوم کے زندہ رہنے کے لیے امریکی اطاعت لازم ہوگی۔ امریکی صدر کے ایک ترجمان نے یہ بھی کہا تھا کہ امریکہ اب ایک مست ہاتھی ہے، جو اس کے راستے میں آئے گا کچلا جائے گا جبکہ موجودہ امریکی صدر اوباما نے آج واشگاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ کوئی ایک ملک اور اُس کی عسکری اور مالی قوت دنیا کے

مسائل حل نہیں کر سکتی۔ ہم نے عراق میں مداخلت سے سبق سیکھا ہے۔ یہ واضح اعترافِ شکست ہے۔ یہ بیان بتاتا ہے کہ صرف تہائی صدی میں امریکیوں کی غلط فہمی دور ہوگئی اور طاقت کا نشہ بھی بہر حال کچھ نہ کچھ اترا ہے، اگر چہ ہنوز رسی جل گئی مگر بل نہ گیا کا معاملہ ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ صدر امریکہ نے عراق میں سیکھے سبق کا ذکر کیا ہے جبکہ جو خجالت، شرمندگی اور ذلت اُسے افغانستان میں اُٹھانی پڑی ہے، وہاں سے سیکھے ہوئے سبق کا اوبامانے سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان امریکہ کے گلے کی پھانس بن گیا ہے، نہ اُس سے نگلا جارہا ہے اور نہ اُگلا جارہا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ برطانیہ اور سوویت یونین کی طرح امریکہ کی سپر میسی بھی افغانستان میں دفن ہوگی۔ دنیا کی طاقتور ترین جمہوریت کا یہ انجام اب نوشتۂ دیوار ہے۔ جہاں تک دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت کا تعلق ہے، نریندر مودی جنرل اسمبلی سے خطاب تو نہیں کر سکے لیکن نیویارک میں اُنہوں نے ایک تقریب میں کہا ہے کہ سلامتی کونسل سمیت اقوام متحدہ میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ حقیقت میں مودی کا اس خواہش پر دم نکلا جارہا ہے کہ بھارت کو سلامتی کونسل کا مستقل رکن بنایا جائے اور اُسے بھی ویٹو کا حق ملے۔ مودی کو اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل میں بس اتنی ہی اصلاح درکار ہے لیکن اُس کے راستے میں دیوارِ چین حائل ہے، وہ چین جو اب پاکستان کے تعاون سے اکنامک کوریڈور بنا کر بھارت کے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ اقوام متحدہ کے اس اجلاس سے وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف بھی خطاب کر چکے ہیں۔ ہماری رائے میں لکھنے والوں نے اچھی تقریر لکھی اور پڑھنے والے نے بھی اچھی پڑھی۔ توقع کے مطابق اس مرتبہ اُنہوں نے ماضی سے ہٹ کر، کھل کر کشمیر پر بات کی، فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وستم کا بھرپور ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ اُمت مسلمہ کو خاص طور پر نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اُنہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ مسئلہ کشمیر کے متعلق قرارداد پر عمل درآمد نہ ہونا اقوام متحدہ کی بہت بڑی ناکامی ہے۔ البتہ تقریر کے آغاز میں اقوام متحدہ کے کارناموں کی تحسین کرنا اور آخر میں یہ کہنا کہ وہ مکمل ناکام ہوئی ہے، اُس سے اُن کی تقریر میں ایک تضاد سامنے آیا ہے۔ بلوچستان میں بھارت کی مداخلت اور کراچی میں ''را'' کے کارناموں کا بھی کوئی ذکر نہیں ہوسکا۔ نواز شریف نے اپنے خطاب میں بھارت کو چار نکاتی امن فارمولہ پیش کیا: (1) 2003ء میں لائن آف کنٹرول پر ہونے والی جنگ بندی کے سمجھوتے پر عمل درآمد کیا جائے۔ (2) دونوں ممالک کسی بھی صورت میں طاقت کے استعمال کی

دھمکی سے گریز کریں۔(3) کشمیر سے افواج کی واپسی کے لیے اقدام کیے جائیں۔(4) سیاچن سے دونوں ممالک غیر مشروط طور پر افواج نکال لیں۔ بہر حال، قومی نقطۂ نظر سے بحیثیت مجموعی یہ ایک اچھی تقریر تھی جسے قومی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا لیکن.....اور یہ بہت بڑا لیکن ہے کہ..... پاکستان کو یا اُمت مسلمہ کو پندرہ کروڑ روپے مالیت کی اس تقریر سے عملی لحاظ سے کیا فائدہ ہوا یا آئندہ مستقبل میں کیا فائدہ ہوگا!

اُمت مسلمہ کو اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے (ایک رائے میں مسلمان حکمران سب کچھ سمجھ کر بھی سمجھنا نہیں چاہتے) کہ اقوام متحدہ یا کوئی بھی عالمی ادارہ مسلمانوں کو تحفظ دینے کے لیے نہیں بنایا گیا تھا۔ عالمی حالات کا بغور جائزہ لیں تو بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اُمت مسلمہ عالمی قوتوں کا اصل ٹارگٹ ہے اور اُن کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ایسے ہونا بھی چاہیے، اس لیے کہ آج سرمایہ دارانہ نظام دنیا پر مسلط ہے، امریکہ اور اُس کے حواری اور حلیف یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ آج اُمت مسلمہ نحیف ونزار ہے، اُس کے وجود میں سکت نہیں اور اُس کی حقیقت اسلام دشمن قوتوں کے سامنے ریت کی دیوار سے بھی کمزور ہے لیکن اسلام ایک نظریہ ہے جو ایسے نظام کی بات کرتا ہے جس میں عدل وانصاف ہے، مساوات ہے، اخوت ہے اور جہاد ایمانِ حقیقی کا رکنِ رکیک ہے، لہٰذا مسلمانوں کے مردہ تن میں کسی وقت اس نظریہ کی بنیاد پر جان پڑ سکتی ہے۔ گویا غلبہ حاصل کرنے کا نصاب اور نسخہ موجود ہے، اس کی تعلیم اور اس کی بنیاد پر تربیت کی ضرورت ہے اُسے عملی تعبیر دینے کی ضرورت ہے جس سے کسی وقت بھی پانسہ پلٹ سکتا ہے۔ اُن کا سرمایہ دارانہ نظام انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا بدترین ذریعہ ہے۔ اُس کا خاتمہ ہو سکتا ہے اس لیے اس جابرانہ اور ظالمانہ نظام کے بدنما چہرے کو جمہوریت کے میک اپ سے خوشنما اور خوبرو بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ محدود سوچ کی حامل انسانیت کو فریب دیا جا سکے۔ اقوام متحدہ اور اُس کی ''بے چاری'' سلامتی کونسل کو بھی باقی دنیا کو فریب دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرمایہ دارانہ نظام دنیا میں مسلط رہتا ہے تو امریکہ کی عسکری قوت اور مغرب کی بدبودار اور بے حیا تہذیب کو شکست نہیں دی جا سکے گی، اُس کا غلبہ رہے گا۔ لہٰذا کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ سب سے پہلے نظری سطح پر یہ سمجھا جائے بلکہ اس پر مکمل یقین رکھا جائے کہ غیر اسلامی قوتوں میں سے جو براہ راست پنجۂ یہود کی گرفت میں ہیں اور جب تک رہیں گی، اُن کا مسلمانوں کا دوست

ہونے کی توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے یا دریا کے دو کناروں کے ملاپ کی توقع کرنا۔ لہٰذا اُن کے فراہم کردہ لالی پاپ سے دور رہے خود اُمت مسلمہ متفقہ طور پر غور و فکر کرے کہ اس صورت حال سے کیسے نمٹا جائے۔ ادارہ خلافت کے ختم ہونے کے بعد مسلمان ممالک مکمل طور پر بٹے ہوئے ہیں۔ اُنہیں اپنے فروعی اختلافات ختم کر کے فی الحال کم از کم مشترکہ تھنک ٹینک بنانے چاہئیں جو غور و فکر کے بعد تجاویز دیں کہ کون سے مراحل طے کر کے مسلمانوں کا عالمی اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے۔ آغاز میں یہ اتحاد سماجی سطح پر اور مسلمانوں میں مذہب کی طرف مراجعت کرنے کے لیے کام کرے، بعد ازاں سیاسی سطح پر اتحاد کا سوچا جائے۔ چاہے فی الحال بہ امر مجبوری قومی ریاستوں کو قائم رکھتے ہوئے سیاسی حوالے سے مشورہ ہو۔ ان کی دنیا میں سفارتی پالیسی ایک ہوتی چلی جائے، پھر کوئی ایسی سٹیج آ سکتی ہے کہ عسکری سطح پر بھی اتحاد ہو اور بالآخر خلافت کا ادارہ بھی بحال ہو جائے اور مسلمانوں میں مرکزیت قائم ہو جائے۔ تب اگر یہ اقوام متحدہ زندہ سلامت رہ گئی تو اُس میں سب سے بڑی قوت اُمت مسلمہ ہوگی۔ آج اسے یقیناً دیوانے کی بڑ کے سوا کیا کہا جائے گا لیکن یاد رکھیں فرد ہو، قوم ہو یا ملت صحیح، سمت کی طرف پیش قدمی ہوگی تو منزل ملنے کی توقع ہوگی۔ فی الحال اگر چلنے کی قوت بھی نہیں ہے تو نیک نیتی سے اس منزل کی طرف رخ کر کے کھڑے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ وقت کے ساتھ ہمت عطا فرمائے گا۔ اگر کسی کو حج یا عمرہ کرنا ہے تو اپنے مقام سے عرب کی طرف چلیں گے تو خانہ کعبہ پہنچ سکیں گے، مخالف سمت میں چلنا اور یہ سمجھنا کہ کبھی نہ کبھی کسی معجزے سے منزل مل جائے گی، حماقت عظمیٰ ہوگی اور انجام کے حوالہ سے کبھی خیر برآمد نہ ہو سکے گی۔ مسلمانوں کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمان ایک نظریاتی قوم ہے۔ یہ امت ایک نظریے سے جڑی ہوئی ہے لہٰذا مسلمان کے نزدیک اصل اہمیت نظریے کی ہے نہ کہ جغرافیائی حدود و قیود کی۔ آخر میں عالم اسلام خصوصاً اہل پاکستان کی خدمت میں علامہ اقبال کا یہ شعر پیش کرنا ضروری ہوگا۔

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے



زلزلہ سے بڑا عذاب

دس سال یعنی ایک عشرہ کے بعد ایک بار پھر اکتوبر ہی میں زلزلے نے پاکستان خصوصاً صوبہ خیبر پختونخوا میں تباہی مچادی ہے۔ ہمیں اپنے بھائیوں کے جان و مال کے نقصان پر شدید صدمہ پہنچا ہے۔ مال کی تلافی تو کچھ نہ کچھ، کسی نہ کسی انداز میں ہو جاتی ہے، جان کا کوئی صلہ نہیں۔ پھر یہ کہ سردی کے اِس موسم میں سر سے چھت کا اٹھ جانا ایک انتہائی تکلیف دہ معاملہ ہے۔ سنے اور دیکھے کا فرق تو ہے ہی، دیکھے اور بیتے کا اُس سے کہیں زیادہ فرق ہے، جسے ماپا تولا نہیں جا سکتا، جسے شمار کرنا ممکن نہیں۔ تحریر و تقریر سے ان کے زخموں پر مرہم نہیں رکھا جا سکتا، ہاں دعا کی جا سکتی ہے، دل کی گہرائی سے، یہ تصور کرتے ہوئے کہ مصیبت ہم پر ہی نازل ہوئی ہے، اللہ ان کی مشکلات کو دور کرے، اللہ ان کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اللہ ان کو بے سروسامانی کی حالت سے نکالے۔ یہ اہل پاکستان پر اللہ کا فضل اور خصوصی کرم ہے کہ بہت سی اخلاقی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہاں کثیر تعداد میں ایسے لوگ بستے ہیں جنہیں بلا تامل صاحب خیر کہا جا سکتا ہے، جو اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کسی طرف سے کوئی پکار آئے تو وہ فوراً لپکتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق مالی وسائل اور آمدن کی شرح کا لحاظ رکھتے ہوئے اہل پاکستان دنیا میں خیرات کرنے اور خیراتی اداروں کی مدد کرنے والوں کی فہرست میں ٹاپ پر ہیں۔ ضمنی طور پر یہ عرض کرنا سودمند رہے گا کہ ہمارے ہاں ادارے اگر منظم ہوں اور قوم کو قیادت پر اعتماد ہو تو اہل پاکستان میں بالفعل یہ جذبہ موجود ہے کہ کوئی شہری بھوکا نہ سوئے، بے لباس نہ ہو، بے گھر نہ ہو اور کوئی انسان دوا دارو کی عدم دستیابی کی وجہ سے جان سے نہ جائے۔ بہرحال اس وقت قوم کی اولین ترجیح زلزلہ متاثرین کی بنیادی ضروریات ان تک پہنچانا ہے۔ زخمیوں کا مناسب علاج اور ان کی نگہداشت ہم سب پر فرض ہے۔ عارضی چھتیں مہیا کرنے کے بعد جلد از جلد مکانات کی تعمیر ہو

تا کہ ویران بستیاں ایک بار پھر بس جائیں۔

ہم اہل پاکستان کا مسئلہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی آسمانی آفت زلزلہ، طوفان یا سیلاب کی صورت میں نازل ہوتی ہے تو پاکستان کے مذہبی طبقات اور سیکولر عناصر کے درمیان ایک بحث چھڑ جاتی ہے۔ ائمہ مساجد اور علماء کرام اسے خالصتاً اللہ کا عذاب قرار دیتے ہیں، اور اہل پاکستان کے گناہوں اور بداعمالیوں کو اس کا اصل سبب قرار دیتے ہیں، جبکہ سیکولر عناصر استہزائیہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا یورپ اور امریکہ کے لوگ بہت نیک ہیں اور پاکستان میں بھی کیا غریب اور متوسط درجہ کے لوگ ہی گناہگار ہیں اور کیا حکمران اور امراء کا طبقہ بہت نیک اور پارسا ہے کہ وہ ان آفات سے محفوظ رہتے ہیں؟ اس بحث مباحثہ میں عوام پریشان ہو جاتے ہیں کہ کسے صحیح سمجھیں اور کسے غلط۔ ہم اس حوالہ سے اپنے دین دار طبقہ سے کافی حد تک متفق ہیں، لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ ہر آسمانی آفت محض اللہ کا عذاب ہوتا ہے، اس کی کوئی دوسری صورت ممکن نہیں۔ ہماری رائے میں اولاً تو اس بات پر شک کرنا کہ اس کائنات میں ایک پتہ یا ایک ذرہ اذنِ الٰہی کے بغیر جنبش کر سکتا ہے آپ کو ایمان سے ہی نہیں اسلام سے بھی فارغ کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ آفت عذاب ہی ہو، یہ آزمائش بھی ہو سکتی ہے۔ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں (یہ وہ دور تھا جب نہ صرف روحانی لحاظ سے لوگ انفرادی اور اجتماعی طور پر بلند اور اعلیٰ سطح پر تھے بلکہ دنیوی طور پر بھی گورننس اپنی مثال نہ رکھتی تھی) اتنا شدید قحط پڑا کہ آپ کو قطع ید کی سزا عارضی طور پر معطل کرنا پڑی، ظاہر ہے یہ آزمائش تھی۔ پھر یہ کہ ہمارا ایمان ہے کہ امتِ مسلمہ کو اُس کے گناہوں کی سزا بعض اوقات اِس دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے، لہٰذا اُس آبادی کے گناہوں کو دنیا میں دھو کر ان کی آخرت کو سنوارنا مقصود ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ ظاہری عذاب نعمت کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ دنیا کی سزا شدت کے حوالہ سے آخرت کی سزا کے سامنے سرے سے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔ لہٰذا دنیا میں آنے والے عذاب یقیناً انسانوں کے گناہوں کی سزا ہوتے ہیں، کیونکہ قرآن وحدیث میں واضح اشارے موجود ہیں، لیکن یہ لازم نہیں ہے کہ جسے ہم عذاب سمجھ رہے ہیں وہ واقعتاً عذاب ہو اور اس کی وجہ صرف عوام الناس کے گناہ ہوں۔

اب آیئے ان سیکولر عناصر کی طرف جن کے لیے ہدایت کے ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرنا ہوگی کہ وہ کسی معاملے میں سنجیدگی بھی اختیار کر لیا کریں ایک دنیا مصیبت میں مبتلا ہوتی ہے اور

انہیں چٹکلے اور مذاق سوجھ رہا ہوتا ہے۔ جہاں تک اس بات یا اعتراض کا تعلق ہے کہ مغرب اور امریکہ میں عذاب کیوں نازل نہیں ہوتے، حالانکہ وہاں بے حیائی، سود خوری جوا، سٹہ اور شراب نوشی وغیرہ مشرق سے اور عالم اسلام سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ہم سے کہیں بڑھ کر اللہ کے نافرمان ہیں، اگر یہ آسمانی آفات انسان کے گناہوں کی پاداش میں ہی آتی ہیں تو مغرب اور امریکہ میں تو ایسے بہت سے عذاب نازل ہونا چاہئیں۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ وہاں زلزلے اور دوسرے طوفان وغیرہ نہیں آتے۔ وہاں بھی یقیناً آتے ہیں، لیکن اگر سمجھنے کی نیت اور خواہش ہو تو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ امتِ مسلمہ اللہ کی نمائندہ امت ہوتی ہے، چاہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم یعنی بنی اسرائیل ہو اور چاہے امت محمد ﷺ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیوی حکمران بھی اپنے نمائندے کی نافرمانی کا سختی سے نوٹس لیتا ہے۔ بنی اسرائیل کو اپنی نافرمانی کی سخت سزا کاٹنا پڑی۔ امت محمد ﷺ کا معاملہ ایک ہاتھ اور آگے کا ہے۔ یہ آخری نبی کی امت ہے، یہ آخری اور حتمی کتاب کی حامل ہے، لہٰذا اسے بروقت اور برموقع ٹوکا جائے گا، تاکہ یہ راہِ راست پر آئے۔ باپ بھی غلطی پر اپنے بیٹے کو سختی سے ڈانٹے گا بنسبت محلہ دار کے بیٹے کے جو اسی غلطی کا ارتکاب کر رہا ہوگا۔ پھر یہ کہ ہمارا ایمان ہے کہ جن گناہوں کی سزا اس دنیا میں مل جائے گی آخرت میں اس حوالہ سے چھوٹ اور بچت کا امکان ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو امت مرحومہ فرمایا ہے یعنی وہ امت جس پر رحم کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ اور رسولؐ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم اپنی حفاظت سے غافل ہو جاؤ۔ ہمارا عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھیں پھر اللہ پر توکل کریں اور اس سے حفاظت کی دعا کریں۔ ہم غفلت برتتے ہیں اور سنت اللہ کے مطابق اس کا مزہ چکھتے ہیں۔ اس کے برعکس امریکی اور یورپین سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر اپنی حفاظت کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، لہٰذا وہ ان عذابوں سے اپنی جان و مال کو کسی حد تک محفوظ کر لیتے ہیں، لیکن وہاں اللہ عذاب کی شکل بدل دیتا ہے۔ مثلاً امت مسلمہ اگر اس وقت حادثاتی اموات اور جنگیں جو ان پر مسلط کی گئی ہیں ان کی وجہ سے ہلاکتوں کے عذاب میں مبتلا ہے تو سفید فام اقوام پیدائش کے عذاب میں مبتلا ہیں، یعنی ان کی شرح پیدائش اب نہ ہونے کے برابر ہے۔

مغرب میں دولت، وسائل اور عیش و عشرت کی کوئی کمی نہیں، لیکن پاکستان جیسے غریب اور معاشی لحاظ سے محتاج ملک سے وہاں زیادہ لوگ خودکشیاں کرتے ہیں۔ وہاں اول تو شادی کا رواج نہیں وگرنہ

شادی کے بعد طلاق دنوں کی بات ہوتی ہے۔ پیرس کے ایک گرجا گھر میں کئی کئی سال کوئی جوڑا شادی کے بندھن میں بندھنے کے لیے نہیں آتا۔ وہاں فزیشن اور سرجن تو مصروف نظر نہیں آتے البتہ ماہر نفسیات کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایک دنیا ہے جو نفسیاتی مریض ہو چکی ہے۔ مغرب پر سب سے بڑا اور انتہائی شدید اللہ کا عذاب یوں نازل ہوا ہے کہ ان کا معاشرتی ڈھانچہ تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ وہاں گھر اور خاندان کا تصور ہی تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے ہاں اب بھی لوگ کہتے ہیں "جو سکھ اپنے چوبارے نہ بلخ نہ بخارے" (یعنی جو سکھ اپنے گھر میں ملتا ہے وہ دنیا کی بہترین جگہ پر بھی ممکن نہیں)۔ رشتوں کی اس تباہی و بربادی نے انہیں ایک مشین بنا دیا ہے جس میں خوراک تیل کے انداز میں ڈالی جاتی ہے اور وہ کام کرتی ہے۔ وہاں انسان جانوروں کی طرح ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ کون کس کا جنا ہوا ہے۔ اور کس نوعیت کا عذاب یہ سیکولر اپنے چہیتے مغرب کے لیے مانگتے ہیں؟ یہ عذاب زلزلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ایک اعتراض یہ بھی سامنے آتا ہے کہ یہ عذاب غریب لوگوں اور غریب بستیوں پر ہی کیوں نازل ہوتے ہیں؟ اصل میں ایسے مصائب اگر کسی کے لیے مصیبت یا آزمائش کا باعث ہیں تو کسی کو عبرت کا درس دیتے ہیں۔ پھر یہ بھی اللہ کی سنت ہے کہ وہ گناہوں میں بری طرح ڈوبنے والے کو اور توبہ نہ کرنے والے کو ڈھیل دیتا ہے۔ یہ ڈھیل مکڑی کے جالے کا کام کرتی ہے اور بالآخر وہ خود اس میں بری طرح پھنس جاتا ہے۔ مراعات اور اچھے حالات اُس کی واپسی میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور بالآخر وہ جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔ ہم اہل پاکستان سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اس وقت ان مباحث میں الجھنے کی بجائے زلزلہ کے متاثرین کی ہر ممکن مدد کریں۔ علاوہ ازیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر توبہ کریں۔ اہل پاکستان اپنے اس وعدہ کو نبھائیں جو انہوں نے تحریک پاکستان کے دوران کیا تھا۔ اللہ نے انہیں! یہ ملک آزمائش کے طور پر دیا ہے کہ وہ اس ملک میں اپنے وعدہ کے مطابق اللہ کا دین نافذ کرتے ہیں یا نہیں اگرچہ یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ضرور سوچنا چاہیے کہ سود کے فیصلے اور جج صاحب کے نامناسب ریمارکس کے فوری بعد اہل پاکستان کو کیوں ہلا مارا گیا ہے۔ اس مسئلہ کا پہلا آخری اور حتمی حل صرف یہ ہے کہ انفرادی سطح پر اللہ کے حضور سربسجود ہو کر گڑگڑا کر اور مخلص ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی جائے اور اجتماعی سطح پر مغرب کی تقلید چھوڑ کر اللہ اور رسول ﷺ کے فرمودات کی تعمیل کرتے ہوئے پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست بنایا جائے، تاکہ عالمی خلافت کے قیام کے لیے کوئی پیش رفت ہو سکے۔ ✿✿✿

نوشتۂ دیوار

مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے اور اسلامی جمہوری اتحاد (I.J.I) کو سیڑھی بنا کر ایوان اقتدار میں داخل ہونے والے میاں محمد نواز شریف جو تیسری بار ملک کے وزیر اعظم بن کر پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک ریکارڈ قائم کر چکے ہیں، اُنہوں نے ایک فورم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا ہے: "The future of the nation lies with democratic and liberal Pakistan" یعنی قوم کا مستقبل جمہوری اور لبرل پاکستان سے وابستہ ہے۔ اس سے پہلے وہ سیفما کے فورم پر گفتگو کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ ہندو اور مسلمان ایک ہی خدا کو پوجتے ہیں، اُن کی زبان ایک ہے، اُن کی بود و باش یعنی رہن سہن ایک جیسا ہے، اُن کی ثقافت ایک ہے۔ ایک لکیر ہے جو بھارت اور پاکستان کے درمیان کھینچ دی گئی ہے۔ گویا قائداعظم نے یہ لکیر کھینچنے کے لیے جو بنیادیں قائم کی تھیں یا قیام پاکستان کے لیے جو جواز پیش کیے تھے اس تقریر میں ایک ایک کا نام لے کر یہ بنیادیں ڈھا دی گئیں اور وہ دلائل جو اُنہوں نے تحریک پاکستان کے دوران دیئے تھے سب کی نفی کر دی گئی۔ علاوہ ازیں مشرقی پنجاب (بھارت) کے وزیر اعلیٰ لاہور تشریف لا کر وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کی موجودگی میں یہ کہہ چکے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کھینچی گئی لائن کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس ہفتہ کے دوران دیوالی کے موقع پر ہندوؤں کے ایک اجتماع میں گفتگو کرتے ہوئے وزیر اعظم یہ کہہ چکے ہیں کہ مجھے اپنی اُس تقریب میں مدعو کریں جس میں آپ ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں (ہولی) اور مجھ پر بھی رنگ پھینکیں۔ دوسری طرف 1997ء میں جب میاں نواز شریف کو اسمبلی میں دو تہائی اکثریت حاصل ہوئی تھی تو اُنہوں نے اپنے والد محترم کی موجودگی میں ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے

اس مکمل اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ایک سال میں ملک سے سودی معیشت کا خاتمہ کر دیں گے۔ پھر یہ کہ میاں نواز شریف ہر رمضان کا آخری عشرہ حرمین میں گزارتے ہیں۔ یہ سب وہ تفصیلات ہیں جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں اور مصدقہ ریکارڈ کا حصہ ہیں۔ انتہائی معتبر اور قابل اعتماد ذرائع کے مطابق جب صدر پرویز مشرف نے اُنہیں جبری طور پر جلاوطن کر دیا تھا تو خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اُنہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ اب اگر اللہ نے اُنہیں موقع دیا تو وہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کریں گے۔ حال ہی میں جنگ گروپ سے منسلک مشہور و معروف صحافی انصار عباسی نے ایک کالم میں انکشاف کیا ہے کہ وزیراعظم نواز شریف، وزیر خزانہ اسحاق ڈار اور موجودہ ڈپٹی گورنر اسٹیٹ بینک سعید احمد نے 2013ء میں رمضان المبارک کے تیسرے عشرے میں مسجد نبوی میں بیٹھ کر باقاعدہ یہ طے کیا تھا کہ وہ پاکستان میں سودی معیشت کا خاتمہ کر دیں گے۔ لیکن گزشتہ اڑھائی سال میں حکومت نے بلاسود بینکاری کی طرف رتی بھر پیش قدمی نہیں کی۔

میاں نواز شریف 1981ء میں جنرل ضیاالحق کا ہاتھ تھام کر سیاست میں داخل ہوئے۔ اُن کے مارشلائی دور میں پنجاب کے وزیر خزانہ بنے اور اُس کے بعد آج تک دو مرتبہ وزیراعلیٰ اور تین مرتبہ وزیراعظم بن چکے ہیں۔ لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر چلانے میں وہ کمال مہارت رکھتے ہیں۔ پاکستان میں فرقہ واریت گہری جڑیں رکھتی ہے۔ اہلحدیث اور بریلوی کبھی ایک دوسرے کے قریب آنے کو تیار نہیں ہوتے، لیکن اہلحدیث رہنما سینیٹر پروفیسر ساجد میر اور جامعہ نعیمیہ کے راغب نعیمی دونوں اُن کے سپورٹرز ہیں۔ اہل تشیع کے کئی گروہوں سے اُن کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ سپاہ صحابہ بھی اُن کے گُن گاتے تھے۔ دیوبندیوں کے سرخیل مولانا فضل الرحمٰن اُن کے قریبی ترین ساتھیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ روس سے خصوصی تعلقات رکھنے والے اچکزئی جیسے قوم پرست لیڈر قومی اسمبلی میں برملا اعلان کرتے ہیں کہ میں دو شریفوں میں سے سویلین شریف کے ساتھ ہوں، فوجی شریف کے ساتھ نہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو جب پھانسی چڑھے تو اہل لاہور اچھی طرح جانتے ہیں کہ شریف فیملی نے مٹھائی تقسیم کی تھی۔ وزیراعظم بے نظیر کو سکیورٹی رسک قرار دیا گیا۔ عوامی اجتماع میں کہا گیا کہ پیپلز پارٹی کا نام سن کر میرا خون کھول جاتا ہے۔ آج پیپلز پارٹی قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کہلاتی ہے لیکن لیڈر آف دی اپوزیشن جناب

خورشید شاہ وزیر اعظم میاں نواز شریف کے صدقے واری جا رہے ہیں۔ اسے پاکستان کی جمہوری سیاست میں انتہائی انوکھا واقعہ کہا جا سکتا ہے۔ سابق صدر زرداری تھوڑا بہت غصہ نکال لیتے ہیں لیکن دل و جان سے نواز شریف کے ساتھ ہیں۔ میاں نواز شریف پنجابیوں کے ہیرو ہیں لیکن پنجابیوں سے اللہ واسطے کا بیر رکھنے والے اسفند یار ولی خان اُن کے دست و بازو ہیں اور میاں نواز شریف کے دشمن عمران خان کو اپنا دشمن گردانتے ہیں۔ صحافت ریاست کا چوتھا ستون ہے، صرف ایک صحافی کی مثال کافی ہوگی۔ نجم سیٹھی جو نظریات کے اعتبار سے کٹر سیکولر ہیں اُنہیں آپ نے اپنے اولین دور میں گرفتار کیا اور ذلیل و خوار کیا، لیکن پھر بھی وہ آج آپ کے قدموں میں پھول نچھاور کرتا ہے اور آپ کی حمایت میں صفِ اول میں کھڑا ہے۔ میاں صاحب جب سیاست میں آئے تھے تب بھی وہ صنعت کار تھے لیکن اُن کا کاروبار صرف پاکستان میں تھا، آج اُن کا کاروبار مشرق وسطیٰ میں بھی ہے اور مغرب میں بھی ہے۔ اس وقت وہ لندن میں سرمایہ کاری کرنے والے تیسرے سب سے بڑے ایشیائی ہیں۔

ہم نے یہ سارے حقائق میاں صاحب کے سامنے یاد دہانی کے لیے رکھے ہیں کہ وہ غور فرمائیں کہ اللہ نے کس طرح اُنہیں اپنے فضل سے نوازا ہے۔ انہیں کیسے کیسے مواقع فراہم کیے ہیں، حوادث زمانہ سے انہیں کیسے کیسے بچایا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اپنے پہلے دور حکومت میں چیف آف آرمی سٹاف آصف جنجوعہ سے اُن کی کشیدگی کس حد تک بڑھ گئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی وقت بھی آرمی چیف کوئی قدم اٹھا سکتا ہے کہ اچانک صحت مند و توانا آصف جنجوعہ کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس وقت سول اور فوجی قیادت میں کشیدگی اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ آصف جنجوعہ کے ورثاء نے میاں نواز شریف پر یہ الزام عاید کر دیا تھا کہ اُنہیں زہر دے کر مارا گیا ہے۔ میاں صاحب غور فرمائیں! آپ دینی جماعتوں کے ساتھ مل کر اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں اور ایوان اقتدار میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آپ پاکستان میں اپنے والد کی معیت میں ایک درویش کی مجلس میں بیٹھ کر سود ختم کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ آپ یہ وعدہ اللہ کے گھر اور مسجد نبوی میں دہراتے ہیں، لیکن نہ صرف یہ کہ سود کے خاتمے کے لیے ایک قدم بھی نہیں اُٹھاتے بلکہ یو بی ایل کے ذریعہ سے اس تاریخی فیصلے کے خلاف اپیل میں چلے جاتے ہیں جس میں بنک کے سود کو قرآن کے ربا کا ہم معنی قرار دے کر حرام مطلق ڈیکلیر کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اگر حقائق پر مبنی ہے تو پھر ذرا

سوچیے! ذرا غور فرمائیں کہ اتنی صلاحیتوں سے نوازے جانا اور اتنے مواقع کا فراہم ہونا' کہیں یہ ڈھیل تو نہیں دی جا رہی، کہیں یہ رسی تو دراز نہیں ہو رہی، یہ آزمائش تو نہیں ہے' جس میں آپ مسلسل فیل ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا' انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔ جب وہ اللہ کے فضل اور اس کی نوازشات کو اپنا استحقاق سمجھنے لگتا ہے، جب یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کا پسندیدہ ہوں' تبھی تو یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ یہ انسان مکڑی کی طرح خود اپنے گرد جال بُن لیتا ہے۔ فرد ہو یا گروہ، جب یہ روش اختیار کر لیتا ہے تو بالآخر رب العالمین کی گرفت میں آ جاتا ہے جو اپنی شدت کے حوالہ سے کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ وہ غفور و رحیم بھی ہے۔ لیکن جبار اور قہار بھی ہے۔ اُس کے ہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ ہاں البتہ جب تک زندگی ہے' جب تک موت کے آثار واضح نہیں ہو جاتے' توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یقیناً وہ غفور و رحیم ہے بشرطیکہ توبہ کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے توبہ کی جائے۔ میاں صاحب احساس کیجیے! شدید خطرہ صرف آپ کے نہیں، ساری شریف فیملی کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ یہ سیاسی تجزیہ نہیں، تاریخ کا سبق ہے جو ہم آپ کے سامنے دہرا رہے ہیں۔ نوشتۂ دیوار کو پڑھیں اور اُس کا تدارک کریں۔ آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ ٹلا نہیں کرتا۔ ہماری یہ گزارشات بہت کڑوی کسیلی ہیں۔ آپ کے منہ کا ذائقہ یقیناً خراب ہو گا لیکن یاد رہے دوائی ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے اور پلانے والا خیر خواہ ہوتا ہے جبکہ خوشامدی محض اقتدار کے پجاری ہوتے ہیں جو خطرہ محسوس کرتے ہی کشتی سے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ اللہ کی پناہ حاصل کریں تو وہ آپ کو دنیا اور آخرت میں کامیاب کرے گا۔ ان شاء اللہ!



بند گلی سے نکلتا کشادہ راستہ

نومبر کے آغاز سے کراچی آپریشن سست روی کا شکار تھا، جسے پاکستان میں ہر سطح پر محسوس کیا گیا اور طرح طرح کے تبصرے بھی ہونے لگے کہ شاید فوج اور سندھ کی دونوں سیاسی قوتوں یعنی ایم کیو ایم اور پیپلز پارٹی کی ڈیل ہوگئی ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ حکومت اس آپریشن کے حوالے سے سنجیدہ نہیں ہے کیونکہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کی سیاسی حمایت کھونہیں دینا چاہتی اور فوج کو حکومت کی غیر سنجیدگی پر شدید اعتراض ہے۔ اس دلیل کو اُس وقت مزید تقویت پہنچی جب کور کمانڈرز کانفرنس کے بعد آئی ایس پی آر نے ایک پریس ریلیز میں حکومت کی گورننس پر سوالیہ نشان لگا دیا بلکہ واضح طور پر کہا کہ آپریشن کی کامیابی کے لیے گڈ گورننس لازم ہے، بالفاظ دیگر وہ اس وقت مفقود ہے۔ حکومت نے بھی نہلے پر دہلا دے مارا اور کہا کہ گورننس گڈ ہی نہیں ویری گڈ ہے اور ہر ادارے کو چاہیے کہ وہ اپنی حدود میں رہ کر کام کرے۔ اسی لے دے میں آرمی چیف امریکہ کے دورہ پر روانہ ہوگئے۔ اِدھر آپریشن میں سست روی کی وجہ سے ٹارگٹ کلرز اور دوسرے جرائم پیشہ افراد کی حوصلہ افزائی ہوئی اور کراچی میں کم ہوتی وارداتیں پھر بڑھنے لگی۔ دہشت گردوں نے جمعہ کے روز مسجد کی حفاظت پر مامور رینجرز کی ایک گاڑی پر حملہ کیا اور اُن کے چار اہلکاروں کو شہید کر دیا۔ اس کے بعد آپریشن میں ایسی تیزی آئی ہے کہ رینجرز دن رات چھاپے مار کر گرفتاریاں کر رہے ہیں اور اسلحہ برآمد کر رہے ہیں۔ ایم کیو ایم کے مطابق اُنہیں ٹارگٹ کیا جا رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ اُن کی جماعت کو دیوار سے لگا دیا جائے اور 5 دسمبر کو ہونے والے بلدیاتی انتخابات میں اُن کے لیے مشکلات پیدا کی جائیں۔ ہماری اطلاعات کے مطابق ممکن ہے ایم کیو ایم کے ارکان زیادہ تعداد میں گرفتار ہوئے ہوں لیکن پیپلز پارٹی اور بعض کالعدم تنظیم کے کارکن

بھی بڑی تعداد میں گرفتار ہوئے ہیں۔ آصف زرداری کے انتہائی قریبی ساتھی اور جگری دوست ڈاکٹر عاصم حسین کا نوے روزہ ریمانڈ ختم ہونے پر اُن پر دہشت گردی میں معاونت کرنے کے الزام میں مقدمہ درج کرنے کے لیے پولیس کو کہا گیا ہے اور اُن پر پاکستان سے باہر جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ علاوہ ازیں شرجیل میمن جو سندھ حکومت کے بڑے اہم وزیر ہیں لیکن کئی ماہ سے گرفتاری کے خوف سے کراچی کی بجائے دبئی بیٹھ کر اپنی وزارت چلا رہے تھے، وہ بھی ای سی ایل کی زد میں آ گئے ہیں۔ گویا سندھ کی دیہی اور شہری دونوں سیاسی قوتیں رینجرز کے نشانے پر ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس صورت حال پر احتجاج کرتے ہوئے ایم کیو ایم نے قومی و صوبائی اسمبلیوں اور سینیٹ سے استعفیٰ دیا تھا، حالات اُن کے لیے مزید خراب اور ناموافق ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنے استعفے واپس لے لیے ہیں۔ اُدھر وفاقی حکومت زبان سے جو چاہے کہتی رہے اور کراچی آپریشن کو جتنا بھی own کرتی رہے، یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ کراچی میں رینجرز کی یہ کارروائیاں اور بحیثیت مجموعی فوج کا رویہ وفاقی حکومت کو قطعی طور پر پسند نہیں۔ اس لیے بھی کہ سندھ میں پکڑ دھکڑ کے بعد یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ اسے سندھ تک کیوں محدود رکھا جا رہا ہے۔ کیا پنجاب میں سب فرشتے بستے ہیں اور کیا پنجاب میں کرپشن نہیں ہو رہی؟ این ایل سی اور نندی پور جیسے میگا پراجیکٹ میں میگا کرپشن ہوئی ہے۔ پنجاب کے ایک وزیر کی وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کے نام پر رشوت لیتے ہوئے ویڈیو میڈیا میں دکھائی جا چکی ہے۔ ایک وزیر پر بیس افراد کے قتل کا الزام ہے لیکن سندھ میں کارروائی کرنے والی فوج پنجاب کے بارے میں کچھ نہیں کر رہی ہے۔ اس سے صوبائی تعصب پھیلے گا۔ لہٰذا یہ مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ پنجاب میں اور وفاق میں کرپٹ عناصر کے خلاف فوج کارروائی کرے۔ پھر یہ کہ جنرل راحیل شریف کی ملکی اور غیر ملکی سطح پر بڑھتی ہوئی مقبولیت وفاقی حکومت کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ عوامی تاثر یہ ہے اور میڈیا اس کو مزید ہوا دے رہا ہے کہ ڈی فیکٹو حکومت جنرل راحیل شریف اور فوج کی ہے۔ ملک میں امن و امان کا قیام اور دہشت گردی کا جو کافی حد تک سدباب ہوگیا ہے اس کا سہرا جنرل راحیل شریف کے سر باندھا جا رہا ہے۔ اس پر حکومت اور فوج میں اختلافات ہیں اور یہ خلیج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ہماری رائے میں پاکستان کی سیاسی صورت حال اور اداروں کے باہمی تعلقات میں ایسی پیچیدگی پیدا ہوگئی اور ایسا الجھاؤ آ گیا ہے کہ اس گتھی کو سلجھانا کوئی آسان کام نہیں۔ اہل سندھ یا

سندھ کی سیاسی قوتوں کا یہ مطالبہ انتہائی جائز اور منطقی ہے کہ اگر فوج نے ان معاملات میں دخل اندازی کرنی ہے تو صرف سندھ میں کیوں، پنجاب اور وفاق کے کرپٹ لوگ کیوں نہیں پکڑے جا رہے۔ لہٰذا اس جائز مطالبے کو پورا کرنے کے لیے اگر فوج یا رینجرز پنجاب اور وفاق میں اقدام کرتے ہیں تو کیا پاکستان کے سب سے بڑے صوبے اور مرکز کا فوج سے تصادم بچانا ممکن ہوگا؟ فرض کریں سندھ کی طرح پنجاب کے وزراء پر بھی ای سی ایل لگے یا اُنہیں گرفتار کرلیا جائے تو کیا ہوگا؟ وزیر خزانہ اسحاق ڈار عدالت میں دفعہ 164 کے تحت حلفیہ بیان دے چکے ہیں کہ اُنہوں نے منی لانڈرنگ کر کے میاں نواز شریف کا بہت بڑا سرمایہ لندن بھجوایا تھا۔ اگر یہ حلفیہ بیان جھوٹا تھا تو اسحاق ڈار کی پکڑ ہوتی ہے اور اگر سچا تھا تو نواز شریف گرفت میں آتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ نظام کیسے چل سکے گا؟ لیکن دوسری طرف اور اگر فوج پنجاب اور وفاق میں کوئی قدم نہیں اٹھاتی تو کیا جسم کے ایک حصہ سے کینسر ختم کر کے اور دوسرے حصے کا سرے سے کوئی علاج ہی نہ کیا جائے تو ایسی صورت میں پورے جسم کو کینسر سے بچایا جا سکتا ہے؟ ایک جیسے جرائم میں ایکشن مختلف ہو تو بہت سے مسائل کھڑے ہو جائے گے۔ مرکزی حکومت کا یہ موقف ہے کہ فوج صرف اپنا رول ادا کرے۔ وہ حکومت کا ایک ماتحت ادارہ ہے لہٰذا جس کام کا حکومت حکم دے وہ کرے، دوسرا کوئی کام نہ کرے۔ یعنی ضربِ غضب پر حکومتی منشا کے مطابق عمل ہو۔ آئینی لحاظ سے دیکھا جائے تو بات کوئی ایسی غلط بھی نہیں ہے، لیکن جب حکومت کی یہ حالت ہو کہ وہ گورننس کے حوالہ سے مفلوج نظر آئے۔ واپڈا کے لگائے گئے میٹر چیک کرنے کے لیے فوج کو کہا جائے۔ گھوسٹ سکولوں کی تلاش فوج کرے۔ کسی بڑے طوفان، سیلاب یا زلزلہ کی بات الگ ہے کہ ایسی ایمرجنسی میں دنیا بھر میں فوج کو طلب کیا جاتا ہے۔ لیکن سندر انڈسٹریل اسٹیٹ میں ایک فیکٹری کی عمارت گر جائے یا چھوٹی اور معمولی سطح کی آگ ایک آدھ بلڈنگ کو لگ جائے تو فوج کی مدد لیے بغیر چارہ نہیں۔ پھر فوج کا اعتراض یہ بھی ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف جنگ میں اُنہیں جھونک دیا جاتا ہے، اُن کے ہزاروں جوان اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر چکے ہیں۔ لیکن سویلین کرپشن سے حاصل کردہ بے پناہ دولت سے دہشت گردوں کے سہولت کار بنے رہیں۔ ہم ملک کو لوٹا جاتا دیکھتے رہیں؟ حکمران خود سرمایہ غیر قانونی طور پر بیرون ملک منتقل کرتے ہیں۔ ایان علی جس کی بڑی مثال ہے۔ علاوہ ازیں لانچوں کے ذریعے بھی سرمایہ بے دریغ منتقل ہوتا رہے۔ ملک پر قرضے اس طرح بڑھ

رہے ہوں کہ دور و نزدیک سے یہ آواز آ رہی ہو کہ کسی وقت بھی یہ ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔ آرمی چیف ہی نہیں، چیف جسٹس آف پاکستان بھی پکار اٹھیں کہ خراب حکمرانی سے لاتعلق رہ کر عوام کو حکمرانوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس پس منظر میں دہشت گردی کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں جل کر بھسم ہونے والے کہہ سکتے ہیں کہ کیا ہم آئینی دائرہ کار کا منہ دیکھتے رہیں اور ملک تباہ ہو جائے؟ آئین ملک کے لیے ہوتے ہیں، ملک آئین کے لیے نہیں ہوتے۔ لیکن دوسری طرف سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ کیا فوج اور عدلیہ میں کرپشن نہیں ہے۔ کیا ماضی میں جرنیل آئین شکنی سے اور جج نظریہ ضرورت کے تحت فیصلے کر کے ملک کو نقصان نہیں پہنچا چکے؟ لہٰذا یہ مسئلہ یعنی پاکستان کی سیاسی صورت حال انتہائی گھمبیر ہو چکی ہے اور اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس حوالہ سے بند گلی میں داخل ہو چکے ہیں۔

معاشی دہشت گردی کے خلاف فوج آگے بڑھتی ہے تو نظام ٹھپ ہوتا ہے اور اگر آپریشن ادھورا چھوڑ کر واپسی کا راستہ اختیار کرتی ہے تو گویا بُرائی سے شکست کھانے کا اعتراف ہوتا ہے ایسی صورت میں معاشی اور خونی دہشت گردی ایسے سر اٹھائے گی کہ الامان الحفیظ۔ حالات کو کنٹرول کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ فوج کو من چاہی کرنے دی گئی تو آئین اور قانون بُری طرح بھاری بوٹوں تلے روندے جائیں گے۔ پھر اُس کی بھی کیا ضمانت دی جا سکتی ہے کہ وہ وہی کچھ نہیں کریں گے جو سول حکمران کر رہے ہیں۔ لہٰذا بند گلی سے کشادہ راستہ پا لینے اور یہ جو غار کے دہانے کو بہت بڑی چٹان نے بند کر دیا ہے، یہ اسی صورت میں سرک سکتی ہے اگر اُس خالق و مالک کی طرف رجوع کیا جائے جس نے آسمان کو ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہوا ہے۔ جو کیڑے کو پتھر کے اندر رزق پہنچا رہا ہے۔ جس نے فضاؤں میں پرندوں کو تھاما ہوا ہے۔ جس کے حکم سے کشتیاں پانی پر دوڑتی نظر آتی ہیں۔ جو بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان کو پیدا کرتا ہے۔ وہ حاکم مطلق جسے اپنے حکم پر عمل درآمد کے لیے صرف ''کُن'' کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آیئے اُس کا دامن تھام لیں۔ وہ گرتوں کو تھام لیتا ہے۔ ہمارے آگے پیچھے، اندر باہر، اڑوس پڑوس ہر طرف دشمن ہی دشمن ہیں۔ آیئے اُس ''ایک'' کو راضی کر لیں، یہ سب زیر ہو جائیں گے۔ اور اُس کو راضی کرنا مشکل نہیں۔ اُس فطری نظام کو نافذ کر دیں جو اُس نے انسانیت کی بہتری کے لیے رحمۃ للعالمین اور محسن انسانیت کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے۔

❁❁❁

اے اللہ! ہمیں برکت دے ہمارے شام میں!

جنگ عظیم اوّل اور دوم یورپ میں عیسائیوں کے درمیان ہوئیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان جنگوں کے بدترین متاثرین مسلمان تھے۔ ان جنگوں کے بعد عیسائیوں کے درمیان ایک عرصہ سے جاری جنگ و جدل اور قتل و غارت ختم ہوا، یورپ متحد ہو گیا جبکہ مسلمان بدترین انتشار کا شکار ہوئے۔ ترکوں نے خود خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ سرزمین عرب کو کیک کی طرح کاٹ کر مختلف ریاستیں قائم کر دی گئیں اور ان ریاستوں میں من پسند ضمیر فروش علاقائی لیڈروں کو ڈکٹیٹروں کی صورت میں مسلط کر دیا گیا۔ اس سرزمین میں اسرائیل کو ایک خنجر کی مانند گھونپ دیا گیا۔ مسلمان ریاستوں کے درمیان گھری ہوئی اس یہودی ریاست کی حفاظت اور سلامتی کا ٹھیکہ نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ نے بھی لے لیا۔ مشرقی یورپ میں یوگوسلاویہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے مسلمان اکثریت کے علاقے میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اگرچہ عربوں نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا لیکن اسرائیل کی فتح میں یورپ اور امریکہ کا بھی ہاتھ تھا۔ اس جنگ میں اسرائیل نے عربوں کے بہت سے علاقے ہتھیا لیے۔ مصر سے صحرائے سینا چھین لیا۔ شام میں گولان کی پہاڑیوں پر قابض ہو گیا۔ یہاں تک کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فتح کردہ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کا بازیاب کردہ بیت المقدس بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر یہودیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ 1967ء کی جنگ سے پہلے عربوں کا نعرہ تھا: اسرائیل کو نیست و نابود کر دو۔ اس جنگ کے بعد عربوں کا مطالبہ اپنے علاقے واپس لینے تک محدود ہو گیا۔ 1974ء میں مصر اور اسرائیل میں پھر جنگ ہوئی۔ اب کے مصری بڑی جرأت اور بہادری سے لڑے۔ یوں معلوم ہوتا تھا مصری ظفر مند ہوں گے۔ اسرائیل کی وزیر اعظم گولڈا میئر کہتی ہیں

کہ میں خودکشی کا سوچ رہی تھی کہ امریکہ جنگ میں کود پڑا اور اس نے اپنے اور اسرائیل کے درمیان اسلحہ اور بارود کا پل قائم کر دیا۔ سیٹلائیٹ سے بھی اسرائیل کی مدد کی۔ یوں عربوں کی فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ سوویت یونین مصر کا اتحادی تھا لیکن وہ اس کی مدد کو نہ پہنچا۔ مصری صدر انور السادات پکار اٹھے کہ ہم اسرائیل سے لڑ سکتے ہیں، امریکہ سے نہیں۔ وہ انتہائی بددل ہوئے' اپنی پالیسی کو یوٹرن دیا' کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کیا اور امریکہ کی گود میں جا بیٹھے۔ مصر نے صحرائے سینا تو واپس لے لیا لیکن اپنے نظریات، اپنی سوچ اور اسرائیل دشمنی بیچ ڈالی۔ اس شکست سے انور السادات گھٹنوں کے بل گر پڑے اور اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ انہیں اپنی ذات کے حوالہ سے یہ سودا مہنگا پڑا اور ان کے ہم وطنوں نے' جو دشمن کے سامنے سجدہ ریز ہونے پر ان سے ناخوش تھے' انہیں سرمیدان قتل کر دیا۔ لیکن یہ قتل بھی عربوں کے سیاسی' عسکری اور ذہنی وفکری زوال میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ انور السادات کے بعد فلسطینیوں کے ہردلعزیز لیڈر یاسر عرفات نے ذہنی طور پر شکست تسلیم کر لی۔ بعدازاں ہر عرب ریاست اور ہر عرب لیڈر امریکہ کے آگے بلاواسطہ اور اسرائیل کے سامنے بالواسطہ جھکتا چلا گیا۔ عراق کا صدر صدام حسین کچھ اکڑ دکھاتا تھا اور مصر کے بعد وہی ایک قوت تھی جو اسرائیل کو کھٹکتی تھی۔ اسے امریکہ نے جھوٹا عذر تراش کر تباہ و برباد کر دیا۔ کسی زمانے میں لیبیا کے کرنل قذافی بھی امریکہ اور اسرائیل کو آنکھیں دکھاتے تھے۔ اسی دور میں انہوں نے مانگ تانگ کر ابتدائی ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کی۔ ظاہر اُوہ ایٹم بم بنانے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے لیکن حالات اور امریکہ کے تیور دیکھتے ہوئے انہوں نے ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے سے سربازار توبہ کی اور امریکہ کی تسلی اور خوشنودی کے لیے ایٹمی بوریا بستر جہاز میں لاد کر امریکہ بھیج دیا۔ سامراجی قوتوں نے انہیں پھر بھی معافی نہ دی اور اس جرم کی سزا کے طور پر کہ ایٹمی سوچ کو بھی اپنے اندر پروان کیوں چڑھنے دیا، انہیں ذلیل کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اسرائیل کے حوالہ سے اب عربوں کا حال یہ ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اس کی نظروں میں پسندیدہ بننے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ شام اسرائیل کے خلاف صرف اس حد تک ڈٹا ہوا ہے کہ وہ اس سے گولان کی پہاڑیاں خالی کرنے کا مطالبہ کرتا چلا جا رہا ہے اور اسرائیل کے حوالہ سے شام اب بھی hard liner ہے، جو مخالفانہ سیاسی بیان بازی کرتا رہتا ہے۔ لیکن شام کی اسرائیل دشمنی مذہبی بنیادوں پر نہیں بلکہ سیاسی بنیادوں

پر ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ماضی کا سوویت یونین جو اب روس تک محدود ہو گیا ہے اپنے ضعف، کمزوری اور عاقبت نااندیش قیادت کی وجہ سے مشرق وسطیٰ سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن پیوٹن کی قیادت میں روس ایک بار پھر اُبھرا ہے۔ اگرچہ مشرق وسطیٰ سے امریکہ کو نکالنا تو ظاہر ہے ابھی اس کے بس کی بات نہیں لیکن وہ شام کی پشت پر زوردار انداز میں کھڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شام میں Tartus کی بندرگاہ اب مشرق وسطیٰ میں روس کا واحد بحری ٹھکانہ ہے۔ عرب بہار جو اب عرب خزاں بن چکی ہے وہ تیونس میں زین العابدین کو، مصر میں حسنی مبارک کو اور یمن میں عبداللہ صالح کو روندتی ہوئی شام پہنچی تو بشار الاسد روسی آشیر باد پر ڈٹ گئے۔ شام کے صدر بشار الاسد جو صدر حافظ الاسد کے بیٹے ہیں، اہل تشیع کے علوی فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ شام کا اقلیتی فرقہ ہے۔ اسد خاندان کے یہ باپ بیٹا انتہائی ظالم اور شق القلب انسان ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے اکثریتی عوام پر بدترین مظالم ڈھائے تھے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ عرب میں جب ڈکٹیٹروں کے خلاف عوامی تحریکیں شروع ہوئیں اور کامیابی سے تخت الٹ دیے گئے تو شام کے عوام بھی بشار الاسد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ امریکہ، روس کے اتحادی بشار الاسد کو نکال کر مشرق وسطیٰ میں روس کے واحد اڈے کو بھی چیلنج کرنا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں سعودی عرب جو مذہبی اختلاف کی وجہ سے شام کے بشار الاسد کا شدید مخالف ہے۔ امریکہ اس پر احسان جتا کر اسے مزید اپنا طفیلی بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی بدترین دشمن تنظیم القاعدہ کی مدد بھی حاصل کی یا صحیح تر الفاظ میں شام میں باغی قوتیں تشکیل دینے میں اس کی مدد کی اور دنیا کے سامنے Good Al-Qaida اور Bad Al-Qaida کی اصطلاح سامنے آئی۔ یوں F.S.A یعنی فری سیرین آرمی وجود میں آ گئی۔ ادھر عراق میں صدر صدام کی حکومت ختم کر کے جو مالکی کی حکومت قائم کی گئی تھی، وہ بری طرح ناکام ہو گئی اور صدام کے دور کی بعث پارٹی کے ارکان اور سابق فوجیوں نے ایک جنگجو تنظیم داعش کے نام سے عراق میں قائم کر لی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے عراق کا بہت سا حصہ فتح کر لیا۔ اس تنظیم نے نظامِ خلافت قائم کرنے کا اعلان کر دیا اور اس کے سربراہ ابوبکر البغدادی نے خلافت کی بیعت لینا شروع کر دی۔ امریکہ نے مسلمانوں کو باہم لڑانے کا اچھا موقع سمجھا اور داعش کو خود پھلنے پھولنے کا موقع دیا اور اسے شام کی طرف بھی راستہ دے دیا تاکہ بشار الاسد کے خلاف

تحریک تیز کی جائے۔ لیکن روس بشار الاسد کی پشت پر بھرپور انداز میں کھڑا تھا۔

ہماری رائے میں اس مسئلہ پر امریکہ روس رابطہ ہوا اور امریکہ سمجھ گیا کہ روس بشار الاسد کی حمایت میں کسی حد تک بھی جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنے رویے میں تبدیلی کی اور بشار الاسد کی حکومت گرانے سے زیادہ مسلمانوں کے باہم خون خرابے پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ اب وہ کبھی باغیوں کی مدد کر کے شام کی حکومت کو نقصان پہنچاتا ہے اور کبھی داعش پر حملے کر کے بشار الاسد کو تقویت پہنچاتا ہے تاکہ جنگ کسی انجام تک نہ پہنچے اور مسلمانوں میں باہمی قتل و غارت جاری رہے۔ البتہ روس اور ایران واضح طور پر بشار الاسد کے حمایتی ہیں۔ روس داعش اور دوسرے باغیوں پر مسلسل فضائی حملے کر رہا ہے۔ ایران بشار الاسد کی زمینی جنگ میں پوری مدد کر رہا ہے۔ سعودی عرب شام میں باغیوں کی کھلم کھلا پشت پناہی کر رہا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے جنگجو خلافت کے نام کی دلکشی کی وجہ سے داعش کی مدد کے لیے شام پہنچ رہے ہیں۔ داعش اس وقت شام کے ساٹھ فیصد رقبے پر قابض ہے، اگرچہ وہاں آبادی صرف سولہ فیصد ہے۔ سانحہ پیرس کے بعد فرانس بھی شام میں داعش پر بمباری کر رہا ہے، جس سے داعش بہت سے علاقوں سے پسپائی اختیار کر رہی ہے۔ لہٰذا اس وقت شام کی زمینی صورت حال یہ ہے کہ ایک حصہ پر داعش قابض ہے، وسطی شام کے ایک حصہ پر النصرہ فرنٹ کو کنٹرول حاصل ہے، وسطی شام سے حلب کے شہر تک کا علاقہ آزاد فوج کے قبضہ میں ہے۔ اُردنی سرحد کے قریب درعا کا ضلع بھی آزاد فوج کے قبضہ میں ہے۔ دمشق سے لاذقیہ شہر تک بشار الاسد کی حکومت ہے۔ گویا ایسا گنجلک معاملہ ہے کہ کہیں بھی صورت حال واضح نہیں، یہاں تک کہ اس معاملے میں بھی بعض اوقات یہ کنفیوژن پیدا ہو جاتا ہے کہ کون کس کا ساتھی ہے اور کون کس سے لڑ رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی بساط لپیٹ دینے کا وقت قریب آتا محسوس ہو رہا ہے۔ اس آخری وقت میں شام کے کردار پر نبی کریم ﷺ کی بہت سی احادیث مبارکہ ہیں جن میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کے آخری الفاظ ہیں: ''پس جب فتنے رونما ہوں گے تو ایمان شام میں ہوگا''۔ ایک دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ ہمارے مکے میں برکت دے، اے اللہ ہمارے لیے برکت رکھ ہمارے مدینہ میں، اے اللہ ہمیں برکت دے شام میں، اور برکت دے ہمارے صاع میں اور برکت رکھ ہمارے مد میں۔ ایک صحابیؓ

نے عرض کیا: یارسول اللہؐ اور عراق میں؟ تو آپؐ نے توجہ دوسری طرف کر لی۔ ان صاحب نے یہ بات تین مرتبہ دہرائی۔ وہ یہی کہتے رہے ''اور ہمارے عراق میں'' تو آپؐ التفات نہ فرماتے۔ پھر آپؐ نے فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہاں شیطان کا سینگ طلوع (نمودار) ہوگا۔'' لہٰذا شام میں زمینی حقائق کچھ بھی ہوں دشمنانِ دین جتنا چاہیں مسلمانوں کا خون بہالیں اور ظاہری طور پر وہاں حالات مسلمانوں کے لیے کتنے ہی ناموافق ہو جائیں، آپؐ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوگی۔ ان شاءاللہ! اس پر ہمارا ایمان سر کی آنکھوں سے نظر آنے والی ہر شے سے زیادہ ہے لہٰذا شام کے حالات سے بالآخر اُمت مسلمہ کے لیے خیر برآمد ہوگا۔ ان شاءاللہ!



سب سے پہلے پاکستان

اللہ رب العزت نے اپنی آخری کتاب قرآن کریم میں قصہ آدم و ابلیس سات بار دہرایا ہے۔ گویا انسان کو تکرار سے یاد دلایا ہے کہ ایک رویہ ابلیس لعین نے اختیار کیا، اس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کر کے مالک حقیقی کی نافرمانی کی اور جواب دہی پر اکڑ گیا' تکبر کیا اور اس دلیل بازی میں پڑ گیا کہ میں انسان سے بہتر ہوں اور ایک رویہ تمہارے ماں باپ آدم علیہ السلام اور حوا کا تھا، ان سے بھی خطا سرزد ہوئی لیکن وہ پشیمان ہوئے اور ان الفاظ میں معافی کی درخواست کی: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾ (الاعراف)

ترجمہ: ''(اس پر) وہ دونوں پکار اُٹھے کہ اے ہمارے رب ہم نے ظلم کیا اپنی جانوں پر' اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' اس قصہ کو بار بار دہرانے سے ایک عام سادہ ذہن کا قاری بھی یہ سمجھ جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اسے نصیحت کر رہا ہے کہ دیکھنا غلطی اور خطا کا ارتکاب کسی سے بھی ہو سکتا ہے، ہرگز ہرگز ابلیس والا رویہ اختیار نہ کرنا یعنی غلطی پر اصرار اور ہٹ دھرمی اختیار نہ کرنا بلکہ اپنے باپ آدم علیہ السلام والا رویہ اختیار کرنا' رجوع کرنا اور معافی کے طلب گار ہونا، میں رؤف و رحیم اور تواب ہوں، تمہاری توبہ قبول کر لوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابلیس کو تو ایک وقت مقررہ تک رخصت ملی ہوئی ہے۔ انسان جب ابلیسی رویہ اختیار کرتا ہے تو بھرپور امکان ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بھی ذلت اور خسارہ اٹھائے گا لیکن اصل سزا یہ ہے کہ آخرت میں وہ راندۂ درگاہ شیطان کا ہم ٹھکانہ ہوگا۔

آج امت مسلمہ کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔ مسلمان اقوام ہیں' مدت ہوئی جن کے سربراہوں کو مل بیٹھنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ ہر مسلمان ملک کسی نہ کسی انداز میں یہود و نصاریٰ کا غلام ہے' کوئی

ان کے دربار میں کشکول لیے کھڑا ہے اور مالی امداد کا طلب گار ہے' اور کوئی ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر اپنے لیے امن اور تحفظ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ ہم اس لحاظ سے ''سب سے پہلے پاکستان'' کے قائل ہیں کہ اہل پاکستان کی اصلاح اور فلاح پر توجہ مرکوز کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔ اس لیے کہ ہر نیک کام کا آغاز اپنے گھر سے کرنا چاہیے۔ کسی قوم کی اصلاح اور فلاح کے لیے سب سے پہلے اس مرض یا ان امراض پر غور کرنا ہوگا جن کے لاحق ہونے سے اس قوم کی ناؤ ڈوبتی ہوئی نظر آئے۔ ہماری رائے میں مرض وہی ایک ہے یعنی جرم کے ارتکاب پر ابلیسی رویہ اختیار کرنا' وہی جرم پر اصرار اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنا' قومی سطح پر اس رویہ کو اپنانے سے قیام پاکستان کے چوبیس سال چار ماہ بعد عذاب کا پہلا کوڑا ہماری پیٹھ پر برسا۔ پاکستان شکست وریخت سے دوچار ہوا اور ملک دو لخت ہو گیا۔ دشمن کو کہنے کا موقع ملا کہ ہم نے نظریۂ پاکستان کو خلیج بنگال میں غرق کر دیا ہے۔ ضرب بڑی کاری تھی، ہم جیسے کچھ ناسمجھ لوگوں کا خیال تھا کہ قوم اب سنبھل جائے گی' اب رجوع کر لے گی اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے گی لیکن ہوا کیا؟ چند دن چیخ و پکار ہوئی' کچھ لوگ معافی طلب کرتے بھی دیکھے' سنے گئے۔ اس بے آئین سرزمین کو ایسا آئین مل گیا جس میں بااہتمام درج کیا گیا کہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی اور قانون ساز ادارے کی عمارت پر کلمہ طیبہ جلی حروف سے لکھا گیا۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ سب زبانی اور کاغذی کارروائی تھی عملاً ہم پھر پرانی ڈگر پر رواں دواں ہیں بلکہ پہلے سے زیادہ بے باکی اور سرعت سے یہ سفر جاری ہے۔

جس قانون ساز اسمبلی کے ماتھے پر کلمہ طیبہ درج ہے اسی کی آغوش میں بیٹھ کر تحفظ حقوقِ نسواں کے بل کو قانون کا درجہ دیا گیا، جس کے بارے میں علماء کرام نے مکمل اتفاق رائے سے فتویٰ دیا کہ یہ قانون خلاف شریعت ہے۔ گویا جس آئین کے تقدس کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اسے ہی پاؤں تلے روند دیا گیا۔ عوام کے یہ نمائندے ابلیسی رویہ اختیار کرتے ہوئے ڈٹ گئے اور خلافِ شریعت قانون نافذ ہو گیا۔ بھارت نے جارحیت کی دھمکی دی تو پارلیمنٹ کا مشترکہ اجلاس بلا لیا گیا تاکہ عوامی نمائندوں کی طرف سے بھارت کو مشترکہ جواب دیا جائے کہ ہم متحد ہیں اور جارحیت کا جواب دینے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن اس اجلاس میں ایک دوسرے کو غدار ہونے کے طعنے دیے گئے۔ جبکہ حکومت نے مشترکہ اجلاس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سینٹ کو بائی پاس کیا اور غیرت کے نام پر قتل کو دوسرے قتل سے الگ کرنے کا غیر شرعی قانون منظور کر لیا گیا۔ اس قانون کے مطابق اگر غیرت کے نام پر قتل ہوگا تو قاتل اور مقتول کے ورثاء کے مابین دیت کی بنیاد پر یا

فی سبیل اللہ چاہے سمجھوتہ ہو بھی جائے تو قاتل کو پھر بھی عمر قید کی سزا ہوگی' ہے کوئی جو اسے خلاف شریعت نہ کہے' لیکن پوری ڈھٹائی کے ساتھ یہ قانون عوامی نمائندوں نے ملک میں نافذ کر دیا۔ پھر یہ کہ زنا بالجبر کے لیے خصوصی سزا کا اعلان کر کے بین السطور زنا بالرضا کا راستہ ہموار کیا گیا ہے۔ سود کے حرام مطلق ہونے کے فیصلہ کو پہلے سرد خانہ میں ڈالا گیا پھر مرضی کے جج لا کر فیصلہ بدل دیا گیا۔ میڈیا خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا نوجوانانِ پاکستان کو فحاشی اور بے حیائی کی باقاعدہ تربیت دے رہا ہے اور تشہیر فاحشہ کے حوالے سے جو ممکن ہو کر گزرتا ہے۔

یہ صورت حال کسی بھی اسلامی ملک میں ہو، اللہ رب العزت کے غضب کا موجب بنے گی اور جب کسی ایسے ملک میں عوامی نمائندے اللہ اور رسول ﷺ سے بغاوت کا اعلان کریں اور اپنے عمل سے ڈھٹائی اور تکبر کا اظہار کریں جو ملک معرضِ وجود ہی لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پر آیا ہو تو غضب الٰہی میں یقیناً شدت آئے گی۔ بدقسمتی سے غضب الٰہی کی علامات ظاہر ہونے کے باوجود عوام و خواص کوئی تبدیلی لانے کو تیار نہیں۔ ذرا غور فرمائیں کہ پاکستان زرعی ملک کہلاتا ہے لیکن یہاں زراعت بری طرح تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ دیہاتی لوگ اکثر قسمت پر شاکر ہوتے ہیں یا ان میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ شہریوں کی طرح میدان میں نکل کر احتجاج کریں لیکن آج ہمارا کسان سڑکوں پر پولیس کی لاٹھیاں کھا رہا ہے کیونکہ زمینی حالات بھی اس کو موت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ معاشی طور پر یہ حال ہے کہ ایک طرف زرمبادلہ کے ذخائر ریکارڈ سطح پر پہنچ جانے کی حکومت دعوے دار ہے اور دوسری طرف موجودہ حکومت تین سالوں میں چوبیس ارب ڈالر کے قرضے لے چکی ہے۔ پاکستان پر اس وقت 72 ارب ڈالر کا قرض ہے۔ توقع ہے کہ 2018ء تک قرضوں کا حجم 90 ارب ڈالر تک پہنچ جائے گا۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمیں ریاستی گارنٹی پر قرضہ نہیں مل رہا لہٰذا ہم ایئرپورٹس' موٹروے' ریڈیو' ٹیلی ویژن کی عمارات گروی رکھ کر قرضے حاصل کر رہے ہیں۔ اگر ہم بروقت قرضہ نہیں اتار سکیں گے تو ملکی سلامتی کا تحفظ کیسے ہوگا؟ سیاسی لحاظ سے بھی ملک میں افراتفری ہے۔ حکومت پانامہ لیکس پر کسی صورت خود کو احتساب کے لیے پیش کرنے کے لیے تیار نہیں اور عمران خان کہتا ہے کہ اسے موت کے سوا احتساب کے لیے تحریک چلانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ چھ ماہ ہر قسم کی جدوجہد کرنے کے بعد اس نے فیصلہ سنا دیا ہے کہ وہ اکتوبر کے اواخر میں اسلام آباد بند کر دے گا اور نواز شریف کی حکومت چلنے نہیں دے گا۔ گویا فساد ہونا صاف نظر آ رہا ہے۔

حکومت کے اندر انتشار کی کیفیت یہ ہے کہ کئی وزراء ایک دوسرے سے بات کرنے کو تیار

نہیں اور انتہائی خطرناک بات یہ ہے کہ حکومت اور فوج کے باہمی تعلقات جو تین سال میں کبھی بھی خوشگوار نہیں رہے۔ وہ ایک واقعہ کی وجہ سے انتہائی کشیدہ ہو گئے ہیں ہوا یوں کہ ایک اعلیٰ سطح کی میٹنگ جس میں اعلیٰ ترین سیاسی اور عسکری قیادت شریک تھی' اس میٹنگ کی روداد ایک اخبار میں شائع ہو گئی۔ خبر سے یہ بات آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہے کہ فوج غیر ریاستی عناصر کو دوسرے ممالک میں کارروائی کے لیے پالتی ہے اور انہیں پکڑنے کے لیے حکومت سے تعاون نہیں کرتی جس کی وجہ سے پاکستان دنیا میں تنہائی کا شکار ہو رہا ہے اور یہ امر ملک کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔ گویا خبر کے مطابق حکومت نے بھارت کے موقف کی تائید کی کہ پاکستان دہشت گردی ایکسپورٹ کرتا ہے۔ اس خبر کے بریک ہونے کے بعد حکومت اور فوج میں اتنی شدید کشیدگی اور تناؤ پیدا ہو چکا ہے جو کسی وقت بھی رنگ لا سکتا ہے۔ مذہبی حلقے بھی کسی سے پیچھے نہیں وہ ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔ ہر طرف انتشار اور افتراق ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ چیف جسٹس آف پاکستان جو عام طور پر سیاسی صورتِ حال پر تبصرہ نہیں کرتے وہ بھی پکار اُٹھے ہیں کہ پاکستان میں جمہوریت نہیں بادشاہت ہے۔ بیڈ گورننس کی وجہ سے عوام بدحال ہیں اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس کے باوجود لوگ مزید کس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ عذاب الٰہی کا مظہر نہیں کہ ملک میں ہر طبقہ دوسرے طبقے کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہے۔ ہمیں اپنے ایٹمی اثاثہ جات پر بڑا فخر ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ یہ اللہ کا ہم پر بہت بڑا فضل اور کرم ہے لیکن یاد رہے کہ سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہوتے وقت ہم سے کئی گنا بڑی ایٹمی قوت تھا۔ ہم ایک عرصہ سے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ہماری اللہ سے یہ بغاوت ہمیں بہت مہنگی پڑے گی لیکن کوئی سننے کو تیار نہیں۔ بہرحال آس پاس کی فضا سے آثار نمایاں ہو رہے ہیں کہ دنیا پر قیامت اللہ جانے کب آئے گی لیکن ہماری قیامت سر پر کھڑی ہے۔ کبوتر کا خطرہ بھانپ کر آنکھیں بند کر لینا اسے بچا نہیں سکتا۔ ہمیں آنکھیں ہی نہیں کان اور دماغ کے دریچے بھی کھولنے کی ضرورت ہے۔ نظریہ یا عقیدہ ہی نہیں اب تو عقل بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کائنات کے مالک کا دامن تھام لو۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کو اوڑھنا بچھونا بنا لو۔ یہی عمل طوفانِ نوح میں کشتی کا کام دے سکتا ہے، باقی سب کچھ غرق ہو جائے گا۔ لہٰذا ہمارا اوّلین فرض یہ ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عطا کردہ نظام کے نفاذ کے لیے سب سے پہلے پاکستان میں جدوجہد کریں۔

وزیراعظم پاکستان کا جنرل اسمبلی میں خطاب

پاکستان کے وزیراعظم محترم میاں نواز شریف اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب فرما چکے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ جو غیر جانبدارانہ سیاسی سوچ رکھتے ہیں اور حکومت سے بھی کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھتے وہ بھی تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے تو اختلاف نہیں ہے کہ تقریر میں بھرپور انداز میں کشمیر کا ذکر ہوا' لیکن اگر ہم اس تقریر کے الفاظ پر جانے کی بجائے اس حکومتی رویے پر باریک بینی سے نگاہ ڈالیں جو بحیثیت مجموعی حکومت خصوصاً وزیراعظم پاکستان نے بھارت کے حوالہ سے اپنایا ہوا ہے تو پھر تصویر کا بالکل دوسرا رخ نظر آتا ہے۔ ہمیں گفتار اور کردار کا واضح فرق نظر آیا ہے۔ اسی لیے ہم اس گفتگو کے صرف اُس مختصر سے حصہ کا ذکر کریں گے جس میں اُنہوں نے فرمایا کہ ''افغانستان میں فوجی آپریشن 15 سال سے ناکام ہے۔ آج بین الاقوامی برادری اتفاق کرتی ہے کہ اس ملک میں پائیدار امن کا واحد راستہ کابل میں حکومت اور افغان طالبان میں بات چیت میں ہے''۔ اگر وہ کابل حکومت کی بجائے امریکہ کا نام لے لیتے جسے حقیقت میں افغانستان میں عبرت ناک فوجی شکست ہوئی ہے تو اُن کی بات زیادہ حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ ہوتی۔ بہرحال جو کچھ اُنہوں نے کہا ہمارے نزدیک یہ بھی غیر متوقع تھا۔ جہاں تک تقریر میں کشمیر کا ذکر ہے اور بھرپور ذکر ہے' اِسے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ زبان کو دل و دماغ کی کس قدر تائید حاصل تھی۔

یہ وقت کا تقاضا تھا' یہ حالات کا جبر تھا۔ یہ زبان سے اُس وژن کا اظہار ہرگز ہرگز نہ تھا جس کی بنیاد پر قائداعظم نے کہا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ اگر کشمیر کا مسئلہ حقیقت میں اٹھانا مقصود ہوتا' اگر یہ حالات کے جبر اور وقت کے تقاضے کے ساتھ ساتھ اسٹیبلشمنٹ کے دھکے کا نتیجہ

نہ ہوتا' بلکہ ذہنی اور دلی طور پر اس مہم کو لے کر چلنے کی نیت یا خواہش ہوتی تو اڑھائی ماہ پہلے جب کشمیر میں عوامی تحریک برپا ہوئی تھی' پاکستان کا فارن آفس بھی ہوم ورک شروع کر دیتا۔ وزیراعظم نے امریکہ جانے سے کچھ روز پہلے پارلیمانی وفد کشمیر کا مسئلہ اجاگر کرنے کے لیے دنیا کے دورے پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے' وہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے یہ وفد تشکیل دیتے۔ پھر یہ کہ وفد کے ارکان کا چناؤ صاف ظاہر کرتا ہے کہ کچھ لوگوں کو سرکاری مال پر سیر سپاٹا کرانا مقصود ہے۔ حکومت کی اس غیر سنجیدگی اور نیم دلی سے مسئلہ اٹھانے کا اندازہ کیجئے کہ وفد کے ایک رکن کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ مقبوضہ کشمیر کی وزیراعلیٰ محترمہ محبوبہ مفتی ہیں۔ ملک بھر سے 15 یا 20 افراد کا ایک ایسا وفد جس کے ارکان کشمیر کی موجودہ صورت حال اور اس کے تاریخی پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوتے جنرل اسمبلی کے اجلاس سے ایک ماہ پہلے دنیا کا طوفانی دورہ کرتے' زخمی کشمیریوں کی تصویریں ساتھ لے کر جاتے' گیارہ سالہ ناصر شفیع کی چھروں سے چھلنی لاش کو دنیا بھر میں پھیلاتے۔ تمام سفارت کاروں کی ذمہ داری لگائی جاتی کہ وہ اپنی باقی تمام مصروفیات ترک کر کے کشمیر کی صورت حال کی وضاحت کو ترجیح دیں۔ وزیراعظم نے ایک بند کمرے میں جنرل سکریٹری اقوام متحدہ کو بھارتی فوج کے ظلم اور تشدد کی چند تصاویر دکھائی ہیں۔ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا! اگر یہ کام مذکورہ بالا وفد یا ہمارے سفارت کاروں نے کیا ہوتا تو پھر وزیراعظم کی تقریر کچھ نہ کچھ اثر ضرور دکھاتی۔

یاد رکھئے، دنیا میں کوئی بڑا اور مشکل کام مکمل ذہنی وابستگی اور دلی آمادگی کے بغیر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر قائداعظم نے سچ کہا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے تو پھر وطن کا درد رکھنے والے ہر شہری خصوصاً حکمرانوں کو جنونی انداز میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کے وزیراعظم کے لیے یہ ایسا مسئلہ ہوتا جسے حل کرنے کے لیے وہ شب و روز تگ و دو کر رہے ہوتے۔ ہم نے جو یہ عرض کیا ہے کہ وقت کے تقاضے' حالات کے جبر اور اسٹیبلشمنٹ کے دھکے نے وزیراعظم کو ایسی تقریر کرنے پر مجبور کیا وہ بلا دلیل اور غیر حقیقی نہیں ہے۔ موجودہ دور حکومت میں وزیراعظم نواز شریف کی کشمیر کے حوالے سے کارکردگی بلکہ طرز عمل ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

2013ء میں جنرل اسمبلی میں خطاب کے لیے نیویارک جاتے ہیں' کشمیر کا نام بھی نہیں لیتے۔ جس پر ملک کے سنجیدہ حلقوں کو اعتراض ہوا' اسٹیبلشمنٹ نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا' لیکن میاں صاحب نے رتی بھر اثر قبول نہ کیا' بلکہ کشمیریوں کی جان و مال اور عزت کے دشمن بھارت

کے لیے اُن کے منہ سے پھول جھڑتے رہے۔ اس سے پہلے بھارت کے وزیراعظم من موہن سنگھ کو اپنی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے چکے تھے' جو اُنہوں نے رد کر دی تھی' لیکن اس کے باوجود گجرات میں ہزاروں مسلمانوں کے قاتل مودی کی رسم تاج پوشی میں شرکت کے لیے بھاگم بھاگ دہلی پہنچے اور پاکستان کی تاریخ میں یہ واقعہ پہلی دفعہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے حریت کے وفد کو کہہ دیا گیا کہ پاکستان کے وزیراعظم آپ سے نہیں مل سکتے۔ البتہ وزیراعظم پاکستان نے بھارتی اداکاروں اور ایکٹرسوں سے ملاقات کا وقت نکال لیا۔ پھر یہ کہ پروٹوکول کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بیٹے حسین نواز کو ساتھ لے کر بھارت کے آئرن کنگ سے ملاقات کے لیے اُن کے گھر پہنچ گئے۔ ان صاحب کا افغانستان میں بھی لوہے کا کاروبار ہے۔ دروغ بر گردنِ راوی' شنید یہ ہے کہ شریف فیملی اُن کے کاروبار میں پارٹنر بن چکی ہے۔ واللہ اعلم!

2013ء ہی کے رمضان المبارک میں پاکستان کے بھارت میں ہائی کمشنر نے حریت رہنماؤں کو دہلی میں افطار پارٹی کی دعوت دے رکھی تھی' لیکن چند روز پہلے کسی بھارتی وزیر کا پاکستان کے دورے کا امکان پیدا ہوا' فوری طور پر افطار پارٹی منسوخ کر دی گئی' کہ کہیں یہ افطار پارٹی بھارتی وزیر کے ممکنہ دورہ میں حائل نہ ہو جائے۔ چند ایک حریت رہنما دہلی پہنچ چکے تھے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ افطار پارٹی منسوخ کر دی گئی ہے۔ کیا ایسی حکومت اور اُس کا سربراہ دل و جان سے کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے؟

2014ء میں دھرنے نے جنرل اسمبلی میں کشمیر کا ذکر کرنے پر مجبور کیا اور آج مقبوضہ کشمیر میں چلنے والی عوامی تحریک اور پاکستانیوں کے اس حوالہ سے جوش و خروش کی مجبوری ہے کہ جنرل اسمبلی میں اس نوع کی تقریر کی گئی ہے۔ بہرحال بھارت سے ذاتی اور تجارتی تعلقات نبھانے کے لیے اور اپنی فوج کو ٹھینگا دکھانے کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایسی ہی لیپا پوتی ہوتی رہے گی۔ اگر حکومت پاکستان اور اُس کے سربراہ کو حقیقت میں بھارت کو زچ کرنا اور اُس کی پاکستان دشمنی کو بے نقاب کرنا ہوتا تو جنرل اسمبلی میں کھل کر بلوچستان میں بھارتی مداخلت کاروں کی تخریب کاری اور دہشت گردی کا ذکر کیا جاتا۔ بنگلہ دیش میں مودی کی تقریر کا حوالہ دیا جاتا جس میں کھلم کھلا اعترافِ جرم کیا گیا تھا۔ کل بھوشن یادیو کی بلوچستان سے گرفتاری کا ذکر کیا جاتا۔ یاد رہے کہ پہلی

جنگ عظیم سے لے کر یعنی بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر آج اکیسویں صدی تک یہ جدید دنیا کی تاریخ کا انوکھا ترین واقعہ ہے کہ کسی ملک کی خفیہ ایجنسی کا حاضر سروس آفیسر دشمن ملک میں جاسوسی کرتا ہوا پکڑا جائے۔ آج تک وزیراعظم پاکستان نے اس ''محترم'' جاسوس کا ذکر تک نہیں کیا۔ بھارت سے کوئی گلہ شکوہ یا شکایت تک نہیں کی گئی' اُسے شرم دلانا تو بہت دور کی بات ہے۔ جبکہ کچھ عرصہ پہلے بلوچستان میں دہشت گردی کے کئی واقعات ہوئے اور ان میں قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اگر کل کلاں بلوچستان کی صورت حال بہت دگرگوں ہوتی ہے، تب بلوچستان کے حوالے سے رونا پیٹنا کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

آج ضرورت ہے کہ وہاں اچھی سیاسی قیادت لائی جائے جو امن وامان کے قیام کے لیے صحیح رخ پر جدوجہد کرے، جو گمراہ لوگ راہ راست پر آنے کو تیار ہوں اُن سے مذاکرات کیے جائیں اور جو بھارت کے کھلاڑی بن چکے ہیں اُن سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت کو ناممکن بنایا جائے۔

آخر میں ہم اپنے اس عزم کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے، جو ہمارے ایمان کا حصہ بن چکا ہے کہ اگر کشمیری یہ نعرہ لگاتے ہیں: ''پاکستان سے رشتہ کیا: لا الٰہ الا اللہ!'' تو پاکستان جب تک ''لا الٰہ الا اللہ'' کا عملی نمونہ نہیں بنتا یہ جوڑ کیسے لگے گا؟ البتہ یہ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پاکستان میں مکمل طور پر نافذ ہو جائے تو بھارت کسی صورت کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننے سے روک نہیں سکتا' بلکہ کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں آ گرے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی صورت میں پاکستان کے داخلی مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور پاکستان کی شہ رگ بھی بھارتی قبضہ سے آزاد ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!



ہماری قربانیاں

ندائے خلافت کا یہ شمارہ جب قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا تو عیدِ قرباں قریب ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ امتِ مسلمہ یہ دن ایک ایسے واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے مناتی ہے، جس کے بارے میں بلاخوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ انسانی تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے حیران کن اور عظیم ترین واقعات کی جب بھی کوئی فہرست بنائی جائے گی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل، یہ کارنامہ، یہ محیر العقل قدم کہ اپنے رب کے حکم پر، اُس کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے اپنے جواں سال بیٹے کی گردن پر چھری چلادی، یقیناً سرفہرست ہوگا۔ انسانی تاریخ کا یہ ایسا واقعہ ہے کہ ممتحن پکار اٹھا کہ بس بس تم کامیاب قرار پائے، تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ اللہ کے آخری نبی محمد مصطفٰے احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ نے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ قربانی کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔'' ستاسی سال کی عمر میں اولادِ نرینہ کی نعمت سے نوازے جانے والے باپ نے سو سال کی عمر میں اپنے 13 سالہ اکلوتے بیٹے کو اللہ کی راہ میں ذبح کرنے کے لیے زمین پر لٹادیا۔ انسانی فطرت کو سمجھتے ہوئے اور بیٹے کے لیے باپ کے جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی باپ کا اپنی جان کو قربان کردینا، خاص طور پر اس عمر میں، اپنے بیٹے کو قربان کردینے کی نسبت انتہائی کمتر درجہ کی قربانی ہے۔ حالانکہ ہزاروں سال میں انسان نے یہ جانا اور صحیح جانا کہ اپنی جان سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔

ہمیں یہاں قربانی کے مسائل اور فضائل بیان کرنا مقصود نہیں۔ صرف یہ عرض کردینا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر دو اور دو چار کی طرح واضح کررہا ہے کہ دنیا میں انسان کی عزیز ترین متاع بھی

اللہ کے حکم کے مقابلے میں سرے سے کوئی وقعت، کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ وہ اپنی آخری کتاب قرآن مجید فرقانِ حمید میں فرماتا ہے: ''اور ہم نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اپنی بندگی کے لیے۔'' انسان کا مقصدِ پیدائش ہی اللہ تعالیٰ کی بے چون و چرا اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ پھر یہ کہ جو کچھ دنیا میں ہمارے پاس ہے، وہ اُسی کا فضل ہے اور اُسی کا عطا کردہ ہے۔ گویا ہم اُسی کا دیا ہوا، اُسی کے حضور پیش کرتے ہیں اور وہ اپنی رحمت کے صدقے اسے ہماری طرف سے قربانی قرار دے دیتا ہے۔ لیکن آج اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت نے اس قربانی کو کیا بنا دیا ہے؟ حلال روزی کے شرعی تقاضوں کو بالائے طاق رکھو، جیسی چاہو حرام خوری کرو، دوسروں کے حقوق پر ڈاکے ڈالتے رہو، رشوت ستانی اور بلیک مارکیٹنگ کا بازار گرم رکھو، بے حیائی کا ارتکاب کرو اور پھر جو چاہو کرتے چلے جاؤ، لیکن عید پر لاکھوں روپے کی مالیت کا عظیم الجثہ جانور قربان کر دو اور پھر اُس سارے اجر و ثواب کا خود کو حقدار سمجھو جس کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں کیا گیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی آخری کتاب میں صاف صاف فرماتا ہے کہ جانور کا گوشت یا خون اُس تک نہیں پہنچتا بلکہ اصلاً تقویٰ درکار ہے۔ یعنی خلوص اور نیک نیتی سے کیا گیا عمل۔ ہم نے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر قربانی کے فلسفے کو سمجھنے اور جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ بچے قربانی کے جانوروں سے دل بہلاتے اور کھیل کود کرتے ہیں اور بڑے گوشت کھانے اور کھلانے کے علاوہ قربانی کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے۔ کوئی نفسانی خواہشات کو قربان کرنے کو تیار نہیں، کوئی اپنے حقوق کی قربانی کرنے کو تیار نہیں۔ کسی کو شریعت کے تقاضے پورے کرنے کی فکر نہیں۔ امیر غریب پر مسلط ہے اور اُس پر ظلم و ستم ڈھا رہا ہے اور غریب سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ وہ بھی امیر ہو جائے اور پھر جو کچھ ظلم اُس پر ہوتا رہا وہ اُس سے بھی بڑھ کر کرے۔

انفرادی سطح پر یہ کچھ ہو رہا ہے اور معاشرہ چونکہ افراد سے ہی تشکیل پاتا ہے لہٰذا معاشرے کے لیے الگ طور پر کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ حکمرانوں کا تصور یہ بن چکا ہے کہ حکومت ملنے کا مطلب عیش و عشرت کا حصول اور ملکی وسائل کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ اُنہیں نہ عوام کی صحت کی فکر ہے اور نہ تعلیم و تربیت سے مطلب ہے۔ حکومت دن رات کرسی بچانے کی فکر میں رہتی ہے اور اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے سیاست دان حکومت مخالف نت نئی تحریکیں اٹھانے کے علاوہ کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ ریاستی اداروں کی حالت مختلف نہیں۔ ہم اداروں کی کارکردگی پر کئی صفحات سیاہ

کر سکتے ہیں لیکن بقول سابق برطانوی وزیراعظم چرچل، انصاف کی فراہمی ریاستی سلامتی اور تحفظ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یعنی وہی ریاست سلامت اور محفوظ رہتی ہے جس میں عدل قائم ہو۔ لہٰذا ہم صرف اپنے عدالتی نظام کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہیں گے۔ اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ توہین عدالت کا عصا اژدھا بن کر ہمارے اس معصوم سے جریدے کو ہڑپ کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارا عدالتی نظام ہماری اشرافیہ کی چوکھٹ پر سربسجود رہتا ہے۔ یہ انصاف غریب کی رسائی سے کوسوں دور ہے۔ ہمارا قانون آنکھیں رکھتا ہے۔ یہ طاقتور کے سامنے کورنش بجالاتا ہے اور کمزور پر کوڑا بن کر برستا ہے۔ ہماری عدلیہ کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں۔ یہ عدالتی نظام وردی سے خوفزدہ ہو کر عوامی وزیراعظم کو پھانسی لگا دیتا ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ اِسے عدالتی قتل بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے اور کسی ''طاقتور شریف'' کے خلاف کسی صورت کچھ کرنے کو تیار نہیں ہوتا، چاہے لوٹ مار کی خبر معتبر عالمی اداروں کی طرف سے آئے۔ اسے کوئی توہین عدالت قرار دے یا تحسینِ عدالت، ہم نے قارئین کو تاریخ کی چیخ سنوائی ہے اور تاریخ کی چیخ و پکار کبھی نہیں رکتی، چاہے مائی لارڈ کتنے ہی زوردار انداز سے ہتھوڑا میز پر مارتے رہیں۔

نجی اور احتجاجی سطح پر اس پس منظر میں کہ دھن اور دھاندلی کا معاشرے میں تسلط ہو تو قربانی کے لیے مطلوب تقویٰ ناپید ہوگا اور اخلاص اور نیک نیتی کہاں سے آئے گی؟ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ کم از کم مسلم معاشرہ کبھی بھی ایسے صالح لوگوں سے مکمل طور پر خالی نہیں ہوتا جن سے اللہ راضی ہوتا ہے اور جو اللہ سے راضی ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان انگلیوں پر شمار کیے جانے والے صالحین نے ہی اس خستہ ریاست کو کندھا دے کر گرنے سے بچایا ہوا ہے۔ لیکن قوم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اتنے کم لوگ اتنی بڑی قوم کو سہارا دے کر کب تک کھڑا رکھ سکیں گے؟ مسلمانانِ پاکستان کو کچھ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ ان صالحین کے کندھے جواب دے جائیں۔ کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ قربانی کے جانور کی گردن پر چھری پھیرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ناجائز خواہشات پر بھی چھری چلائیں۔ اپنے نفس کو قابو کریں۔ پھر یہ کہ ذاتی طور پر اللہ اور رسول کی فرمانبرداری اختیار کریں اور اجتماعی سطح پر نظام عدل و قسط قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ اگرچہ بُرائی کو دل سے بُرا جاننا بھی کسی درجہ میں ایمان کی موجودگی کا ثبوت ہے، لیکن ہمارا قومی جسد جتنے خوفناک عوارض کا شکار ہو چکا ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سے آگے بڑھ کر کم از کم زبان

سے بُرائی کے خلاف جہاد شروع کریں۔ آج کا دور زبان درازی کا دور ہے۔ سیکولر میڈیا کی گز گز لمبی زبانیں بے خدائی اور بے حیائی کے بیج بو رہی ہیں۔ انہیں جواب دینا ہوگا، لیکن شائستگی کے ساتھ، حکمت کے ساتھ! اللہ رب العزت سے مدد طلب کرتے ہوئے، اس دعا کے ساتھ کہ جلد وہ وقت آئے کہ ہم اللہ اور دین کے دشمنوں کا ہاتھ سے مقابلہ کر سکیں۔ پھر وہ نظام قائم ہوگا جس میں اکثریت متقین کی ہوگی اور اُن کی قربانی اخلاص اور نیک نیتی کی بنیاد پر ہوگی، جسے اللہ تعالیٰ شرفِ قبولیت بخشے گا۔ ان شاء اللہ! ہماری مسلمانانِ پاکستان سے درخواست ہے کہ وہ جانوروں کی قربانی ضرور کریں کہ یہ ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظیم سنت ہے، یہ ربّ ذوالجلال کے پاک اور مقدس گھر کے معمار کی سنت ہے، یہ اُس عظیم ہستی کی سنت ہے جس کے پاک وجود نے آتش کدہ کو گلشن بنا دیا، لیکن یاد رکھیں کہ تقویٰ یعنی عمل صالح اور نیک نیتی قربانی کی بنیادی شرط ہے۔ اللہ ربّ العزت ہماری صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائے اور ہماری قربانیاں قبول فرمائے۔ آمین!



غلامی کی زنجیر توڑ ڈالیں

انگریز کی غلامی کا پٹہ اُتارے پون صدی بیت گئی مگر نہ جانے کونسی ایسی غیر مرئی رسی ہے جو اب تک ہماری گردنوں کو شکنجے میں جکڑے بحیثیت آزاد قوم آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے روک رہی ہے؟ کیا مجال ہے کہ ایک قدم بھی مغرب اور امریکہ کی مرضی کے بغیر اُٹھتا ہو، کوئی پالیسی، کوئی حکمت عملی اور کوئی لائحہ عمل ایسا نہیں ہے جو امریکہ اور مغرب کی آشیر باد کے بغیر طے پاتا ہو۔ امریکہ، مغرب اور بھارت کو خوش کرنے کے لیے ہم نے اپنے گھر کو جہنم بنا ڈالا، ہر گلی کوچے میں آگ لگا دی، اپنے ہی گھر کے افراد کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا۔ اپنے گھروں پر ڈرون حملے کروائے اور نہتے بچوں، عورتوں اور بے گناہ لوگوں کے پرخچے اُڑا دیئے۔ جو باقی بچے تھے ان کو گھروں سے بے گھر کر کے بے آسرا و بے سہارا چھوڑ دیا۔ غیروں کو خوش کرتے کرتے اپنوں ہی کو ناراض کر بیٹھے اور نتیجہ میں اپنے ہی گھر کو آگ لگا بیٹھے۔ مگر غیر ہیں کہ خوش ہونے کی بجائے ہمارے گھر کی مزید تباہی کا مژدہ سناتے ہیں۔ چنانچہ امریکی صدر باراک اوباما اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ''پاکستان کئی دہائیوں تک غیر مستحکم رہے گا نیز یہ کہ (پاکستان کی بجائے) انڈیا ان کا فطری اتحادی ہے''۔

یاد رہے کہ نائن الیون کے بعد جب سے پاکستان کو اس جنگ میں دھکیلا گیا ہے، اس طرح کے کئی بیان امریکی و بھارتی اعلیٰ عہدیداران کی جانب سے سامنے آتے رہے ہیں جن میں واضح اشارہ موجود تھا کہ پاکستان کی اس قدر قربانیوں کے باوجود امریکہ کو انڈیا سے اتنا ''عشق'' کیوں ہے؟ ان اشاروں کی روشنی میں ہمارے پالیسی سازوں اور اعلیٰ دماغوں (اگر کہیں وجود ہے) کو بہت پہلے جان لینا چاہیے تھا کہ بھارت امریکہ کا فطری اتحادی کیوں اور کیسے ہے؟ نیز یہ کہ اس''

فطری اتحاد'' کا مقصد کیا ہے؟ خاص طور پر جب 2010ء میں RAW کی کچھ دستاویزات CIT-X operations کے حوالے سے منظر عام پر آئی تھیں کہ کس طرح بھارت، اسرائیل اور امریکہ کی انٹیلی جنس ایجنسیاں (را، موساد اور CIA) مل کر پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے لیے مصروف عمل ہیں، اس وقت ہماری آنکھیں کھل جانی چاہیے تھیں۔ دستاویز کے مطابق ان کے طریقہ کار کے پیچھے فلسفہ یہ تھا کہ بھارت پاکستان کو امن کے لیے بات چیت میں الجھائے رکھے جبکہ RAW کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھے۔ اس گھناؤنے شیطانی منصوبے (بغل میں چھری منہ میں رام رام) کو CIT-X (Counter Intelligence Team-x) operations کا نام دیا گیا۔ واجپائی دور حکومت میں اس طرز کی بھارتی ایجنسیوں کو عام اجازت تھی کہ وہ پاکستان میں کارروائیوں کے لیے Agents بھرتی کریں۔ اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لئے پوری دنیا سے جرائم پیشہ افراد کا انتخاب کیا گیا جن میں افغان بھی شامل تھے۔ اسرائیلی اور بھارتی ایجنسیوں نے بین الاقوامی ڈرگ مافیا کے لوگوں کو بھی ساتھ ملایا ہوا تھا۔ اسی ڈرگ مافیا سے CIT-X کے لیے فنڈنگ حکومتی سرپرستی میں حاصل کی جاتی تھی۔ اس کام کے لیے بھارتی وزارت داخلہ میں ایک خفیہ سیل قائم کیا گیا اور اس کے تحت سرمایہ اکٹھا کرنے کے لیے ہماچل پردیش، اروناچل پردیش، میزورام اور اتر پردیش میں غیر قانونی پوست کی کاشت کی جاتی تھی۔ بھارت کے ڈرگ مافیا کے لوگوں کے افغان ڈرگ مافیا کے ساتھ گہرے روابط تھے اور مل کر کام کرتے تھے اور دونوں ملکوں کی ایجنسیاں ان کو مانیٹر کرتی تھیں۔ منصوبے کے تحت مقبوضہ کشمیر، مشرقی پنجاب، اتر پردیش، راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور آسام میں 57 ٹریننگ کیمپس قائم کیے گئے جہاں سے Agents کو ٹریننگ دے کر پاکستان میں داخل کیا جاتا تھا۔ پاکستان کے اندر مختلف گروپس جو پاکستان کے خلاف کام کر رہے تھے۔ انہیں بھی بھاری معاوضہ دے کر ساتھ شامل کیا گیا۔ اس آپریشن کو کامیاب بنانے کے لئے Diplomatic Cover کا بھی سہارا لیا گیا۔ بھارت کے لندن، دبئی، ایران اور جنوبی افریقہ میں قائم RAW سینٹرز نے موساد کے ساتھ مل کر پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے لیے پورے پاکستان کے اردگرد جال بچھایا ہوا تھا۔

2010ء میں منظر عام پر آنے والی اس رپورٹ کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس سارے

عرصہ میں جس طرح بھارت نے ایک طرف بات چیت کا ڈھونگ رچائے رکھا اور دوسری طرف پاکستان میں قتل و غارت گری کا جو بازار گرم رہا وہ اس رپورٹ کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔ یہ ساری صورت حال سامنے آجانے کے باوجود بھی، حالانکہ پاکستان میں ''را'' کی دہشت گردی کے ثبوت بھی اکٹھے کیے گئے، مگر کیا مجال ہے کہ ہمارے حکمرانوں کی امریکہ و بھارت کے حوالے سے پالیسیوں میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہو۔ بلکہ بدستور امریکہ و بھارت کے ساتھ دوستی، تجارت اور عشق و محبت کی پینگیں بڑھانے کے لیے ہمارے حکمران بے تاب رہے۔ مودی کی پاکستان آمد پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے، لبرل، سیکولر اور امن کی آشا کے پجاری طبقہ کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بھول گئے کہ مکار بنیئے کے منہ میں جب رام رام ہو تو بغل میں چھری ضرور ہوتی ہے اور یہی ہوا کہ فوراً بعد پٹھانکوٹ ائیربیس سے پاکستان کی پیٹھ میں خنجر اُتار دیا گیا اور ایک بار پھر ممبئی حملوں کے طرز پر دہشت گردی کا لیبل لگا کر پاکستان کو عالمی سطح پر تنہا کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ دوسری طرف ہمارے پالیسی سازوں کو جن پتوں پر تکیہ تھا وہی ہوا دینے لگے۔ ہمارے حکمرانوں اور نام نہاد دانشوروں کو توقع تھی کہ ''را'' کی دہشت گردی کے ثبوت اقوام متحدہ اور امریکہ کو دینے پر امریکہ پاکستان کے احسانات کا لحاظ کرتے ہوئے انڈیا کے خلاف ردعمل ظاہر کرے گا۔ بجائے اس کے اسٹیٹ آف دی یونین ایڈریس میں نہ صرف انڈیا کو فطری اتحادی قرار دیا گیا بلکہ پاکستان کو مزید عدم استحکام سے دوچار ہونے کا مژدہ جانفزا بھی سنا دیا گیا جو اس بات کا واضح اعلان ہے کہ پاکستان کے خلاف CIT-X operations جیسا شیطانی کھیل جاری رہے گا اور انڈیا اس میں اپنا ''فطری'' کردار ادا کرتا رہے گا۔ یعنی انڈیا کا Diplomatic Cover پاکستانی قیادت کو مذاکرات کے جھانسے میں الجھائے رکھے گا اور بھارتی ایجنسیاں گھناؤنا کھیل کھیلتی رہیں گی۔ مودی کی یوٹرن Diplomacy، پٹھانکوٹ ڈرامے سے از سر نو جواز پیدا کرنا اور باچا خان یونیورسٹی پر حملہ، یہ سب حالات اور واقعات اسی بات کے غماز ہیں۔ چنانچہ پاکستان کے جو دانشور مودی کی پاکستان آمد کو نیک شگون اور امن اور مسائل کے حل میں اہم پیش رفت قرار دے رہے تھے، وہ بھی اب پاکستان کو اسی پوزیشن پر دیکھ رہے ہیں جہاں 26 نومبر 2008ء کے ممبئی حملوں کے بعد کھڑا تھا، جب مذاکرات کو دہشت گردی کے خاتمے اور حافظ سعید کی حوالگی سے مشروط کیا جا رہا تھا۔ اب بھی انڈیا کی جانب سے ایسے ہی مطالبات سامنے آرہے ہیں۔ گویا اس قدر قربانیاں دینے اور دہشت

گردی کے خلاف طویل جنگ لڑنے کے باوجود پاکستان عالمی سطح پر تنہا کھڑا ہے۔ دوسری طرف جن کی خوشنودی کے لیے اپنوں کو ناراض کیا گیا وہی گلشن کی بربادی کی خبر دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہے کہ

نہ خدا ہی ملا ، نہ وصالِ صنم

نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

یہ تلخ سبق حاصل ہونے کے بعد ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم قومی سطح پر غور وفکر کے بعد ماضی اور تاریخ کو مدنظر رکھتے ہوئے، اپنے دوست دشمن کو پہچان کر، خالصتاً قومی بنیادوں پر ایسی پالیسیاں مرتب کرتے جو اپنے گھر کی مضبوطی اور استحکام کا باعث بنیں، جن سے قومی سطح پر ہم آہنگی و یکجہتی کی فضا پیدا ہو، ملک امن وسلامتی کا گہوارہ بنے اور قوم ترقی وخوشحالی کی جانب آگے بڑھ سکے ۔ بجائے اس کے ہماری حالت یہ ہے کہ ہم آج بھی مغرب کے کھونٹے کے ساتھ بندھے ہیں اور اُسی کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں۔ امریکہ، مغرب اور بھارت کی خوشنودی کے لیے اپنے مذہبی طبقہ کے خلاف گھیرا تنگ کیا جارہا ہے، مدارس پر چھاپے اور علماء کو حراساں کرنا، پکڑ دھکڑ اور مذہبی جکڑ بندیاں، یہ سب کچھ غیروں کو خوش کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ موجودہ دور میں مسلم ممالک میں انتشار پیدا کرنے کے لیے یہی مغرب کا سب سے بڑا حربہ ہے جبکہ ہماری عقلوں پر ایسا پردہ پڑ گیا ہے کہ ہم اپنی نفسیاتی غلامی کو کبھی لبرل ازم سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی اسے روشن خیالی کا نام دیتے ہیں ۔ چنانچہ آج ہم اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں ہر طرف انتشار ہی انتشار ہے اور یہ صرف غیروں کی خوشنودی کے لیے بنائی گئی پالیسیوں کا نتیجہ ہے۔ جب تک امریکہ بہادر کی مرضی تھی ہم نے سرکاری سطح پر جہاد کو مقدس بنائے رکھا، لیکن جب مغرب اور امریکہ کے تیور بدلے تو ہم نے اسی جہاد کو دہشت گردی قرار دے دیا اور اس کے نام پر اپنے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر امریکہ کے حوالے کیا۔ 68 سال میں ہم اللہ سے وعدے اور آئینی مطالبے کے باوجود اپنے ملک میں اسلام کا ایک جز بھی نافذ نہ کرسکے مگر جب امریکہ کی خواہش تھی تو ریمنڈ ڈیوس کی گردن چھڑانے کے لیے اسلام کے اصول دیت کا سہارا لے لیا۔ ایک جرنیل نے امریکہ کی خوشنودی کے لیے نظام مصطفیٰ کے نعرے کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا، دوسرا آیا تو امریکی آشیر باد سے یکسر مختلف سمت میں چلتے ہوئے نظام مصطفیٰ کو شدت پسندی قرار دے دیا اور روشن خیالی سرکاری مذہب قرار پایا۔

یہ تو عسکری قیادت کی امریکہ نواز اور مغرب نواز پالیسیوں کا حال تھا، جو کچھ جمہوریت کے

نام پر سیاستدانوں نے گل کھلائے ان کا چرچہ بھی صولت مرزا کے بعد عزیر بلوچ کے انکشافات کی صورت میں پوری قوم کے سامنے ہے کہ کس طرح لیاری گینگ وار کو ایک سابق وزیر داخلہ کے کہنے پر پیپلز امن کمیٹی کا نام دیا گیا اور اسی وزیر کے کہنے پر ہزاروں لوگوں کا قتل عام کیا گیا۔ سرکاری سرپرستی میں بھتہ خوری اور اغوا برائے تاوان کی وارداتیں کرائی گئیں۔ جوئے کے اڈوں سے حاصل ہونے والی آمدنی پولیس افسران اور حکومتی شخصیات کو پہنچتی رہی، نیز لیاری گینگ وار کے کارندے وارداتوں کے لئے پولیس کی گاڑیاں بھی استعمال کرتے رہے۔ لسانی بنیاد پر اغوا کیے جانے والے مغویوں کی لاشیں کس کی گاڑی میں ٹھکانے لگائی جاتی تھیں۔ زمینوں پر قبضہ کے لیے وزیروں نے کس طرح لوگوں کو قتل کرایا۔ سب سے اہم انکشاف یہ بھی کہ اسی لیاری گینگ وار کو سیاسی سرپرستی میں نیٹو کا اسلحہ فراہم کیا گیا جس کی ترسیل سرکاری گاڑیوں میں اہم سیاسی راہنما وں نے کی۔ اس اسلحہ کو اہم سیاسی راہنماؤں نے قبضوں، ٹارگٹ کلنگ اور دیگر جرائم کے لیے استعمال کیا۔ اس انکشاف کے بعد یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ نیٹو کے اسلحہ بردار کنٹینر جو غائب ہوئے تھے وہ کہاں گئے؟

اپنی نسل کی بقاء اور تحفظ ہر ایک کو عزیز ہے۔ لیکن اس ملک کے جرنیلوں سے لے کر سیاستدانوں اور حکمرانوں تک سب غیروں کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں، سب غیروں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، فوجی حکومتوں کی پالیسیاں بھی دشمن نواز ہیں اور جمہوریت میں بھی دھوکا ہے۔ جان، مال، عزت، آبرو کچھ بھی محفوظ نہیں ہے تو عدم تحفظ کا یہی احساس متبال نظام اور تحفظ کی راہیں تلاش کرنے پر عوام کو مجبور کرتا ہے اور اسی مجبوری سے دہشت گرد نیٹ ورک فائدہ اُٹھاتے ہیں اور ملک میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔

اگر ہم نے لوگوں کو دہشت گرد گروپوں کے ہتھے چڑھنے سے روکنا ہے، اگر ہم نے ترقی کرنی ہے اور آگے بڑھنا ہے تو اس کے لیے پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ خود کو امریکہ و مغرب کی نفسیاتی غلامی سے آزاد کرنا ہوگا اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے قومی مفادات سے ہم آہنگ آزاد فیصلے کرنے ہوں گے اور اپنے گھر کو سنوارنے کے لیے گھر کے مکینوں کے جذبات، احساسات اور امنگوں کے مطابق ریاست کا بیانیہ اور پالیسیاں ترتیب دینی ہوں گی۔ عوام کی جان، مال اور عزت کے تحفظ کو یقینی بنانا ہوگا۔ لوگوں کو ان کے حقوق دینے ہوں گے۔ اگر اس ملک میں

اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے اور اس ملک کا وزیر اعظم ہندوؤں کی مذہبی رسوم میں شریک ہو کر ان کی حوصلہ افزائی کر سکتا ہے تو اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں مسلمان اکثریت کی مذہبی آزادی سوالیہ نشان کیوں بنائی جا رہی ہے؟ اگر جمہوری انداز سے دیکھا جائے تو بھی اس ملک میں اکثریت کی مرضی کے مطابق پالیسیاں بننی چاہئیں۔ اکثریت کا مینڈیٹ حاصل کر کے فیصلے بیرونی ڈکٹیشن پر کرنا جمہوری تقاضوں کے بھی خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی معاشرت کا قیام پاکستان کے مسلمانوں کا آئینی حق ہے۔ اگر انہیں یہ حق نہیں دیا جا رہا تو اس میں قصور کس کا ہے؟ اور انہیں کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ غیروں کو خوش کرنے کے لیے ہم نے اپنے گھر کو بگاڑا ہے۔ لہٰذا اب اپنے گھر کو سنوارنے کے لیے غیروں کی ناراضگی سہنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا اور اپنا گھر درست کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم غلامی کی اُس زنجیر کو، جس سے سفید سامراج نے ہماری گردنوں کو جکڑا ہوا ہے، توڑ ڈالیں تاکہ ہم آزاد ذہن سے ایسے فیصلے کر سکیں جو قومی اور ملی مفادات سے ہم آہنگ ہوں۔



زمینی حقائق

''نیپالی قوم نے بھارتی چالبازوں کے سامنے قومی خودمختاری کا ڈٹ کر دفاع کیا۔ 20 ستمبر 2015ء کو شروع ہونے والا محاصرہ بالآخر 12 فروری 2016ء کو ٹوٹ گیا۔ مودی اور اس کے حواریوں کا نیپالی آئین میں من پسند 7 ترامیم کرانے کا خواب ادھورا رہ گیا۔ کھٹمنڈو میں بھارتی ہائی کمشنر رنجیت رائے کو وائسرائے بنانے کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔ نیپالی وزیر خارجہ کمال تھاپا نے سفارتی محاذ پر بھارتی چالبازوں کو خاک چٹادی۔ کاش ہمارے پاس بھی کوئی کمال تھاپا ہوتا، کیا عجب ستم ظریفی ہے کہ ہمارا تو کوئی وزیر خارجہ ہی نہیں۔ نیپالی وزیراعظم کھادگا پرشاد شرما اولی نے محاصرہ کے دوران یرغمالی وزیراعظم کے طور پر بھارت کا دورہ کرنے سے انکار کر کے باور کرایا تھا کہ پہلے محاصرہ غیر مشروط ختم ہوگا۔ طویل محاصرہ کے دوران ایک طرف ہڈیوں کا گودا جما دینے والی سخت سردی اور دوسری طرف ایندھن کی عدم دستیابی نیپالی قوم کے لیے سب سے بڑا امتحان تھی لیکن ساری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر مکروہ بھارتی عزائم کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ہماری قوم کے لیے نیپال کے 135 دن جاری رہنے والے محاصرہ میں کئی سبق موجود ہیں کہ تمام تر زمینی حقائق، خشکی سے گھرے ہوئے نیپال کے خلاف تھے۔ تباہ کن زلزلے کی وجہ سے چین کے ساتھ تمام زمینی راستے اور ذرائع آمدورفت ختم ہو چکے تھے، بھارت نے ناکہ بندی کر کے دنیا سے رابطے کا واحد راستہ بھی بند کر دیا تھا۔ پٹرول ختم ہونے کے بعد فضائی رابطہ بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ جان بچانے کی ادویات ختم ہو چکی

تھیں، تعلیمی ادارے بند ہو چکے تھے، ٹریفک ناپید ہوتی جا رہی تھی، نیپال پتھر کے دور میں واپس جا چکا تھا لیکن اذیت کے اس اعصاب شکن سفر میں بھی بھارتی نیتاؤں کو کھٹمنڈو میں ایک بھی ایسا دانشمند نہ مل سکا جو نیپالی قوم کو زمینی حقائق کے سامنے سر جھکانے کا مشورہ دینے کی جرأت کر سکتا کہ قومی عزت و افتخار پر سودے بازی کا کھٹمنڈو میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ اسلام آباد نہیں تھا جہاں پر ایرا غیرا، نتھو خیرا زمینی حقائق کے نام پر امن کے سہانے سپنے دکھا کر ہمیں یک طرفہ ذہنی شکست پر آمادہ کر رہا ہے۔"

مندرجہ بالا تحریر ایکسپریس اخبار میں اسلم خان صاحب کے شائع ہونے والے ایک کالم سے لیا گیا اقتباس ہے۔ پاکستان میں اُن لوگوں کو انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے جن کے علم میں ہو کہ گزشتہ ساڑھے چار ماہ سے نیپال کن حالات سے گزر رہا تھا اور بھارت امریکہ کی پشت پناہی سے خطے میں کیسا گھناؤنا کھیل کھیل رہا تھا۔ علاوہ ازیں بھارت کا اپنے پڑوسیوں سے عمومی رویہ کیسا ہے؟ فرض کیجیے، خدانخواستہ پاکستان اپنے کسی کمزور ہمسائے سے یہ سلوک کر رہا ہوتا تو بھارت دنیا میں کس قدر واویلا مچاتا اور عالمی سطح پر پاکستان کو مجرم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کر چکا ہوتا۔ اِس کے برعکس پاکستان کی وزارت خارجہ کے ترجمان نے اس عرصہ میں نیپال کا نام لینے کی بھی جرأت نہ کی چہ جائیکہ بھارت کے اس ظلم کا پردہ چاک کیا جاتا، ہمارا وہ الیکٹرانک میڈیا بھی اس حوالہ سے گونگا بہرہ ہو گیا جو بھارت میں پٹاخہ چل جانے پر اُن دانشوروں کے "بالاگ" تبصرے دنیا کو سنانا شروع کر دیتا ہے جس میں اول و آخر قوم کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ ہمیں اپنا گھر درست کرنا ہوگا۔ ہم دنیا میں تنہا نہیں رہ سکتے، ہمیں زمینی حقائق کا ادراک کرنا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ یہ زمینی حقائق سب سے پہلے اُس وقت ہماری جان کا وبال بنے تھے جب نائن الیون کے مبینہ سانحہ کے بعد امریکہ نے افغانستان پر حملہ کرتے ہوئے ہمیں کہا تھا: you are with us or against us یعنی آپ ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے مخالفین میں سے ہیں اور ہم نے ہمسائیگی کے ساتھ ساتھ سیاسی، سفارتی، قانونی اور اخلاقی آداب اور انصاف کے تقاضے سب کچھ بالائے طاق رکھتے ہوئے کمزور کے مقابلے میں طاقتور اور بالادست کا ساتھ دیا اور زمینی حقیقت کیا سامنے آئی۔ سب سے پہلے پاکستان، عقل اور مادیت کے پرستار آج بھی یہ کہتے ہیں کیا ہم امریکہ کے خلاف جنگ کرتے؟

جنگ میں کودنے کا حمایتی کوئی بھی نہیں لیکن غیر جانبدار رہا جا سکتا تھا۔ دنیا کے سامنے اپنا موقف پیش کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً دنیا حقائق و دلائل پر مبنی موقف قبول کرتی۔ بہر حال طاقتور امریکہ کمزور اور اور ناتواں طالبانِ افغانستان کی حکومت ختم کرنے میں تو کامیاب ہوا لیکن پندرہ سال تک اسی چٹان سے سر پٹخنے کے بعد اُن ہی طالبانِ افغانستان سے مذاکرات کی بھیک مانگ رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے اللہ رب العزت پر بھروسا کرتے ہوئے طاغوتی قوتوں کے پیدا کردہ زمینی حقائق کو ٹھکرانے کا جبکہ پاکستان جس نے امریکہ کا ہاتھ تھام کر یہ سمجھا تھا کہ فرعون دنیا کے سائے تلے معاشی ترقی ہو گی، کشمیر جھولی میں آ گرے گا، ایٹمی اثاثہ جات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گے لیکن آج کی زمینی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو سلامتی کے لالے پڑے ہیں، کشمیر کو دور سے بھی دیکھنے پر بھارت کو اعتراض ہے۔ معاشی طور پر دیوالیہ ہوا چاہتے ہیں۔ ایٹمی اثاثہ جات دشمن کے نشانے پر ہیں۔ نائن الیون کے موقع پر فوجی حکومت پاکستان پر مسلط تھی لہٰذا وہ زمینی حقائق کو چاٹتی چاٹتی امریکہ کے سامنے زمین ہی کی طرح بچھ گئی۔

آج ایک سول حکومت ہمارا مقدر ہے اور وہ امریکہ چھوڑ بھارت کے سامنے بچھی جا رہی ہے۔ پٹھانکوٹ کے ائربیس پر دہشت گردوں نے حملہ کیا، ایسے شواہد سامنے آ رہے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی ریاست سے ناراض عناصر اس میں ملوث ہیں لیکن بھارتی میڈیا یہ پکا راگ الاپ رہا ہے کہ اس میں پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔ کوئی ٹھوس ثبوت فراہم نہیں کیے گئے۔ جو ٹیلی فون نمبرز دیئے گئے تھے جعلی نکلے۔ دہشت گردوں کی لاشیں دکھانے کا کہا گیا تو جواب ملا کہ جل کرنا قابل شناخت ہو چکی ہیں۔ پھر بھی ہماری سول حکومت نے زمینی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے گوجرانوالہ میں FIR نامعلوم افراد کے خلاف درج کر لی ہے جبکہ بھارتی سیکورٹی فورس (BSF) کے ذمہ داران چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اُس روز سرحد عبور کرنے کا کوئی واقعہ ہی پیش نہیں آیا۔ جونہی پاکستان میں FIR درج کی گئی بھارت کی طرف سے domore کا مطالبہ سامنے آ گیا۔

تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بھارت کا یہ مطالبہ بھی سامنا آیا ہے کہ اُسے افغانستان سے تجارت کے لیے راہداری دی جائے۔ تاریخ گواہ ہے کہ غیر ممالک کو تجارتی سہولتیں اور راہداریاں دینا اکثر اوقات بہت مہنگا پڑتا ہے۔ بھارت جیسے ازلی دشمن سے ہم کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ شنید یہ ہے کہ یہی وہ اصل تنازعہ ہے جو موجودہ عسکری قیادت اور سول قیادت میں کشیدگی کا

باعث بنا ہوا ہے۔

بہر حال ہمارا موضوع زمینی حقائق کے ادراک کا ہے۔ ہم ہرگز ہرگز یہ سوچ نہیں رکھتے کہ زمینی حقائق کو یکسر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ دینی اور دنیوی دونوں لحاظ سے زمینی حقائق اہم ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ قوم کی عزت و وقار اور دینی غیرت و حمیت پر رتی بھر حرف آئے بغیر اگر زمینی حقائق کا اعتراف اور ادراک کیا جائے اور اُن کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ اپنے معاملات نبٹاتے ہیں تو ہر فہیم اور ذی شعور انسان کے لیے یہ قابل قبول ہوگا۔ یعنی یہ کہ کسی ہدف کے حصول کے لیے اپنی دینی بنیادوں پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی دنیوی اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے اگر زمینی حقائق کو بنیاد بنا کر آپ کوئی تبدیلی یا ترمیم کرتے ہیں تو اس میں قطعی طور پر کوئی حرج یا نقصان نہیں لیکن کسی قوت سے مرعوب اور خوفزدہ ہو کر یا کسی دنیوی طمع اور لالچ میں اگر عزت و وقار اور غیرت و حمیت کی بولی لگنے پر ہدف ہی سے رخ موڑ لیا جائے یا ہدف کے حصول میں ایسا لائحہ عمل اختیار کر لیا جائے جو دینی غیرت سے لگا نہ کھاتا ہو یا عدل و انصاف کے تقاضوں سے متصادم ہو تو ایسے زمینی حقائق کو قبول کرنے سے سرے سے انکار کر دینا چاہیے اگرچہ اس کی ظاہری قیمت کتنی ہی کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔

ضیاء الحق کے دور میں اسرائیل کی طرف سے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کی اطلاعات آئیں۔ اُس وقت پاکستان کے پاس ایسے میزائل نہیں تھے کہ وہ اسرائیل کے خلاف جوابی کارروائی کر سکے۔ تو ضیاء الحق نے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ہمارا اصل دشمن بھارت ہے۔ اگر دنیا کے کسی بھی حصے سے ہمارے خلاف ایکشن ہوا تو ہم اس کا جواب بھارت کو دیں گے اس لیے کہ بھارت کی مدد کے بغیر پاکستان پر حملہ اسرائیل کے لیے ممکن نہ تھا۔ یہی بات امریکہ کو اُس وقت کہی جا سکتی تھی اگر وہ طالبان کے خلاف جنگ میں غیر جانبدار رہنے کی صورت میں بھی پاکستان کو دھمکی لگاتا کہ وہ یہ مدد بھارت سے حاصل کر لے گا اور پاکستان کو پتھر کے دور میں پہنچا دیا جائے گا۔ حقیقت میں بدقسمتی سے ہمارے حکمران اپنے اقتدار کے لالچ میں ملکی مفاد کے خلاف کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ زمینی حقائق یقیناً مشکلات پیدا کر رہے ہوتے ہیں لیکن اُنہیں موافق بنانے کے لیے عزم صمیم کی اور حق پر مبنی اپنے موقف پر ڈٹ جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ یقیناً اُن کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔



مودی کو جواب دیں، وگرنہ.....

کل کی بات ہے کہ آرمی پبلک سکول پشاور کے حادثے نے قوم کو متحد کر دیا۔ عمران خان کنٹینر سے نیچے اُتر کر نواز شریف کے ساتھ ایک میز پر بیٹھ گئے۔ سیاسی جماعتیں چاہے اُن کا تعلق حکومت سے تھا یا اپوزیشن سے سب عسکری قیادت کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ آج جب قوم کوئٹہ کے حادثہ سے دوچار ہوئی ہے تو بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں۔ سب سے پہلے حکومتی اتحادیوں نے قومی اسمبلی میں یہ کہہ کر فوج کے خلاف طوفان اٹھا دیا کہ جو ایجنسیاں گدلے پانی سے سوئی ڈھونڈ نکالتی ہیں وہ 12 گلیوں کے شہر کوئٹہ میں دہشت گرد نہیں پکڑ سکتیں۔ یہاں تک کہ نظریاتی کونسل کے چیئرمین جنہیں ایسے معاملات میں بہت کم دخیل ہونا چاہیے، اُنہوں نے فوج کو خوب لتاڑا۔ فوج نے بھی جوابی کارروائی کرتے ہوئے یہ کہہ ڈالا کہ فوج کو تو ضرب عضب میں شاندار کامیابیاں مل رہی ہیں۔ سول انتظامیہ کی کارکردگی چونکہ انتہائی مایوس کن ہے لہٰذا ان کامیابیوں کے ثمرات عوام تک نہیں پہنچ پا رہے۔ علاوہ ازیں حکومت اور اپوزیشن میں موجود تناؤ اور کشیدگی میں بھی اضافہ ہوا۔ ایسا کیوں ہوا کہ ایک حادثہ نے اتحاد اور دوسرے نے انتشار پیدا کر دیا ہماری رائے میں اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد کی بنیاد مثبت نہ تھی بلکہ منفی تھی۔ دہشت گردی ختم کرنا، اسے ثانوی حیثیت حاصل تھی جبکہ ریاست کے ایک ستون کا دوسرے ستون کو نیچا دکھانے کو اولیت حاصل تھی۔ ملکی حالات کو درست کرنے کی کوشش کندھے سے کندھا ملا کر نہیں ہو رہی بلکہ دوسرے کو کندھا مار کر ہو رہی ہے۔ ایسے میں کیسا اتحاد اور کیسی کامیابی؟ حقیقت میں ہاتھیوں کی اس جنگ میں گھاس بُری طرح مسلی جا رہی ہے۔ عوام اور عوامی مسائل سے نہ حکومت کو کوئی تعلق ہے نہ حزبِ اختلاف اس پر کوئی بات کرنے کو تیار ہے۔

اس افتراق و انتشار نے ہمیں خارجی سطح پر بھی زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ بھارت اور اُس کا وزیراعظم مودی کشمیر میں تحریک آزادی کو دبانے کی کوشش میں کشمیریوں پر جو ظلم وستم ڈھا رہا تھا اور اُس وجہ سے دنیا بھر میں بدنام ہو رہا تھا اُسے موقع مل گیا کہ وہ دنیا کی توجہ اپنی طرف سے ہٹا کر پاکستان کی طرف پھیر دے۔ یہاں یہ نکتہ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ نریندر مودی نے یہ رویہ کوئٹہ میں ہونے والی دہشت گردی کے فوری بعد اختیار نہیں کیا بلکہ کوئٹہ سانحہ کے حوالہ سے پاکستان میں جب ایک دوسرے پر زبان سے گولا باری شروع ہوئی یعنی باہم الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع ہوا تب نریندر مودی کو جرأت ہوئی اور اُس نے تمام سفارتی اداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بلکہ اقوام متحدہ کے طے شدہ پروٹوکولز کو پاؤں تلے روندتے ہوئے بلوچستان اور کراچی کے حوالہ سے ہرزہ سرائی شروع کر دی اور ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو واضح طور پر دوسری آزاد ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے۔ اُس نے دنیا کو یہ بتانا چاہا کہ جو کچھ کشمیر میں ہو رہا ہے وہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ بلوچستان میں بھی یہی کچھ بلکہ اس سے بڑھ کر ہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں پاکستان کی طرف سے نہ حکومت نہ اپوزیشن کسی نے اُسے جواب نہیں دیا۔ جبکہ مودی کو دندان شکن جواب دیا جا سکتا تھا۔ مقبوضہ کشمیر اور بلوچستان کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے بات کرنا غلط ہی نہیں بددیانتی پر بھی مبنی ہے۔ بلوچستان میں وقفہ وقفہ سے دہشت گردی کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج دنیا کا کون سا ملک اور شہر دہشت گردی سے مکمل طور پر بچا ہوا ہے؟ یقیناً بلوچستان میں دہشت گردی کے واقعات بہت زیادہ ہو رہے ہیں لیکن کون نہیں جانتا کہ ہمسایہ ملک بھارت اُس میں اہم رول ادا کر رہا ہے جبکہ آج مقبوضہ کشمیر میں دہشت گردی کے واقعات نہیں ہو رہے کہ بھارت پاکستان کو موردالزام ٹھہرائے بلکہ وہاں آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے پچاس پچاس ہزار کا جلوس نکل رہا ہے۔ بھارت برہان وانی کو دہشت گرد کہہ کر شہید کرتا ہے لیکن لاکھوں لوگ اُس کا نماز جنازہ ادا کرتے ہیں اور کشمیر میں پچاس جگہ اُس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جاتی ہے کیا بلوچستان میں دہشت گردوں کے حق میں پچاس یا سو افراد بھی جلوس نکال سکتے ہیں، ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ دہشت گردوں کو وسیع پیمانے پر عوامی حمایت حاصل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی دہشت گرد مارا جاتا ہے تو اُس کی لاش وصول کرنے کوئی نہیں آتا۔ بلوچستان میں مودی کے بیان کے بعد مودی مردہ باد کے جلوس نکلے ہیں۔ اس پر بھارت یہ کہے گا کہ یہ جلوس

پاکستان کی حکومت یا اسٹیبلشمنٹ نے ارینج (arrange) کیے ہوں گے۔ چلیے ہم اس کو تسلیم کر لیتے ہیں تو کیا بھارتی حکومت یا بھارتی اسٹیبلشمنٹ مقبوضہ کشمیر میں بھارت کے حق میں جلوس ارینج کر سکتی ہے؟ وہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مقبوضہ کشمیر کے اکثر علاقے کرفیو کی زد میں ہیں۔ کشمیری کرفیو کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بھارتی حکومت کے جابرانہ اور غاصبانہ قبضہ کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ بلوچستان کے کچھ لوگ وفاق سے یقیناً ناراض ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اُن کی تعداد سینکڑوں میں نہیں تو چند ہزار ہوگی۔ کیا امریکہ کی ریاستوں میں ایسے لوگ نہیں جو اپنی ریاست کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے الگ دیکھنا چاہتے ہیں؟ وہ ہزاروں کی تعداد میں امریکہ کے صدر کو اس حوالہ سے خط لکھتے ہیں۔ مقبوضہ کشمیر کو ایک دنیا disputed area قرار دیتی ہے۔ کیا کبھی بلوچستان کو کسی ملک نے disputed قرار دیا؟ 1948ء میں خود بھارت کشمیر کے مسئلہ کو سلامتی کونسل میں لے کر گیا تھا اور وہاں کشمیریوں کو استصواب رائے کا حق دینے کا وعدہ کیا تھا اور بعد ازاں مُکر گیا۔ کیا ایسا کوئی معاملہ بلوچستان کا ہے؟ بھارت کی فوج کی کل تعداد چودہ لاکھ ہے، جس میں سے نصف یعنی سات لاکھ کشمیریوں کی تحریک کو دبانے اور اُن پر ظلم و ستم ڈھانے کے لیے مقبوضہ کشمیر میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جبکہ بلوچستان جو جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے وہاں پاکستان کی فوج کا معمولی حصہ متعین ہے۔ اُس کے باوجود کوئی عوامی مظاہرہ نہیں ہوتا۔ البتہ ''را'' کی مدد سے دہشت گردی کے واقعات ہو جاتے ہیں اور چند سو گمراہ لوگ اس حوالہ سے اُن سے تعاون کرتے ہیں۔ لیکن دہشت گردی فرانس اور جرمنی میں بھی ہو رہی ہے۔ وہاں بھی دہشت گرد چھپ کر کارروائی کرتے ہیں۔ کسی جلسہ جلوس کا سوال ہی نہیں۔ مودی اتنے بھولے کیوں بنتے ہیں؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ ہمسائے دہشت گردی تو کروا سکتے ہیں ہزاروں اور لاکھوں کا جلوس نہیں نکلوا سکتے۔ اتنے بڑے جلوسوں کا مطلب ہے کہ علاقے میں وسیع پیمانے پر عوام اُس تحریک کے حق میں ہے۔

یہ بات ہماری عقل اور فہم سے بالاتر ہے کہ جب بھارت کا وزیراعظم اتنا بڑا منہ کھول کر پاکستان کے حوالہ سے ہذیان بک رہا ہے تو ہمارے وزیراعظم منہ میں گھنگنیاں کیوں ڈالے ہوئے ہیں۔ فوج، سیاست دان، میڈیا اور عوام میں سے ہر طبقہ کے لوگ پکار اٹھے ہیں کہ بلوچستان اور کراچی میں بھارت دہشت گردوں کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے۔ اُنہیں وسائل اور اسلحہ بارود مہیا کر رہا

ہے۔ افغانستان میں پاؤں جمانے کا اصل مقصد ہی پاکستان کے خلاف اس طرح کی کارروائیاں کرنا ہے۔ بنگلہ دیش کے دورہ کے دوران مودی نے برملا اعتراف کیا کہ بھارت نے پاکستان کو دولخت کرنے میں مرکزی رول ادا کیا تھا۔ کل بھوشن یادیو بھارت کی خفیہ ایجنسی کا سروِنگ آفیسر رنگے ہاتھوں بلوچستان میں گرفتار ہوا۔ حال ہی میں مودی نے بلوچستان کے حوالہ سے ہرزہ سرائی کی ہے لیکن مجال ہے ہمارے وزیراعظم نواز ''انتہائی'' شریف نے بھارت کے خلاف ''را'' کے بارے میں یا کم از کم ''را'' کے جاسوس کے پکڑے جانے پر بھارت یا اُس کی خفیہ ایجنسی کے خلاف مذمت کا ایک لفظ بھی اپنی مبارک زبان سے نکالا ہو۔ محترم وزیراعظم! مودی کو جواب دیں وگرنہ قوم آپ سے جواب مانگے گی۔ یاد رہے بہت سے جوابات آپ کی طرف Due ہو گئے ہیں۔ ایسا نہ ہو اوپر سے کوئی جواب نازل ہو جائے۔ کشمیریوں کا خون جب روز قیامت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں قصاص کا مطالبہ کرے گا تو مودی کے ساتھ ساتھ پاکستان کے آج تک کے تمام حکمرانوں کو بھی جواب دینا پڑے گا اور یہ سودا بڑے خسارے کا ہوگا۔ آج وقت ہے کل نہیں رہے گا۔



اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر!

رمضان، قرآن اور پاکستان محض ہم قافیہ الفاظ نہیں ہیں، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے کسی دوسرے گوشے میں بسنے والے مسلمانوں کی نسبت مسلمانانِ پاکستان کا رمضان اور قرآن سے اضافی تعلق بھی ہے، وہ اس لیے کہ پاکستان رمضان کی اس شب میں قائم ہوا، جس کے بارے میں گمانِ غالب ہے کہ وہ لیلۃ القدر ہے جسے قرآن نے نزولِ قرآن کی شب ہونے کی بنا پر ہزار مہینوں سے بہتر قرار دیا۔ اگرچہ 1946ء کے انتخابات میں مسلم لیگ یہ ثابت کر چکی تھی کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے۔ لیکن پھر بھی 1947ء کے آغاز میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان اسی سال دنیا کے نقشہ پر حقیقت بن کر اُبھر سکے گی۔ انگریز حاکموں اور برصغیر کی بڑی قوم ہندو کی شدید ترین مخالفت کے باوجود اس کا قائم ہو جانا ہی کچھ ناقابل فہم سا محسوس ہوتا تھا۔ لیکن تشکیل پاکستان کے تاریخی واقعات کو مرحلہ وار دیکھیں تو اس سال ستائیس رمضان المبارک کی نصف شب کے قریب قیام پاکستان کا اعلان خالصتاً کن فیکون کا مظہر محسوس ہوتا ہے۔ 1940ء کی قرارداد لاہور میں پاکستان کا ذکر نہیں تھا بلکہ اس میں آزاد مسلمان ریاستوں کا ذکر ہے۔ اس پس منظر میں ایک ہزار میل سے زائد زمینی فصل رکھنے والے دو حصوں پر مشتمل ایک ریاست کا قائم ہو جانا معجزہ محسوس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان کو بجا طور پر مملکت خداداد کہا جاتا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان بنا کر ہندوؤں سے ہزار سالہ رفاقت ختم کی، اس کی دشمنی مول لی اور نتیجہ کے طور پر ہندوؤں کے ہاتھوں لاکھوں مسلمان بے گھر ہوئے، بے شمار قتل ہوئے اور ان گنت مسلم خواتین کی بے حرمتی ہوئی، یعنی پاکستان پر جان، مال اور عزت جو انسان کا کُل سرمایہ ہوتا ہے، سب کچھ لٹا دیا۔ 'پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ' اتنا پُرکشش نعرہ تھا اور نظریۂ پاکستان

کی اصطلاح اتنی دلپذیر تھی کہ یہ قربانیاں حقیر محسوس ہوتی تھیں۔ نظریہ پاکستان یعنی اسلام کے یوں تو دو بنیادی ماخذ ہیں: قرآن اور حدیث، لیکن یہ دو بھی اس طرح اکائی بن جاتے ہیں کہ حضور ﷺ قرآن مجسم اور قرآن ناطق بھی تو کہلاتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث کے مطابق قرآن سیرت رسول ﷺ اور خلق رسول ﷺ ہی کا تو بیان ہے۔ یعنی قرآن دین متین کا اصل منبع، سرچشمہ اور ماخذ ہے۔ لہٰذا نظریہ پاکستان کی آبیاری کے لیے پاکستان میں جو پہلا کام ہونا چاہیے تھا، وہ یہ تھا کہ قرآن کی تعلیم کو عام کیا جاتا، قرآن کی زبان کو سیکھا اور سکھایا جاتا، آخر انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی جا سکتی ہے تو قرآن کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے عربی کیوں نہیں سیکھی جا سکتی تھی۔ اگرچہ قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ اسے سمجھے بغیر بھی پڑھا جائے تو بھی ایک لطف، سرور اور کیف محسوس ہوتا ہے، لیکن عملی زندگی میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے احکاماتِ قرآنی کو اپنا امام بنانے کی ضرورت تھی۔ اس کے حکم پر عمل کیا جاتا اور اس کے روکے رکا جاتا۔ لیکن صد افسوس کہ عوامی اور حکومتی دونوں سطحوں پر عملی زندگی سے اسلام کو خارج کر دیا گیا۔ ہم مصنوعی روشنیوں کے ذریعے عزت و وقار کا راستہ ٹٹولنے کی کوشش کر رہے ہیں اور فطری روشنی کے مینار قرآن مجید پر ریشمی جزدانوں کے بے شمار غلاف چڑھا دیے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور پر کوشاں ہیں کہ حق کو دبیز ریشمی پردوں میں چھپا دیا جائے۔ نتیجتاً ہم صراطِ مستقیم سے بہت دور ہو چکے ہیں۔ اسلام کے عادلانہ نظام کو اپنانا تو دور کی بات ہے، ہم عام انسانی اخلاقیات سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔ رمضان اور قرآن کے ساتھ مسلمانانِ پاکستان نے کیا سلوک کیا، یہ ایک دل فگار کہانی ہے۔ رمضان کو تاجروں، سٹاکسٹوں اور صنعت کاروں نے لوٹ کھسوٹ اور چور بازاری کا مہینہ بنا لیا۔ حکومت کا حال یہ ہے کہ گراں فروشی کے الزام میں چھوٹے چھوٹے دکانداروں اور کریانہ فروشوں کو گرفتار کر رہی ہے اور اپنی گراں فروشی کا یہ عالم ہے کہ دنیا بھر میں تیل انتہائی سستا ہو گیا لیکن پاکستان میں عوام کو اُس قدر ریلیف نہ مل سکا۔ ظلم، ناانصافی، کرپشن، خیانت، جھوٹ، بددیانتی اور منافقت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا۔ اپنے معاشرے پر نگاہ ڈالیں، سیاسی اور معاشی سطح پر ہماری کوئی کل سیدھی نہیں۔ بیرونِ ملک ہماری پہچان ایک بھکاری ملک کی ہے۔ دولت اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم نے طبقاتی خلیج کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ یا وہ لوگ ہیں جو نزلہ و زکام کے علاج کے لیے یورپ میں ہسپتال بک کرواتے ہیں اور اپنے کتوں کے لیے ایئر کنڈیشنڈ کمرے تعمیر کرواتے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو بھوک اور بیماری کے

ہاتھوں رسی باندھ کر چھت سے جھول جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے وقت کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ وقت بھی آئے گا کہ اس کا وزیر اعظم مملکت خداداد پاکستان کا مستقبل جمہوریت کے ساتھ ساتھ لبرل ازم میں بھی دیکھے گا۔ پروگریسو پاکستان حکمرانوں کا ہدف ہوگا اور اسلام کی بات کرنے والوں کو انتہا پسند قرار دے دیا جائے گا اور پاکستان کے ذرائع ابلاغ فحاشی اور عریانی کی کھلم کھلا تشہیر کریں گے۔ اسلام کے نام پر بننے والے ملک کی معیشت کا انحصار سود پر ہوگا اور شجاعت، بہادری اور غیرت کا جنازہ یوں نکل جائے گا کہ ڈرون حملوں سے آزادی اور خودمختاری کو پاؤں تلے روندنے والوں کو ہم اپنا حلیف اور اتحادی قرار دینے پر مجبور ہوں گے۔

قصہ مختصر اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہم بند گلی میں داخل ہو چکے ہیں لیکن مایوسی کفر ہے۔ ضرورت ہے واپس لوٹنے کی، قرآن کی طرف رجوع کرنے کی جو نسخہ کیمیا ہے اور اسی میں ہمارے تمام مسائل کا حل موجود ہے، جو ہمیں ماضی سے بھی آگاہ کرتا ہے اور مستقبل کے لیے رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔ رمضان کا بابرکت مہینہ ہمیں دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم غور کریں کہ ہماری ذلت و رسوائی کی اصل وجہ کیا ہے۔ ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم نے اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا اسلامی ممالک میں سے صرف پاکستان ہی نے قرآن حکیم سے اعراض کیا ہے اور اسے پس پشت ڈالا ہے اور اس کے نتیجہ میں یہ اس حال کو پہنچا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان واحد اسلامی ملک ہے جس کے قیام کا جواز اسلام بتایا گیا تھا۔ کسی اور ملک نے اپنے نام کا مطلب لا الٰہ الا اللہ نہیں بتایا تھا۔ علاوہ ازیں اگر دوسرے اسلامی ممالک نے بھی قرآن کو ترک کیا ہے تو کون سی دنیا میں عزت کمائی ہے۔ آج پوری دنیا میں ایک اسلامی ملک بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا دعویٰ کر سکے اور وقت کی سپر پاور سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر مسلمانوں کی بستیاں اجاڑ رہا ہے اور مسلمانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل رہا ہے۔ اور 57 اسلامی ممالک ٹس سے مس نہیں ہو رہے امریکہ اور اسلام دشمن قوتوں کا ہاتھ صرف اور صرف ایک اسلامی فلاحی ریاست روک سکتی ہے۔ ہر کلمہ گو کا اوّلین دینی فریضہ ہے کہ مذکورہ اسلامی ریاست کے لیے تن من دھن لگا دے۔ یہی حالات کا تقاضا ہے، یہی کرنے کا اصل کام ہے، یہی جہاد ہے۔ اور اسی غرض کو پورا کرنے کے لیے اگر بات جان کا نذرانہ پیش کرنے تک پہنچے تو جان ہتھیلیوں پر رکھ کر نکلنا ہوگا۔

پندرہ سو سال قبل مدینہ کی چھوٹی سی بستی میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی ریاست چند

سالوں میں اگر یورپ، ایشیا اور شمالی افریقہ تک پھیل گئی تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں نے قرآن کو اپنا امام بنا کر انفرادی اور اجتماعی زندگی کی راہیں متعین کیں تھیں اور آج اگر اسلام کے نام پر بننے والی دوسری ریاست پاکستان ناکامیوں اور محرومیوں سے دوچار ہے تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآن سے حقیقی اور عملی تعلق منقطع کر لیا ہے۔ ہم اگر رمضان کی برکات سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآن کو اوڑھنا بچھونا بنانا ہوگا۔ اے کاش!

اے کاش! رمضان میں جنم لینے والا پاکستان قرآن کی عملی تعبیر نظر آئے۔ اے کاش! رمضان کے روزے ہمیں ایسی توانائی بخش دیں کہ ہم موجود باطل نظام کا سر کچل سکیں جس نے دنیا میں ہمیں ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں دیا اور ہماری آخروی فلاح بھی مشکوک کر دی ہے۔ ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ آج مسلمانانِ پاکستان جتنا قرآن پڑھتے ہیں آج جتنے بچے قرآن حفظ کر رہے ہیں اِس حوالہ سے ماضی قریب کی نسبت ہماری صورت حال بہت بہتر ہے پھر ہماری یہ ذلت و رسوائی کیوں۔ یقیناً یہ بات درست ہے کہ تلاوت قرآن اور حفظ قرآن میں اضافہ ہوا ہے اس کے فائدے سے ہم محروم نہیں رہیں گے ہم اس کے روحانی اثرات مرتب ہونے کے بھی مکمل طور پر قائل ہیں۔ لیکن ایک مثال جو اگرچہ پوری طرح منطبق نہیں ہوتی لیکن صرف متوجہ کرنے کے لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ کبھی کسی مریض کو ڈاکٹر کا نسخہ صرف پڑھ لینے سے یا دوائیوں کے نام رٹ لینے سے افاقہ ہوا ہے۔ صرف اُس کے علم میں اضافہ ہو سکتا ہے کہ اس مرض کے لیے یہ دوائیاں کارآمد ہیں۔ اسی طرح جب تک ہم اپنی عملی زندگی میں قرآن سے رہنمائی حاصل نہیں کریں گے اور اس کتابِ ہدایت کو اپنے دل و دماغ میں انڈیل نہیں لیں گے، اُس کے حکم پر آگے بڑھیں گے اور جس سے روک دے گا اس سے رک جائیں گے۔ کسی قسم کے لیت و لعل میں اور کسی قسم کی دلیل بازی میں نہیں پڑیں گے۔ تب ہم قرآن پاک سے حقیقی اور مکمل فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ تب ہم حاملِ قرآن ہونے کے دعویٰ میں سچے ہوں گے۔ یہ ایک ایسا راز ہے جسے افشاں ہوئے پندرہ سو سال ہو چکے ہیں مسئلہ ہماری بیداری کا ہے، مسئلہ ہماری نیت کا ہے اور مسئلہ صرف عمل کا نہیں ضعفِ ایمان کا بھی ہے۔ آخر میں علامہ اقبال کا یہ شعر عرض کیے دیتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

خدا خیر کرے.....ایک سیاسی میچ کا احوال

''1997ء میں پاکستان میں آزادی کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ زیرِ نظر مضمون اُس موقع پر گولڈن جوبلی کرکٹ میچ کے عنوان سے تحریر کیا گیا تھا۔ بعض قارئین کے اصرار پر اِس کو قندِ مکرر کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ البتہ آخر میں آج تک کے سیاسی حالات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔''

سرسبز و شاداب سٹیڈیم بیضوی نہ ہونے کے باوجود بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں موجود لوگ بڑے پراعتماد نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور بڑے پرجوش دکھائی دے رہے تھے۔ سٹیڈیم کے مختلف دروازوں سے لوگ جوق در جوق اندر داخل ہو رہے تھے۔ یہ نئے آنے والے لوگ، محسوس ہوتا تھا بڑا دور دراز کا سفر طے کر کے آ رہے ہیں۔ ان کے سر گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر دکھ اور غم کے آثار نمایاں تھے۔ ان میں اکثر کے جسم زخموں سے چور تھے، جن سے رسنے والا خون سٹیڈیم کی ہریالی کو سرخی مائل کر رہا تھا، لیکن پھر بھی ان کی آنکھوں میں چمک تھی اور یہ بڑے پُرعزم دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سٹیڈیم میں داخل ہوتے ہی انتہائی خوشی کا اظہار کرتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے راہی کو منزل مل گئی ہو۔ سٹیڈیم میں پہلے سے موجود لوگ نو واردوں کا والہانہ استقبال کر رہے تھے۔ انہیں خالی جگہوں پر بٹھا رہے تھے، جگہ کی کمی محسوس ہوتی تو وہ خود سکڑ جاتے۔ کھانے پینے کی چیزیں خود ان کے اپنے پاس بھی زیادہ نہیں تھیں، لیکن جو کچھ بھی تھا وہ اس سے نئے آنے والوں کی تواضع کر رہے تھے۔

اچانک سٹیڈیم میں شور اٹھا اور تالیوں کی گونج میں اعلان ہوا کہ محمد علی نے ٹاس جیت کر خود بیٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیاقت کو اوپننگ بیٹسمین کے طور پر بھیجا گیا۔ لیاقت جو ایک سینئر اور

تجربہ کار کھلاڑی تھے، انگریزی کٹ پہنے عینک لگائے خراماں خراماں وکٹ پر پہنچے اور بڑی آہستگی سے کھیل کا آغاز کیا۔ وہ مغرب کی طرف کھیلنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے جس سے مشرق کی طرف رنز بنانے کے انہوں نے کئی قیمتی مواقع گنوا دیئے۔ پھر انہوں نے ایک شاندار چھکا لگانے کی کوشش میں اپنا دایاں بازو ہوا میں بلند کیا اور اپنی مٹھی کو مضبوطی سے بند کر لیا۔ وہ گیند کو تو زیادہ دور نہ پھینک سکے، البتہ سٹیڈیم میں موجود لوگوں نے ان کی اس کوشش پر انہیں زبردست داد دی۔ اللہ اکبر اور ہم جیتیں گے کے زبردست نعرے لگے۔ ابھی داد و تحسین کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک تیز نو بال لیاقت کے سینے پر لگا۔ وہ دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ ٹیم کا ڈاکٹر سٹریچر لے کر بھاگم بھاگ آیا، لیکن ایمپائر شہادت کی انگلی آسمان کی طرف بلند کر چکا تھا اور لیاقت ہمیشہ کے لیے آؤٹ ہو گئے۔ سٹیڈیم میں کھلبلی مچ گئی۔ بہت سے لوگ گراؤنڈ میں داخل ہو گئے اور سٹیڈیم میں سرخ دھبے مزید بڑھ گئے۔

ٹیم کے کھلاڑی غیر ذمہ دارانہ کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پے در پے آؤٹ ہونے لگے۔ کوئی جم کر کھیل نہ پا رہا تھا۔ لوگوں میں مایوسی بڑھنے لگی۔ وہ اپنے کھلاڑیوں پر تنقید کرنے لگے۔ اس پر بیٹنگ آرڈر تبدیل کر کے چودھری محمد علی جو بنیادی طور پر ایک سکورر تھے، انہیں سفید کٹ پہنا کر میدان میں اتار دیا گیا۔ چودھری صاحب نے وکٹ کے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ایک شاندار چوکا لگایا۔ یوں تو سٹیڈیم میں موجود سب لوگوں نے اس چوکے کو سراہا لیکن جس مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ یہ چوکا لگایا گیا تھا، اسے بھرپور طور پر سراہنے اور اس کی داد دینے کا حق بہت کم لوگوں نے ادا کیا۔ اس چوکے نے اچھے سکور کی بنیاد رکھ دی اور آنے والے کھلاڑیوں کی ایک ضابطہ کی طرف رہنمائی کر دی کہ اگر وہ کراس بیٹ کی بجائے سیدھے بیٹ کے ساتھ کھیلیں گے تو لمبی اور محفوظ اننگز کھیل سکتے ہیں۔ لیکن ٹیم میں چونکہ یقین، اتحاد اور تنظیم کا فقدان تھا، لہٰذا کھلاڑی پھر یکے بعد دیگرے آؤٹ ہونے شروع گئے۔

ٹیم کی اس ناقص کارکردگی پر لوگ مسلسل ناراضی اور بیزاری کا اظہار کر رہے تھے کہ اچانک سٹیڈیم میں سناٹا چھا گیا۔ ایک لمبا تڑنگا سرخ و سفید چہرے والا بارعب کھلاڑی خاکی کٹ اور بھاری فلیٹ پہنے لانگ ہینڈل بیٹ گھماتے ہوئے گراؤنڈ میں داخل ہوا۔ یہ ایوب خان ہے، سٹیڈیم میں موجود بعض لوگوں نے سرگوشی کے انداز میں دوسروں کو بتایا۔ لیکن اس کا نام تو کھلاڑیوں

کی فہرست میں نہیں تھا۔ بعض لوگ شش و پنج میں پڑ گئے مگر اس کی غضبناک آنکھوں اور خاکی کٹ کی دہشت سے سب خاموش رہے۔ اس نے وکٹ پر آتے ہی چند ایک اچھے شارٹ کھیلے جس پر لوگ خوش ہو گئے۔ لنچ کے وقفہ کے بعد جب کھیل دوبارہ شروع ہوا تو ایوب خان کٹ تبدیل کر چکا تھا۔ تھکاوٹ اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ اب وہ اپنے ساتھ ایک نوجوان کو جو ہو بہو اس کا ہم شکل تھا بحیثیت رنر کے ساتھ لایا۔ رنر جس کا واحد کام زخمی کھلاڑی کی جگہ دوڑنا ہوتا ہے کھیل میں مداخلت کرنے لگا اور پچ کو خراب کرنا شروع کر دیا، جس پر لوگ شدید احتجاج کرنے لگے۔ پتھر، خالی بوتلیں، چھلکے اور جوتے گراؤنڈ میں آنا شروع ہو گئے۔ سٹیڈیم میں موجود سب لوگ کھلاڑی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ البتہ اب قیادت کے لحاظ سے لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ مغربی حصے میں احتجاجی ہنگاموں کی قیادت ذوالفقار علی نامی ایک نوجوان کر رہا تھا اور مشرقی حصے کی قیادت ادھیڑ عمر مجیب کر رہا تھا۔ آخر کار کھلاڑی میدان چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

نیا کھلاڑی بھی خاکی کٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ بھاری ڈیل ڈول رکھتا تھا، لیکن وکٹ کی طرف چلتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ ذوالفقار اور مجیب کا سہارا لئے ہوئے تھا۔ اس نے سٹیڈیم میں موجود لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ کپتان تمہاری مرضی کا بنایا جائے گا۔ بتاؤ کس کو کپتان بنانا چاہتے ہو؟ سٹیڈیم کے مشرقی حصے سے زوردار آواز آئی مجیب اور مغربی حصے سے آواز آئی ذوالفقار۔ اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ کیوں نہ ان دونوں کو باری باری ٹھکانے لگا کر خود بیٹنگ کی جائے۔ لہٰذا پہلے ذوالفقار کی مدد سے مجیب کو پویلین میں بند کر دیا، لیکن اس پر سٹیڈیم کے مشرقی حصے سے زبردست طوفان اٹھا اور انہوں نے سٹیڈیم کے باہر سے بھی لوگوں کو اپنی مدد کے لیے پکارنا شروع کر دیا۔ کھلاڑی نے آنکھیں بند کر کے بیٹ گھمانا شروع کر دیا لیکن وہ کوئی شارٹ لگانے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ سٹیڈیم کے باہر سے کچھ لوگ اس کے مشرقی حصے میں چھپ چھپ کر داخل ہونا شروع ہو گئے۔ ان میں سے اکثر سروں سے گنجے تھے، البتہ بالوں کی ایک لٹ سر کے پچھلے حصے پر لٹک رہی تھی اور کچھ لمبی داڑھی والے سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ انہوں نے گراؤنڈ میں پٹاخے پھینکنے شروع کر دیئے۔ کھلاڑی اوندھے منہ گر گیا اور مشرقی حصے کے لوگوں نے الگ پویلین بنا کر اس پر نیا جھنڈا لگا دیا۔ اس جدائی پر مغربی حصے سے کچھ دیر رونے اور سسکنے کی آوازیں آتی رہیں، لیکن جلد مغربی حصے والوں نے بھی سٹیڈیم کی تقسیم کو قبول کر لیا اور اسی ٹیم کے

ساتھ جواب نصف رہ گئی تھی اپنے حصے کی گراؤنڈ میں کھیل کا آغاز کر دیا۔

ذوالفقار علی پہلے کھیلنے آئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک شاندار سٹروک کھیلا جس پر انہیں زبردست داد ملی۔ اس کا یہ سٹروک چودھری محمد علی کے چوکے سے بہت مماثلت رکھتا تھا بلکہ ذوالفقار علی نے اسے چودھری محمد علی سے بھی بہتر انداز میں Shape کیا تھا۔ اس نے یہ شارٹ کھیلنے سے پہلے ہر ہر فیلڈر کا بغور جائزہ لیا اور وہ فری سٹائل کرکٹ کھیلتے رہے اور سٹیڈیم سے باہر کے لوگوں کو بھی للکارے مارتے رہے۔ اچانک مشرق کی طرف سے سٹیڈیم کی بیرونی دیوار سے متصل جگہ پر ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ دھماکا اتنا زوردار تھا کہ سٹیڈیم کے در و دیوار لرز اٹھے اور اندر کی فضا گرد آلود ہو گئی اور تھوڑی دیر کے لیے کھیل روک دینا پڑا۔ اس دوران ذوالفقار علی ٹیم کے دوسرے ارکان سے مشورہ کرتے رہے۔ چائے کے وقفے کے دوران جب اخباری نمائندوں نے ذوالفقار علی سے دھماکے کے بارے میں سوالات کئے تو انہوں نے بڑی گرج دار آواز میں کہا کہ ہم گھبرانے والے نہیں ہیں، ہم گھاس کا ڈنر کر لیں گے لیکن لیڈ لے کر دکھائیں گے۔ اس پر سٹیڈیم میں موجود لوگ ''جیوے جیوے'' اور ہزار سالہ میچ کھیلیں گے کے فلک شگاف نعرے لگاتے رہے۔ لیکن فری سٹائل کھیل اور قواعد و ضوابط کو مسلسل نظر انداز کرنے سے صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ تو پہلے ہی مخالفت اور ہوٹنگ کر رہے تھے، سیڑھیوں اور زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بھی کچھ لوگ جو شروع شروع میں اچھل اچھل کر داد دے رہے تھے اور گلے پھاڑ کر نعرے لگے رہے تھے، آوازے کسنے لگے۔ آہستہ آہستہ مخالفت بڑی شدت اختیار کر گئی۔ ذوالفقار علی جوں جوں بیٹ زور سے گھماتا توں توں جوتے پتھر وغیرہ تیزی سے گراؤنڈ میں پھینکے جاتے۔ بعض باریش حضرات بڑے غضبناک ہو رہے تھے اور یہ کہہ کر لوگوں کو اشتعال دلا رہے تھے کہ یہ تو ہمارا کھلاڑی ہی نہیں ہے۔ ایک بزرگ سرخ ٹوپی پہنے ہاتھ میں حقہ تھامے زوردار طریقے سے اعلان کر رہے تھے، اس کو ٹیم سے نکالو، میچ ہمارا ہے۔ ذوالفقار علی مطمئن تھا کہ ایمپائر اس کا اپنا ہے لیکن وہ اس وقت حیران رہ گیا جب اسے ایک وائیڈ بال پر LBW قرار دے دیا گیا۔ اس فیصلے پر سٹیڈیم کے بالائی نشین لوگوں نے اپنی جگہ سے اچھل اچھل کر خوشی کا اظہار کیا۔

نیا کھلاڑی گو خالی کٹ اور بھاری فلیٹ پہنے ہوئے تھا لیکن کوتاہ قد، سپاٹ سا چہرہ، بڑی بے ضرری شخصیت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ وہ سر جھکائے آہستگی سے چلتا ہوا گراؤنڈ میں پہنچا۔ وہ

قسم کھا کر پویلین سے نکلا تھا کہ وہ کھلاڑی نہیں ہے نہ کھیلنے میں دلچسپی رکھتا ہے، وہ صرف گراؤنڈ کی صفائی اور پچ کو ہموار کرنے جا رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بہت زیادہ فاؤل کھیلنے سے پچ بہت خراب ہو چکی ہے۔ اس نے اپنے مشن کو "آپریشن فیر پلے" قرار دیا۔ پچ پر پہنچ کر وہ بڑا مسرور دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں کی فضا اس کو راس آ گئی تھی۔ اس نے تمام وعدے پس پشت ڈال کر خود کھیلنا شروع کر دیا۔ شمال مغرب کی طرف اس نے چند ایک اچھے شارٹ کھیلے جس پر اسے داد بھی ملی۔ وہ دھیمے پن سے لیکن بیٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر کھیلتا رہا۔ سٹیڈیم میں جگہ جگہ ترنگے جھنڈے کے سائے میں بیٹھے لوگوں کی ٹولیاں کبھی کبھار اس پر پتھراؤ کرتیں تو وہ بڑے سلیقے سے گیند کے ساتھ انہیں بھی فلک (Flick) کر دیتا۔ وہ اپنی دفاعی بیٹنگ کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ وہ چوکا مارنے کے لیے بھی بیٹ اٹھانے کی بجائے پلیسنگ (placing) پر انحصار کرتا تھا۔ جس سے وہ باریش لوگوں سے بڑی داد وصول کرتا تھا لیکن ایک تیز رنز بنانے کی کوشش میں جب وہ کریز پر پہنچنے کی کوشش میں تھا، بیٹ اور پاؤں ابھی ہوا ہی میں تھے کہ اس کی وکٹیں اتنے زوردار طریقے سے اڑا دی گئیں کہ بیلز بھی ٹوٹ پھوٹ گئیں۔

سٹیڈیم میں سناٹا چھایا ہوا تھا کہ ایک خاتوم پیڈ باندھے دستانے پہنے بڑے سٹائلش انداز میں بیٹ گھماتے گراؤنڈ میں داخل ہوئیں۔ ترنگے جھنڈے کے سائے میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس کا تالیوں سے زبردست استقبال کیا۔ البتہ باریش لوگ بڑے سیخ پا ہو رہے تھے۔ مردوں کے کھیل میں عورت کیسے شریک ہو سکتی ہے۔ خاتون کھلاڑی بڑے اعتماد سے میدان میں داخل ہوئی تھی لیکن وہ کوئی اچھا شارٹ نہ کھیل سکی۔ اس کا ایک آسان کیچ چھوٹ گیا اور اسے ایک اور موقع دستیاب ہو گیا۔ اب کی بار اس نے بڑی مونچھوں والے ایک شخص کو جو حلئے سے کسی گروہ کا سرغنہ معلوم ہوتا تھا پارٹنر کی حیثیت سے اپنے ساتھ کھلانا شروع کیا۔ لوگ حیران تھے کہ کرکٹ کھیلتے ہوئے اس شخص نے بیٹ کی بجائے کدال پکڑا ہوا تھا اور اس کی کٹ کو بڑی بڑی جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ خاتون تو جلد ہی کلین بولڈ ہو کر باہر چلی گئیں، لیکن جو صاحب ان کے ساتھ تھے ان کے گلوز (Gloves) اتار کر ان کی کلائیوں سے لپیٹ دیئے گئے۔ خاتون کے آؤٹ ہو جانے پر سٹیڈیم میں موجود اکثریت نے خوشی کا اظہار کیا۔

نئے کھلاڑی کا عوام نے والہانہ استقبال کیا گیا۔ وہ لوگ بڑی دیر تک بنچوں پر کھڑے ہو کر

تالیاں بجاتے اور استقبالیہ نعرے لگاتے رہے۔ ایسا استقبال پہلے کسی کھلاڑی کا نہیں ہوا تھا۔ یہ کھلاڑی جس کا نام نواز ہے خوش شکل وخوش ذوق اور سلیقہ مند دکھائی دیتا ہے۔ عوام کی متفقہ رائے ہے کہ یہ آخری اچھا کھلاڑی ہے۔ یہ کھلاڑی اگر ناکام رہا تو میچ میں ہار ہمارا مقدر ہوگا۔ نواز صاحب بڑے اعتماد سے پچ پر پہنچے۔ ایمپائر سے گارڈ لے کر پراعتماد انداز سے گراؤنڈ کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دوسری طرف بالروں نے بھی فیلڈ بڑی جارحانہ کھڑی کر دی اور انہوں نے نواز کو پے در پے کئی باؤنسر مارے جنہیں وہ صحیح طور پر ہک نہیں کر پا رہے تھے۔ ان سے کوئی خاص اچھا شارٹ نہیں کھیلا جا رہا تھا۔ بال بار بار انہیں (Beat) کر رہا تھا لیکن ان کے اعتماد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ سٹیڈیم میں موجود لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے کہ ہمیں تو بہت بہتر کارکردگی کی توقع تھی۔ انہوں نے پویلین سے نکلتے وقت اخباری نمائندوں کو بتایا تھا کہ ٹیم کو اس خوفناک بحران سے نکالنے کے لیے میں کشتیاں جلا کر میدان میں کود رہا ہوں۔ آپ دیکھئے، میری کٹ کو جیب نہیں لگی ہوئی اور یہی حکم میں نے ٹیم کے دوسرے ممبروں کو دیا ہے کہ بغیر جیب کے کٹ (Pocket less Kit) پہنیں۔ لیکن سراغرسانوں نے نشاندہی کی کہ کٹ میں کچھ خفیہ خانے لگے ہوئے تھے جو کمال مہارت سے لگائے گئے اور سرسری نگاہ ڈالنے سے نظر نہیں آتے تھے۔ یہ نئے کھلاڑی اپنی بیٹنگ بہتر بنانے کی بجائے بالروں سے بار بار بال آہستہ کرنے کی درخواست کر رہے تھے اور باؤنسر نہ کرانے کے لیے ان کی منت سماجت کر رہے تھے جن پر سٹیڈیم میں موجود ان کے اپنے حمایتی سخت پریشان تھے۔ اس کے بعد تو ہماری ٹیم میں اور کوئی اچھا کھلاڑی نہیں ہے۔ محدود اوورز کا میچ ہے۔ دن ڈھلنے لگا، درختوں کے سائے لمبے ہونے لگے۔ مشرق تو پہلی ہی ابر آلود تھا، مغرب کی طرف سے بھی کالی گھٹائیں اٹھنے لگیں۔ ٹارگٹ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ کچھ لوگ کہنے لگے کہ اگر کوئی فری ہٹر (Free Hitter) آجائے تو اب بھی وقت ہے۔ ایسے سادہ لوح لوگ بار بار آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنے لگے۔

اسی اثناء میں فضا میں ایک طیارہ نمودار ہوا۔ کچھ پولیس والوں نے ہاتھوں میں سرخ جھنڈیاں لئے جہاز کو لینڈ کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن جلد ہی خاکی یونیفارم میں بھاری بوٹ پہنے ہوئے کچھ لوگ پولیس کی طرف بڑھے۔ پولیس انہیں دیکھ کر ایک طرف دبک گئی۔ یونیفارم والوں نے جہاز کو سبز جھنڈی لہرا کر لینڈ کرنے کے لیے کہا۔ جہاز سے درمیانے

قد، سانولے رنگ کا آدمی اترا۔ مضبوطی سے ہاتھ میں بیٹ پکڑے بغیر پیڈ کے پچ کی طرف چلنے لگا۔ پہلے بیٹسمین کے سینے پر بیٹ کا ہینڈل رکھ کر اسے سٹیڈیم سے ہی باہر نکال دیا۔ وہ روتا ہوا سٹیڈیم سے باہر نکلا اور کھجور کے درختوں والی سرزمین میں جا چھپا۔ کھلاڑی کا نام پرویز تھا۔ عوام نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ ہر طرف سے آواز آنے لگی، اب سب اچھا ہو جائے گا، یہ کھلاڑی خوبصورت شارٹ کھیلے گا، اس کے بیٹ پر بڑے خوبصورت حروف میں ''کمانڈو'' لکھا ہے۔ پرویز نے اننگز کا آغاز بڑے اچھے انداز میں کیا۔ موٹے فربہ جسم کے فیلڈروں کی طرف تاک تاک کر ہٹیں لگائیں۔

ان فیلڈروں کی کٹ کچھ اس طرح کی سلی ہوئی تھی کہ جیبیں بہت زیادہ اور وزنی ہونے کی وجہ سے ان سے بھاگا نہیں جاتا تھا۔ یہ نیا کھلاڑی مشرق کی جانب سٹیڈیم سے باہر بھی وقتاً فوقتاً دھمکی کے انداز میں اونچی دیکھتا لیکن اچانک سٹیڈیم سے باہر بہت دور بہت دور سات سمندر پار زوردار دھماکہ ہوا۔ ہر طرف طوفان برپا ہو گیا۔ دنیا کے کونے کونے سے یہ آوازیں آنے لگیں کہ جس سٹیڈیم میں پرویز کھیل رہا ہے، اس کے شمال مغرب میں رہنے والوں نے دھماکہ کیا ہے۔ او ہو یہ الیون پر نائن آؤٹ ہو گئے۔ اس دھماکہ کے بعد پرویز کے کھیل میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اب اُس نے اپنی جارحانہ بیٹنگ کا رخ ان فیلڈروں کی طرف کر لیا، جن کی کٹ ٹخنوں سے اوپر تھی اور انہوں نے لمبی داڑھیاں رکھی ہوئی تھیں اور وہ بڑے پھرتیلے تھے۔ ان لوگوں نے پرویز کو رن آؤٹ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہاں تک کہ ایک آدھ مرتبہ انہوں نے خود پرویز سے ٹکرانے کی کوشش کی۔ پرویز کی زوردار ہٹیں اب صرف ان لوگوں کو لگ رہی تھیں۔ سٹیڈیم کے باہر خصوصاً مشرق کی طرف اب وہ مسکرا مسکرا کر دیکھتا اور سات سمندر پار والوں کے ہر باؤنسر پر اپنا سر جھکا لیتا، لیکن داڑھی والے فیلڈروں کو گھور کر دیکھتا۔ سٹیڈیم کے لوگ اُس سے بہت مایوس ہو کر کہنے لگے کہ اس سے بہتر تو پہلے کھلاڑی تھے۔ وہ باؤنسر پر اتنا جھکتے نہیں تھے، یہ تو سر ہی نہیں اٹھاتا۔ تماشائیوں کے ہنگاموں اور شور شرابے کے باوجود پرویز کھیلتا گیا۔ بُرے کھیل کے باوجود پرویز کا انداز فاتحانہ تھا۔ ایمپائر نے اُسے ایک دو بار ٹوکا جس پر وہ ایمپائر پر برہم ہو گیا اور اُسے باہر دھکیل دیا۔ سٹیڈیم کے وسط میں ایک عمارت جس پر انصاف منزل لکھا تھا اور جس کی پیشانی پر ترازو کا نشان بنا تھا اور وہاں بیٹھے

سب لوگوں نے کالے کوٹ اور کالی ٹائیاں پہنی ہوئی تھیں، ایمپائر سے بدسلوکی پر انتہائی مشتعل ہوئے اور میدان میں کود پڑے۔ وہ بڑے غصے میں تھے اور پرویز کے خلاف کھڑے تھے۔ گارڈ اُنہیں باہر دھکیلتے، وہ دوبارہ اندر آجاتے، خاتون کھلاڑی جو آؤٹ ہونے کے بعد سٹیڈیم سے باہر جا چکی تھی، پھر سٹیڈیم میں آگئی۔ لیکن یہ کیا ہوا، ایک اور دھماکہ۔ اسی باغ کے باہر جہاں لیاقت ہمیشہ کے لیے آؤٹ تھا، وہاں انجانی سمت سے ایک بال خاتون کے سر پر لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئیں۔ سٹیڈیم میں طوفان کھڑا ہو گیا اور ہر طرف ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ کسی کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

آخر وہی مونچھوں والا خاتون کا ساتھی گیٹ پر اجرک پہنے گراؤنڈ میں داخل ہوا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ مجھے خاتون نے اپنے بعد ٹیم کا کپتان نامزد کیا تھا، اور پچ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ پرویز اُسے منانے کی کوشش کر رہا تھا، آؤ دونوں چل کر کھیلیں، لیکن نیا کھلاڑی آصف کرکٹ ہاکی کے انداز میں کھیل رہا تھا۔ وہ فیلڈروں کو ہی نہیں ٹیم کے کھلاڑیوں کو بھی ڈاج پر ڈاج دے رہا تھا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ سٹیڈیم میں بیٹھے لوگ سر پیٹ رہے ہیں۔ وہ گرمی سے بے حال ہو رہے ہیں، بار بار اندھیرا چھا جاتا ہے۔ آصف بار بار کہہ رہا ہے کہ اس اوور کے ختم ہونے پر اندھیرا ختم ہو جائے گا، لیکن کوئی یقین نہیں کر رہا، کیونکہ آصف سٹیڈیم کا تمام ساز و سامان زرداری انکلوژر میں جمع کرتا جا رہا ہے۔ اوہ یہ فضا میں گدھ کیوں جمع ہوتے جا رہے ہیں، لوگ حیران ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں اور یہ آصف ہر بال کھیلنے سے پہلے گدھوں کی طرف کیوں دیکھتا ہے خدا خیر کرے، اللہ سٹیڈیم اور اہل سٹیڈیم کی حفاظت کرے۔

❁❁❁